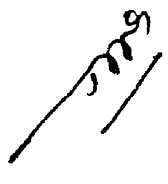


شمارہ ۱ جلد ۴

دوماہی

الفاظ

جنوری، فروری ۱۹۷۹ء

چیف ایڈیٹر

ابوالکلام قاسمی

مینیجنگ ایڈیٹر

اسد یار خاں

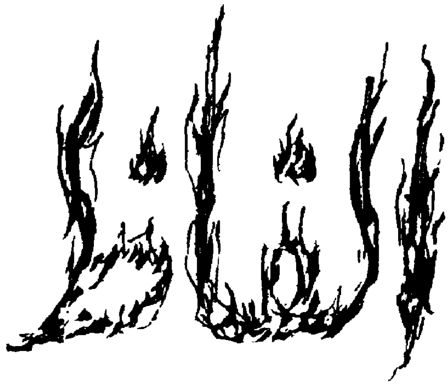
زر سالانہ ——— دس روپے
فی کاپی ——— دو روپے

پرنٹر پبلشر ——— اسد یار خاں
مطبوعہ ——— اسرار کریمی پریس، الہ آباد
کتابت ——— ریاض احمد الہ آباد
سرورق ———

مقام اشاعت:
ایجوکیشنل بک ہاؤس
مسلم یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱

پتہ: دوماہی الفاظ ایجوکیشنل بک ہاؤس
مسلم یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱
فون نمبر ۳۷۶۸

آئینہ



آگ کے شعلوں سے سارا شہر روشن ہوگیا
ہو مبارک آرزوئے خار وخس پوری ہوئی

بحث

تحریک: ابوالکلام قاسمی

نئی کہانی

اردو میں کہانی کی روایت بہت قدیم نہیں تاہم اس کم عمری کے باوجود اس صنف نے اپنے روپ کئی بار بدلے۔ رنگ و روپ کا یہ تنوع کسی بھی صنف ادب کے لئے خوش آیند بات ہو سکتی ہے، مگر تنوع بذات خود بہت زیادہ اہم چیز نہیں۔ اہم بات یہ ہے کہ یہ تنوع کس حد تک اپنے عہد، طرز احساس اور زندگی کی بدلتی ہوئی اقدار سے ہم آہنگ رہا ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ ہم عصر زندگی اور اس سے پیدا ہونے والے مسائل کے مقابلے میں کہانی کی تکنیکی اور ہیئتی تبدیلیوں کی رفتار زیادہ تیز رہی ہو ؟؟

فکشن مدت سے زمانی اور مکانی حدود میں محصور ہونے کے لئے بدنام رہا ہے۔ نئی کہانی کا آغاز نہ صرف یہ کہ کہانی کے لئے زمینی اور زمانی حد بندیوں سے ارتفاع کی ایک کوشش ثابت ہوئی بلکہ اس کوشش نے کہانی کو اس کی صنفی پابندیوں سے بھی چھٹکارا دلایا اور رفتہ رفتہ شاعری اور فکشن دونوں تخلیق کی مطلق اصطلاح کے تحت شمار کئے جانے لگے۔ کہانی کی داخلی اور خارجی تبدیلیاں روایت سے اس انحراف کا نتیجہ تھیں جو اپنے ساتھ نیا ذہن اور نیا طرز اظہار لے کر آیا تھا۔ نئی کہانی کے یہ نقوش روایت کے بسیط شعور، زندگی کو آرپار دیکھنے کی صلاحیت اور ذاتی طرز اظہار کی تلاش کا مظہر تھے۔ قرۃ العین حیدر اور انتظار حسین کی کہانیاں اس بیان کی توثیق کے لئے کافی ہیں —— ایک کی کہانی تکنیک، فضا اور موضوع کے اعتبار سے عصری زندگی کے بطن سے ظہور پاتی ہے تو دوسرے کے یہاں اسی زندگی کو ایام رفتہ اور اس زمانے کے مزعومات کے وسیلے سے سمجھنے کا رجحان ملتا ہے۔ یہ مختلف الجہت رویئے نئی کہانی کے سنگ میل کی حیثیت سے سامنے آئے تھے اور ان کے بعد ہندو پاک کے کم از کم ایک درجن افسانہ نگاروں نے نئی کہانی کے سرمایے میں بیش قیمت اضافے بھی کئے مگر کچھ ہی عرصے میں ان کے گرد ناپختہ کاروں کی اتنی بڑی بھیڑ جمع ہوئی کہ رطب و یابس کی شناخت تک مشکل ہو گئی۔ ان خام کاروں کے پاس لسانی قوت اختراع تھی اور نہ انھیں زندگی کا عرفان حاصل تھا۔

اس سے سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ کہانی سے قاری کا رشتہ کمزور پڑنے لگا اور نئی کہانی کی مقبولیت میں غیر معمولی طور پر کمی واقع ہوئی (میں شعری تخلیقات کے معاملے میں با جماعت تخلیق اور عمومی ترسیل کا زیادہ قائل نہیں مگر ناول اور کہانی کی حد تک قاری کی پسند و ناپسند کو ناقابل اعتنا نہیں سمجھتا) اور کہانی کی شناخت اور اس کی قدر و قیمت کے تعین کے سارے پیمانے مشتبہ ہو گئے۔

نئی کہانی کا یہ انحراف یہیں اپنی جڑیں مضبوط کر لیتا جب بھی غنیمت تھا۔ مگر دو دہائی گزرنے کے بعد بھی یہ انحراف انحراف ہی رہا روایت میں تبدیل نہ ہو سکا۔

اس پس منظر میں ان چند باتوں پر غور کئے بغیر کہانی کی موجودہ صورت حال کا جائزہ لینا ممکن نہیں۔

۱۔ کیا کہانی کی کوئی ایسی جامع تعریف کی جا سکتی ہے جو نئی اور پرانی دونوں طرح کی کہانیوں کا احاطہ کر سکے ؟

۲۔ ہم عصر زندگی میں کہانی کا کیا رول ہے ؟

۳۔ ہندو پاک کے مختلف النوع سطحوں پر زندگی گزارنے والے باشندوں کے تناظر میں عصری حسیت اور آگہی کا کیا مفہوم ہے ؟

۴۔ کہانی کی موجودہ صورت حال کو دیکھتے ہوئے آپ کو اس صنف کا مستقبل خطرے میں تو نظر نہیں آتا ؟

شرکاء { مہدی جعفر / حسین الحق

مہدی جعفر :

ا ــــ میں نئی کہانی میں انحراف کا قائل نہیں ہوں۔ انحراف غالباً مناسب لفظ نہیں۔ اسے نئے رجحان، نئے وسیلہ یا نئے میڈیم سے بہ آسانی تبدیل کر سکتے ہیں۔ کیا انحراف زیادہ دور تک ساتھ دے سکتا ہے؟ مجھے اس میں شبہ ہے۔ غالباً میڈیم کا لفظ مناسب ترین ہے۔

باقر مہدی نے اپنے ایک حالیہ مضمون "نیا افسانہ۔ اظہار کے چند مسائل" میں نئے اور پرانے افسانے کے ٹکراؤ کا تذکرہ کرتے ہوئے میڈیم کی طرف ایک ہلکا سا اشارہ کیا ہے ــــ "نئے افسانے کا مقابلہ ترقی پسند افسانے سے نہیں بلکہ داستانی کہانی سے ہے جس کے نمایندے انتظار حسین ہیں۔ انتظار حسین نے اپنے ایک انٹرویو میں کہا تھا کہ انور سجاد وغیرہ جانے کس دنیا کی باتیں کرتے ہیں میں ان کی زبان نہیں سمجھ سکتا اور انور سجاد نے اپنے کئی مضامین میں انتظار حسین کو نہایت دقیانوسی افسانہ نگار قرار دیا ہے۔ انتظار حسین نے قدیم کہاوتوں حکایتوں اور فیبلس کو نئے معنی و مفہوم دیے ہیں۔ ناول اور مختصر افسانہ مغرب کی دین ہے۔ جیسے کہ ریڈیو اور ٹی وی۔ میک موہن کی بات یاد رکھنا چاہیے کہ میڈیم اظہار کے نئے طریقے ایجاد کرتا ہے۔ نئے افسانے پر فلم میڈیا کا خاصا اثر ہے اور لفظوں میں پیکر تراشی اور رنگوں، کانکریٹ امیج، غرض کہ شہری زندگی کی تیز رفتاری تک نے افسانوی ادب کی دنیا میں انقلاب پیدا کر دیا۔ مگر انتظار حسین ان دلائل کو قابل اعتنا ہی نہیں سمجھتے۔" (اظہار-۲) ۔ ظاہر ہے باقر مہدی پرانے اور نئے افسانے کے فرق کو عصری مگر سطح پر کار فرما زندگی کے پیمانے سے ناپتے ہیں جس پر بیرونی عوامل کے اثرات پڑتے رہتے ہیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا عصری حسیت شہری زندگی، اخبارات، ریڈیو، ٹی وی، فلم یعنی ماس میڈیا کے توسط سے ہی عبارت ہے یا کہ زیادہ داخلی حیثیت رکھتی ہے اور اس کی جڑیں فرد کی ذات میں ابھرتی ہیں۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں عصری حسیت ان

دونوں کیفیات سے متعلق ہے۔ ظاہر ہے اس صورت میں انور سجاد کے نئے اور 'شہری' افسانے کا انتظار حسین کی 'داستانوی کہانی' سے ٹکراؤ نہیں ہے۔ دراصل انتظار حسین عصری حسیت کو پیش کرنے کے لیے داستانوی میدان یا میڈیم کو ازسرنو دریافت کرتے ہیں اور انور سجاد اپنے ایک نئے میدان یا میڈیم کی تشکیل کرتے ہیں جس کے ڈانڈے شہری فضا سے ملتے ہیں۔ لہٰذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ انتظار حسین اور انور سجاد میں بازیافت اور ایجاد کا فرق ہے انحراف کا نہیں۔ دونوں افسانہ نگار ضرور ایک دوسرے کی زبان سمجھتے ہوں گے مگر اپنے اپنے میدان میں ڈٹے رہنا چاہتے ہیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ قدیم اور جدید طرز کے افسانوں کا احاطہ کرنے کے طور پر افسانے کی بنیادی تعریف کی جاسکتی ہے۔ مثال کے طور پر میں نے افسانے کی مندرجہ ذیل تعریف کی ہے۔ اپنے استعمال کیے ہوئے لفظوں کی وضاحت بھی درج کر دینا چاہتا ہوں

> افسانہ بظاہر فن کار کی زندگی سے غیر متعلق[1] مگر زندگی[2] کے گہرے[3] تاثراتی[4] وسیلوں[5] اور/ یا وقوعوں[6] کا مناسب ترتیب[7] اور ڈرامائی[8] طرز بیان[9] ہے جس کی کیفیت سے قاری کی عقلی تخیلاتی، جذباتی، حسیاتی اور/ یا[10] فکری سطحیں برانگیختہ ہوتی ہیں اور اسے زندگی اور ذات[11] کا نیا عرفان[12] ہوتا ہے۔

۱۔ غیر متعلق ــــ افسانہ تخلیق کے بعد افسانہ نگار سے غیر متعلق ہو جاتا ہے اس لیے کہ اس میں افسانہ نگار کی ذات کی شمولیت باقی نہیں رہتی۔ ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ نے فن کار اور فن کے سلسلے میں اسی غیر شمولیت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ۲۔ زندگی ــــ زندگی سے مراد فرد کی اجتماعی زندگی یا سماج بھی ہے۔ قدیم افسانے فرد کے سماجی رتبے یعنی ESSENCE سے متعلق تھے۔ قرۃ العین حیدر کے افسانے اجتماعی سطح پر تشکیل ہوتے ہیں اور کردار کی انفرادیت سماج کی اجتماعیت کا ایک حصہ ہوتی ہے۔ جدید افسانوں میں زیادہ تر فرد کی انفرادیت کی سطح ابھری ہے۔ ان افسانوں میں سماج کی حیثیت پس منظری یا غیر اہم ہوتی ہے۔ نئے افسانوں میں زندگی حیوانات کی سطح سے بھی دیکھی گئی ہے۔ مثلاً انور سجاد کا افسانہ "بچھو غار نقش" اور قمر احسن کا افسانہ "ہڈی کی مٹھی میں سور کا کوڑھی"۔ ان افسانوں میں حیوانات استعاراتی جہت رکھتے ہیں۔ انور سجاد نے اپنے افسانے میں انسانی کردار کی نفی کی ہے۔ جوگندر پال کے افسانے "چہار درویش" میں زندگی کو نباتات کی استعاراتی حیثیت سے ابھارا گیا ہے اور رتن سنگھ نے "زندگی سے دور" میں جمادات میں زندگی کی فنی جہتیں تلاش کی ہیں۔ ۳۔ گہرے ــــ قدیم افسانوں میں تمثیلی اور فنی گہرائیاں دیکھی جاسکتی ہیں۔ جدید افسانوں میں نئے داخلی استعارے دریافت اور منکشف ہوئے ہیں جن کی بنت اسطوری یا آرکی ٹائپل ہوتی ہے۔ ۴۔ تاثراتی ــــ کہانی پن کا

تاثر جس کا براہ راست تعلق تخلیقی عمل یا تخلیقی رو سے ہوتا ہے۔ ۵۔ وسیلوں ـــــ وسیلوں سے مراد ہے افسانے کا میڈیم۔ ظاہر ہے میڈیم افسانے کی بنت یا طریق کار (PROCESS) کو نمایاں کرتا ہے۔ مثلاً رمزیت، شعوری رو، لاشعوری کیفیات، مابعد الطبیعیات، غیر ارضیت، طلسم، فکری ادراک، بے معنویت، وجودیت، حسیاتی یا محسوساتی روش، جبلّت، وجدان وغیرہ۔ ۶۔ وقوعوں ـــــ وقوعوں سے مراد ہیں حادثات، واقعات، بے کیفی یا بورڈم۔ واقعات چاہے چھوٹے ہوں یا بڑے ان میں وقت کا عنصر شامل ہوتا ہے۔ افسانے میں وقت داخل ہوکر تاریخی یا عصری سطح اختیار کرسکتا ہے یا حیاتیاتی یا جسمانی طور پر ابھر سکتا ہے۔ وقت ایک تسلسل بھی ہوسکتا ہے یا منجمد صورت حال اختیار کرسکتا ہے۔ ۷۔ مناسب ترین ـــــ الفاظ کا چناؤ اور شکست و ریخت افسانوں کی عظمت بڑھاتی ہے جس کے ذریعے ابلاغ اور ترسیل کا مسئلہ کسی حد تک حل کیا جاسکتا ہے۔ افسانوں میں خیالات لفظوں کا جامہ پہنیں یا لفظ خیالات کی بنت تشکیل کریں مناسب اظہار یا اسلوب کی اہمیت مسلم ہے۔ ۸۔ ڈرامائی ـــــ افسانہ کا ڈرامائی عنصر قاری کو تحیّر یا صدمے سے دوچار کرتا ہے۔ ۹۔ طرز بیان ـــــ افسانے میں بیانیہ کا عنصر اسے نظم سے مختلف کرتا ہے۔ بیانیہ ہیئت کی تشکیل کرتا ہے۔ ۱۰۔ اور / یا ـــــ عقلی، تخیلاتی، جذباتی، حسیاتی، فکری لفظوں کے درمیان حرف عطف ہیں۔ ۱۱۔ زندگی اور ذات ـــــ یہاں اجتماعیت اور انفرادیت کے مفاہیم شامل ہیں۔ ۱۲۔ نیا عرفان ـــــ زندگی چونکہ افسانے میں بنیادی حیثیت رکھتی ہے اور افسانہ ایک تخلیقی صنف ہے اس لئے زندگی کا ایک نئی سطح سے انکشاف اور عرفان ضروری ہے۔ یہ چاہے اجتماعیت کی سطح پر ہو یا انفرادیت کی سطح پر، چاہے وہ ایک باریک یا مبہم سا انکشاف ہو جو قاری کی گرفت میں بمشکل آئے یا نہ آسکے (البتہ لکھتے وقت افسانہ نگار کا رویہ، ضمیر اور ذہن صاف ہو اس لئے کہ اکثر کہانیاں خود اپنے عصر میں نہیں پہچانی جاتیں۔ ان کی صحیح قدر بعد کی نسلیں ہی کر پاتی ہیں) یا ایک بڑا یا عظیم انکشاف ہو (حالانکہ اس کی گنجائش عصر حاضر میں کم رہ گئی ہے) میرے خیال سے اس سلسلے میں بیرونی ادب سے استفادہ کرنے میں کوئی ہرج نہیں جب کہ نقالی سے گریز کیا جائے اور ادب کو زرخیز کرنا مقصود ہو۔

۲ ـــــ افسانہ نگار اپنے میڈیم میں زندگی کو اپنے مخصوص طرز سے دیکھتا ہے۔ لہٰذا افسانہ قاری کے لئے ایک نئی آگہی کا سبب بنتا ہے۔ یہ آگہی افسانہ نگار کے تخلیقی وسیلے سے سامنے آتی ہے۔ ظاہر ہے افسانہ نگار اپنے میدان میں قاری کے تخیل کو زندہ کرتا ہے تاکہ اسے ہم عصر زندگی کے عرفان کے طور پر ایک انوکھا، اچھوتا اور نیا شعور پیدا ہوا اور اس کے اندر کچھ منفی یا مثبت قوتیں بیدار ہوں۔ افسانہ پہلے بھی ایک محرک کی حیثیت رکھتا تھا اور اس کی آج بھی وہی حیثیت ہے البتہ فرق شدت اور سطح کا ہے۔ پچھلے ادوار میں

زندگی کی تبدیلیاں فرد کو اجتماعی سطح پر تبدیل ہونے کا جواز مہیا کرتی تھیں۔ آج کی انتہائی سکڑتی ہوئی زندگی اور بے اندازہ بڑھتے ہوئے انتشار، دہشت اور شدت کے زہریلے عناصر اس دور کے فرد کو کس درجہ بوجھل کر چکے ہیں اور اس کی روح کے عوامل کو کس قدر پیچیدہ کر چکے ہیں اس کا احتساب نئے افسانے کا کام ہے۔ چنانچہ آج کا افسانہ معلوک زندگی تضحیک، بے تعلقی اور ان سب کے نتیجہ میں ٹوٹتے ہوئے کنبے، جنسی بے راہ روی، برانگیختگی، تھکن وغیرہ کو داخل کی خردبین کے ذریعے دکھلاتا ہے اور خارج سے منعکس کرتا ہے تاکہ قاری اپنی تمام تر فکری، عقلی، جذباتی اور حسی سطحوں کے خفیہ اور خفتہ پہلوؤں کو متحرک یا بیدار کر سکے۔ چنانچہ ایک نئی بیداری اور آگہی آج کے افسانوں کا رول ہے۔

۳ ـــــ میرے نزدیک عصری حسیت اور آگہی کا مفہوم چند لفظوں میں اس طرح ہے:ـــــ ترقی یافتہ بیرونی ممالک کا سیاسی اور اقتصادی دباؤ۔ بیرونی ممالک کے درمیان سرد جنگ یا جنگی تناؤ جو امن کی ایک عجیب صورت حال پیدا کرتا ہے۔ اس براعظم کے بنیادی کلچر سے بیرونی ممالک کے کلچر کا ٹکراؤ اور آخرالذکر کے اثر سے پیدا شدہ کرب۔ ملکی سطح پر موجودہ نسل کے احساس کمتری کا بوجھ جو اسے ورثہ میں ملا ہے اور نئی نئی شکلوں میں ابھر رہا ہے۔ رشتوں کا ٹوٹناؤ اور شہروں کی طرف آبادی کا انتقال جو ہجرت کی صورت حال ہے۔ نسلی خلیج کی کشادگی جو قدیم روایات، قوانین، قدروں اور بزرگانہ شفقت سے برسرِ پیکار ہے۔ نئی نسل کی بڑھتی ہوئی بے ضمیری اور پیچیدہ ذہنی۔ آبادی کا اُمڈتا ہوا سیلاب جو بہت کم عرصے میں اپنی انتہائی حدود کو تجاوز کرنا چاہتا ہے۔ اس صورت حال سے پیدا مستقبل کی بے یقینی، گھٹن اور فرد کی انفرادی آزادی کی سکڑتی ہوئی حدیں جس کے باعث کارفرما خارج کا سمٹاؤ فرد کو داخل میں پھیلنے اور جینے پر مجبور کر رہا ہے۔ خارج کے دباؤ کی وجہ سے جبلت، حسیات اور فکر کی شکستہ صورت حال اور اس ناامیدی میں وجدان کی کارفرمائی جو ڈوبتے کو تنکے کا سہارا ہے۔

۴ ـــــ جب بنی نوع انسان ہی کا مستقبل خطرے میں ہے تو اردو زبان اور افسانے کا مستقبل کس شمار میں ہے۔ مگر پھر بھی اس بات کا اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ پریم چند کے بعد آج کا افسانہ پھر ایک بار اپنی قلب ماہیت کر رہا ہے۔ سریندر پرکاش کا 'بجوکا'، انور سجاد کے 'انکھی کا مونولاگ' اور 'یوسف کھوہ'، انور عظیم کا 'گورستان سے پرے'، قمراحسن کا 'کوڑھی کی مٹھی میں سور کی ہڈی' اور شفق کا افسانہ 'بچا ہوا گلاب'، اپنے اندر داخلیت کے عناصر سے زیادہ خارجیت کے عناصر رکھتا ہے۔ یہ افسانے خارج کی سطح پر برسرِ تشکیل ہوتے ہیں۔ چنانچہ اس بات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اب اینٹی اسٹوری اور بے ربط افسانوں کا رواج زائل ہو رہا ہے۔ تجریدی افسانے تجسیمی افسانے بنتے جا رہے ہیں اور فرد کی داخلی بازیافت اور ذات کی ازسرِنو دریافت

کی کوششوں کے بعد ایک نامیاتی نوتعمیری سلسلہ (جس میں تجسیم کا عمل نظر آتا ہے) شروع ہو چکا ہے۔ حالیہ افسانے کہانی پن اور ڈرامائی سطح بحال کرتے نظر آتے ہیں۔ ان سب باتوں کے باوجود افسانہ قاری کی سطح پر اترتا نظر نہیں آتا۔ (یہ بات ان افسانہ نگاروں کے لیے تشویش کن ہے جو قاری کی سطح کو ذہن رکھنے کے لئے ایڑی اور چوٹی کا زور لگا رہے ہیں)۔

اپنی اس بات کے ثبوت میں ایک آٹھویں درجہ کے طالب علم بچے کا لکھا ہوا افسانہ پیش کرنا چاہتا ہوں۔ اسد کا لکھا ہوا یہ افسانہ ایک طرف تو قاری کی سطح پر نہیں اترتا تو دوسری طرف اس میں مستقبل کی جھلکیاں بھی دیکھی جاسکتی ہیں اور اس بات کا بخوبی اندازہ لگ سکتا ہے کہ مستقبل کا افسانہ رد و قبول کے کس راستے سے گذرے گا۔ اس افسانہ میں افسانہ نگار کی ذات شامل نظر نہیں آتی۔ اسلئے کہ بنیادی کردار 'میں' ایک بالغ شخص ہے جو کسی دفتر میں کام کرتا ہے جب کہ لکھنے والے کی عمر ناپختہ ہے۔ دوسری چیز جو توجہ منعطف کرتی ہے وہ افسانے کی استعاراتی جہت ہے جس کی وجہ سے افسانہ ایک نامیاتی کل بن گیا ہے۔ عصری حسیت پورے طور پر کارفرما ہے اور کہانی پن اور ڈرامائیت برقرار ہے۔ پر اسرار اور دہشت ماحول میں بے خوفی اور سبک روی ایک نئی صورت حال ہے۔ جبلت اور وجدان کی کارفرمائی بھی قابل غور ہے۔

گمشدہ مکان

(اسد)

رات کے گیارہ بج چکے ہیں۔ میں تھک کر اپنے آفس سے لوٹ رہا ہوں۔ اپنے مکان میں پہنچ کر چین پانا چاہتا ہوں۔ مگر میرا مکان گم ہے اور مجھے اس کی تلاش ہے۔ کافی دیر تک ڈھونڈتا ہوں پھر ایک راہ گیر کو روک کر پوچھتا ہوں

صاحب میرا مکان کہاں ہے ——؟

وہ چونک کر اپنی ادھ گنجی کھوپڑی کو کھجلاتا ہے۔ سنہری فریم کے چشمہ کو ٹھیک کرتا ہے۔ اپنے ہونٹوں کو ہلاتا ہے اور پاس کھڑے بچے کی طرف مخاطب ہو کر بڑبڑاتا ہے۔

پاگل ہے ——!

مجھے لگتا ہے میں سچ مچ پاگل ہوں۔ بہرحال مجھے اپنا مکان تلاش کرنا ہے اور میں اس کی تلاش جاری رکھتا ہوں۔

میں شہر کی سڑکوں پر گھومتا ہوں۔ محلوں کی گلیوں کو چھانتا ہوں۔ میں بری طرح تھک جاتا ہوں۔

کسی مکان پر پہنچ کر آرام کرنا چاہتا ہوں ۔ مگر سبھی مکانوں کے دروازے بند ہیں ۔

اب میں شہر کی ایک سڑک کی طرف بڑھ گیا ہوں ۔ آگے کی طرف سڑک اندھیرے میں گم ہوتی نظر آتی ہے ۔ اس اندھیرے کے پیچھے کھیتوں کے سلسلے معلوم ہوتے ہیں ۔ اس لئے کہ ادھر سے آتی ہوئی ٹھنڈی ہوا تھکن نچوڑ لیتی ہے ـــــ اس طرح چلتے ہوئے میری نظر دائیں طرف بنے ایک بنگلے نما مکان پر پڑتی ہے ـــــ اور میرے پیر خود بخود اس مکان کی جانب مڑ جاتے ہیں ۔ بڑے سے کمپاؤنڈ سے گھرا یہ ایک اونچا مکان ہے جس کا دروازہ بہت بھاری اور پرانے ڈھنگ کا ہے ۔ لوہے کی ایک زنجیر لٹک رہی ہے ۔ مکان کے اندر سناٹا اور خاموشی ہے ۔ مکان اندھیرے میں ڈوبا ہوا ہے مگر سامنے کی سنسان سڑک سے آتی روشنی میں صاف نظر آتا ہے ۔ کمپاؤنڈ کافی چوڑا ہے اور اس میں لگا گیٹ لوہے کا ہے ۔ گیٹ میں جگہ جگہ زنگ لگا ہوا ہے ـــــ میں اس مکان کو دیکھتا ہوا لوہے کے بڑے سے گیٹ کو اندر کی طرف ڈھکیلتا ہوں چرچراہٹ سناٹے میں دور تک گونج جاتی ہے ۔ میں مکان کے دروازے تک پہنچ کر اس دروازے کو بھی ڈھکیلتا ہوں ۔ مگر وہ ہلتا ہی نہیں ۔ میں کچھ دیر تک کھڑا رہتا ہوں ـــــ پھر مکان کے پچھواڑے کا رخ کرتا ہوں ۔

پیچھے ایک چھوٹا سا دروازہ ہے ۔ دروازے کے بائیں طرف پانی کی ایک ٹنکی ہے جس کی ٹونٹی کھلی ہوئی ہے اور پانی تیزی سے بہہ رہا ہے ـــــ میں کچھ دیر تک اس منظر کو دیکھتا ہوں ۔ دروازہ کھولتا ہوں ۔ پھر اندر جھانکتا ہوں ۔ اندر اندھیرا ہے ۔ اس اندھیرے میں ایک سایہ نظر آتا ہے جو کندھے سے پیر تک سفید پوشاک پہنے ہے اور ایک ٹک مجھے گھور رہا ہے ۔ اس کی آنکھیں چمک رہی ہیں ۔ میں تھوڑی دیر کے لئے اپنی جگہ پر ساکت ہو جاتا ہوں ۔ سایہ ۔ سفید پوشاک ۔ آنکھیں !!! میں گھبرا کر پیچھے ہٹ جاتا ہوں ۔ آہستہ سے دروازہ کو بند کر دیتا ہوں ۔

ایک بادامی اونچا جھبریلا کتا نظر آتا ہے ۔ اس کے کان بہت بڑے اور کافی نیچے لٹک رہے تھے ۔ اس کی آنکھوں میں چمک ہے ۔ وہ اپنی لمبی دم ہلاتا ہوا دروازہ تک جاتا ہے ۔ اس دروازہ سے ناک لگا کر سونگھتا ہے ۔ اور پھر پلٹ کر میرے پاس آکر کھڑا ہو جاتا ہے ۔ میں چل پڑتا ہوں ۔ وہ بادامی کتا بھی میرے پیچھے آنے لگتا ہے ۔ میں کمپاؤنڈ کے کھلے گیٹ سے نکل کر باہر سڑک پر آجاتا ہوں ۔ پھر چونک کر پلٹتا ہوں اور اپنے پیچھے اس کتے کو ڈھونڈتا ہوں مگر کتا کہیں نظر نہیں آتا ـــــ اب میں اس سڑک پر ہوں جو شہر کی گنجان آبادی سے ملتی ہے ۔

شاید میرا مکان ہی مجھے تلاش کرے ۔

حسین الحق :

۱ــــ میرے خیال میں کہانی ہی نہیں بلکہ کسی بھی صنفِ ادب کی کوئی جامع تعریف ممکن نہیں ہے۔ شاعری ہی کو لیجئے۔ ایک طرف قدما میں شبلی ہیں جو شاعری کی تعریف کرتے ہوئے مروّجہ اور مفروضہ حدوں سے آگے بڑھ کر مور کے رقص اور شیر کی گرج کو بھی شاعری کہہ دیتے ہیں اور دوسری طرف حالی اور امداد امام اثر ہیں جو شاعری کی حدیں قایم کرتے ہیں۔ تقریباً ایسی ہی صورت حال انگریزی، ہندی اور دوسری زبانوں میں بھی ہے۔ وزن، بحر، قافیہ، ردیف کی پابندیوں کو ہلکا کرنے کا منطقی نتیجہ اب نثری نظم کی ہم آہنگی کی صورت میں ظاہر ہو رہا ہے۔ کچھ ایسی ہی صورت کہانی کے ساتھ بھی ہے کہ آغاز، وسط، کلائمکس، اینٹی کلائمکس اور انجام کی تکنیکی حد بندیوں میں اسیر کہانی اپنا پچھلا سارا ڈھانچہ خود شکست کرتی ہوئی اب اس منزل تک آ پہنچی ہے کہ اس کی نئی تعریف کی ضرورت محسوس کی جا رہی ہے۔

لیکن میں ادب کے وسیع تناظر کو پیش نظر رکھتے ہوئے نئی یا پرانی کسی قسم کی بھی کہانی کی نصابی تعریف کرنے کے حق میں نہیں ہوں اس لئے کہ نئی کہانیوں کی اہم خصوصیات گناتے ہوئے آپ نے زمینی اور زمانی حد بندیوں سے ارتفاع کی جو بات کی ہے وہ صرف نئی کہانیوں تک محدود نہیں ہے بلکہ اگر ایک نظر پیچھے کی طرف کی جائے تو ہمیں "چھتری"، "مردہ سمندر"، "غالیچہ"، "آدھے گھنٹے کا خدا" (کرشن چندر) "پھندنے" "ٹوبہ ٹیک سنگھ" (منٹو) "میتھن"، "بادل" (راجندر سنگھ بیدی) "سلطان"، "پاگل" (احمد ندیم قاسمی) "کچلیاں اور بال جبریل"، "سپنوں کے دیس میں" (اختر اورینوی) "مدن سینا اور صدیاں" اور "زرّیں تاج" (عزیز احمد) جیسی کہانیاں بھی ملتی ہیں جن میں زمینی اور زمانی حد بندیوں سے ارتفاع کی تقریباً وہی کیفیت موجود ہے جو آج کی کامیاب کہانیوں کا طرۂ امتیاز ہے۔

اور اگر آپ مجھے کہانی کو قصہ (FICTION) کے مفہوم میں استعمال کرنے کی اجازت دیں تو میں "سب رس"، "معراج العاشقین"، "طلسم ہوشربا"، "فسانۂ عجائب" اور ایسے بہت سے قصوں کا نام لینا چاہوں گا جن میں زمینی اور زمانی حد بندیوں کی ساری سرحدیں توڑ دی گئی ہیں۔

لہٰذا میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ کہانی ادب کی ایک شاخ ہے اور کسی بھی بہترین ادب کو تکنیک اور تعریف کے پیچیدہ حصار میں قید نہیں کیا جا سکتا اور یہ بھی کہ ہر بہترین ادب کئی سطحوں اور پرتوں کا حامل ہوتا ہے اور کوئی زبان جیسے جیسے ترقی یافتہ اور بالغ ہوتی جاتی ہے اس کی مختلف السطحیاتی کیفیت (MULTY DIMENSIONALISM) بھی گہری ہوتی جاتی ہے اور یہ گہرائی اور گیرائی کسی خانے اور کسی نام اور کسی فارم

میں قید نہیں کی جا سکتی ۔

اگر متذکرہ بالا فن کاروں کی تمام دوسری ترقی پسند کہانیاں ایک طرف رکھی جائیں اور دوسری طرف مذکورہ بالا کہانیاں تو ہر صاحب فہم و ادراک قاری یہ تسلیم کرے گا کہ چھٹری، پھندنے اور سپنوں کے دیس میں جیسی کہانیاں انہی فن کاروں کی دوسری (ترقی پسند) کہانیوں کے مقابلے میں زیادہ گہرائی، گیرائی اور عمق کی حامل ہیں ـــــ تو صورت حال جب یوں ہے تو یہ کیا ضروری ہے کہ ہم کہانی کی کسی جامع تعریف کے لئے جھگڑتے پھریں؟

لیکن اگر اس کے باوجود مجھے کہانی کی کسی تعریف پر مجبور کیا جائے تو میں "عوام" کی خاطر صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ میرے خیال میں ہر وہ نثری فن پارہ کہانی ہے جس میں کم از کم (۱) کہانی پن (STORY ELEMENT) ہو اور (۲) دلچسپی یا بالفاظ دیگر (قاری کی) شمولیت (INVOLVEMENT) برقرار رہے۔

جہاں تک کہانی پن کا سوال ہے یہ بہت آسانی سے کہا جا سکتا ہے کہ کہانی پن کا مطلب یہ ہے کہ اس ادب پارے میں کوئی واقعہ، قصہ، حادثہ، تجربہ، وقوعہ، سانحہ کسی بھی طور سے موضوع بنے لیکن دلچسپی کی بات میرے خیال میں ذرا تفصیل طلب ہے کیوں کہ یہیں سے پھر ادیب اور قاری کے رشتے کی باتیں سر اٹھانے لگتی ہیں۔

تو عرض یہ ہے کہ شمولیت (اور دلچسپی) کی کئی سطحیں ہوتی ہیں اور ہر سطح خود قاری کی اپنی سطح کے مطابق ہوتی ہے۔ میں نے غالب کی غزل ؎ یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصال یار ہوتا، رنڈیوں کو بھی طبلے کی تھاپ پر گاتے سنا ہے، ناکام عاشق کو بھی گنگناتے دیکھا ہے اور صاحبان علم و نظر کو بھی بنظرِ غائر مطالعہ میں مشغول پایا۔ یہی نہیں، تازہ مثال اقبال کی غزل ؎ ذرا اے حقیقتِ منتظر... سے دی جا سکتی ہے جسے فلم (دولہن ایک رات کی) میں "تک دھنا دھن دھن" کے سہارے سے مجرے پر گایا گیا ہے اور بہت سے وقف حرمان و یاس حضرات بھی رو رو کر گنگناتے ہیں۔ ؎ تو بچا بچا کے نہ رکھ اسے... صوفیوں کو بھی اس غزل پر محو کیفیت دیکھا اور ایک مقرر شعلہ بیان نے بھی سیرت کے ایک جلسے میں گرج کر پڑھا ؎ ترا دل تو ہے صنم آشنا تجھے کیا ملے گا نماز میں اور پھر کلیم الدین احمد اور احتشام حسین صاحبان کو بھی پڑھا جو اقبال کی ایسی ہی غزلوں اور اشعار کی بنا پر اسے شاعر تسلیم کرتے ہیں۔

تو ادب کے اوسط درجے کے طالب علم کے لئے بھی یہ کچھ ڈھکی چھپی بات نہیں ہے کہ شمولیت بہرحال آدمی کی اپنی ہی سطح کے مطابق ہوتی ہے۔ لہٰذا اگر کوئی فن پارہ یا کہانی کسی قاری کو اپنی طرف متوجہ نہیں کرتی، قاری کی دلچسپی کا سبب نہیں بنتی اور اپنے میں شامل نہیں کر پاتی۔ تو یہ قصور دراصل قاری کی سطح کا ہے فن پارے

یا کہانی کا نہیں۔

برسبیلِ تذکرہ ایک واقعہ یاد آگیا۔ شاید کسی مغربی ملک کا کوئی سربراہ نیپال گیا تھا۔ وہاں ضیافتِ طبع کے طور پر نیپالی گلوکاروں نے گانے سنائے، گانا ختم ہونے پر مہمان نے بہت تعریف کی تو شاہ نیپال نے پوچھا کہ "جناب آپ تو نیپالی زبان سمجھتے نہیں پھر تعریف کیسے کر رہے ہیں؟ تو مہمان نے سوال کیا کہ "کیا چڑیوں کا چہچہانا آپ کو اچھا لگتا ہے؟" شاہ نیپال نے کہا "یقیناً"، تو مہمان نے پوچھا "چڑیوں کی زبان تو آپ سمجھتے نہیں؟" تو کچھ یہی ادب کے ساتھ بھی ہے کہ سمجھ میں آئے یا نہ آئے اگر فن پارہ یا کہانی کوئی تاثر بھی چھوڑنے میں کامیاب ہے تو بہت ہے۔

پہاڑوں پر بہت دور سے جھرنوں کے گرنے کی صدا، دیہاتوں میں شام کے وقت رواں رواں کرتی گذرتی ہوئی بیل گاڑی کی آواز، دھند میں کھوئی صبح کی فضا میں چڑیوں کی چہکار ... کس کی سمجھ میں آتا ہے یہ سب کچھ؟ لیکن اچھا تو لگتا ہے .... بس اتنا ہی کافی ہے! اور اسی اچھا لگنے کا نام شمولیت ہے۔

دراصل سچ پوچھئے تو میں بھی شوپنہار کی طرف منسوب اس بات کو صحیح سمجھتا ہوں کہ تمام فنون کی انتہا موسیقی کی سطح تک پہنچنے کی تمنا ہے مگر ادب کے سلسلے میں میں الفاظ کو میڈیم کی حیثیت سے قبول کرتا ہوں اور موسیقی کی سطح تک پہنچنے کی تمنا والی بات اور الفاظ کے میڈیا والے خیال کے درمیان مطابقت کچھ اس طرح پیدا کرتا ہوں کہ چونکہ ادب کا ذریعۂ اظہار بہرحال الفاظ ہوں گے لہذا موسیقی کی سطح تک پہنچنے کا مطلب یہ نہیں کہ الفاظ اپنی اصلیت کھو دیں اور صرف "سُر" باقی رہ جائیں کیوں کہ ایسی صورت حال قبول کرنے سے پھر ابلاغ اور ترسیل کا سارا مسئلہ کھٹائی میں پڑ جائے گا جب کہ کم یا بیش جب جب ادب کی بات اٹھے گی تو کسی نہ کسی سطح سے ترسیل اور ابلاغ کا سوال بھی اٹھے گا تو دراصل "موسیقیت" کا مطلب "روحِ فن" کے اس اجتماعی حسن کی طرف اشارہ ہے جس کی انتہا موسیقی کی "بے زبان گفتگو" کی طرف لے جاتی ہے اور اسی لئے میں نے شاہِ نیپال والا قصہ بیان کیا ہے کہ ادب کے لئے ہمیشہ یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ سمجھ میں آہی جائے لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ ادب کو کبھی بھی سمجھ میں نہیں آنا چاہئے جب کہ موسیقی کے لئے سمجھ میں آنے کی شرط کبھی بھی نہیں لگائی جا سکتی، موسیقی کے لئے صرف احساس کافی ہے اور ادب میں احساس کے ساتھ ادراک، ابلاغ، ترسیل اور تفہیم بھی کچھ ضروری ہے (یہ الگ بات ہے کہ ان تمام عناصر کی سطحیں افراد کے مختلف ذہنی درجات کے مطابق ہوں گی، جس کی طرف میں اشارہ کر چکا!)

۲ ــــــ آپ کا دوسرا اور تیسرا سوال میرے خیال میں بہت متنازعہ فیہ اور ہنگامہ کرنے والا ہے۔ ہو سکتا ہے کچھ حضرات اس سلسلے میں مجھ پر مختلف قسم کے الزامات عائد کریں لیکن میں خاک کے تودے کو دماوند نہیں

کہہ سکتا لہذا اس تلخ نوائی کے لیے معافی چاہتے ہوئے یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ جہاں تک ہم عصر زندگی میں کہانی کے رول کا سوال ہے میں سمجھتا ہوں کہ کہانی نہیں بلکہ سارا ادب اور صرف ادب ہی نہیں بلکہ منطق اور فلسفہ بھی اور (اگر آپ اس وسعت کی مجھے اجازت دیں تو) اس سے بھی دو قدم آگے بڑھ کر میں تو یہ کہوں گا کہ وہ سارے علوم وفنون جس کا تعلق کم وبیش کسی بھی سطح پر وجدان (INTUTION) سے ہے، ہم عصر زندگی میں کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ اور اس کی بہت واضح وجوہات ہیں۔

ہر فکر، نظریے اور رجحان کا ایک خاص وقت ہوتا ہے اور جب وہ وقت گذر جاتا ہے تو وہ چیزیں بھی بیکار ہو جاتی ہیں اور ان کی جگہ دوسری چیزیں اپنا مقام بنا لیتی ہیں، ایک وقت تھا جب مذہب، فلسفہ، علم اخلاق، شعر وادب اور روحانیت میں کمال باعث فخر سمجھا جاتا تھا۔ لیکن آج ایک طرف ابراہیمؑ، گوتم، رام، خواجہ غریب نواز، راما کبیر، نانک جیسے پیغمبروں اور بزرگوں کو دیکھئے، دوسری طرف حسان بن ثابتؓ، فرزدق، رومی، حافظ، بھوبھوتی، ٹیگور، غالب وغیرہ جیسے مختلف زبانوں کے ادیبوں اور شاعروں کو دیکھئے اور تیسری طرف کپلا، پاتنجلی، جیمینی، گوتم، فارابی، ابن سینا، غزالی، ابن رشد، اسپینوزا اور شوپنہار وغیرہ کو دیکھئے اور غور کیجئے کہ مذہبی اور روحانی رہنماؤں، ادیبوں اور شاعروں اور فلسفیوں کو سماج میں کل جو مقام حاصل تھا وہ آج ہے؟ مغرب کے کچھ مستثنیات (مثلاً سارتر اور رسل وغیرہ) کو چھوڑ کر اب کہیں ان چیزوں کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ وہ دور گذر گیا جب شاعر ہونا فیشن اور کریز تھا آج تو آپ دیکھ ہی رہے ہیں کہ ڈاکٹر اور انجینیر بننا فیشن اور کریز ہو گیا ہے۔ آج اردو، ہندی یا بنگالی ادب کی تعلیم (۹۵ فی صدی) صرف ویسے ہی لڑکے حاصل کرتے ہیں جو دنیا میں کچھ نہیں کر پاتے ورنہ جو بھی تھوڑا بہت اچھا کرنے کی پوزیشن میں ہوتے ہیں وہ سائنس کا انتخاب کرتے ہیں یا آرٹس میں ایسے موضوعات کا انتخاب کرتے ہیں جن کے ذریعہ انھیں اچھی اور جلدی نوکری مل سکے۔

اور اگر کچھ اچھا کرنے والے لڑکے یہ سبجکٹ نہیں لیتے ہیں تو انگلش اور فارسی یا عربی میں اچھا کرنے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ اس کے سہارے (I.A.S) یا (I.F.S.) کے امتحانات میں کامیاب ہو سکیں یا مشرق وسطیٰ کے ممالک میں نوکری کرنے جا سکیں —— تو پھر ایسی صورت میں غریب و نادار کہانی کیا رول ادا کر سکتی ہے؟ معاف کیجئے گا! ترقی پسندوں کی طرح میں ایسا قطعی نہیں سمجھتا کہ کہانی کوئی انقلاب لا سکتی ہے یا ہماری نام نہاد، ہم عصر زندگی میں کوئی خاص رول ادا کر سکتی ہے۔ ہم ادیب و شاعر خواہ کتنا ہی پوز کیوں نہ ماریں مگر یہ حقیقت ہے کہ پہلی اور دوسری جنگ عظیم کے برپا ہونے یا ختم ہونے میں ذرا بھی، کسی بھی طور ادب کا کوئی رول نہیں رہا۔ یہ دور سودے بازی کا دور ہے۔ سودے بازیاں ہی جنگیں اور جھگڑے کھڑے کرتی ہیں

اور پھر انھیں کے باعث یہ جنگیں اور جھگڑے ختم بھی ہوتے ہیں۔

بنگلہ دیش کے سانحے اور ہندوستان میں ایمرجنسی کی زیادتیوں کا تذکرہ ادیب و شاعر لاکھ کرتے رہتے مگر اس کا کوئی اثر نہ ہوتا اور نہ ہوا۔ سچ پوچھیے تو میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ ہماری زندگیوں میں کہانی سے زیادہ اہم رول اخبارات کا ہے۔ اخبارات ہی انقلاب لاتے ہیں اور COUNTER REVOLUTION کا سبب بنتے ہیں۔

اور اس کی صرف ایک اور بڑی وجہ یہ ہے کہ ہمارا قاری اب تک ہماری باتوں کو (خواہ وہ علامتی انداز میں لکھی گئی ہوں یا سیدھے سادے انداز میں) جھوٹ اور افسانہ سمجھتا ہے۔ جب تک قاری شعر و ادب اور کہانی کو حقیقت نہیں سمجھے گا یہ سب ہماری زندگیوں میں کوئی رول ادا نہیں کر سکیں گے۔

اس سلسلے میں سوچنے کا ایک انداز یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مذہب، فلسفہ اور ادب ان سب کا تعلق وجدان سے ہے اور وجدان کا تعلق روح سے ہے اور روح کا تعلق احساس سے ہے اور احساس کا تعلق غیب (UNSEEN) سے ہے اور اس دور میں "غیب" پر یقین کرنے والے "از کار رفتہ" میں شمار کیے جاتے ہیں۔ یہ دور روحانی ترقی کا نہیں بلکہ مادی ترقی کا دور ہے لہٰذا مادی ترقی کے ارتقا کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ روح احساس اور غیب سے تعلق رکھنے والی ہر چیز کی نفی کی جائے اور اسی لیے ادب کا رشتہ وجدان سے کاٹ کر نفسیات سے جوڑنے کی کوشش کی گئی ہے۔ میں نفسیات کو "غیوب" اور "حضور" کے بیچ کی چیز سمجھتا ہوں اور اسی لیے شاید ان دنوں "وحی نفسی"، "وحی قلبی"، "نفسِ امارہ"، "نفسِ لوامہ" اور "نفسِ مطمئنیت" کو کنارے کر کے ایڈ، ایگو، سپر ایگو اور شعور، تحت الشعور اور لاشعور وغیرہ کی اصطلاحیں وضع کی گئی ہیں۔ آدمی کبریا کے عرش کے نیچے کبریا ہی کو گرفتار کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ صورت حال ابھی تک دھند میں ہے مگر اور کچھ حاصل ہوا ہو یا نہ ہوا ہو اتنا تو طے ہے کہ وجدان کا جنازہ نکل گیا تو اب لکیر پیٹتے رہیے اور "ہم عصر زندگی میں کہانی کے رول کی بات کرتے رہیے مگر اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں ہے کہ اگر بہت کھینچ تان کر اور تاویلات و تشریحات کے ساتھ گفتگو کرنے کی گنجائش نکالی جائے تب بھی یہ اعتراف کرنا ہی ہوگا کہ کہانی ہی کی نہیں بلکہ مذہب، فلسفہ اور ادب سب کی اہمیت صرف انھی لوگوں کے لیے ہے جو اس دنیا کے باشندہ ہیں ورنہ آگ کا دریا ہو یا اداس نسلیں یا آنگن ان میں سے کسی کی بھی کوئی اہمیت ان فن پاروں کے عہد کی (نام نہاد) ہم عصر زندگی کے لیے نہ تھی نہ ہے لیکن ان کے مقابل سائنس اور دیگر علوم جدیدہ کی اہمیت زندگی میں ہے، ضرور ہے اور صرف اس لیے ہے کہ ان میں سے کسی کے سبب ہم ریڈیو سنتے ہیں، کسی کے سبب ہمارا ٹی۔ بی۔ کا مرض اچھا ہوتا ہے اور کسی کے سبب مکان بنانے کا نیا سے نیا طریقہ معلوم ہوتا ہے، پل بنتا ہے، بورنگ بٹھائی جاتی ہے اور بیچارے

ذوق کی روح خوش ہوتی ہوگی ۔

نام منسوب ہے تو نام کے اسباب بنا   پل بنا چاہ بنا منبر و محراب بنا

تو صاحب ! بات صرف اتنی سی ہے کہ LITERATURE IS ONLY FOR LITERATURE اور یہ ہر دور میں ہوا۔ یہ بات غالباً ادب کا اوسط درجے کا طالب علم بھی جانتا ہوگا کہ ادب کے نام پر جو تخلیقات ہمیشہ سے پیش کی جاتی رہی ہیں ان کی ہمیشہ سے تین سطح رہی ہے، ایک تو سب سے اعلیٰ وارفع سطح ہے جہاں بہت کم لوگ پہنچ پاتے ہیں (خود میں اس اعتراف پر اپنے آپ کو مجبور پاتا ہوں کہ ادبیات عالم کے بہت سے فن پارے میری بھی سمجھ میں نہیں آتے) دوسری سطح وہ ہے جہاں فن بھی ہے اور سہل بیانی بھی۔ اس کو سمجھنے والے اچھی خاصی تعداد میں ہیں اور تیسری سطح ایسے قارئین کی ہے جو واجدہ تبسم کی سونی صدا اور کرشن چندر کی ۵۰ فیصد کہانیوں کے والا وشیدا ہیں تو اب اگر آپ کی (مفروضہ اور نام نہاد) ہم عصر زندگی کو ادبی رویہ رکھنے والے افراد کی زندگی تک بھی محدود کر دیا جائے تب بھی یہ مختلف سطحیں ہمارا دامن کھینچتی ہیں اور غور و فکر کی نت نئی راہیں پیدا کرتی ہیں ۔

اس کے علاوہ ایک بات صفائی کے ساتھ یہ عرض کرنی ہے کہ فلسفیانہ طور پر تو خیر میں عصر کا قائل ہی نہیں ہوں لیکن عام زبان میں بھی اگر گفتگو کی جائے تب بھی میں یہ نہیں سمجھ پایا کہ آپ نے کس ہم عصر زندگی کی بات کی ہے کیوں کہ عام معاشرے کی ہم عصر زندگی کی ذہنی انتشار کا جو حشر اس مادی دور میں ہو چکا اس کی طرف اوپر کے صفحات میں میں نے اشارہ کر دیا، اب باقی بچے وہ لوگ جو بزعم خود اپنے کو اردو زبان اور ادب کا عاشق بتاتے ہیں تو ان کی عاشقی کا امتحان بھی بہت آسان ہے، آپ کسی اسٹیشن پر لگائے گئے بک اسٹال پر کھڑے ہو جائیے اور دیکھئے کہ قرۃ العین حیدر، جیلانی بانو، انتظار حسین، حیات اللہ انصاری، ٹیگور، کملیشور اور موہن راکیش وغیرہ کی تخلیقات کتنی بکتی ہیں اور رانو، گلشن نندہ، عادل رشید کی تخلیقات کی خریداری کا تناسب کیا ہے !

باقی بچ گئے یہ بیچارے دو صفوں والے ادیب و شاعر تو آج کی زندگی اور سماج میں ان کی (ان کی فکر کی اور ان کی کہانیوں کی) اہمیت ہی کیا ہے۔ میں اردو کے ایک درجن مقتدر اساتذہ، ناقدوں، مدیروں اور چوٹی کے افسانہ نگاروں کے بیٹے بیٹیوں کے بارے میں جانتا ہوں جو لٹریچر، آرٹس اور کہانی وغیرہ سے شغف تو دور کی چیز ہے اردو لکھنا پڑھنا بھی نہیں جانتے ہیں۔ اور میرے خیال میں ایسی مثالیں پورے ہندوستان میں با آسانی تلاش کی جا سکتی ہیں تو حضور والا ایسی صورتِ حال میں بیچاری کہانی یا کہانی کار آپ کی مفروضہ ہم عصر زندگی میں کیا رول ادا کرے گا جب کہ وہ غریب اپنی ذاتی زندگی میں گھر کی اور خاندان کی

زندگی میں کبھی کوئی رول ادا نہیں کر پاتا ـــــ واحسرتا!

۳ ـــــ باقی بچا عصری حسیت کا مسئلہ تو صاحب میں تو (جیسا کہ گذشتہ صفحات میں بھی بار بار اس کی طرف اشارہ کر چکا) سرے سے عصری حسیت کا قائل ہی نہیں ہوں اس لئے کہ میرے نزدیک خود "عصر" ہی کا وجود مشتبہ ہے۔ ہو سکتا ہے بعض حضرات میری اس فکر کو صرف ایک فلسفیانہ توجیہہ قرار دیں لیکن ۶۲ء سے ۷۵ء تک سوچتے رہنے کے نتیجے میں جو عرفان مجھے حاصل ہوا ہے اس نے میری اس فکر کو اور پائیدار کیا کہ ادب کا تعلق فلسفۂ تصوف اور وجدان سے اتنا گہرا ہے کہ میرے خیال میں کسی مقام پر اس سے الگ ہٹ کر سوچا ہی نہیں جا سکتا (اور یہاں میں اپنے ذہنی سفر کے اس دلچسپ موڑ کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں جو حسن عسکری (مرحوم) کو ضعیفی میں اس مقام تک لایا اور مجھے جوانی ہی میں یہاں پہنچا گیا) لہٰذا میرا خیال ہے کہ عصر، روحِ عصر اور عصری حسیت وغیرہ کا پرچار دراصل ترقی پسندوں کا اسٹنٹ ہے۔ یہ اسی چور دروازے سے ادب میں وقتی، عارضی اور سطحی موضوعات کو داخل کر کے اپنے سیاسی مقاصد کی تکمیل کرنا چاہتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ادب میں عصری حسیت سے زیادہ اہم چیز دائمی حسیت ہے اور دائمی حسیات میرے خیال میں صرف تین ہیں ۱ بھوک ۲ خوف اور ۳ لالچ۔ اور انہی تین حسیتوں کے بطن سے ایک اور حسیت جنم لیتی ہے جو اپنی اصل میں ضمنی ہونے کے باوجود بنیادی حقیقت اختیار کر چکی ہے اور وہ ہے "بے سکونی کی حسیت" (جس کی ابتدا اور انتہا دونوں کا منطقی نتیجہ "جستجو" ہے)۔

اگر سنجیدگی اور غیر جانب داری سے غور کیا جائے تو احساس ہوگا کہ آج ہی کی "نام نہاد" عصری حسیت نہیں بلکہ جہاں سے تاریخ کے تحفظ کا عمل شروع ہوتا ہے تب سے آج تک جتنی عصری حسیات کا ڈھنڈورا پیٹا گیا ہے (ترقی پسندوں کے عہدِ شباب کی "روحِ عصر" سمیت) سب انہی چار عوامل اور حسیات کی شاخیں ہیں (بشرطیکہ دیمک زدہ نصابی اور کتابی نقاد حسیت اور جبلت کے فرق پر دھواں دھار بحث نہ شروع کر دیں)۔

یہاں اس بات کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ میں اپنے CONTEMPERARIES کی "عصری حسیت" کے سلسلے میں لمبی چوڑی آرا سے بھی واقف ہوں، مجھے یہ بھی معلوم کہ تشکیل، بے یقینی، استحصال، سماجی نظام کا انتشار، اقدار کا بکھراؤ، انسانی زندگی کی بے قدری، امنِ عالم کے سلسلے میں تمام نظریات کی بے بسی وغیرہ وہ الفاظ ہیں جنھیں عصری حسیت کا پرچار کرنے والے بار بار دہراتے ہیں مگر میں سمجھتا ہوں کہ یہ ساری باتیں انڈر گریجویٹ یا زیادہ سے زیادہ پوسٹ گریجویٹ کی سطح تک کی باتیں ہیں یا پھر ایسے ناقدوں کا وظیفہ ہے جن کے یہاں علم ہمیشہ صرف علم ہی رہتا ہے ادراک کبھی نہیں بنتا۔

مادیت، عقلیت وغیرہ اور غیر ترقی پسندوں کی تجریدیت [illegible] یہ ساری تحریکوں

رجحانات اور نظریات کی اصل یہی حسیات ہیں جو کبھی ترقی پسندی کی شکل اختیار کرتی ہیں کبھی غیر ترقی پسندی کی، کبھی تجرید کے پیرائے میں اپنا اظہار کرتی ہیں کبھی علامتوں کا سہارا لیتی ہیں کبھی جدلیاتی مادیت اور عقلیت پسندی کے کاندھے پر سوار ہوتی ہیں اور کبھی روحانیت اور غیر عقلیت پسندی کا بلکہ حد یہ ہے کہ کبھی کبھی سارتر کے انکارِ خدا پر مبنی وجودیت کا لبادہ اوڑھ کر دو آتشہ بن جاتی ہیں۔

تو صاحب بات تو بس اتنی سی ہے کہ سارے رستے جھوٹے رستے / سید حارث وارث شاہ / بلھے شاہ اور تب ایسے میں کاہے کا عصر اور کاہے کی حسیت، سب دھوکے کی ٹٹی ہے، بھلاوے کی باتیں ہیں۔ دو دن بشریت کی بے بسی کے نتیجے میں آرزو کرنے میں کٹ گئے (وگرنہ میں خدا ہوتا جو دل میں مدعا ہوتا) دو دن باقی ہیں سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارہ اور ایسے میں "عصر" اور "عصری حسیت" وغیرہ کا پرخا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ سچ پوچھئے تو کہانی کار کی سب سے بڑی مجبوری اظہار ہے اور صرف اظہار ہے (کنتُ کنزاً مخفیاً ...) خود اس نے اپنے آپ کو پہچاننے کے لئے تخلیق کائنات کے ذریعہ اپنا اظہار کیا اور اب اس کی تخلیق بھی اپنے "عرفان" کی خاطر اپنا اظہار کرنے پر مجبور ہے اور اس اظہار کے سلسلے میں عصر اور عصری حسیت کی مثال اس جھوٹ کی ہے جسے بار بار بول کر سچ ثابت کرنے کی کوشش کی جاری ہے ورنہ سچ پوچھئے تو عصر صرف دو ہے (۱) ماضی اور (۲) مستقبل۔ صرف ونحو والوں کے تیسرے عصر، یعنی عصر حاضر کا کیا شمار کیا جائے جس کی ناپائیداری کا یہ عالم ہے کہ "عصر حاضر" کا نام لیتے لیتے لفظ "عصر" ماضی کا حصہ بن جاتا ہے۔

لہٰذا میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ہر لمحہ ماضی کی میراث ہے اور مستقبل کا عالم یہ ہے کہ ہمیں اس کا علم نہیں۔ پس ہمارا سب سے مضبوط، گہرا پائیدار، اٹل، عمیق اور دائمی عصر ماضی ہے اور اس لئے میرے یہاں "عصری حسیت" کا مطلب اگر کچھ ہو بھی سکتا ہے تو صرف یہ کہ ماضی کی بازیافت اور دریافت کی جائے (اور اس تناظر میں میں انتظار حسین کے رویّے کو صحیح سمجھتا ہوں لیکن اسلوب کے سلسلے میں انتظار حسین کی بہ نسبت قرۃ العین حیدر کا زیادہ مداح ہوں) لیکن کلی طور پر ماضی کی بازیافت خود ایک امرِ محال ہے لہٰذا اقبال مجید کے انداز میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ "چلئے گا تا گایا جائے"... منے تیری مٹھی میں کیا ہے؟" اور منّا جب بہت خوشامد کرنے پر مٹھی کھول بھی دے تو معلوم ہو کہ "کاگ ــــ نہ جُفت صرف

... عنوان سادی تفصیلات کا تجزیہ نکلتا ہے کہ "عصری حسیت صرف کھوکھلا ہے"۔

۳ ـــــــ کہانی کے مستقبل کے بارے میں مختصراً تین باتیں عرض کرنی ہیں۔

اوّل تو یہ کہ کہانی اس وقت تک زندہ رہے گی جب تک آدمی زندہ ہے کیوں کہ کہانی سننا سنانا اس کا بہت قدیم شعار ہے۔ یہ الگ سی بات ہے کہ کہانی اپنی شکلیں تبدیل کرتی رہے لیکن اس سے کیا ہوتا ہے ؟ حکایت، قصّہ، داستان، ناول، افسانہ، پلاٹ لیس افسانہ، تجریدی، علامتی، رومانوی یا لاشعوری افسانہ یا رد افسانہ (ANTI STORY) شکل کچھ بھی ہوسکتی ہے مگر اپنی روح (یعنی دلچسپی، شمولیت اور کہانی پن کے بنیادی عناصر) کے ساتھ کہانی زندہ رہے گی کیوں کہ میرے خیال میں زندگی کا سب سے بہتر ذریعۂ اظہار کہانی ہے۔

دوئم یہ کہ یہ بات مجموعی طور پر ہر زبان کی کہانی کے بارے میں کہی جاسکتی ہے لیکن جہاں تک اردو کہانی کا سوال ہے غیر ترقی پسند کہانی اپنے تناظر میں ترقی پسند کہانی سے بہت زیادہ وسیع ہے (یہاں اس بات کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ میں کرشن چندر کی "چھڑی"، "مردہ سمندر"، "غالیچہ" اور "آدھے گھنٹے کا خدا"، بیدی کے "میتھن" اور "بادل" قاسمی کی "سلطان" اور "پاگل" منٹو کی "ٹوبہ ٹیک سنگھ" اور "پھندنے" اشفاق احمد کی "گڈریا" عبداللہ حسین کی "ندی" قرۃ العین حیدر کی "ہاؤسنگ سوسائٹی"، "جلاوطن"، "پت جھڑ کی آواز"، "حاجی بابا گل بیکتاشی" اور "سینٹ فلورا آف جارجیا کے اعترافات" وغیرہ قسم کی کہانیوں کو غیر ترقی پسند کہانی سمجھتا ہوں) لیکن اس کے ساتھ ساتھ میں اس تلخ حقیقت کا اعتراف بھی کرنا چاہتا ہوں کہ جلد سے جلد مشہور ہو جانے کے چکر میں ان غیر ترقی پسند دوستوں نے (جو قرۃ العین حیدر اور انتظار حسین والی نسل سے تعلق رکھتے ہیں) بنیادی طور پر بیچاری کہانی ہی کا ختنہ کر دیا اور مشہور ہونے کے چکر میں ایسی ایسی پینترے بازیاں کی ہیں کہ الاماں والحفیظ۔

ایک صاحب اونچی جگہ پر بیٹھ کر زور زور سے کہانی پڑھنے کا مشورہ دیتے ہیں۔ دوسرے صاحب اقلیدس کی تیغ برّاں سے کہانی کا جھٹکا کرنے کی کوشش کر چکے ہیں۔ تیسرے صاحب طور کی بلندی سے اترتے ہیں تو اپنی کہانی سے لمبا خط چھپواتے ہیں اور کہانی کا عنوان رکھتے ہیں ایک طویل کہانی۔ چوتھے صاحب جب کیفیتوں کے حصار میں قید ہوتے ہیں تو ٹپ ٹپ کھٹ کھٹ کی تکرار سے کہانی کو آگے بڑھاتے ہیں۔ گویا ان کی باقی کہانیاں بغیر کسی کیفیت کے لکھی گئی ہیں)، پانچویں صاحب انتظار حسین بننے کے چکر میں عربی ناموں کا استعمال کر کے باقی ہم عصروں کو بونا سمجھنے لگتے ہیں اور پرچوں میں فرضی نام سے اپنی

لے معنی کچھ نہیں، خالی، سرابی کیفیت۔

جہاں سے ادراک کی منزل شروع ہوتی ہے وہاں سے یہ ساری چیزیں فریب نظر معلوم ہونے لگتی ہیں اور اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ سجاد حیدر یلدرم کے عہد کی رومانویت، ترقی پسندوں کے عہد کی اشتمالیت، مادیت، عقلیت وغیرہ اور غیر ترقی پسندوں کی تجریدیت، علامیت، تثلیثیت، غیر عقلیت وغیرہ ساری تحریکوں رجحانات اور نظریات کی اصل یہی حسیات ہیں جو کبھی ترقی پسندی کی شکل اختیار کرتی ہیں کبھی غیر ترقی پسندی کی، کبھی تجرید کے پیرائے میں اپنا اظہار کرتی ہیں کبھی علامتوں کا سہارا لیتی ہیں، کبھی جدلیاتی مادیت اور عقلیت پسندی کے کاندھے پر سوار ہوتی ہیں اور کبھی روحانیت اور غیر عقلیت پسندی کا بلکہ حد یہ ہے کہ کبھی کبھی سارتر کے انکارِ خدا پر مبنی وجودیت کا لبادہ اوڑھ کر دو آتشہ بن جاتی ہیں۔

تو صاحب بات تو بس اتنی سی ہے کہ سارے رستے جھوٹے رستے / سید حارث وارث شاہ / بلھے شاہ اور تب ایسے میں کاہے کا عصر اور کاہے کی حسیت، سب دھوکے کی ٹٹی ہے، بھلاوے کی باتیں ہیں۔ دو دن بشریت کی بے بسی کے نتیجے میں آرزو کرنے میں کٹ گئے (وگرنہ میں خدا ہوتا جو دل میں مدعا ہوتا) دو دن باقی ہیں سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارہ اور ایسے میں "عصر" اور "عصری حسیت" وغیرہ کا چرغا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ سچ پوچھئے تو کہانی کار کی سب سے بڑی مجبوری اظہار ہے اور صرف اظہار ہے (کنتُ کنزاً مخفیاً ...) خود اس نے اپنے آپ کو پہچاننے کے لئے تخلیق کائنات کے ذریعہ اپنا اظہار کیا اور اب اس کی تخلیق بھی اپنے "عرفان" کی خاطر اپنا اظہار کرنے پر مجبور ہے اور اس اظہار کے سلسلے میں عصر اور عصری حسیت کی مثال اس جھوٹ کی ہے جسے بار بار بول کر سچ ثابت کرنے کی کوشش کی جاری ہے ورنہ سچ پوچھئے تو عصر صرف دو ہے (۱) ماضی اور (۲) مستقبل۔ صرف و نحو والوں کے تیسرے عصر، یعنی عصر حاضر کا کیا شمار کیا جائے جس کی ناپائیداری کا یہ عالم ہے کہ "عصر حاضر" کا نام لیتے لیتے لفظ "عصر" ماضی کا حصہ بن جاتا ہے۔

لہٰذا میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ہر لمحہ ماضی کی میراث ہے اور مستقبل کا عالم یہ ہے کہ ہمیں اس کا علم نہیں۔ پس ہمارا سب سے مضبوط، گہرا پائیدار، اٹل، عمیق اور دائمی عصر ماضی ہے اور اس لئے میرے یہاں "عصری حسیت" کا مطلب اگر کچھ ہو بھی سکتا ہے تو صرف یہ کہ ماضی کی بازیافت اور دریافت کی جائے (اور اس تناظر میں میں انتظار حسین کے رویئے کو صحیح سمجھتا ہوں لیکن اسلوب کے سلسلے میں انتظار حسین کی بہ نسبت قرۃ العین حیدر کا زیادہ مداح ہوں) لیکن کلی طور پر ماضی کی بازیافت خود ایک امر محال ہے لہٰذا اقبال مجید کے انداز میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ "چلئے گا تا گایا جائے"... متے تیری مٹھی میں کیا ہے؟" اور متا جب بہت خوشامد کرنے پر مٹھی کھول بھی دے تو معلوم ہو کہ "کاگ ــــ نہ مجفت صرف

کھکھا[1]" لہذا ان ساری تفصیلات کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ " عصری حسیت صرف کھکھا ہے "۔

۴ ـــــ کہانی کے مستقبل کے بارے میں مختصراً تین باتیں عرض کرنی ہیں۔

اوّل تو یہ کہ کہانی اس وقت تک زندہ رہے گی جب تک آدمی زندہ ہے کیوں کہ کہانی سننا سنانا اس کا بہت قدیم شعار ہے۔ یہ الگ سی بات ہے کہ کہانی اپنی شکلیں تبدیل کرتی رہے لیکن اس سے کیا ہوتا ہے ؟ حکایت، قصہ، داستان، ناول، افسانہ، پلاٹ لیس افسانہ، تجریدی، علامتی، رومانوی یا لاشعوری افسانہ یا ردّ افسانہ (ANTI STORY) شکل کچھ بھی ہو سکتی ہے مگر اپنی روح (یعنی دلچسپی، شمولیت اور کہانی پن کے بنیادی عناصر) کے ساتھ کہانی زندہ رہے گی کیوں کہ میرے خیال میں زندگی کا سب سے بہتر ذریعۂ اظہار کہانی ہے۔

دوئم یہ کہ یہ بات مجموعی طور پر ہر زبان کی کہانی کے بارے میں کہی جا سکتی ہے لیکن جہاں تک اردو کہانی کا سوال ہے غیر ترقی پسند کہانی اپنے تناظر میں ترقی پسند کہانی سے بہت زیادہ وسیع ہے (یہاں اس بات کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ میں کرشن چندر کی "چھڑی"، "مردہ سمندر"، "غالیچہ" اور "آدھے گھنٹے کا خدا"، بیدی کے "میتھن" اور "بادل" قاسمی کی "سلطان" اور "پاگل" منٹو کی "ٹوبہ ٹیک سنگھ" اور "پھندنے" اشفاق احمد کی "گڈریا" عبداللہ حسین کی "ندی" قرۃ العین حیدر کی "ہاؤسنگ سوسائٹی"، "جلاوطن"، "پت جھڑ کی آواز"، "حاجی بابا گل بیکتاشی" اور "سینٹ فلورا آف جارجیا کے اعترافات" وغیرہ قسم کی کہانیوں کو غیر ترقی پسند کہانی سمجھتا ہوں) لیکن اس کے ساتھ ساتھ میں اس تلخ حقیقت کا اعتراف بھی کرنا چاہتا ہوں کہ جلد سے جلد مشہور ہو جانے کے چکر میں ان غیر ترقی پسند دوستوں نے (جو قرۃ العین حیدر اور انتظار حسین والی نسل سے تعلق رکھتے ہیں) بنیادی طور پر بیچاری کہانی ہی کا ختنہ کر دیا اور مشہور ہونے کے چکر میں ایسی ایسی پینترے بازیاں کی ہیں کہ الامان والحفیظ۔

ایک صاحب اونچی جگہ پر بیٹھ کر زور زور سے کہانی پڑھنے کا مشورہ دیتے ہیں۔ دوسرے صاحب اقلیدس کی تیغ برّاں سے کہانی کا جھٹکا کرنے کی کوشش کر چکے ہیں۔ تیسرے صاحب طور کی بلندی سے اترتے ہیں تو اپنی کہانی سے لمبا خط چھپواتے ہیں اور کہانی کا عنوان رکھتے ہیں ایک طویل کہانی۔ چوتھے صاحب جب کیفیتوں کے حصار میں قید ہوتے ہیں تو ٹپ ٹپ کھٹ کھٹ کی تکرار سے کہانی کو آگے بڑھاتے ہیں۔ گویا ان کی باقی کہانیاں بغیر کسی کیفیت کے لکھی گئی ہیں)، پانچویں صاحب انتظار حسین بننے کے چکر میں عربی ناموں کا استعمال کر کے باقی ہم عصروں کو بونا سمجھنے لگتے ہیں اور پرچوں میں فرضی نام سے اپنی

---

[1] بمعنی کچھ نہیں، خالی، سرابی کیفیت۔

تعریف میں خطوط چھپواتے ہیں اور اوپر سے گذارش کرتے ہیں کہ آفاقی کہانیاں لکھنے والے فلاں فنکار کی کہانی شایع کی جائے۔ ایک صاحب ہیں جو غیاث احمد گدی کے ساتھی ہونے کے باوجود جب ان کی فنی بلندیوں تک نہیں پہنچ سکے تو اب سال بھر اپنی کتاب کی طباعت کا اعلان کرتے ہیں جب کہ عالم یہ ہے کہ سال بھر میں کتابت بھی مکمل نہیں ہوتی اور جب اس سے بھی نہیں بھرتا اور کوئی صورت نظر نہیں آتی اور کوئی امید بر نہیں آتی تو اپنے سجے سجائے ڈرائنگ روم میں بیچارے نئے فن کاروں کو انگریزی کی بھاری بھرکم کتابیں دکھا کر ڈراتے اور بلیاتے ہیں اور فلسفہ کی کتاب سامنے رکھ کر افسانہ لکھنے کی کوشش کرتے ہیں اور ایسا پوز مارتے ہیں جیسے وہ قرۃ العین حیدر اور غیاث احمد گدی سے بڑے افسانہ نگار ہیں۔

تو اس صورت حال میں آپ کا شکوہ بھی بجا ہے کہ افسانہ نگار کا رشتہ قاری سے منقطع ہوتا جا رہا ہے اور سوال یہ ہے کہ منقطع کیوں نہیں ہوگا جب کہ یہاں ہر شخص اپنی جگہ خود آخرالزماں ہے، تو پھر بیچارے قاری کی پرواہ کس کو اور کیوں ہو؟

لیکن اسی کے ساتھ ساتھ میں یہ بھی عرض کرنا چاہتا ہوں کہ فیشن زدہ تجربے کے نتیجے میں پیدا ہونے والا ابہام ایک الگ چیز ہے اور تخلیقی طور پر اگر کوئی نئی صورت حال پیدا ہوتی ہے اور اس صورت حال کے ظہور کے نتیجے میں اگر کچھ ابہام پیدا ہوتا ہے تو یہ ایک الگ مسئلہ ہے مگر اس فیشن زدہ "چیتانی کیفیت" اور تخلیقی ابہام کے درمیان کا فرق کہانی کار کا قاری ہی کر سکتا ہے بشرطیکہ قاری صاحب فہم و ادراک بھی ہو۔

اور اس پس منظر میں میں یہ سمجھتا ہوں کہ یہ ساری دھاندلی بازیاں اپنی موت آپ مر جائیں گی اور صرف فن بچ جائے گا، کہانی بچ جائے گی، وہ کہانی جو اپنے (تخلیقی) ابہام کے باوجود قاری کو اپنی طرف متوجہ کرے گی اور میری ناقص عقل میں تخلیقی ابہام "زرد کتا"، "آخری آدمی"، "شہر افسوس"، "سیڑھیاں"، "سواری" "ہزار پایہ"، "دوب لنجا اور ہوا"، "دوسرے آدمی کا ڈرائنگ روم"، "بجوکا"، "پرندہ پکڑنے والی گاڑی"، "تج دو تج دو"، "پوشاک"، "دو بھیگے ہوئے لوگ"، "گٹھری"، "کانچ کا بازی گر"، "ڈوبتا ابھرتا ساحل"، "آگ اپنے اندر کی"، "ڈھلان پر رکے پاؤں"، "سچویشن سٹ"، "رپورٹ"، "اندھی دشاؤں کے سائے"، "خارشیت" "صحرا کا سورج"، "منظر کچھ یوں ہے"، "آتم کتھا"، "لخت لخت"، "رات اور کنبھیاں" اور "کھلونے" وغیرہ میں موجود ہے جب کہ فیشن زدہ ابہام "تلقارمس"، "ماچس" (دوسرا عنوان "وہ")، "لا کے نام ایک خط"، "گرداباد اور پیلیا"، "سانپ" اور "بھوں بھوں" وغیرہ کا مقدر ہے اور ظاہر ہے کہ تخلیقی ابہام والی کہانیاں زندہ رہیں گی اور فیشن زدہ ابہام والی کہانیوں کو تو آج یا کل مرنا ہی ہے۔

اور سوئم یہ کہ اردو کہانیوں کا مستقبل اب ہماری ہی نسل کی صلاحیتوں پر منحصر کرتا ہے۔ آپ کو یاد ہوگا

سنہ ئہ کے آس پاس سے کہانی کاروں کا ایک جم غفیر انگڑائیاں لیتا ہوا اٹھا تھا، ابرار عظمت، بلو بدیل، اکرام باگ، بشیر باگ، انیس اشفاق، عبید قمر، انیس رفیع، قیصر رضا، محبوب الرحمٰن، نورالہدیٰ، شبیر احمد، علی حیدر ملک، ساجد رشید، عوض سعید، فیاض رفعت، صادق مولیٰ، نسیم محمد جان، محافظ حیدر، منظر کاظمی اور نہ جانے کون کون .... لیکن آج ملاحظہ فرمائیے کہ اس فوج میں سے کتنے جیالے زندہ ہیں۔

تقریباً تمام مذکورہ بالا حضرات چند دنوں اپنی بہارِ جانفزا دکھلاکر آرام فرما رہے ہیں اور اب لے دے کر علی امام نقوی، انور خاں، سلام بن رزاق، قمر احسن، شوکت حیات، حمید سہروردی اور حسین الحق کے علاوہ کون ہے جس کا ذکر کیا جا سکے۔

اور ان حضرات میں بھی انور خاں، سلام بن رزاق اور شوکت حیات کم و بیش ترقی پسندی کے ہم نوا بن گئے ہیں اور تیزی کے ساتھ اس COMMITTMENT کی طرف بڑھ رہے ہیں جو فن کے لئے سمِ قاتل ہے۔

باقی بچ گئے علی امام نقوی، قمر احسن اور حسین الحق (حمید سہروردی کے بارے میں ابھی میں اپنی رائے محفوظ رکھ رہا ہوں) جو ترقی پسندی اور "نام نہاد" جدیدیت" دونوں سے اپنے کو غیر متعلق رکھ کر صرف فن سے اپنا تعلق برقرار رکھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

تو سچ پوچھئے تو ایسی صورت حال میں نئی کہانی کا مستقبل انھی نئے فن کاروں کے ہاتھ میں ہے۔ اگر یہ اپنے فن کے ساتھ ایماندار رہے تو نئی کہانی کو بھی یہ نئی جہتیں عطا کر سکیں گے اور اگر ان دونوں صفوں کے مذکورہ بالا فن کار ترقی پسندوں اور جدیدیوں کی فارمولا بندی کے شکار ہوئے تو کہانی کا نقصان ہو یا نہ ہو خود ان کا سنبھلنا مشکل ہو جائے گا۔

اور اختتام پر صرف ایک اور بات یہ کہ یہ ساری باتیں تو خاص انداز کی کہانیوں سے متعلق ہے ورنہ جہاں تک مجموعی اور عمومی طور پر اردو کہانی کا سوال ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ اس کا بڑا گہرا سمبندھ زبان سے ہے۔ اگر زبان زندہ رہے گی تو اردو کہانی بھی زندہ رہے گی اور اردو زبان کی صورتِ حال کیا ہے اس کی طرف میں آپ کے دوسرے سوال (کے جواب) میں اشارہ کر چکا ——!! □

خورشید الاسلام
صدر شعبۂ اردو
مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ

غزلیں

(۱)

ناچتے ہیں سربسر، کون و مکاں، اللہ بس
ہم بھی اک عالم میں بیٹھے ہیں میاں، اللہ بس
اک نگہ ایسی کہ سناٹے میں آجائے وجود
آئے کیوں حرفِ شکایت درمیاں، اللہ بس
شیشہ خالی ہے، سبو خالی ہے، دل ہیں بے حضور
کیا کہیں پیرِ مغاں، پیرِ مغاں، اللہ بس
شب کے آئینے میں دیکھا، میں نے اک سیلِ الم
موج اندر موج، تا حدِ مکاں، اللہ بس
شیشۂ و ساغر سے آگے، غنچۂ و گل سے پرے
دل اگر ڈھونڈے نشاطِ جاوداں، اللہ بس
زندگی میں پیچ و تابِ غم، نشاطِ غم کے ساتھ
ہیں یہی تیرِ و کماں، تیر و کماں، اللہ بس
اس بدن میں ہم نے پایا، اپنے دل کا سا گداز
خرمنِ گل میں رہے، آتش بجاں، اللہ بس

(۲)

کب تلک بے مہریٔ حالات کی باتیں کریں
جام کو چھلکائیں، اوجِ ذات کی باتیں کریں
دن میں دیکھیں اک روپہلے گنگناتے دن کا خواب
رات میں اک جگمگاتی رات کی باتیں کریں
فرش سے بھیجیں سوئے عرشِ بریں وحیٔ انام
عرش سے اتری ہوئی آیات کی باتیں کریں
کھول دیں دل کے دریچے، جائیں پھولوں سے لپٹ
کوئی موسم ہو بھری برسات کی باتیں کریں
آج کی شب یوں گذاریں، نازِ بے جا ہی سہی
خاندانِ عشق کے سادات کی باتیں کریں
زندگی آفات ہے، آفات سے جائیں گذر
زندگی سوغات ہے، سوغات کی باتیں کریں
زخمِ دل، زخمِ خموشی، زخمِ عبرت، زخمِ ننگ
لذتیں اتنی ہیں، کن لذات کی باتیں کریں
بے محابا، بے تکلف، بے تحاشا، بے درنگ
دوستوں سے جسم کے نغمات کی باتیں کریں
ڈوب جائیں رات کے سینے میں اور ڈھونڈیں نشاط
پھر تصور میں کسی بارات کی باتیں کریں
لہلہاتے دو بدن اور سینۂ شب کا گداز
کیوں نہ یاروں سے انھیں اوقات کی باتیں کریں
دل کے سوتے جاگ اٹھے ہیں، یہ ساعت ہے عجیب
آؤ ایسے میں خمارِ ذات کی باتیں کریں

غلام ربانی تاباں
جامعہ نگر، نئی دہلی

غزل

خود نما تو کیا کہئے خود شکن سی ہوتی ہے
زندگی کہ خوابوں کی انجمن سی ہوتی ہے

ہم بھی ڈھونڈ ہی لیتے گوشۂ اماں لیکن
قید کے تصور سے کچھ گھٹن سی ہوتی ہے

لوگ بے زبانی کو درد کی زباں سمجھے
ورنہ دل کی بے تابی کم سخن سی ہوتی ہے

زندگی کا ہر منظر اجنبی سا لگتا ہے
اب نظر کہیں جائے بے وطن سی ہوتی ہے

دل نواز ہیں کتنی موسمی ہوائیں بھی
نرم نرم جھونکوں میں اک چبھن سی ہوتی ہے

حرفِ مدعا تاباں جب بھی لب پہ آتا ہے
دیر تک نہ جانے کیوں کچھ جلن سی ہوتی ہے

شہریار
فیصل ولا، سرسید نگر، علی گڑھ

غزلیں

(۱)

آنکھ کی یہ ایک حسرت تھی کہ بس پوری ہوئی
آنسوؤں میں بھیگ جانے کی ہوس پوری ہوئی

آرہی ہے جسم کی دیوار گرنے کی صدا
اک عجب خواہش تھی جو اب کے برس پوری ہوئی

اس خزاں آثار لمحے کی حکایت ہے یہی
اک گلِ ناآفریدہ کی ہوس پوری ہوئی

آگ کے شعلوں سے سارا شہر روشن ہوگیا
ہو مبارک آرزوئے خار و خس پوری ہوئی

کیسی دستک تھی کہ دروازے مقفل ہوگئے
اور اس کے ساتھ رودادِ قفس پوری ہوئی

(۲)

کاروبارِ شوق میں بس فائدہ اتنا ہوا
تجھ سے ملنا تھا کہ میں کچھ اور بھی تنہا ہوا

کوئی پلکوں سے اترتی رات کو روکے ذرا
شام کی دہلیز پر اک سایہ ہے سہما ہوا

منجمد ہوتی چلی جاتی ہیں آوازیں تمام
ایک سناٹا ہے سارے شہر میں پھیلا ہوا

آسمانوں پر لکھی تحریر دھندلی ہو گئی
اب کوئی مصرف نہیں آنکھوں کا یہ اچھا ہوا

اس ہتھیلی میں بہت سی دستکیں روپوش ہیں
اس گلی کے موڑ پہ اک گھر تھا کل تک کیا ہوا

نشتر خانقاہی
محلہ بھاٹان، بجنور، یو۔پی۔

غزلیں

لوگ، فرصت کے لمحوں میں بیٹھے ہوئے بے خبر، ذات گم
نام اپنا لگاتار لکھنے کی عادت سے ناآشنا

وضع آدرش شہری کو کرتے ہوئے اپنی تنسیخ سے
خود کو ہم حسبِ معمول رکھنے کی عادت سے ناآشنا

اشتہائیں کئی، رزق اور جنس کی بھوک سے ماورا
زندگی اپنے اندر کی صد رنگ حاجت سے ناآشنا

ہر طرف نرخ معلوم کرتے ہوئے شہر کے سنگ زن
اور ہم ہیں کہ ہیں اپنے ہی سر کی قیمت سے ناآشنا

غیر ثابت شدہ سچ کو تشکیک کا رنگ دیتا ہوا
آدمی، بے یقینی کی بے انت لعنت سے ناآشنا

برف اور سرد و سیال منظر اسے کتنے مرغوب ہیں
وہ کہ اک شخص اپنے بدن کی حرارت سے ناآشنا

کم نظر میں ہوں، تہیں ذات کی، دوہری تہری
نارسائی، میں تجھے دوست بنا کر رکھ لوں

نصف شب آئے گا اک شخص بجھانے والا
طاقِ دل! تجھ میں کوئی شمع جلا کر رکھ لوں

اب تو ایسا بھی نہیں، چھوڑ ہی جائے کوئی شام
یاد ایسی، جسے سینے سے لگا کر رکھ لوں

حرفِ کاذب کہ ہے خوش فہمئ پیہم، اب بھی
زخم کے بیچ ترے ہونٹ سجا کر رکھ لوں

تازگی میری نوا میں، نہ توازن، نہ ہنر
آبروِ دل کا لہو ہے، سو چھپا کر رکھ لوں

سرد راتوں میں کبھی جس سے تپش ملتی تھی
اب وہ انگارہ ہتھیلی پہ اٹھا کر رکھ لوں

مجھ سے وابستہ ہے اب تک وہی قاتل چہرہ
زندگی کاش تجھے خود سے بچا کر رکھ لوں

دو ماہی الفاظ
اے ۵۶، بلاک 'ایچ' نارتھ ناظم آباد
کراچی، پاکستان

پروین شاکر

... واوف بعہدک

(امام حسین کے آخری الفاظ)

کنارِ دریا،
اب آخری بار رن پڑا ہے،
علم کی نصرت کو جانے والے وہی جری پاس بچ رہے ہیں،
کہ جو مری ذریت میں ہیں
اور جاں سپاری جنھیں اب و جد سے ورثۂ افتخار بن کر عطا ہوئی ہے
لڑائی کی رات
گفتگو میں وہ لمحہ آیا تھا
جب کہ میں اپنے خیمے کے سب دیے بجھا کر چلا گیا تھا
مرے رفیقوں کی مشکلیں کچھ تو سہل ہوتیں
مگر چراغوں کی لو بڑھانے کے ساتھ ہی
فیصلے کی ساعت گزر چکی ہے
مبارزت کی نوید میرے شجیع لوگوں کو مل چکی ہے
مرے ہراول جوان ایک ایک کر کے کام آ رہے ہیں
مجھ کو یہ بات اچھی طرح سے معلوم ہو چکی ہے
کہ میرا پرچم ہوا کے آگے زیادہ عرصے نہیں رکے گا
سبھی طرف سے غنیم گھیرے کو تنگ تر کرتا جا رہا ہے
یہ ہاتھ سے ڈھال چھوٹنے کی صدا مجھے کس طرف سے آئی
گماں ہے شاید مرا کوئی شہسوار گھوڑے سے گر گیا ہے

مرے یمین و یسار نیزوں کی زد پہ ہیں
میرا قلب پہلے ہی برچھیوں سے چھدا پڑا ہے
عقب تک اب تو بجھے ہوئے تیر آرہے ہیں
وہ رن پڑا ہے کہ صحنِ مقتل ہماری لاشوں سے پٹ گیا ہے
برہنہ نعشوں کو اب تو گھوڑے بھی روند کر آگے جا چکے ہیں
میں بکھرے ٹکڑوں کو جمع کرتے
بریدہ سر سے بدن کی نسبت تلاش کرتے
کنارۂ روح تک شکستہ ہوں ـــــ تھک گیا ہوں
بہت کڑا وقت ہے
کہ اس مجمعِ عزیزاں میں آج تنہا کھڑا ہوا ہوں
تمام زخموں سے چور ہوں میں
مگر شہادت گہِ وفا میں
لہو سے رسمِ وضو کی تکمیل کرنے سے قبل
اپنے سجدے کی مستجابی کی بشارت مجھ کو مل چکی ہے
مرا یہ اعزاز کم نہیں ہے
کہ اتنے تیروں میں ایک بھی تیر وہ نہیں تھا
کہ جو کسی پشت سے نکالا گیا ہو
ہنگامِ عصرِ مقتل سے سرخرو ہوں
کہ میرے توشے میں جتنے وعدے تھے ـــــ اتنے سر ہیں!

442, TALBOT STREET
APARTMENT 10,
LONGUEVIL, QUEBEC, CANADA
J4L1T6

ناصر بغدادی

کافکا کے خطوط، ملینا کے نام

فرانز کافکا پہلی بار ملینا (MILENA) سے اس وقت متعارف ہوا جب وہ بطور مترجمہ اس کی ابتدائی نثری تخلیقات کو جرمن سے چیک (CZECH) زبان میں منتقل کر رہی تھی۔ رسمی جان پہچان سے گہرے جذباتی لگاؤ کا عبوری دور چند زقندوں میں طے ہوگیا اور وہ بہت جلد اس کی اجاڑ زندگی کے تاریک افق پر واحد ٹمٹماتا ستارہ بن کر نمودار ہوگئی۔ سنہ ۱۹۲۰ء سے اس کی المناک موت تک (سنہ ۱۹۲۴ء) کافکا نے ملینا کے نام جو بے شمار خطوط تحریر کئے ہیں ان کے مطالعہ سے قاری کو پتہ چل جائے گا کہ اس کی زندگی کے آخری ایام میں ملینا اس کے لئے جزو لاینفک بن چکی تھی۔ ایک خط میں اس نے فراخدلی کے ساتھ اس امر کا اعتراف کیا ہے :

"بجز ان امور کے کہ جن کا تعلق ہم دونوں کی ذات سے ہے، اب میں اس قابل نہیں رہا ہوں کہ دنیاوی ہنگامہ خیزیوں پر کچھ لکھ سکوں۔ علاوہ اس کے کہ ہر شے منطقی طور پر بیکار ہے، غلط ہے، بالکل غلط!"

وہ اس بے پایاں درجہ کافکا کے احساسات میں رچ بس گئی تھی کہ بسا اوقات وہ دن میں دو تین خطوط لکھنے کے بعد ہی اپنے جذبات کے آتش فشاں کو لمحاتی طور پر خاموش کرسکتا تھا۔ اس کے خطوط ایک ایسا بلوریں آئینہ ہیں جس میں ہم بہ آسانی ایک تنہا اور مجبور محض انسان کا دکھی جذبات کی گرد میں اٹا ہوا چہرہ دیکھ سکتے ہیں۔ اس کے خطوط سادگی، صاف دلی اور بے تکلفی سے مملو ہوتے ہوئے ہر قسم کی بناوٹ اور تصنع سازی سے قطعی طور پر مبرا ہیں۔ ان کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ان کا لکھنے والا نہ صرف صاحب فہم اور تیز نگاہ ہے بلکہ بے کراں قوتِ مشاہدہ کا بھی مالک ہے۔ بعض جگہ خطوط کے الفاظ سے تاک جھانک کرتی ہوئی تحیّر سے بھرپور معصومیت ایک ایسے خرد سال بچے کی یاد دلاتی ہے جو اپنے کمرے کے دریچے سے دنیاوی اژدہام کو بہ نظرِ استعجاب دیکھے جا رہا ہو۔

کافکا کی ڈائریوں کے مطالعے سے بھی ان دونوں کے قریبی تعلقات کی نوعیت کا پتہ چلتا ہے۔ سنہ ۱۹۲۱ء اور سنہ ۱۹۲۲ء کے سالوں میں جگہ بہ جگہ ڈائریوں کے اوراق میں ملینا کا تذکرہ ملتا ہے۔ نہ معلوم

کن وجوہ کے پیشِ نظر کافکا نے اس کے مکمل نام کی جگہ صرف M کا حرف استعمال کیا ہے۔ ممکن ہے وہ ملینا کی دوستی کے تقدس کو پردۂ راز میں رکھنے کا خواہاں تھا مگر اسے کیا معلوم تھا کہ ملینا کا نام ایک حرف میں سمٹ کر بھی بین الاقوامی سرحدوں کی ہر کڑی بندش کو عبور کر کے ایک غیر مختتم بازگشت بن جائے گا یکم دسمبر ۱۹۲۱ء کو کافکا نے ڈائری میں لکھا کہ اس نے چار مرتبہ اس سے ملاقات کی اور اب وہ رخصت ہوا چاہتی ہے "۔ ۔ ۔ طوفانی شب و روز میں چار پرسکون دن .... اب اس کی جدائی نہ ختم ہونے والے غم انگیز احساسات کا باعث بن جائے گی" اگلے روز اس کی ڈائری پر یہ الفاظ درج تھے " M ہمیشہ رہے یا نہ رہے .... مگر ایک تابناک اصول، تاریکی میں ابھرتی ہوئی ایک روشنی ...." ۔ ۲۲ جنوری ۱۹۲۲ء کو وہ لکھتا ہے " M ٹھیک کہتی ہے ۔ خوف کا مطلب ناخوشی"۔ ۱۲ جنوری کو اس کے قلم نے یہ الفاظ تحریر کئے "تم جس طرح چاہتی ہو اس انداز سے مجھ سے محبت نہیں کر سکتیں ...."

اس کی دیگر تحریروں کی نسبت ان خطوط میں الہامی کیفیات کی آمیزش بھی کم ہے ۔ اگر ہم اس کے مکاتیب اور ڈائریوں کا موازنہ اس کی دوسری تحریروں سے کریں تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ دونوں میں ایک حدِ فاصل ہے فکشن لکھتے وقت اس نے تجریدی اور علامتی انداز کو بڑی چابکدستی کے ساتھ اپنایا ہے ۔ جابجا وسیع پیمانے پر ان گنت مابعد الطبیعیاتی قسم کے کنایوں کا سہارا لیا ہے ۔ اگرچہ یہ تجریدی انداز پیچیدگیوں سے معرا معلوم ہوتا ہے مگر کرداروں کے عمل اور مناظر کے پس منظر سے جس اشاری رمزیت کا احساس اظہار ملتا ہے اس کی تہہ تک پہنچنے کے لئے قاری چند ثانیوں تک تعمیق و تفحص کی بھول بھلیوں میں خود کو الجھا ہوا پاتا ہے۔ کافکا کے اسی اشاری فکشن کی بنیاد پر آج کے بین الاقوامی ادب نے نظریۂ اشاریت کی ایک مہتم بالشان عمارت استادہ کر دی ہے مگر اس کے برخلاف جب ہم اس کی ڈائریوں اور مکاتیب کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ کافکا نے اپنے محسوسات اور مشاہدات کو ایک ایسا عام ناظر بن کر پیش کیا ہے جس کو تجریدی الجھاؤ سے جیسے کوئی علاقہ ہی نہ ہو۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ ان مکاتیبی تحریروں میں اشاری نقوش مفقود ہیں۔ بے شک بعض جگہوں پر ہمیں ان کی موجودگی کا پتہ چلتا ہے مگر اس کے باوجود ہمیں یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کافکا قلم برداشتہ لکھتے ہوئے غیر دانستہ طور پر ابہام سے دوچار ہو گیا ہو اور پھر اس میں تعجب کی کوئی گنجائش بھی نہیں کیوں کہ کافکا جیسا زود حس شخص وفورِ جذبات اور شدتِ احساسات سے مغلوب ہو کر بڑی آسانی سے ابہام کا شکار ہو سکتا تھا !!

جن حالات میں وہ دونوں جذباتی اور ذہنی طور پر ایک دوسرے سے وابستہ ہوئے وہ تم ظریفانہ حد تک متناقض تھے جیسے دو مخالف سمت رواں انجانے مسافر حادثاتی انداز میں ایک دوسرے سے مل

گئے ہوں اور اپنی منزلوں کو بھول کر ایک بالکل ہی انجانے راستے پر چل پڑے ہوں ـــــ جسمانی طور پر نہ سہی تو کم از کم ذہنی طور پر ہی !! ملینا ان دنوں ویانا (VIENNA) میں اپنی بتدریج تحلیل ہوتی ہوئی شادی شدہ زندگی کی ژولیدگیوں سے نبرد آزما تھی اور دوسری طرف کافکا پراگ (PRAGUE) میں اتنا آزاد نہ تھا کہ ملینا کی محبت کے بوقلموں خوابوں سے اپنی زندگی کو گل و گلزار کر سکتا۔ انھیں دنوں اس کی منگیتر انتظار کے طولانی لمحات سے عاجز ہو کر شادی کے لئے مصر ہو رہی تھی مگر کافکا پچھلی دو منگنیوں کے عبرت ناک انجام کے پیش نظر شادی کو وعدہ فردا پر ٹالتا جا رہا تھا۔ علاوہ ازیں وہ کما حقہ واقف تھا کہ ازدواجی زندگی کے بوجھ کو اٹھانے کے لئے وہ کسی طرح بھی اہل نہیں۔

جن دنوں دونوں کے درمیان دوستانہ تعلقات کی بنیاد استوار ہوئی کافکا کی عمر ۳۸ سال تھی اور وہ جسمانی لحاظ سے منحنی اور لاغر ہونے کے ساتھ ساتھ دق کا برسوں پرانا مریض بھی تھا۔ ملینا ۲۴ سالہ کم عمر خاتون تھی جس کی زندگی بے نام مسرتوں کی تلاش میں حقیقتوں کی سخت کوششوں کا بوجھ اٹھائے غیر یقینی حالات سے دوچار تھی۔ کافکا نے بارہا اپنے خطوط میں اس کی خوبیوں کی نشان دہی کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "وہ اس قابل نہیں کہ کسی کا دل دکھا سکے"۔ بلا مبالغہ وہ زندگی بھر تمام آلام و مصائب کا شکار رہی ـــــ اپنی پریشانیاں، گھریلو پریشانیاں اور سب سے بڑھ کر کافکا کی پریشانیاں جن کا احساس اُس کی روح میں زہر ہلاہل گھولنے کے لئے کافی تھا۔ جب تک کافکا زندہ رہا وہ اس کی دل جوئی کرتی رہی۔ اس کی نیندوں میں نشاط انگیز خواب بن کر ابھرتی رہی۔ وہ اس کا کس حد تک خیال رکھتی تھی اس کا ثبوت اس بات سے ملتا ہے کہ اس کے مہلک مرض کی چارہ سازی کرتے کرتے وہ خود ہی اس کی بیماری کا شکار بن گئی۔ شباب کی بہار آفرینیاں اس کے نصیب میں نہ تھیں اور شاید اسے ان کی ضرورت بھی نہ تھی۔ اسے تو کافکا کا دکھ پیارا تھا۔ اس کی پریشانیاں عزیز تھیں۔ اس کی بیماری سے محبت تھی اور ایک دن یہ "خزانے" اسے مل ہی گئے۔ ایک دن اس کے پھیپھڑوں نے جواب دینا شروع کر دیا اور شدومد سے اس کے منہ سے خون کا فوارہ پھوٹنے لگا۔ جب کافکا کو اس کی بیماری کا علم ہوا تو اس نے لکھا "تم کہ جس نے شعلۂ مستعجل بن کر زندگی بسر کی اور حقائق کی اتھاہ گہرائیوں کو چھولینا چاہا"۔ حقیقت میں وہ کہنا یہی چاہتا تھا کہ اس انداز سے زندہ رہنے والے آخر کار اسی حالت کو پہنچتے ہیں ـــــ اب جب کہ دونوں کی بیماری مشترک تھی۔ دونوں مریض چارہ گر بن کر ایک دوسرے کی چارہ گری کرتے رہے۔ دونوں ایک دوسرے کے لئے زندہ رہنے کے خواہاں تھے۔ زندگی کے لئے ان کی اشتہا عظیم تر تھی۔ مگر دونوں ایک دوسرے کی بیمار زندگی کو توانائی، صحت مندی اور تر و تازگی بخشنے کی خواہش میں مزید ان دیکھے المیوں سے ہمکنار ہوتے رہے۔

ملینا نے کافکا کی موت کے پورے بیس سال بعد ۱۷ مئی ۱۹۴۴ء کو اس دنیا سے اپنا رشتہ توڑا۔ اس کی ساری زندگی غم و آلام کا ایک غیر مختتم سلسلہ تھی۔ دوسری عالمگیر جنگ کے دوران وہ عرصہ دراز تک نازیوں کی قید میں ناقابلِ بیان اذیتوں کو سہنے پر مجبور رہی۔ اکثر جب رات کی تاریکیاں اس کے روح کے اندھیروں سے گھل مل جاتیں تو اس کی سسکیاں خاموش فضا کے سینے پر خوفزدہ انداز میں ابھرتیں۔ اس کے قید خانہ کی ساتھی مارگریٹا بوبر نیومین (MARGARETA BUBER-NEUMANN) نے اپنی کتاب میں اس کی روداد بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ کبھی کبھی وہ سسکیوں کے درمیان اپنے آپ سے کہنے لگتی "اوہ کاش میں اپنی موت سے قبل مر سکتی! مجھے یوں کتے کی موت مرنے کے لئے اکیلا نہ چھوڑو" اور پھر جنگ کے اختتام سے کچھ عرصے پہلے اسی تاریک زنداں میں اس کی روح نے اجالوں کی تلاش میں اس کے جسدِ خاکی سے ہمیشہ کے لئے اپنا ناطہ توڑ لیا۔ وہ مر گئی۔ اور اس کے چند ماہ بعد جنگ بھی ختم ہو گئی۔ قوموں کو دوبارہ آزادی مل گئی مگر ملینا کے نام جب پروانۂ آزادی جاری ہوا اس وقت کافی دیر ہو چکی تھی۔

چوں کہ کافکا نے خطوط لکھتے وقت تاریخ لکھنے کی ضرورت کو قطعی طور پر نظر انداز کر دیا تھا اس لئے ان کی ترتیب و تدوین کے موقعہ پر کتاب کے مدیر وِلی ہاس (WILLI HAAS) کو ناقابلِ بیان دشواری اور عرق ریزی کا سامنا کرنا پڑا۔ اگرچہ مکاتیب کا مطالعہ کرتے ہوئے قاری کو بظاہر تسلسل کے منقطع ہونے کا احساس نہیں ہوتا اس کے باوجود ہم حتمی طور پر نہیں کہہ سکتے ہیں کہ کافکا نے اسی ترتیب سے ملینا کے نام خطوط تحریر کئے تھے۔ لیکن یہ ایک ایسا تکنیکی سقم نہیں جو خطوط کے مواد کی اس اہمیت کی نفی کر سکے جو کافکا کی داخلی شخصیت کے خفیہ پہلوؤں پر روشنی ڈالنے میں ممد و معاون ثابت ہوتی ہے۔

کافکا نے جو کچھ محسوس کیا، جو کچھ سوچا، ادیبانہ دیانت داری سے فی الفور لکھ دیا۔ اس میں حقیقت اور صداقت کے علاوہ کچھ نہیں۔ ایک جگہ وہ لکھتا ہے۔

> "دیکھنا تم ملینا! میں سچ کہہ رہا ہوں۔ مگر تم ذہین ہو۔ تمھیں ہر وقت یہی محسوس ہوگا کہ گویا میرے الفاظ میں صداقت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ میں ضرورت سے کچھ زیادہ ہی سچ بول رہا ہوں"

وہ کس درجہ خوشی اور زندگی کا متلاشی تھا۔ اس کا اندازہ اس کے ان الفاظ سے ہو سکتا ہے:

> "اگر کوئی شخص خوشی کے سبب مر سکتا ہے تو میری آرزو ہے کہ میرے حصے میں یہ سعادت نصیب ہو۔ اور اگر کسی شخص کو موت کے لئے منتخب کر لیا گیا ہو اور وہ خوشی کے سبب زندہ رہ سکتا ہو تو یقیناً میں زندہ رہنے کو تیار ہوں"

بعض اوقات جب غم کے بادل گھنیرے ہوکر اس کی روح پر محیط ہو جاتے تو وہ عارضی طور پر لکھنے کی صلاحیت سے محروم ہو جاتا:

"کل میں کچھ نہ لکھ سکا۔ دنیا میں ہر چیز میرے لئے المناکی کا باعث تھی۔"

وہ کس درجہ ملینا کی شخصیت سے متاثر تھا۔ اس کی محبت کا اسیر تھا اس کا اندازہ اس کے اس اعتراف سے ہوتا ہے:

"میں تمھیں ہر سمت سے اپنے قبضے میں کر لینے کا خواہاں ہوں اور ان سمتوں میں حسد بھی شامل ہے۔ کاش میں تمھارے بیڈروم کا خوش قسمت وارڈروب ہوتا جو ہمہ وقت تمھیں گوناگوں انداز میں دیکھ سکتا۔ ممکن ہے میری یہ آرزو اس لئے پوری نہ ہوئی کہ تمھیں تکالیف سے ہمکنار ہوتے دیکھ کر میری حالت غیر ہو جاتی اور میری قوت برداشت جواب دے دیتی۔"

ایک اور جگہ کافکا نے لکھا:

"تمھاری موجودگی، تمھاری دوستی اور تمھاری محبت کے بغیر میں زندگی کی کرب انگیز کلفتوں کا مقابلہ نہ کر سکتا اور نہ اس قابل ہوتا کہ لوگوں کے وجود کو برداشت کر سکتا۔ مگر اب جب کہ تم نے مجھے قائل کر دیا ہے کہ زندگی میرے لئے ناقابلِ برداشت بوجھ نہیں ہے۔ مجھے اپنے پچھلے شکست خوردہ احساسات پر پشیمانی ہے۔"

کافکا نے بے تحاشہ انداز میں ملینا کے نام خطوط تحریر کئے۔ حقیقتاً وہ ایک بے حد تنہا انسان تھا۔ اس کی تنہائی ایک ایسے انسان کی تنہائی تھی جو مجبوری اور بے کسی کے گنبدِ بے در میں سمٹ کر خارجی دنیا کی دوڑتی بھاگتی سرگرمیوں سے مطلقاً لاتعلق ہو گیا ہے۔ وہ اپنے وقت کے جلتے ہوئے مندر میں بیٹھا ایک ایسا اکیلا دیوتا تھا جس کی عظمت اور برتری سے ہنوز پجاری ناواقف تھے۔ ملینا کے نام لکھے ہوئے خطوط دراصل ایک ایسے ہی اکیلے دیوتا کی زخمی آوازیں ہیں جو مندر کی فضاؤں میں بکھرے ہوئے روح فرسا سناٹوں سے خوفزدہ ہو کر کسی ذی نفس سے بات کرنے کے لئے بے چین ہو بیٹھا تھا۔ اس کے حکایت کے مطالعے سے یہی احساس ہوتا ہے کہ جیسے اس نے ملینا سے مکالمہ گوئی کی ہے۔ اس کے سامنے اپنا دل نکال کر رکھ دیا ہے۔ ان خطوط میں اس کی شخصیت کے تار و پود بکھرے ہوئے ہیں۔ ان کے الفاظ میں ہمیں اس کی زندگی کی اذیت ناکی، بے چارگی، تلخی، ناآسودگی، بیزاری، اکتاہٹ، خود رحمی اور خود نبردی کی منہ بولتی تصویریں ملتی ہیں۔ ان کو پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ اس تھکے ہارے بیمار انسان کی روح کس قدر توانا، صحت مند اور عظیم تھی۔ بعض جگہ علامتوں،

استعاروں اور لفظی پیکروں کے وسیلے سے اس نے زندگی، دنیا اور کائنات سے متعلق ان تمام جزئیات سے بحث کی ہے جن کے باہمی ارتباط سے اس کے فلسفیانہ عقائد اور منطقی نظریات کا خمیر اٹھا تھا۔ یہ ایک کم عمر خاتون کے نام لکھے ہوئے خطوط کا مجموعہ ہی نہیں بلکہ ایک ایسے تیز نگاہ، فہیم اور زیرک ادیب کے نقاط نظر ہیں جس نے دنیا والوں سے چھپ کر ان کی حرکات و سکنات کا زندگی بھر مشاہدہ کیا تھا۔ اس کتاب کو بلا مبالغہ ایک ایسی قیمتی دستاویز کہا جاسکتا ہے جس میں اس کی زندگی بھر کے غم، بھولی بھٹکی خوشیاں اور مسکراہٹیں، کرب انگیز احساسات اور خاموش آنسو، مزاح لطیف اور ناتمام خوابوں کے ماورائی پیکر باہمی طور پر مخلوط ہو کر ایک مرکز میں سمٹ آئے ہیں۔ □

صلاح الدین پرویز

ایک عورت

ایک دروازہ تھا وا
ایک گنبد جل رہا تھا بیچ صحرا شلِ لیل
ریت کے خیموں میں سبزے کے مناظر منجمد
بے غشا وہ سب گلاں تھے زہر کے بستر میں گم
کچھ سُفہا ڈھونڈتے تھے شر کی ہیبت میں سفر
اور جنگل چن رہا تھا راستے کو دربدر
ایک عورت،
جس کا خاکی، دود کا پارا حسد
قلبِ شر اک بے تحاشا تخم لہب و لعب سے
لپٹا ہوا
سر پہ ایندھن اور گردن سے بدن چپکا ہوا
ایک رسی مونج کی باندھے ہوئے فوقِ ہوس
آگ اوڑھے تر بہ تر
اور اک افعی بٹھائے زیرِ یک اسود قمیص
ایک عورت،
چپکے چپکے لا رہی تھی جنگلوں سے لکڑیاں
ایک عورت،
چپکے چپکے کھا رہی تھی جنگلوں کی لکڑیاں

ایک دروازہ تھا وا
زہر کا بستر تھا تختِ منتہیٰ منظر عجب
دربدر اک گھر پریشاں اور اس پر سر عجب

ابتدا

ہوا پریشان نیند شب میں
مکان حیران بے سبب میں

زمین قائم، زمان رفتہ
سکوت سکتہ۔ صدا میں نقطہ

ادھر سے تختِ ثواب لاتی
ادھر سے بخت شراب لاتی
خدا کی خوشبو پرند لاتی
کدھر سے آتی کدھر کو جاتی

سپید شب لازوال باقی
سیہ دنِ بے مثال باقی

صلاح الدین پرویز

ایک دن کا قصہ

دھوپ   کی آواز آتی تھی
دھوپ   ٹن ٹن بجتی تھی
شام   اپنے بچوں میں
صبح   کے درختوں میں   تتلیاں اگاتی تھیں
ایک دن   ذرا ہم نے   آنکھ دیر سے کھولی
شام   اپنے بچوں کے درمیان   غائب تھی
صبح   کے درختوں میں
رات   کالی رات بجتی تھی
دھوپ   کی آواز آتی تھی
دھوپ   ٹن ٹن بجتی تھی

علی ظہیر

نظم

سات دن
سات آسمان دراز
ہفت رنگ
ہفت صوت آہنگ ساز
ہفت پیکر
وجود کی تکرار
تھام لے ہاتھ اے شعور شکار

کتنے سورج زمیں نے اپنائے
کتنے پیراہن شرر بدلے
کتنے رنگ آسماں کے سائے تلے
زمیں پر آئے ہواؤں کے ساتھ بہہ کے چلے
ایک کے بعد ایک آتے دن
آتے اور آ کے دور جاتے دن
دور صدیوں میں ڈوب جاتے دن
دور قرنوں میں بھول جاتے دن

ہر دروں آنکھ آنکھ آنکھ ہی آنکھ
ہر دروں صوت صوت صوت ہی صوت
ہر دروں لمس لمس لمس ہی لمس
ہر دروں ذائقہ ہی ذائقہ بو ہی بو ہے

ہر زمیں آسماں کا مرکز ہے
نجم و شمس و قمر کا مرکز ہے
ذرہ ذرہ کا ایک مرکز ہے
جو بھی ہے وہ طواف کرتا ہے
جو نہیں ہے وہ لا سے آتا ہے
لا سے آگے ملے گا جو کچھ ہے
لا کے زینے بلند ہوں گے جب
سارے بت ٹوٹ ٹوٹ جائیں گے
ریت کے آئینہ میں دیکھو گے
ایک صورت کے جس کو رہنا ہے
ایک چہرہ جو سب پہ چھایا ہے

جب رہے گی نہ طاقتِ گفتار
جب اٹھے گی نہ ہاتھ سے تلوار
جب کے سینے میں بند رہو گی بات
جب کہ آنکھوں میں قید ہو گی رات

اس گھڑی موم کی یہ سب گھڑیاں
آفتابوں کے رخ پر آئیں گی

آفتابوں کے رخ جو تاباں ہیں
آفتابوں کے رخ جو روشن ہیں
آفتابوں کے رخ پر یہ دنیا
بار بار آ کے دور جاتی ہے
ایک گہرے عمیق ساگر میں
ایک پھیلے وسیع پانی میں

چکنی چکنی پھسل پھسلتی حیات
ہاتھ آ آ کے دور جاتی ہے
بے کراں جست جست چلتی حیات
پانیوں تک ہے بس حیات کی رو
بھیگی بھیگی ہے چشم ذات کی ضو
خالی خالی وجود کا صحرا

اونچی نیچی زمیں کی سطحوں پر
پھر اسی کے کرم سے سجتے ہیں
پھر اسی کی مدد سے آتے ہیں
سوکھی دھرتی پہ رات کے خیمے
سوکھی مٹی پہ شام کے ڈیرے
سوکھی دنیا پہ صبح کے چشمے
خشک مٹی جو رنگ پر ور ہے
رنگ لیتی ہے رنگ دیتی ہے
خون کا اور کبھی گلاب کا رنگ
زہر کا اور کبھی شراب کا رنگ
رنگ کے رنگ اور رنگ ہی رنگ
آسمان و زمین رنگ ہی رنگ
حرف و صوت و سماں رنگ ہی رنگ
لفظ و معنی بیان رنگ ہی رنگ
سب پہ چھایا ہوا ہے اس کا رنگ
رنگ کا رنگ اور رنگ ہی رنگ

پرکاش فکری
دریا محلہ، ڈورنڈا، رانچی

علی گڑھ ۱۹۷۸!

تیرے اکتوبر کے نام

سیاہی دشت کی تنہائیاں ہیں
یہاں تو خوف کی پرچھائیاں ہیں
لبوں پر خامشی جلتی ہوئی سی
دلوں میں زخم کی گہرائیاں ہیں
نمی ہے آنسوؤں کی بادلوں میں
سسکتی راکھ سی پروائیاں ہیں
اندھیرے کو ملی ہے کامرانی
چراغوں کے لئے رسوائیاں ہیں
وہی غم خوار ہیں فکری ہمارے
وہی ان کی ستم آرائیاں ہیں

فرحت احساس
۱۲، امیر منزل قلعہ روڈ علی گڑھ

وہ جگے ہوئے تھے تمام شب

علی گڑھ ۱۹۷۸ء کے نام

وہ جگے ہوئے تمام شب
انھیں صبح نیند سی آگئی
انھیں نیند آئی تو پھر کبھی
انھیں دن کی دھوپ نہ مل سکی
وہ گلاب صبح کی شبنمی
وہ ضیافتیں سی نہار منھ
وہ عوام نور کی برکتیں، وہ کھلی ہوئی سی بلا دریغ
حقیقتیں

دم ہوبہو، رم آب جو
سر شام روح کی گفتگو
وہ لجاجتیں وہ سماجتیں
پس آفتاب کی آہٹیں
انھیں پھر کبھی نہ سنائی دیں
وہ چلا گئے
اسی نیند میں وہ چلا گئے
وہ تمام وہم سماعتیں
وہی رات بھر کا دکھا ہوا
انھیں یاد تھا
وہ لکھا گئے
اسی نیند میں
وہ تمام رات کے پیکروں کو جیا گئے
کہ وہ رات بھر کے جگے ہوئے
انھیں دن کی دھوپ نہ مل سکی

رؤف خیر

الاوا بنج بھانی
کاروان، حیدرآباد

غزلیں

(حیدرآباد و علی گڑھ کے پس منظر میں)

کٹنے کا شوق ہی تھا جو رج دھج کے شہر میں
لوگ آگئے تھے گاؤں سے سب تج کے شہر میں

انہونی تھی جو ہو کے رہی، دکھ یہی تو ہے
کیا سائرن تھے رہ گئے بج بج کے شہر میں

بونے خود اپنے سایوں سے خوش، ہم سے ہیں خفا
اندھیر کس قدر ہے یہ سورج کے شہر میں

اس جنگ میں تو دستِ اماں بھی شریک ہے
اک بے کلی کا راج ہے دھیرج کے شہر میں

مہنگا پڑے گا میرا لہو سوچ لیجئے
میں سخت جاں ہوں قتلِ مرزج کے شہر میں

پائے ثبات ہوں میں ہر اک پل صراط پر
دستِ دراز ہوں کلہِ کج کے شہر میں

میں خطِ خیرِ اسود و ابیض کے درمیاں
حرفِ صحیح لہجۂ کج مج کے شہر میں

تا بکے منزل بہ منزل ہم مسافر بھاگتے
آنکھ اب ٹھیری ہوئی ہے اور مناظر بھاگتے

اے حریف ہر قدم شہ مات سے بچنے کی سوچ
اس بساطِ خاک سے کیا ہم سے شاطر بھاگتے

ہم تو آئے ہیں یہاں مٹنے مٹانے کے لئے
اس زمینِ کربلا سے کس کی خاطر بھاگتے

بس میں آجانے کا جذبہ بس میں کرنے کی ہوس
خاک و باد و آب و آتش بھی ہیں قاصر بھاگتے

سر کہیں پاؤں کہیں، آنکھیں کہیں چہرہ کہیں
اس ہوس میں کھو گئی پہچان آخر بھاگتے

خیرؔ شب خوں مار کر چھپ جانے والے ہم نہیں
معرکہ سر کرنے نکلے ہیں تو کیا پھر بھاگتے

کھود لیتے ہیں کنواں شہداب پا لیتے ہیں خیرؔ
اس زمینِ سخت سے کیا ہم سے شاعر بھاگتے

غزلیں

شمیم فاروقی
آل انڈیا ریڈیو، پٹنہ

لوگوں کا کیا قصور کہ نادان میں ہی تھا
اپنی حماقتوں سے پشیمان میں ہی تھا

مجبور تھا وہ حوصلہ کس پر نکالتا
اس کے لئے تو شہر میں آسان میں ہی تھا

میرا ہی خوف اس کو برابر لگا رہا
یہ جانتے ہوئے کہ نگہبان میں ہی تھا

دنیا سمجھ رہی تھی کہ ہوگا کوئی فقیر
کتنی عجیب بات کہ سلطان میں ہی تھا

کل تک بہت غرور اگر تھا تو کیا ہوا
اپنے کئے پہ آج پشیمان میں ہی تھا

منظر کی سمت اب کے کسی کی نظر نہ تھی
سب مجھ کو تک رہے تھے کہ حیران میں ہی تھا

ویسے تو سب کے سب تھے یہاں رمز آشنا
اس شہر کے امور سے انجان میں ہی تھا

مجھ کو گنوا کے وہ ہے بہت مطمئن شمیم
حالانکہ اس کی آخری پہچان میں ہی تھا

سلطان اختر
جیل ڈپارٹمنٹ، پٹنہ

سال خوردہ گفتگو قصہ کہانی روز و شب
زندگی پھر ڈھونڈتی ہے داستانی روز و شب

لمحہ لمحہ تشنگی بادِ خزانی روز و شب
پہ جھنتی پھرتی ہے دنیا پانی پانی روز و شب

چھا گیا خوش رنگیوں پہ زرد لمحوں کا غبار
ہو گئے تحلیل صحراؤں میں دھانی روز و شب

میں تو شیشے سے بھی نازک ہوں مری اوقات کیا
پتھروں کی چاٹ جاتے ہیں جوانی روز و شب

جانے کس غارِ تباہی میں ہمیں لے جائیں گے
یہ عروجِ زندگی یہ درمیانی روز و شب

رات دن مجھ کو بھی میرے جیسے لوگوں کی تلاش
ڈھونڈتا رہتا ہے وہ بھی اپنا ثانی روز و شب

صحنِ دل میں ہو کا عالم رینگتا رہ جائے گا
چاٹ جائیں گے سبھی یادیں پرانی روز و شب

کوئی لمحہ بھی صدی سے کم نہیں ہے اے خدا
ہم زمیں والوں پہ کب تک آسمانی روز و شب

سیّد عارف
"جواز" نیاپورہ، مالیگاؤں، ناسک

شمیم طارق
پوسٹ بکس نمبر ۴۳۵۶، بمبئی ۳

غزلیں

میرے ہونٹوں سے ہر اک حرفِ دعا لے جائے
چھین کر مجھ سے کوئی میرا خدا لے جائے
میرا جینا ہی کسی نام سے منسوب ہوا
میرا جو کچھ بھی اثاثہ ہے ہوا لے جائے
ایک آوارہ مسافر سا بھٹک جاؤں گا
گھر کی دیوار، اگر کوئی صدا لے جائے
میں تو خوابوں کے جزیروں سے نکل آیا ہوں
سایہ سایہ مری آنکھوں سے ضیا لے جائے
زندگی گہرے سمندر سے ابھر آئی ہے
دیکھنا اب کے کہاں موجِ بلا لے جائے

دور کی آہٹ، یاس کا سایہ
چہرہ ہے احساس کا سایہ
اپنی اپنی رام کہانی
جیون ہے بن باس کا سایہ
درد بڑھائے خون رلائے
چہروں پہ اخلاس کا سایہ
رات اندھیری سُرخ سویرا
یاس کا درپن آس کا سایہ
مشک چھپائے جنگل جنگل
ڈھونڈ ہرن بو باس کا سایہ
لرزاں لرزاں اوس کی بوندیں
آئینہ ہے گھاس کا سایہ

رونق نعیم

دوماہی الفاظ
جواہر لال نہرو روڈ
رانی گنج ۷۱۳۳۴۷، مغربی بنگال

غزلیں

عجب ہو گیا سانحہ دور تک
نہ اس کا نہ اپنا پتہ دور تک

تو کیا وہ ہے گویا اسی راہ میں
جو اڑتی ہے اس کی نوا دور تک

اندھیروں سے اب کوئی شکوہ نہیں
اجالوں نے دی بد دعا دور تک

مرا روپ یہ بھی ہے دیکھو مجھے
یہ کہتی ہے اندھی گھٹا دور تک

نہ جانے ہواؤں نے کیا کہہ دیا
کہ چپ ہو گئی ہے فضا دور تک

بلندی پہ اڑتا ہوں یہ جان کر
ملے گا خلا ہی خلا دور تک

کہاں کی غزل اور کیسی غزل
کہ پھیلا ہے اک مرثیہ دور تک

مناسب ہے اپنے شجر میں رہو
ستائے گی ورنہ ہوا دور تک

جو نکلا تھا رونق بڑی آن سے
وہ سورج ہے اب لاپتہ دور تک

طلسم خواب فریب خیال تھا کیا تھا
تو ایک جھیل تھی اور میں ہوا کا جھونکا تھا

سلگتی ریت کے ہونٹوں کو جس نے چوما تھا
وہ قطرہ اپنے کلیجے میں آگ رکھتا تھا

لہولہان تھا سورج غروب ہونے تک
مرے لئے تو یہ احساس جان لیوا تھا

کہاں تھی موج نمو کس طرف تھی جوئے رواں
مرے وجود کے اندر بھی ایک صحرا تھا

وہ خوشبوئیں جنھیں چھونے کی آرزو نہ گئی
میں ان کا کون تھا کیا ان سے میرا ناتہ تھا

بندھے ہوئے تھے گھٹاؤں کے پاؤں میں گھنگھرو
کسے خبر تھی کہ سیلاب آنے والا تھا

اسی سبب سے جڑیں اس کی کاٹ ڈالی گئیں
کہ وہ شجر تھا سر راہ چھاؤں دیتا تھا

وہ بدلیاں جو برستی رہیں سمندر پر
انھیں تو وسعت صحرا میں پھیل جانا تھا

ہوا کی چیخ اندھیرا جہاں اگلتی تھی
وہیں کہیں کوئی جگنو بھی جھلملاتا تھا

وہ پڑھ نہ پائے گا رونق مجھے خبر ہی نہ تھی
کہ میں نے جس کی ہتھیلی پہ خود کو لکھا تھا

نصیر پرواز
B/1092/N2، گوند پورہ
بھوپال ۴۶۲۰۲۳

غزل

آرزو کے نقش پا ویران راہوں میں نہ رکھ
زندگی کو قید کر کے چند یادوں میں نہ رکھ

قطرہ قطرہ آنسوؤں میں بہہ گیا میرا وجود
اب مری خوشبو بچا کر اپنی سانسوں میں نہ رکھ

نرم یادوں کا سراپا ہو نہ جائے زخم زخم
ٹوٹتے خوابوں کی کرچیں اپنی آنکھوں میں نہ رکھ

جن کی قسمت ہے اندھیرے شہر کی آوارہ دھوپ
ایسے کچھ مرجھائے چہرے دل کے خانوں میں نہ رکھ

چھو گیا تھا جو ترے دل کی جواں گہرائیاں
میری اس آواز کا چہرہ بھی لفظوں میں نہ رکھ

میں فقط اک جذبۂ ناکام ہوں اور کچھ نہیں
تو مجھے گذرے زمانے کے اجالوں میں نہ رکھ

بے سبب محفوظ ہو جاتی ہیں کچی لغزشیں
یہ تو بس کاپی کے پنے ہیں کتابوں میں نہ رکھ

مجھ سے جب پھیری نظر اس نے تو یہ سمجھا دیا
اس قدر دل کا یقیں بے روح قسموں میں نہ رکھ

جانے کب آوارہ جھونکا اس کی عزت لوٹ لے
کر کے روشن کوئی شمع دل ہواؤں میں نہ رکھ

راہ کا پتھر سمجھ کر مجھ کو ٹھوکر مار دے
میری آشفتہ مزاجی بھی خیالوں میں نہ رکھ

لوگ چہرے سے بھی پڑھ لیتے ہیں اب دل کی کتاب
کھول کر خود کو زمانے کی نگاہوں میں نہ رکھ

ڈال دے اگنی میں اس کو ورنہ سڑ جائے گی لاش
اپنے جھوٹے پیار کو ٹھنڈی چتاؤں میں نہ رکھ

صاف بتلا دے کہ تیرے پاس اب کچھ بھی نہیں
میرے مستقبل کو یوں الجھا کے خوابوں میں نہ رکھ

میں نہ کہتا تھا کہ سر تا پا ہے وہ پتھر کا جسم
مشورہ یہ بھی تھا اس کو دل کے شیشوں میں نہ رکھ

آرزو کے کھیل میں پرواز سب کچھ لٹ گیا
اب کوئی چہرہ چھپا کر بیتے لمحوں میں نہ رکھ

شمیم حنفی

شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ
نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

مٹی کا بلاوا

(ایک ریڈیائی تمثیل)

آوازیں ______

جاوید ــــــــ ایک نوجوان
منیرہ ــــــــ جاوید کی بہن
اماں بی ــــــــ جاوید اور منیرہ کی ماں
میر عنایت حسین ــ جاوید اور منیرہ کے والد
حکیم صاحب ــــ میر صاحب کے دوست اور پڑوسی
عشرت ــــــــ حکیم صاحب کی بیٹی منیرہ کی سہیلی
عشرت کی ماں ــ حکیم صاحب کی بیگم
غفور ــــــــ میر صاحب کا ملازم

زمانہ ______

حال

ابتدائی موسیقی۔

فیڈ آؤٹ کے ساتھ ہی رات کے دو بجتے ہیں۔ دور سے آتی ہوئی گجر کی آواز سناٹے کے احساس کو اور گہرا کر دیتی ہے۔ کتے بھونکنے لگتے ہیں۔

فیڈ اِن :

جاوید سگریٹ جلانے کے لئے ماچس جلاتا ہے۔

جاوید : (خود کلامی، جذباتی لہجہ، سرگوشیوں سے قریب) دو بج گئے اور ابا کے کمرے میں ابھی بتی جل رہی ہے۔ جاگ رہے ہیں۔ جاگ رہے ہیں اور سوچ رہے ہوں گے۔ وہ پرچھائیاں جنھیں امام باڑے کی دیواروں کے پیچھے ابا چھوڑ آئے تھے، اب تک ان کا پیچھا کر رہی ہیں۔ وہ گلہ کرتے ہیں اس بات کا کہ یہاں بھیڑ بھاڑ بہت ہے۔ لیکن ان کے ساتھ سبھی تو ایک بھیڑ لگی ہوئی ہے۔ اکیلے ہوں تب بھی یہ بھیڑ ساتھ رہتی ہے۔ ان چہروں کی بھیڑ جو مٹی کی تہوں میں دفن ہو چکے۔ میں سمجھتا تھا، وہ رنگ جو ان کی بوڑھی پلکوں پر کانپتے رہتے تھے اس شہر کی پہلی بارش کے ساتھ دھل دھلا گئے ہوں گے۔ لیکن یہ کیا ؛ پانی کی پہلی بوند گرتے ہی انھیں نور پور کی برساتیں بہا لے گئیں۔ اور اماں بی ! ان کا بھی وہی حال ہے۔ ہم نور پور میں تھے تو پانی برستے ہی باہر نکلنے پر پابندی لگ جاتی تھی۔ کیا مجال کہ باغ میں دم بھر چلے جائیں۔ اور کل ——— کل انھی برساتوں کو یاد کرتی رہیں اور دھاروں دھار روتی رہیں۔ باغ یاد آئے، جھولے یاد آئے، ڈومنیوں کے گیت یاد آئے۔ اس روز، اس گھڑی جب ہم نے حویلی کے احاطے سے باہر قدم نکالا تھا، ابا نے سب کی آنکھیں بچا کر دروازے کی مٹی سمیٹ لی تھی ——— پھر اماں نے وہ مٹی اپنی اوڑھنی کے پلو میں باندھ لی ——— ہونہہ ——— بیچارے تھکے ماندے

لوگ۔ وہ اس دھوکے میں ہیں کہ مٹی بھی ان کے ساتھ سفر میں ہے ـــــ جب کہ مسافر صرف ہم ہیں۔ ابا، اماں بی، منیرہ اور میں ـــــ

(سگریٹ پھر سے جلاتا ہے) فیڈ آؤٹ۔

فیڈ اِن:

ہوا کا ایک پرشور جھونکا۔ باغ میں پتے کھڑکھڑاتے ہیں۔

اماں بی: (دور سے) منیرہ! او منیرہ (منہ ہی منہ میں) اسی عشرت کے ساتھ گھسی بیٹھی ہوگی۔

منیرہ: (دور سے) آئی اماں بی، آ رہی ہوں۔ (بھاگتی ہوئی آتی ہے)

اماں بی: ارے بٹیا وہ جاوید کہاں ہے؟ دیکھو تو، زوال کا وقت ہے اور ابھی تک وہ لاپتہ ہے۔ دوپہر کا کھانا بھی نہیں کھایا۔

منیرہ: شکار پر گئے ہوں گے۔

اماں بی: شکار؟ اور کون تھا اس کے ساتھ؟

منیرہ: مجھے کیا پتہ اماں بی! ان کے یار دوست تھے شاید۔ بیٹھک سے آواز آ رہی تھی۔ پھر سب چلے گئے۔

اماں بی: جاوید بھی؟

منیرہ: جی، وہ بھی ـــــ

اماں بی: بتا تو دینا تھا، پھر گیا کیوں؟

منیرہ: (ہنس کر) تو کیا کرتے گھر میں پڑے پڑے۔ یہاں جی بھی تو بہت اوبتا ہے اماں بی۔ ہے نا!

اماں بی: (ایک ٹھنڈا سانس لے کر) یہ لو! جس مٹی میں پل کر اس عمر کو پہنچے وہاں اب جی اوبتا ہے۔ گھر میں جی اوبتا ہے۔ دو چار دن کے لئے شہر سے آیا تھا۔ اور اب کسی اور شہر کو سفر ہے۔ یہ موئی سرکاری نوکری بھی تو ایک بڑا عیب ہے اس میں۔ ہے نا! آدمی جہاں بستا ہے کچھ رشتے ناطے ہو جاتے ہیں۔ گھر بار تو چھوٹا ہی تھا۔ اب وہ جگہ بھی چھوٹ گئی جہاں اس نے تین برس کاٹے تھے۔ وہاں تو دل لگ گیا تھا۔ آگے اللہ جانے کیا ہو، مجھے تو ہول آتا ہے بٹیا۔ یہ مارے مارے پھرتے رہنا ـــــ اس سے تو اچھا تھا کہ نوکری چھوڑ دیتا ـــــ میری

آنکھوں کے سامنے تو رہتا۔

منیرہ : (دھیرے سے) نوکری چھوڑ دیں ـــــ ؟ نوکری ؟

اماں بی : ن ـــــ نہیں بیٹا ! یہ مطلب تھوڑی ہے۔ میں تو کہتی ہوں کہیں مستقل ہو جائے تو اچھا ہے۔ تمہارے ابا بیمار رہنے لگے ہیں۔ یہاں کا انتظام کون سنبھالے کھیتی باڑی کا کام بس دوسروں کے سہارے تو ہونے سے رہا۔ اب وہ زمانے کہاں رہے کہ گھر میں بیٹھے بیٹھے حکم چلتا تھا۔ غلہ سالوں سال بھرا رہتا تھا ـــــ اوپر سے کچھ یافت بھی ہو جاتی تھی۔ باغ الگ پڑے سوکھ رہے ہیں کیسی کیسی قلمیں کہاں کہاں سے جمع کی تھیں۔ زردالو، گلاب خاص، خاص الخاص، شربتی نواب پسند، دھنکِ نہات، آدھ آدھ سیر کی تو ہماری دیسی دسہریاں ہوتی تھیں اور ان کی قاش ـــــ ایک دم بے داغ۔ ریشے کا نام نہیں۔ انجانے آدمی سے قسم لے لو، وہ انھیں لاکھ برس دیسی نہ مانتا ـــــ شہر میں تو جاوید کہتا تھا اب کے لنگڑے پانچ چھ روپے سیر، وہ کیا کہتے ہیں کلو بکے ـــــ آم نہ ہوئے ہیرے جواہرات ہو گئے۔

منیرہ : (اکتا کر) میں ذرا نہا لوں اماں بی۔ پسینے میں بھیگی ہوئی ہوں۔

اماں بی : (چونک کر) ہاں بیٹا ! اُمس بھی تو غضب کی ہے ـــــ ابھی ابھی تو ہوا چلی تھی پل بھر کو ـــــ لیکن جاوید ـــــ

منیرہ : آرہے ہوں گے بھائی جان۔

اماں بی : آرہے ہوں گے ؟ لیکن دوپہر کا کھانا ـــــ

منیرہ : کھا لیا ہوگا کہیں ـــــ اب تک بھوکے تھوڑی ہوں گے ـــــ

اماں بی : کھا لیا ہوگا ؟ لیکن کہاں ؟ ـــــ پھر یہ بھی کوئی بات ہے ؟ گھر کا دسترخوان چھوڑ کر باہر کی ہانڈی سونگھا ـــــ یہ سب لڑکپن کی باتیں ہیں ـــــ اسے مش قلیا پسند ہیں نا ! ـــــ میں نے آج اس کی وجہ سے پکایا تھا۔ صبح کے ناشتے کی ٹکیاں بھی بچا کر رکھ دی تھیں ـــــ اسے بہت پسند ہیں نا ـــــ شہر میں تو یہ سب چیزیں ملنے سے رہیں۔ ایک ایک کے لئے ترستا ہوگا۔

منیرہ : (ہنس کر) اب ایسا بھی نہیں اماں بی ! آخر میں بھی ہوسٹل میں رہتی ہوں۔

اماں بی : ہونہہ ـــــ تم ہی تو کہتی تھیں کہ وہاں وہی ـــــ بوٹی بنا شوربہ، جلی جھلسی روٹیاں ـــــ نہ جی بھرتا ہوگا نہ پیٹ ـــــ پھر ستر روپے مہینے کے مہینے خالی کھانے پر اٹھ جاتے ہیں۔

منیرہ : تو میں جاؤں نہالوں اماں بی۔

اماں بی : (تھکی ہوئی آواز میں) جاؤ بیٹا! تمھارے ابا اب مسجد سے آ رہے ہوں گے۔ چائے کا پانی رکھ دوں۔ جب تک۔ لکڑیاں بھی موئی سیل گئی ہوں گی۔ ارے دھوئیں کے آنکھوں میں مرچیں سی لگنے لگتی ہیں ـــــ

منیرہ : تو آپ رہنے دیجئے نا! میں نہالوں پھر چائے بنا دوں گی۔

اماں بی : یہ لو! ہر وقت کام کے لئے تیار۔ چھ مہینے بعد کالج بند ہونے پر لوٹی ہو، یہاں تو کوئی دم آرام کرلو۔ وہاں تو وہی پڑھائی پڑھائی پڑھائی۔ جبھی تو اتنی سی عمر میں موا چشمہ ناک چڑھ گیا ـــــ مجھے دیکھو ـــــ اپنے ابا کو دیکھو ـــــ مزے سے اخبار پڑھ لیتے ہیں اور میں بھی نور نامے، شہادت نامے کی گردان کرلیتی ہوں۔ جاوید سے کہوں گی کہ اب کے گھر آئے تو میرے لئے ذرا موٹی چھپائی والا شہادت نامہ لے آوے ـــــ یہ جو گھر میں ہے میرے جہیز کا ہے۔ کاغذ بھی اس کے خستہ ہو چکے ہیں۔

(دور سے چھڑی کی ٹھک ٹھک ساتھ ہی ساتھ میر عنایت حسین کے قدموں کی چاپ لمحہ بہ لمحہ قریب آتی ہوئی۔)

منیرہ : (چونک کر) ابا آرہے ہیں۔ میں پہلے چائے کا پانی رکھ دوں۔ بعد کو نہالوں گی۔

اماں بی : رہنے دو۔ تم جاؤ، میں چائے بناتی ہوں۔

(دونوں ساتھ ساتھ جاتے ہیں)

(موسیقی)

(فیڈ آؤٹ۔ جاوید سگریٹ جلاتا ہے)

جاوید : (خود کلامی، جذباتی لہجہ) ابھی تک ابا جاگ رہے ہیں۔ (پس منظر سے گھڑی کی ٹک ٹک ٹک ٹک) وہ سوچتے ہیں، سوچتے رہتے ہیں۔ اس لئے نیند نہیں آتی اور نیند نہیں آتی تو اور زیادہ سوچنے لگتے ہیں۔ وقت اپنی چال چلتا جائے گا۔ (پس منظر سے گھڑی کی ٹک ٹک) ابا اور اماں بی بے چارے اس دھوکے میں پڑے ہیں کہ بیتے ہوئے سارے موسم، ان موسموں کی اچھی بری یادیں، ان یادوں کے دھندلے ہوتے ہوئے رنگ، یوں ہی ان کے ساتھ چلتے رہیں گے اور راستے سہل ہو جائیں گے۔ لیکن ـــــ یہ کیسا سفر ہے ـــــ مسافر تو ہم سب ہیں۔ ابا، اماں بی، منیرہ اور میں ـــــ سب ساتھ ہیں پھر بھی ہماری غرضیں الگ ہیں ـــــ

اباں اور اماں بھی پھر وہیں لوٹ جانا چاہتے ہیں جہاں سے چلے تھے ـــــ الٹی سمت کا سفر۔ یہ کیسی مجبوری ہے اور پھر اب نور پور میں رکھا کیا ہے ؟ ٹوٹتی ہوئی قبریں اور گرتی ہوئی چھتیں اور اجڑے ہوئے باغ۔ اب نہ کوئی چھتوں پر مٹی ڈالے گا، نہ قبروں پر ـــــ

(ہیجان خیز موسیقی کی ایک لہر)

کھیتی اجاڑ ہو چکی ہے۔ وہ بستی گورِ غریباں کا منظر۔ جوان شہروں کو چلے گئے۔ اب وہاں صرف مرجھائے ہوئے چہروں کی آبادی ہے۔ محرم میں تھوڑی بہت چہل پہل ہو جاتی تھی۔ اب وہ بھی نہیں رہی۔ نہ وہ سوزخواں رہے نہ ویسے ماتمی ـــ الاؤ کا ماتم ختم ہوا۔ قمقے کا ماتم ختم ہوا ـــــ ساتویں حلیم کی دیگیں چڑھتی تھیں۔ اب بس شربت اور قبروں پر فاتحے کی نیاز ہو جاتی ہے۔ یہ سارے ہنگامے فراغتوں کے دم سے تھے۔ پھر سڑک پر بجلی کے تار کھنچ گئے ہیں۔ تعزیوں کا جلوس ادھر سے گزرے کیسے ـــــ امام عالی مقام کے روضۂ مقدس کی شبیہ تو سرنگوں ہونے سے رہی۔ چھوٹے چھوٹے یک منزلے تعزیے سنبھالے بچے پرانی رسمیں پوری کر رہے ہیں۔ پہلے سال کے سال پردیس میں کمائی کے لئے جانے والے بھی لوٹ آتے تھے ـــــ اب کوئی نہیں آتا۔ سگریٹ جلاتا ہے ـــــ

(پس منظر سے گھڑی کی ٹک ٹک ٹک)

(موسیقی کی ایک لہر ـــــ) فیڈ آؤٹ۔

فیڈ ان :

میر عنایت حسین : (حقے کا کش لیتے لیتے کھانسنے لگتے ہیں) منیرہ ـــ او منیرہ! (ہانپتے ہیں)

منیرہ : (دور سے) آئی ابی! (آتی ہے)

میر عنایت حسین : بیٹا ذرا اپنی ماں کو بھیج دو ـــــ

منیرہ : چائے پی لی آپ نے ؟

میر عنایت حسین : ہاں !

منیرہ : اور لاؤں ؟

میر عنایت حسین : نہیں ـــ ہاں ـــ اور یہ کرنا کہ اب جو چائے بنانا تو اس میں ذرا سی ادرک اور لونگوں کی دو چار کلیاں ڈال دینا۔

منیرہ : جی ابا جی ! (جاتی ہے)

(میر صاحب پھر حقے کے کش لینے لگتے ہیں۔ اماں بی آتی ہیں۔)

اماں بی : (میر صاحب کو ہانپتے ہوئے دیکھ کر) توبہ ہے ! اب تو حقے کی نے منہ سے الگ کر دیجئے۔ سینہ دھونکنی کی طرح پھول رہا ہے۔

میر صاحب : اوہ، ہاں، نہیں تو !

اماں بی : پھر چائے کو کہلوایا تھا ؟

میر صاحب : ہاں ـــ کیوں ؟

اماں بی : لیکن لونگ کہاں ہے ؟ روپے کی پرسوں منگوائی تھی۔ کوئی بیس بائیس رہی ہوں گی۔ لونگیں نہ ہوئیں ہیرے جواہرات ہو گئے۔

میر صاحب : (کچھ سوچتے ہوئے) تم سے کچھ مشورہ کرنا ہے۔

اماں بی : (چونک کر) جی ؟

میر صاحب : جاوید کی بدلی کا تمھیں معلوم ہی ہے۔ کہتا تھا کہ اسی شہر میں الگ سے لڑکیوں کا کالج بھی ہے۔

اماں بی : پھر ؟

میر صاحب : پھر یہ کہ منیرہ کو اب کے وہیں داخل کرا دیا جائے۔

اماں بی : اس سے کیا فائدہ ہوگا ؟ آخر خرچ تو وہاں بھی اتنا ہی اٹھے گا۔

میر صاحب : (دھیرے سے) نہیں ـــ خرچ اتنا نہیں اٹھے گا۔

اماں بی : وہ کیسے ؟

میر صاحب : وہ یوں کہ منیرہ جاوید، سب ساتھ رہیں ـــ

اماں بی : منیرہ جاوید ـــ ؟ تو کیا دن بھر منیرہ گھر میں اکیلی رہے گی ؟ جاوید تو دفتر چلے جائیں گے۔

میر صاحب : (کانپتی ہوئی آواز میں) اکیلی کیوں ؟ جاوید کہتا ہے کہ ہم بھی وہیں چل کر رہیں۔

اماں بی : (حیرت سے) یعنی کہ ہم ؟

میر صاحب : (دکھ بھرے لہجہ میں) ہاں، ہم ـــ ہم سب۔

(وقفہ)

اماں بی : لیکن رہیں گے کہاں ؟ ابھی تو وہ جا کر گھر ڈھونڈے گا۔

میر صاحب : گھر تو خیر کرایے کے مل جاتے ہیں۔ کہتا تھا بھرا پرا شہر ہے۔ پر رونق آبادی۔ بازار۔ کالج۔

اسپتال۔ کچہریاں۔ سب کچھ ہے وہاں ـــــ ساتھ رہیں گے تو خرچ کچھ کم اٹھے گا۔

اماں بی : (دھیرے سے) تو میں کیا کہوں ؟

میر صاحب : تمھاری رائے کیا ہے ؟

اماں بی : جیسی مرضیٔ مولا !

میر صاحب : تو پھر ہاں کر دوں ؟

اماں بی : (بے خیالی میں) اچھا !

میر صاحب : لل لیکن ـــــ میں تو سمجھتا تھا کہ تم انکار کر دو گی۔ سوچو تو۔ یہاں بزرگوں کی قبریں ہیں۔ ان پر اگر بتیاں کون سلگائے گا ؟ اور تو کوئی نہیں رہ گیا اس خاندان میں۔ ایک غفور ہے، اسی گھر کا پروردہ۔ سو اس سے اب کوئی کام نہیں ہوتا ـــــ کیا اس کے سہارے سب کچھ چھوڑ دوں ؟

اماں بی : ہے ہی کیا جسے چھوڑنے کا دکھ ہو !

میر صاحب : (تڑپ کر) ہے کیوں نہیں ؟ تمھیں یاد ہے۔ کن جتنوں سے میں نے لیموں اور فالسے کا یہ باغ لگایا تھا ـــــ کہاں کہاں سے آموں کی قلمیں منگوائی تھیں ؟ کھیتوں میں اناج کم اگتا ہے تو غلطی مٹی کی نہیں، ہماری اپنی ہے۔ اب محنت کون کرے ؟

اماں بی : تو کیا جاوید ـــــ ؟

میر صاحب : (جلدی سے) کتنا سمجھایا تھا، ڈاکٹری پڑھ کر یہیں مطب کھول لیتا۔ خلقِ خدا کی خدمت بھی ہوتی اور اس کے سہارے زندگی بھی کٹ جاتی ـــــ لل لیکن وہ تو ـــــ

اماں بی : اس کا جی لگتا ہے یہاں۔ منیرہ بھی اسی روش پر چل رہی ہے۔ ان بچوں کو بزرگوں کی کمائی سے وہ لگاؤ تو ہونے سے رہا۔ مولا مشکل کشا کے سپرد کرو اور جہاں تقدیر لے جائے چلے چلو ! (رونے لگتی ہیں)

میر صاحب : (گھبرا کر) ارے تم تو مجھ سے بھی زیادہ کچے دل کی نکلیں ـــــ بوڑھوں کے سرپرست بچے بن جاتے ہیں۔ جاوید کی بات میں سمجھتا ہوں۔ بس ذرا سوچ کر جی بھر آتا ہے۔

(منیرہ کے پیروں کی چاپ)

میر صاحب : آجاؤ بیٹا آجاؤ ! منیرہ !

منیرہ : (آتے ہوئے) آئی ابی ! یہ آپ کی چائے ـــــ

(چائے کے برتن تپائی پر رکھتی ہے)

اماں بی : (حیرت سے) لونگیں کہاں ملیں؟ مہک پھوٹ رہی ہے!
منیرہ : حکیم صاحب کے ہاں سے منگوائی تھیں۔
میر صاحب : بری بات ہے بیٹا۔ چاہے بلا لونگوں کے بھی بن جاتی مفت میں کسی کا احسان اٹھانا۔
منیرہ : (ہنس کر) اس میں احسان کی کیا بات ہے۔ ابھی صبح ہی چھالیہ منگوائی تھی حکیم صاحب نے۔
میر صاحب : تو تم نے بدلہ لے لیا۔ (ہنس دیتے ہیں)
منیرہ : بدلہ کیسا؟ دو چار لونگوں کی بساط کیا ہے؟
اماں بی : ہے کیوں نہیں بیٹا! اب یہ سونے کے مول بکتی ہیں۔ غضب خدا کا۔ ایسی مہنگائی دیکھی نہ سنی۔
میر صاحب : اچھا مجھے ایک پان بنا دو۔ ذرا حکیم صاحب کی طرف ہو آؤں۔ ان سے بھی مشورہ کر لوں۔
منیرہ : کس بات کا ابی جی؟
میر صاحب : (تھکے ہوئے لہجے میں) جاوید کہتا ہے سب شہر چل کر رہیں۔ جہاں اس کی بدلی ہوئی ہے۔
منیرہ : (خوشی سے) کب چلیں گے؟
میر صاحب : (افسردگی سے) ابھی تو وہ جا کر مکان ڈھونڈے گا۔ مکان ملتے ہی ہم وہاں چلے جائیں گے۔
منیرہ : (خوشی سے) یہ تو بہت اچھا ہوا۔ سب ساتھ رہیں گے۔
میر صاحب : (خود کلامی کے انداز میں) سب؟ سب ساتھ رہیں گے؟ تمھاری ماں اور تم اور جاوید اور میں ——— کیا یہی "سب" ہیں؟ یہ در و دیوار ——— یہ بستی ——— امام باڑہ ——— باغ ——— کھیت ——— باپ دادا کی قبریں ——— یہ مٹی، یہ ہوا، یہ ——— یہ کچھ بھی نہیں ——— کچھ بھی نہیں؟ سب کچھ چھوڑ کر جانا ہوگا! یہ سب کچھ! یا مولا ——— کیسی مشکل آن پڑی ہے ———
منیرہ : مشکل کیا ہے ابی جی! مجھے ابھی پڑھائی ختم کرنی ہے۔ جاوید بھیا نوکری پر ہیں۔ سو ہمیں تو باہر رہنا ہی ہے کیسی اچھی بات ہے کہ ہم سب جہاں رہیں ساتھ رہیں۔ خرچہ بھی کچھ کم ہو جائے گا۔
میر صاحب : (کھوئے ہوئے انداز میں) تھوڑے سے فائدے کی خاطر کتنا بڑا نقصان اٹھائیں گے ہم۔ تم کیا جانو بیٹی! ہمارے پاس کیا رہ جائے گا؟ کچھ بھی نہیں (چھڑی ٹیک کر اٹھتے ہوئے) اچھا! میں ذرا حکیم صاحب کے ہاں ہو آؤں!
اماں بی : پان کا بیڑا تو لیتے جائیے۔
میر صاحب : رہنے دو ابھی، وہیں کھا لوں گا!

(چھڑی ٹیکتے ہوئے کمرے سے نکل جاتے ہیں۔ پیروں کی چاپ اور چھڑی کی ٹک ٹک
دور ہوتی جاتی ہے۔)

فیڈ ان :

(رات کا سناٹا۔ کتوں کے بھونکنے کی اکا دکا صدائیں۔ ہوا کے شور میں پتوں کی کھڑکھڑاہٹ۔)

جاوید : (سگریٹ سلگاتے ہوئے) ٹہنیوں سے ٹوٹ کر گرتے ہوئے پتے ـــــ بھورے، مٹیالے، مرجھاتے ہوئے پیلے پتے ـــــ ان کا سفر اب ختم ہوا۔ لیکن ـــــ شاید نہیں، ابھی نہیں۔ ہوائیں انھیں اڑاتی پھریں گی ـــــ یہ سفر بے ارادہ ہوگا ـــــ جن پہ تقدیر ـــــ ابا بھی تو یہی سمجھتے ہیں۔ یوں نہ سمجھتے تو اس روز بے نشان قبروں کی مٹی سے لپٹ کر آنسو روتے کیوں؟ کہتے تھے بے جان مٹی سے جانے کتنے بیتے موسموں کی صدا آتی ہے۔ یہ قبریں ان جیالوں کی ہیں جن کی ہیبت سے نورپور کی زمین کانپ اٹھتی تھی۔ جنھوں نے برسہا برس تک فاتح خیبر کی شجاعت کے قصے دوہرائے اور پھر یہ کیا ہوا ـــــ دیکھتے دیکھتے دنیا بدل گئی۔ زوال کی وہ ساعت جب شہنشاہ کونین نے ذوالجناح کی پیٹھ سے اتر کر سرزمین نینوا کی لہولہان دھرتی پر شکر کا ایک سجدہ ادا کیا تھا ـــــ وہی وقت تھا جب ابا ہمارے ساتھ اس سفر پر نکلے ـــــ

(پس منظر سے ایک طوفانی لہر ـــــ سازوں کی گونج میں گھوڑوں کی ہنہناہٹ اور
ان کے گلوں میں بندھی گھنٹیوں کی آوازیں ـــــ)

حکیم صاحب : (دور سے آتی ہوئی آواز) تو جا رہے ہو بھائی عنایت حسین!

میر صاحب : (بھرائی ہوئی آواز میں) ہاں!

حکیم صاحب : پھر جلد ہی آؤ گے نا؟

میر صاحب : شاخ سے ٹوٹ کر گرنے والے پتے پھر شاخ پر واپس کب آتے ہیں حکیم جی!

حکیم صاحب : ایسا نہ کہو بھائی عنایت حسین ـــــ ایسا نہ کہو۔

(ہوا کا ایک پرشور جھونکا)

میر صاحب : بھائی! (ملتجیانہ انداز میں) ایک بات کا دھیان رہے۔ غفور یہیں رہے گا۔ (ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے) دیکھو! عزا خانے کی ان دیواروں کی طرف۔ ان میں صدیوں کے گریہ و بکا کی گونج بھری ہوئی ہے۔ کہ غم حسین کی لو اس دہلیز پر کبھی مدھم نہ ہوتی۔ بھائی حکیم صاحب! خدا

تمھیں غمِ حسین کے سوا اور کوئی غم نہ دے۔ یہ دیکھنا کہ میں اگر ـــــ اگر ـــــ زندہ نہ رہوں تو بھی اس غم کی مشعل اس دہلیز پر روشن رہے ـــــ زندہ رہا تو اگلے عاشورے تک پھر یہاں آن پہنچوں گا۔ باغ سے تھوڑی بہت جو بھی یافت ہو اس سے اہتمام کر لینا۔ ہمارے نہ رہنے پر غفور اتنا غلّہ تو بچا ہی دے گا کہ امام علیہ السلام کے فقیروں کو ایک وقت پیٹ بھر کھلا دیا جائے ـــــ

(گھوڑوں کی ہنہناہٹ)

جاوید : (بھاری قدموں سے قریب آتے ہوئے) چلئے ابّا، اماں بی کے ساتھ آپ اسی یکّے پر بیٹھ جائیے۔ اب ہمیں اسٹیشن کے لئے چل دینا چاہئے۔ چار کوس کا راستہ ہے۔

میر صاحب : (بے خیالی میں) جاوید ـــــ بیٹے ـــــ کیا کہا؟ چار کوس کا راستہ! ہاں آں!

حکیم صاحب : (گلوگیر آواز میں) تو جا رہے ہو بھائی عنایت حسین؟

میر صاحب : (گلوگیر آواز میں) ہاں بھائی ـــــ مرضیٔ مولا ـــــ اب چلتے ہیں۔

منیرہ : (تیز آواز میں) میں آپ کے ساتھ بیٹھوں نہ بھائی جان؟

جاوید : ہاں!

اماں بی : سامان سارا ٹھیک سے آ گیا بیٹا؟

جاوید : جی اماں بی!

اماں بی : (دھیرے سے) آداب بھائی جان!

میر صاحب : تمھیں سلام کہتی ہیں بھائی

حکیم صاحب : آداب بھائی، آداب ۔ پنجتن پاک کے صدقے میں، اللہ یہ سفر سہل کرے۔

میر صاحب : (بے خیالی میں) ہاں!

حکیم صاحب : تو جا رہے ہو بھائی عنایت حسین؟

میر صاحب : ہاں ـــــ (پھر اپنے آپ سے) الوداع، اے پرانی زندگی، اے زندگی۔

منیرہ : (جاوید سے) بھائی جان ـــــ ہم ایک نئی زندگی کا خیر مقدم کریں ـــــ خوش آمدید نئی زندگی۔

جاوید : (ایکہ بانوں سے) چلو! بڑھاؤ آگے!

(گھوڑے ہنہنا کر ٹاپیں مارتے ہوئے چل پڑتے ہیں۔)

جاوید : آداب چچا جان!

منیرہ : آداب چچا ابا !
حکیم صاحب : جیتے رہو بیٹے، جیتے رہو۔
میر صاحب : تو ہم جاتے ہیں بھائی ــــ
(گھوڑوں کی رفتار تیز تر ہو جاتی ہے)
حکیم صاحب : (بے خیالی میں) چلے گئے ــ سب چلے گئے ــــ
(گھوڑوں کی ٹاپوں کی گونج دور ہوتے ہوتے معدوم ہو جاتی ہے)

فیڈ ان :

حزنیہ موسیقی ــ پس منظر سے گھڑی کی مسلسل ٹک ٹک ٹک ۔ رات کے سناٹے کا تاثر ــــ

جاوید : (سگریٹ جلاتے ہوئے ــ اپنے آپ سے) یہ کیسی چبھن ہے جو رہ رہ کر بے چین کر دیتی ہے۔ اسی روز ــــ ابا نے کہا تھا ! شہر کیا آباد ہوئے کہ گھر اجڑ گئے۔ اس روز نور پور کے درخت، پرندے، ہوائیں اور در و دیوار ــــ سب چپ تھے۔ شاید ان سب کو پتہ تھا کہ اس بستی کا ایک اور گھر اجڑا ــ لیکن ــ لیکن وہ یہ کیوں نہیں سوچتے کہ ایک نیا گھر آباد بھی ہو رہا ہے ــــ آخر ہم سے پہلے بھی کتنوں نے سفر کئے اور ان کے قدموں سے نئی آبادیاں وجود میں آئیں۔ ہمارے گھر میں غفور تو ہے جو ہر شام ڈیوڑھی کے طاق پر ایک چراغ جلا دیا کرے گا ــ ورنہ ــ ورنہ کتنے گھر تو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اندھیرے ہو گئے کہ جوان شہروں میں جا بسے اور بوڑھے زمین کا پیوند بن گئے۔ آگے یہی ہوتا آیا ہے اور آئندہ بھی یہی کچھ ہوتا رہے گا۔ (پس منظر سے گھڑی کی ٹک ٹک ٹک) لیکن ــ ابا کو نیند کیوں نہیں آتی ؟ وہ اب تک جاگ رہے ہیں۔ ابھی تک ــ اور ان کے ساتھ وہ دنیا بھی جاگ رہی ہے جسے، جسے میں سمجھتا تھا کہ ماضی کے کفن نے ڈھک لیا ہے ــــ تو کیا ــــ مر کر بھی لوگ نہیں مرتے ؟ بچھڑ کر بھی لوگ ساتھ رہتے ہیں ۔ بے جان منظر بھی زبان بن جاتے ہیں اور بھولی بسری کہانیاں دوہراتے رہتے ہیں ؟ اس روز نہ ابا نے کھانے کو ہاتھ لگایا، نہ اماں بی نے اور ــــ آخر کوئی بات تھی کہ کبوتروں کی وہ جوڑی بھی جھر کی پیاسی سر نیوڑھائے بیٹھی رہی ــــ تو کیا ــــ ابا سچ کہتے تھے ؟ سچ نہ ہوتا یہ سب تو انھیں نیند کیوں نہ آتی ــــ کوئی تو ہے جو انھیں یوں راتوں کو جگائے رکھتا ہے ــــ وہ اب تک جاگ رہے ہیں اور رات کا

آخری پہر ہے ـــــ اور آج ان کے نئے سفر کا یہ پہلا پڑاؤ ہے۔ لیکن کب تک ـــــ کب تک آنکھیں یونہی کھلی رہیں گی؟ آخر کب تک؟

(پس منظر سے شہر کی بھری پری سڑک کا شور ـــ ہارن ـــ دور سے آتی ہوئی سائرن کی آواز ـــ)

(یہ آواز دھیمی ہوتے ہی منیرہ کی آواز ابھر آتی ہے ـــ)

منیرہ : بھائی جان!

جاوید : (کتاب میز پر رکھتے ہوئے) کیا ہے؟

منیرہ : تم ہر وقت پڑھتے کیا رہتے ہو؟

جاوید : پھر کیا کروں بٹو!

منیرہ : باتیں کرو!

جاوید : کس کی باتیں؟

منیرہ : نور پور کی۔

جاوید : (حیرت سے) نور پور کی باتیں! یہ نور پور ایک دم کیسے یاد آگیا؟

منیرہ : اماں بی کہہ رہی تھیں کہ نور پور میں ہوتے تو آج گڑمبے پکتے۔

جاوید : گڑمبے؟ وہ تو یہاں بھی پک سکتے ہیں۔

منیرہ : وہ تو ہے۔ مگر کیریاں کہاں سے آئیں گی؟

جاوید : بازار سے۔

منیرہ : (ہنس کر) اماں بی کو یہاں کے بازار کی کوئی چیز نہیں بھاتی۔ کہتی تھیں ترکاریوں میں کوئی مزہ نہیں۔

جاوید : غلط نہیں کہا انھوں نے۔

منیرہ : (حیرت سے) آئیں؟

جاوید : ترکاری کے کھیتوں کی سنچائی یہاں شہر بھر کے گندے پانی سے ہوتی ہے۔ جبھی تو ہر چیز بدمزہ ہوتی ہے۔ (سنجیدگی سے) اس شہر کی پرورش غلاظتوں سے ہوتی ہے۔

منیرہ : کیوں؟

جاوید : (سانس بھر کر) بٹو! یہاں تو پینے کو بھی صاف پانی میسر نہیں۔

منیرہ : (لاپروائی سے) ہوگا! ہمیں ایک روز گھما دو۔ ابھی تو ہم نے یہ شہر دیکھا ہی نہیں۔
جاوید : تو میں نے کون سا دیکھا ہے ــــ کہاں چلو گی؟
منیرہ : کہیں بھی!
جاوید : چلو! آج شام کو چلتے ہیں ــــ کوئی اور بھی ساتھ چلے گا؟
منیرہ : کوئی اور کون؟
جاوید : ارے پاس پڑوس میں کسی سے دوستی نہیں ہوئی تمھاری؟
منیرہ : (حیرت سے) اے لو! مجھے تو یہ بھی پتہ نہیں کہ پڑوس میں کون رہتا ہے ــــ کوئی دکھائی ہی نہیں دیتا ــــ ایسا بھرا پرا شہر ہے لیکن محلّے بھر پر ویرانی چھائی رہتی ہے۔ لگتا ہے آدمی نہیں سائے ہیں۔ کھڑکی سے جب بھی باہر دیکھو۔ لوگ سر جھکائے بغل میں بستے یا بریف کیس دبائے تیز تیز بھاگتے نظر آتے ہیں۔
جاوید : (ٹھنڈا سانس بھر کر) سب کو کہیں نہ کہیں پہنچنے کی جلدی ہے۔
منیرہ : کہاں؟
جاوید : (طنزیہ ہنسی کے ساتھ) ان کی منزلیں دور نہیں ہیں ــــ یہی بازار، یا دفتر یا اسپتال یا سینما گھر ــــ یا زیادہ سے زیادہ کسی ریستوراں میں دو چار دوستوں کے ساتھ ایک پیالی چائے کے ساتھ گھنٹے دو گھنٹے کی غپ شپ! اس کے آگے اور کچھ نہیں۔ ایک سے دن۔ ایک سی راتیں ــــ اور اب رات اور دن میں بھید ہی کیا رہ گیا ہے؟
منیرہ : (حیرت سے) بھائی جان!
جاوید : صبح کو بس کے لئے لمبی قطاریں ــــ شام کو پھر ویسی ہی لمبی قطاریں۔ گھر دفتر، دفتر اور گھر ــــ یہاں گھر نام ہے ان سائبانوں کا جن کے نیچے راتیں گزار دی جاتی ہیں اور بس۔ (ہنس کر) اور کتنوں کو تو یہ بھی میسّر نہیں۔
منیرہ (حیرت سے) ہائیں! ہم نے تو یہ دیکھا ہی نہیں۔
جاوید : تم نے ابھی دیکھا کیا ہے۔ شہر کی اصل آبادی یہاں سے دس بارہ میل دور ہے۔ تمھارا کالج یہاں اسی علاقے میں ہے۔ پہلے یہ علاقہ دیہات تھا۔
منیرہ : وہ تو اب بھی ہے!
جاوید : نہیں ــــ اب یہ نہ شہر ہے نہ دیہات۔ یہاں نہ تو شہروں کی بھیڑ بھاڑ ہے، نہ دیہات کا

اکتا دینے والا سکوت ۔ یہ ایک نیا برزخ ہے جبھی تو ابا کو نیند نہیں آتی ۔

منیرہ : نیند نہیں آتی ؟

جاوید : ہاں ـــ وہ جاگتے ہیں اور سوچتے ہیں، سوچتے رہتے ہیں ۔ بہت ہوا تو فجر کی نماز پڑھ کر دریا کنارے جا بیٹھتے ہیں اور بوڑھی آنکھوں سے پانی کی لہریں گنتے رہتے ہیں ـــ

(ہیجان خیز موسیقی ـــ موسیقی کا تاثر دھیما ہوتے ہی ہوا کے جھونکے کا شور اور اس پس منظر میں پانی کی لہروں کے ساحل سے مسلسل ٹکرانے کی آواز ـــ)

فیڈ ان :

حکیم صاحب : سال گزر گیا ۔ (بھرائی ہوئی آواز میں) بھائی عنایت حسین کو نہیں آنا تھا سو نہ آئے ـــ اب کے عزہ داری کا وہ اہتمام بھی نہ ہو سکا ۔ کرتا بھی کون ؟ لوگ چھوٹے چھوٹے غموں میں ایسے الجھے ہیں کہ شبیہہ کربلا کے غم سے دور ہو گئے ۔ اور یہاں ! کیوں نہ ہو ! بھائی عنایت حسین نے روکھی سوکھی کھا کر بھی تیرہ سو برسوں کی اسی روایت کو زندہ کر رکھا تھا غم حسین نے انھیں دنیا کے ہر قسم کے غم سے مستغنی کر دیا تھا بھائی ۔

غفور : (ٹھنڈا سانس بھر کر) لیکن ان کا جی تو اب بھی یہیں اٹکا رہتا ہے ۔ ہے نا حکیم جی !

حکیم صاحب : ہاں میاں غفور ـــ وہ تو ہے ۔ اور کیوں نہ ہو ؟ اپنی مٹی کا بلاوا ایسا ہی ہوتا ہے میاں!

غفور : ادھر کوئی چٹھی آئی ؟

حکیم صاحب : آئی تھی !

غفور : آپ نے مجھے بتایا نہیں ۔

حکیم صاحب : بے دھیانی میں بھول گیا ہوں گا بھائی !

غفور : میرے بارے میں کچھ لکھا ہے حکیم جی ؟

حکیم صاحب : ہاں ـــ تمھیں پوچھا ہے ۔ ویسے پورا خط شہر کے احوال سے بھرا تھا ۔ اس بستی میں جہاں وہ رہتے ہیں کوئی امام بارہ تک نہیں ـــ بس کا ٹکٹ کٹا کر میلوں دور مجلس کے لئے جاتے تھے ۔ میاں اب ہماری عمریں ایسی تو رہیں نہیں کہ بھاگ دوڑ سکیں ۔

غفور : ملکن اور منیرہ بی بی اور جاوید بھیا تو ٹھیک ہیں نا !

حکیم صاحب : ہاں ! (دھیرے سے) سب ٹھیک ہیں ۔

غفور : اور کچھ حکیم جی ؟

حکیم صاحب : اور کیا میاں ! جاوید اور منیرہ کے ناڑے اور کفنیاں بھیجی ہیں پارسل سے۔ ہفتہ دو ہفتہ میں آجائیں گی۔ اب کے سنیچر کو ڈاکیا آئے تو کہہ دینا ذرا دھیان سے پارسل لیتا آئے۔ میں نے جاکر کربلا میں دفن کر دوں گا —— اور ہاں ! کرپی راج ملے تو کہہ دینا کہ بڑے میر صاحب کی قبر پکی کروانی ہے۔ پتھر میں بنوا دوں گا ان کے نام کا۔ بھائی عنایت حسین کی خواہش ہے۔

غفور : آج ہی کہے دیتا ہوں صمد مستری سے۔ منیرہ بی بی اور جاوید بھیا کا کیا حال حکیم جی۔

حکیم صاحب : جاوید اور منیرہ ، دونوں ٹھیک ہیں۔ جاوید میاں کی ترقی ہوگئی ہے۔ پندرہ سو پانے لگے ہیں۔

غفور : (حیرت سے) پندرہ سو ؟

حکیم صاحب : ہاں !

غفور : اتنے میں تو آدمی سونے کی دیوار کھڑی کرے ! ہے نا حکیم صاحب !

حکیم صاحب : (پھیکی ہنسی کے ساتھ) کس دنیا میں رہتے ہو میاں غفور ! اب روپے کی اوقات کیا رہ گئی ہے ؟ بھائی عنایت حسین نے لکھا ہے کہ وہاں آم کی کیری چار روپے سیر بکتی ہے۔ قیامت ہے بھائی۔ آدمی کیا کھائے کیا بچائے ؟ پھر منیرہ کی پڑھائی ہے۔ گھر کا کرایہ ہے۔ تین سو تو اسی پر اٹھ جاتے ہیں جب کہ گھر شہر سے باہر لیا ہے۔

غفور : (حیرت سے) تین سو ؟

حکیم صاحب : اور نہیں تو کیا ؟ لکھا تھا کہ شہر میں دو سو روپے سے کم میں کوٹھری نہیں ملتی۔ ایک ایک کوٹھری میں دس دس نفر رہتے ہیں۔ بھائی عنایت حسین کا گھر تین کمروں کا ہے۔ تس پر ان کا دم گھٹتا ہے۔ نہ دھوپ ، نہ کھلی ہوا ، بے چارے بہت گھبراتے ہیں۔

غفور : پھر لوٹ کر کاہے نہیں چلے آتے حکیم جی ! یہاں تک دک حویلی ہے تو رہنے والے نہیں ! پردیس پردیس ہے۔ اپنی مٹی اپنی ہی مٹی ہوتی ہے حکیم جی ! ہے نا ؟

حکیم صاحب : وہ تو ہے ——

[اچانک پاس کی مسجد سے اذان کی آواز بلند ہوتی ہے۔ اللہ اکبر اللہ اکبر ——
حکیم صاحب ہڑبڑا کر اٹھتے ہیں ——]

حکیم صاحب : اے لو ! عصر کا وقت ہوگیا —— دھوپ سمٹ گئی ہے۔ مجھے باتوں میں دھیان ہی نہیں

رہا ـــــ

[مسجد کی طرف روانہ ہوجاتے ہیں۔ لمحہ بہ لمحہ دور ہوتی ہوئی چاپ ـــ پس منظر سے، اشہدان لاالہٰ الااللہ کی صدا ـــــ معدوم ہوتی ہوئی ـــــ]

فیڈ ان :

سائرن کی چیخ ـــــ ہیجان خیز موسیقی کی ایک لہر

اماں بی : (دور سے) منیرہ ـــــ اے منیرہ !

منیرہ : (دور سے) آئی ممی ! (آتی ہے)

اماں بی : ارے دیکھو تو مل کا بھونپو بج رہا ہے۔ کے بجے کا ہے !

منیرہ : چار بجے کا ـــــ

اماں بی : اے لو ـــ زوال کا وقت ہے۔ میں ایک دم بھول جاتی ہوں۔ دن بھر میں کئی کئی دفعہ تو بجتا ہے۔ میں سمجھی ابھی دو کا وقت ہوگا! سردی کے دن کا کچھ ٹھکانہ ہے ـــــ ابھی صبح ابھی شام ـــــ اب تو جاوید کے آنے کا وقت بھی ہو رہا ہے۔ آج سنیچر ہے نا !

منیرہ : ہاں! آج تو وہ دو بجے چھوٹ جاتے ہیں۔ آرہے ہوں گے۔ دو گھنٹہ تو راستے میں لگ ہی جاتا ہے۔ اگر بس چھوٹ نہ گئی ہو تو !

اماں بی : تمھارے ابا بھی اٹھ گئے ہوں گے۔ نماز وظیفہ پڑھ لیں تو چائے کا پانی رکھوں۔ کھانے کو کچھ ہے نہیں، ذرا دوڑ کر اسٹور سے بسکٹوں کا ایک پیکٹ تو لے لو۔

منیرہ : ابھی لاتی ہوں !

اماں بی : (حسرت سے) کیا کروں بیٹا تمھیں کو بار بار دوڑاتی ہوں۔ سوچا تھا غفور کو بلالوں۔ پھر خیال آیا کہ وہاں کا کیا ہوگا؟ ڈیوڑھی پر کوئی چراغ جلانے والا تو رہے ـــــ

منیرہ : (ہنس کر) تو اس میں کیا بات ہے؟ میں لئے آتی ہوں۔

[منیرہ جاتی ہے۔ دروازہ کھلتا ہے]

منیرہ : (خوشی سے) بھائی جان !

جاوید : (ہنس کر) کیا حال ہے؟ آج کالج سے کب لوٹیں؟

منیرہ : گھنٹہ بھر پہلے ـــــ (دونوں آتے ہیں)

اماں بی : آگئے بیٹا!
جاوید : ہاں! اور خوش خبری سناؤں ؟
اماں بی : کیسی خوش خبری بیٹا ؟
جاوید : وہ جو کمار صاحب تھے نا، وہی جو اس دن آئے تھے میرے دوست! انھیں ہیڈ آفس بھیج دیا گیا۔
اماں بی : کہاں ؟
جاوید : کمپنی کے بڑے دفتر میں ـــــ ان کی ترقی ہوگئی۔
اماں بی : چلے گئے بیچارے ـــــ تم سے تو یارانہ تھا ان کا!
جاوید : ہاں! اب ان کی جگہ مجھے چارج مل گیا ہے!
اماں بی : کیا مطلب ؟
جاوید : (ہنس کر) اونہہ! مطلب یہ کہ اب پھر ترقی ہوگئی ہے میری۔ سال بھر کے اندر اندر دوسری ترقی! بھتہ بڑھ جائے گا کوئی پچاس روپے مہینے!
اماں بی : (بے خیالی میں) تو تمھارا ان کا ساتھ چھوٹ گیا بیٹا!
جاوید : (ہنس کر) ہاں! اس سے تو مجھے ترقی ملی۔ پہلے جس جگہ پر وہ کام کرتے تھے وہی تو خالی ہوئی ہے اماں بی!
(منیرہ سے) اے بٹو! ابی کہاں ہیں! انھیں بھی بتا دو ذرا۔

[جاتا ہے]

جاوید : (دروازے پر رک کر) ابا آجاؤں میں ؟
میر صاحب : (چونک کر، تھکے ہوئے لہجہ میں) کون ؟ جاوید ؟ آؤ آؤ!

[ایک کرسی گھسیٹ کر بیٹھ جاتا ہے]

جاوید : میری ترقی کا پھر ایک موقع نکل آیا ہے۔
میر صاحب : (دھیرے سے) اللہ کا شکر ادا کرو بیٹا!
جاوید : ہوسکتا ہے اگلے برس تک مجھے ٹریننگ کے لئے ملک سے باہر بھیج دیا جائے، شاید چھ مہینے کے لئے لندن میں رہنا ہوگا۔
میر صاحب : کہاں ؟ ولایت ؟

جاوید : ہاں !
میر صاحب : پھر یہاں کا کیا ہوگا ؟
جاوید : یہاں منیرہ تو ہے ہی۔
میر صاحب : (ٹھنڈا سانس بھر کر) ٹھیک ہے بیٹے ! اب لڑکیوں لڑکوں میں فرق ہی کیا رہ گیا ہے ؟ یا پھر ایک کام کیوں نہیں کرتے ؟
جاوید : جی ؟
میر صاحب : منیرہ کو پھر بورڈنگ ہاؤس میں داخل کرا دینا۔ میں اور تمھاری اماں نور پور چلے جائیں گے۔
جاوید : نور پور ؟
میر صاحب : ہاں ! نور پور۔
جاوید : (حیرت سے) وہاں آپ کا جی لگے گا ابّی ؟
میر صاحب : (تڑپ کر) جاوید ——
جاوید : وہاں رکھا کیا ہے ابّی۔ جب ہم تھے تبھی گھر کی ساری چھتیں ٹپکنے لگی تھیں۔ آپ کا جی اچھا نہیں رہتا۔ وہاں آس پاس بھی کوئی ڈاکٹر نہیں۔
میر صاحب : (بیقرار ہو کر) جاوید !
جاوید : آپ ہی سوچیے۔ اس ویرانے میں آپ کیا کریں گے ؟ پھر یہاں جما جمایا گھر اجڑ جائے گا۔
میر صاحب : (اداسی سے) اور وہ جو جما جمایا تھا اس کے اجڑنے کا تمھیں کوئی غم نہیں۔ تمھیں کچھ پتہ نہیں بیٹے کہ جب کوئی پرندہ اپنے جھنڈ سے بچھڑ جاتا ہے تو اس پر کیا گزرتی ہے ؟ تم نے شام کے دھندلکے میں کسی پرندے کو ہراساں اور سرگرداں نہیں دیکھا !
جاوید : ابّی !
میر صاحب : (اسی رو میں) اور اب میری زندگی کی بھی شام ہے۔ نئی جگہ کیسی بھی آرام دہ کیوں نہ ہو نیند مشکل سے آتی ہے۔ نور پور ویرانہ سہی لیکن وہاں رفاقت اور اپنائیت کی وہ مہک ہواؤں میں رچی ہوئی ہے جو سانس کے ساتھ دلوں کو فرحت پہنچاتی ہے۔ تمھیں کیا پتہ بیٹے کہ اس ویرانے میں آج بھی یادوں کے کتنے شہر آباد ہیں !
جاوید : (ہنس دیتا ہے) اوہ ابّی ! میں نے ناحق آپ کو ابھی سے بتا دیا۔ ابھی سال بھر بعد کہیں یہ مسئلہ پیدا ہوگا۔ لیکن ابّی ! آپ بیتے ہوئے دنوں کے بارے میں اتنا کیوں سوچتے ہیں ——

میر صاحب : اور تم صرف آنے والے دنوں کے بارے میں سوچتے ہو! تم اور منیرہ دونوں! اسی لئے اپنے حال سے بے خبر ہو!

جاوید : (دھیرے سے) ہم سب اپنے حال سے بے خبر ہیں ابّی! ہم سب!

میر صاحب : (دھیرے سے) ہاں بیٹے! جبھی تو ہمیں اپنے پڑوسیوں کے نام تک معلوم نہیں! تم اور منیرہ اپنے دن جس دنیا میں گزارتے ہو وہ ہمارے لئے اجنبی ہے۔

جاوید : (جذباتی لہجہ میں) اجنبی تو وہ ہمارے لئے بھی ہے ابّا جی! لیکن اس میں حرج ہی کیا ہے؟

میر صاحب : کوئی حرج نہیں بیٹے! پہلے جینا کچھ رشتوں کے تحفظ سے عبارت تھا۔ اب رشتے ہی کہاں رہ گئے۔ تمھیں اپنے رفاقت چچا کیا یاد ہوں گے ــــ تم بہت چھوٹے تھے جب انھوں نے دنیا چھوڑی۔ ہمارے گھرانے میں وہ پہلے شخص تھے جنھوں نے کالج میں تعلیم پائی اور کلکتے میں ہیڈ ماسٹر لگ گئے۔ سوچو! کہاں کلکتہ کہاں نور پور۔ دو رات دو دن کا سفر تھا۔ تس پر بھی سال کے سال گھر آتے تھے۔ محرم کے دس دن چاہے جو ہو نور پور ہی میں گزارتے تھے۔ انھوں نے کتنا چاہا کہ تمھارے داداجان مرحوم بس ایک بار ان کے ساتھ کچھ روز کلکتہ میں رہ لیں لیکن ابّا نے اپنی ڈیوڑھی نہ چھوڑی۔ اپنی مٹی اپنی ہی مٹی ہوتی ہے بیٹے!

جاوید : اب زندگی بہت مہنگی ہو گئی ہے ابّی!

میر صاحب : (بے خیالی میں) ہر رشتے کو قایم رکھنے کے لئے کچھ نہ کچھ ایثار کرنا پڑتا ہے بیٹے، کچھ قیمت چکانا پڑتی ہے۔ تمھیں کیا پتہ بیٹے کہ تم دونوں کے لئے ہم نے کیا قیمت چکائی ہے۔ (اچانک کھانسنے لگتے ہیں۔ سانس پھولنے لگتا ہے) زندگی شاید اسی مفاہمت کا دوسرا نام ہے۔

جاوید : (اداسی سے) ابّا جی!

میر صاحب : (ہانپتے ہوئے) میں کیا کروں بیٹے! وہ ساری بے جان اشیا جنھیں اپنے پیچھے چھوڑ آیا تھا رات دن مجھے پکارتی ہیں۔ بے نشان قبریں، عزا خانے کے در و دیوار صحن میں کھڑا ہوا نیم کا وہ درخت ــــ سب کے سب زبانوں میں ڈھل گئے ہیں۔ تمھاری اماں نے مہندی کا جو پودا لگایا تھا اس میں اب کتنی پتیاں آگئی ہوں گی۔ کہتی تھیں یہ پودا منیرہ کے لئے ہے۔

جاوید : (اداسی سے) ابّا جی!

میر صاحب : کبوتروں کی وہ جوڑی تمھیں یاد ہے؟ اور لیموں کا وہ پیڑ جس کے پھولوں کی ترش مہک

سے رات کو سارا گھر بھر جاتا تھا ــــ تمھیں شاید کچھ بھی نہیں یاد رہ گیا۔

جاوید : مجھے کچھ بھی یاد نہیں آبا جی !

میر صاحب : (افسردہ ہنسی کے ساتھ) اس میں تمھاری کچھ بھی غلطی نہیں بیٹے! تم ان لمحوں میں زندگی گزار رہے ہو جو میرے کمزور بازوؤں کی دسترس سے بہت دور ہیں۔ اور میں اب تک ان لمحوں کی گرفت میں ہوں جو شاید تمھارے نزدیک بیتے موسموں کا قصہ بن چکے ہیں ــــ اب تو بس ایک ہی دعا ہے۔ بس ایک دعا کہ مولا مشکل کشا اس مشت خاک کو بزرگوں کی مٹی کا حصہ بنا دیں ــــ

جاوید : (گھبرا کر) اپنے آپ کو اتنا ہلکان نہ کیجیے ابی! ہم سب نور پور چلے چلیں گے۔ ہم سب! میں نوکری چھوڑ دوں گا ــــ منیرہ اپنی پڑھائی ختم کر دے گی ــــ ہم لوٹ چلیں گے آپ کے ساتھ انھیں ویرانوں، کھیتوں اور باغوں کی طرف !

میر صاحب : (سخت گیر لہجے میں) نہیں! ہرگز نہیں۔ جب تک میری آنکھوں میں زندگی کی ہلکی سی رمق بھی باقی ہے میں تمھارے ساتھ چلتا رہوں گا۔ میں اور تمھاری اماں! ہم دونوں تمھارے ساتھ رہیں گے ــــ افسردگی سے لیکن ہم کریں بھی کیا بیٹے! ہم اپنے کانوں کو اس جانی پہچانی صدا کی طرف سے بند تو نہیں کر سکتے ــــ اس شور شرابے میں وہ صدا اور صاف ہو جاتی ہے۔

[ہیجان خیز موسیقی کی ایک لہر ــــ
فیڈ آؤٹ]

فیڈ ان :

حکیم صاحب چھڑی ٹیکتے ہوئے مسجد کی طرف جاتے ہیں۔

غفور : (پیچھے سے آواز دیتا ہے) حکیم جی! حکیم جی ! (حکیم جی رک جاتے ہیں)

حکیم صاحب : کیا ہے بھائی غفور !

غفور : یہ لیو خط۔ ابھی ڈاکیہ دے گیا ہے۔

حکیم صاحب : کس کا خط ہے ؟ دیکھوں !

غفور : آپ کا اور کس کا !

عشرت : (لفافہ کھولتے ہوئے) اوہ! منیرہ کی چٹھی ہے۔ عشرت کے نام!

غفور : عشرت بی بی کے نام! تو لاؤ گھر میں دے آؤں!

[حکیم صاحب چھڑی ٹیکتے ہوئے آگے بڑھ جاتے ہیں۔ غفور حکیم صاحب کے دروازے پر دستک دیتا ہے]

عشرت : (اندر سے) کون؟

غفور : یہ میں ہوں! گفور! چٹھی لے لیو بی بی اپنی! (عشرت بھاگتی ہوئی آتی ہے)

عشرت : لاؤ! ابا کہاں گئے ــــ

غفور : مسجد ــــ دیکھو! سب ٹھیک ٹھاک ہے نا! حکیم جی بتاتے رہے تھے کہ منیرہ بی بی کی چٹھی ہے!

[عشرت خط لے لیتی ہے۔ چند ثانیوں کی خموشی کے بعد]

عشرت : سب ٹھیک ہے۔ سب اچھی طرح ہیں۔

غفور : ہم کو بھی پوچھا ہے۔

عشرت : ہاں! سب ٹھیک ہے۔ تمھیں بھی پوچھا ہے۔ سلام لکھا ہے۔

غفور : اور کیا لکھا ہے بی بی؟

عشرت : (اکتاکر) ذرا اچھی طرح پڑھ تو لوں ــــ (وقفہ) ارے واہ! منیرہ تو اب نوکری کرنے لگی ہے۔ اسکول میں۔ پانچ سو ملتے ہیں۔ (وقفہ) اور سب ٹھیک ہے۔

[غفور چلا جاتا ہے]

عشرت : (خط پڑھتے ہوئے) کتنا جی چاہتا ہے عشرت کہ تو بھی یہاں ہوتی۔ صبح اسکول چلی جاتی ہوں۔ شام کو آتی ہوں۔ دن بھر ابّی اور اماں جی دونوں اکیلے رہتے ہیں۔ اماں جی اب دن بھر سلمی ستارے کے بٹوے ٹانکتی رہتی ہیں۔ یہاں بڑی مانگ ہے ایسی چیزوں کی۔ چار سو تک بِک جاتی ہیں۔ بھیا کا ارادہ یہیں زمین خریدنے کا ہے۔ ابا اب بھی اسی حال میں ہیں۔ تم سب کو ہم سب بہت یاد کرتے ہیں۔ چچا اور چچی کی خدمت میں آداب۔ خط جلد لکھو اور یہ تو لکھو کہ تم ہمارے یہاں کب آرہی ہو۔ کیا چچا چچی تمھیں اکیلے کچھ دن یہاں رہنے کی اجازت دے دیں گے۔ (وقفہ)

[پس منظر سے حکیم جی کے پیروں کی چاپ اور چھڑی ٹیکنے کی آواز]

حکیم صاحب : یہ نہیں ہو سکتا۔ غضب ہے۔ شہر کیا گئے کہ ساری شرم و حیا اٹھا کر طاق پر رکھ دی۔ لکھ دو کہ اب تمھارے نام چٹھی بھی نہ آئے۔ میں بھی بھائی عنایت حسین کو لکھتا ہوں! اور یہ بھابی کو کیا ہو گیا آخر؟ میں کہتا ہوں خاندان کی آبرو بھی کوئی چیز ہوتی ہے ——

[آواز سن کر حکیم جی کی بیوی بھاگی ہوئی آتی ہیں]

عشرت کی ماں : یہ کیا ہو گیا بھلا، کچھ بتائیے تو!

حکیم صاحب : (اسی انداز میں بڑبڑاتے ہوئے) بتاؤں کیا عشرت کی ماں۔ یہ سارا فساد بھابی کی وجہ سے ہوا۔ بھائی عنایت حسین ہرگز جانے پر آمادہ نہ ہوتے۔ انھیں نے اکسایا ہوگا!

عشرت کی ماں : کیوں ناحق ان بے چاری پر تہمت رکھتے ہیں۔ عورت ذات۔ جاوید کے آگے ان کی کیا چلتی۔

حکیم صاحب : بس رہنے دو۔ بڑے بن رہے وہاں۔ بچے جا رہے ہیں۔ نہ جانے کن نامحرموں کے ہاتھ میں جاتے ہوں گے ان کے بڑے۔ لو پڑھو لو یہ خط —— کہاں ہے وہ خط؟ عشرت!

عشرت : جی ابا —— یہ ہے!

حکیم صاحب : لو دیکھو! کیا لکھا ہے منیرہ نے! اپنے گھر پر ان کا اختیار ہے۔ جیسے چاہیں رہیں، جو چاہیں کریں۔ لیکن میں کہتا ہوں یہ عشرت کو کیوں ورغلایا جا رہا ہے۔

(وقفہ)

عشرت کی ماں : تو ایسی کیا قیامت ٹوٹ پڑی۔ خط میں ویسی کون سی بات ہے۔ منیرہ نے عشرت کو اپنے گھر بلایا ہے۔ لکھ دیجئے نہیں جائے گی۔ قصہ ختم۔

حکیم صاحب : ہاں لیکن، میں کہتا ہوں۔ بڑے بنا کر بھیجنے کا کیا مطلب؟ آئیں!

عشرت کی ماں : (جھنجھلا کر) مطلب کیا ہے؟ بڑا شہر ہے، بڑے خرچے ہوں گے۔ اگر اوپر کی یافت ہو جاتی ہے تو اس میں برائی ہی کیا ہے؟ پھر ہم کوئی خدائی ٹھیکیدار ہیں۔

حکیم صاحب : (ایک ثانیے کی خموشی کے بعد) نہیں۔ ہم ٹھیکیدار نہیں ہیں۔ مگر یہ یافت یافت —— آخر اس کا مطلب کیا ہے؟ (دھیرے سے) بھائی عنایت حسین تو ایسے نہیں تھے۔ یہ ہوس آدمی کو کہیں کا نہیں رکھے گی —— خیر —— ہوگا —— میں آج ہی انھیں لکھتا ہوں کہ آئندہ کے لئے منیرہ کو سمجھا دیں۔ ہمارے حال پہ رحم کریں —— دنیا بدل گئی سو بدل گئی ہوگی۔ ہمیں کیا؟ (بڑبڑاتے ہوئے) ہمیں کسی سے کیا لینا! ہمیں کیا؟

[چھڑی ٹیکتے ہوئے باہر نکل جاتے۔ چاپ دھیرے دھیرے دور ہوتی جاتی ہے] (وقفہ)

فیڈ ان :

[رات کا سناٹا۔ اس سناٹے میں دور سے آتی ہوئی کتوں کے بھونکنے کی آواز]

جاوید : سگریٹ جلاتے ہوئے ابا کے کمرے کی بتی ابھی جل رہی ہے۔ اجنبی راتوں کے دیار میں ان کی آخری بیداری۔ انھوں نے ہماری بات نہیں مانی! نہ اس پر تیار ہوئے کہ ہم سب ان کے ساتھ چلے جائیں، لوٹ جائیں انھیں ویرانوں کو جو دن رات ان سے ہم کلام رہتے ہیں۔ یہ کیسی زنجیر ہے جو ٹوٹتی ہی نہیں۔ شاید وہ خود اس قید کے ساتھ زندہ رہنا چاہتے ہیں — لیکن — بیتے دنوں کی بات اتنی طاقت ور کیسے ہو جاتی ہے کہ حال اور مستقبل کے ہر لمحے کو اس طرح اپنی کمندوں میں جکڑے — لیکن — قیدی تو ہم سب ہیں، حالات کے امیدوں کے، ان دیکھے سنہرے خوابوں کے۔ ابا جی جس لمحے کے زندانی ہیں وہ ہمارے لئے افسانہ ہے، ان کے لئے حقیقت۔ ہم جس ساعت آئندہ کی سمت آنکھیں اٹھائے ہوئے ہیں وہ ان کے نزدیک واہمہ ہے، ہمارے لئے سچائی — یہ تو ٹھیک ہے۔ مگر، یہ کیسا فرق ہے، یہ کیسا فاصلہ ہے۔ ان کے لئے وہی حقیقت سکون بخش ہے۔ اور ہم جس سچائی کی تلاش میں سرگرداں ہیں ہمارے لئے وہ کتنی اضطراب آسا ہے؟ (سگریٹ جلاتا ہے)

[پس منظر سے حزنیہ موسیقی۔ جس کا خاتمہ صبح کے تاثر پر ہوتا ہے]

منیرہ : (دروازے پر دستک دیتے ہوئے) ابّی! ابّی!

میر صاحب : (اندر سے) کون، منیرہ!

منیرہ : جی ابّی!

[میر صاحب جمائی لیتے ہوئے اٹھتے ہیں۔ دروازہ کھولتے ہیں]

منیرہ : آپ کا جی تو ٹھیک ہے ابّی؟

میر صاحب : (بڑبڑا کر) اوہ ہاں ہاں! کیا بہت دیر ہو گئی۔ رات دیر سے نیند آئی۔ جاوید بھیا کہتے تھے کہ روز ہی آپ دیر سے سوتے ہیں۔

منیرہ : (پھیکی ہنسی کے ساتھ) وہ تو ٹھیک ہے مگر صبح کاذب کے ساتھ ہی آنکھ کھل جاتی ہے۔ رات نہ جانے کیا ہوا — سامان تو بندھ گیا نا!

میر صاحب : (دھیرے سے) ہاں!

میر صاحب : جاوید کہاں ہے ؟
منیرہ : ناشتہ کر رہے ہیں ۔ آپ بھی منہ ہاتھ دھو کر تیار ہو جائیے ۔
میر صاحب : گاڑی کے بجے جاتی ہے ؟
منیرہ : دس پر ـــــ ابھی سات بجے ہیں ۔
میر صاحب : ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے ۔ میں ذرا منہ ہاتھ دھو لوں ۔ نماز قضا ہو گئی ۔

[دروازے سے باہر نکل جاتے ہیں]

[وقفہ]

جاوید : (منیرہ سے) ابا جی تیار ہو گئے ۔
منیرہ : ہاں !
جاوید : ذرا جلدی سے ان کا سامان تو باندھ دو بھئی !
منیرہ : سامان بندھ گیا ـــــ
اماں جی : (دور سے) جاوید بیٹا !
جاوید : آیا امی ! (جاتا ہے)
اماں جی : (روہانسی ہو کر) مجھے ہول ہو رہا ہے بیٹا ۔ ذرا تو نے خواب دیکھتی رہی ۔ اکیلے وہاں کیسے رہیں گے ؟
جاوید : (بھرائی ہوئی آواز میں) کچھ ہی دنوں کا تو معاملہ ہے امی ۔ منیرہ کو ملازمت پیشہ لڑکیوں کے ہوسٹل میں جگہ مل جائے تو آپ بھی چلی جائیے گا !
اماں جی : کب تک ؟
جاوید : شاید اگلے مہینے تک ! میں آج پھر پتہ لگاؤں گا جا کر
اماں جی : اور پھر تمہارا کیا ہوگا !
جاوید : (پھیکی ہنسی کے ساتھ) آپ ناحق پریشان ہوتی ہیں ۔ مجھے کوئی تکلیف نہ ہوگی امی ! آپ فکر نہ کیجئے ۔ خدا نے چاہا تو دو مہینے بعد ـــــ
اماں جی : کیا ؟ دو مہینے بعد کیا ہوگا ؟
جاوید : گھر کی بنیادیں رکھوا دوں گا ! ٹھیکے دار سے بات کر لی ہے ۔ بس ذرا فنڈ کے پیسے نکل آویں ۔

اماں جی : عزا خانے کی گنجائش بھی نکل آئے گی !

جاوید : (ایک ثانیے کی خموشی کے بعد) اوہ، ہاں —— شاید —— ورنہ کیا ہے ! سال کے سال نورپور آجاؤں گا —— (بات بدل کر) منیرہ ! امّی جی کا بستر بندھ گیا ——

منیرہ : (گھبرا کر) ارے بستر تو رہ ہی گیا ——

[میر صاحب چھڑی ٹیکتے ہوئے آتے ہیں]

میر صاحب : میرا تکیہ الگ کر دینا بیٹا !

منیرہ : (حیرت سے) جی ابّی !

میر صاحب : تکیہ الگ کر دینا۔ بس توشک لحاف باندھ دو !

اماں جی : وہاں نورپور میں کون سا تکیہ رکھا ہوگا ؟

میر صاحب : (پرخیال انداز میں) وہ تکیہ یہاں لاؤ !

[منیرہ جاتی ہے تکیہ لے آتی ہے]

میر صاحب : تمھیں یاد ہوگا بیٹے ! نورپور سے چلتے وقت دروازے کی مٹی سمیٹ کر پلو میں باندھ لی تھی۔ پھر کسی کو یاد نہ رہا۔ میں نے اس مٹی کی پوٹلی اس تکیے میں سل دی تھی —— (وقفہ) اب تم جس دن اپنے گھر کی بنیاد ڈالنا یہ مٹی وہیں دفن کر دینا۔ اور یاد رکھنا کہ نئے گھر میں چھوڑی ہوئی بستی کا پیوند بھی شامل ہے —— بھولنا مت —— (وقفہ)

میر صاحب : چلو بیٹے !

[جاوید اور میر صاحب باہر نکلتے ہیں —— چھڑی کے فرش سے مسلسل ٹکرانے کی آواز]

منیرہ : (اداسی سے) خدا حافظ ابّی !

میر صاحب : (بھرائی ہوئی آواز میں) خدا حافظ !

اماں جی : (گلوگیر لہجے میں) میں اگلے مہینے تک آجاؤں گی ! آجاؤں گی !

میر صاحب : خدا حافظ !

[ٹیکسی اسٹارٹ ہوتی ہے۔ ہارن —— فیڈ آوٹ]

فیڈ ان :

[ہوا کا ایک پرشور جھونکا۔ پتّے کھڑکھڑاتے رہیں۔ گھوڑے کی مسلسل ٹاپیں اور گھ

میں بندھی گھنٹیوں کی گونج ـــــ دور سے آتی ہوئی کسی پرندے کی آواز ـــــ

غفور : (دور سے) ارے، بڑے بھیا! (خوشی سے) بڑے بھیا!

[اکہ رکتا ہے۔ گھنٹیاں بج کر ساکت ہو جاتی ہیں]

میر صاحب : اچھے تو رہے غفور!

غفور : (گھبرائے ہوئے لہجے میں) اِن بڑے بھیا! اور سب کہاں ہیں؟ ملکن کہاں ہیں؟

میر صاحب : جاوید کے پاس! (بات بدل کر) سامان تو اتر والو!

غفور : کوئی چٹھی تو بھیج دیتے بڑے بھیا۔ میں بس اڈے پر آ کے جاتا۔

میر صاحب : کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔ واپسی کا سفر تھا۔

غفور : آپ اندر چلیں۔ میں حکیم جی کو خبر کر دیوں۔

میر صاحب : بتا دو انھیں جا کر! میں یہیں ہوں! انھیں دیکھ لوں تو اندر آ جاؤں۔

[غفور جاتا ہے]

[وقفہ]

[حکیم صاحب چھڑی ٹیکتے ہوئے آ رہے ہیں]

حکیم صاحب : (دور سے) آ گئے بھائی عنایت حسین! (چھڑی ٹیکتے ہوئے قریب آتے جاتے ہیں)

میر صاحب : ہاں، آ گئے بھائی ـــــ (چھڑی ٹیکتے ہوئے ان کی طرف بڑھتے ہیں)

حکیم صاحب : (بے یقینی کے انداز میں) تو آ گئے بھائی عنایت حسین!

میر صاحب : ہاں بھائی ـــــ

[پس منظر سے ہوا کا شور۔ اس میں ملی جلی پرندوں کے چہچہے کی آواز]

حکیم صاحب : مبارک ہو بھائی! آؤ پہلے گھر چلتے ہیں۔

[دونوں ساتھ ساتھ بوجھل قدموں سے آگے بڑھتے ہیں، چھڑی ٹیکتے ہوئے۔]

اختتامیہ موسیقی ـــــ فیڈ آؤٹ ☐

فاروق شفق

کل کا منظر نامہ

ہواؤں کے سینے پہ کب تک
میں انگلی سے لکھوں
میں کب تک زباں اپنی خاموش رکھوں
میں کب تک سمندر کی پرشور گہرائی میں ڈوبنے اور
ابھرنے کا کرتب دکھاؤں
زمینوں کے اور آسمانوں کے وہ رازِ پنہاں
ازل میں جنھیں مجھ کو سونپا گیا تھا
انھیں اب اٹھانے کی مجھ میں سکت بھی نہیں ہے
ہوا کی یہ تیزی
ہوا کی یہ تندی
کڑکتی ہوئی دھوپ کی تیز برچھی
بدن کے مساموں میں چبھتی ہوئی برف کی تیز سوئی
کڑی بارشوں میں
ہر اک لمحہ گھلتی بدن کی یہ مٹی
ہمیں سب کی زد پر
ہمیں سب کا لقمہ
خلا لمحہ لمحہ
مرے سوکھے سینے کا بڑھتا چلا جا رہا ہے
میں وہ راز اب تک
جنھیں اپنے سینے میں محفوظ رکھے ہوئے ہوں
بہت مضطرب ہیں نکلنے کو باہر
اب اس بوجھ سے میرے بچنے کی صورت یہی ہے
میں گذرے ہوئے خشک موسم کی پتی
ہاتھ میں آنے والی رتوں کے تھما دوں
زمیں، آسماں، چاند، سورج، ہوا
سمندر، پہاڑوں کے یہ سلسلے
سب کے کانوں میں اک دوسرے کا ہر اک راز کہہ دوں
پھر آپس میں اک دوسرے کو لڑا دوں
اور سالم نکل جاؤں میں درمیاں سے

فاروق شفق

سونے سے پہلے کا اک منظر

ابھی کچھ ہی پل میں
ایک بے نام خاموش آندھی چلے گی
ستارے پگھل کر سیہ پانیوں میں گریں گے
زمیں پر سیہ، زرد چادر تنے گی
ہر اک سطح روئے زمیں کی
انھیں سے بھی دیکھیں
بس اک جیسا منظر دکھائی پڑے گا
اندھیرے میں تحلیل ہو جائیں گے بام و در سب
زمیں سے لگے سارے منظر ملیں گے
ہر اک شخص کو
ایک بے جان، ہموار ٹکڑا زمیں کا ملے گا
بدن، دست و پا کا نشاں تک نہ ہوگا
یہاں سے وہاں تک
فقط سبز آنکھیں ہی گردش کریں گی
ہر اک شخص دیکھے گا اک دوسرے کو
نہ حرکت کرے گا نہ لب ہی ہلیں گے
ابھی
بس ذرا دیر میں
ٹھیک سونے سے پہلے
ایک بے نام خاموش آندھی چلے گی

فاروق شفق

کل کا منظر نامہ

ہواؤں کے سینے پہ کب تک
میں انگلی سے لکھوں
میں کب تک زباں اپنی خاموش رکھوں
میں کب تک سمندر کی پرشور گہرائی میں ڈوبنے اور
ابھرنے کا کرتب دکھاؤں

زمینوں کے اور آسمانوں کے وہ رازِ پنہاں
ازل میں جنھیں مجھ کو سونپا گیا تھا
انھیں اب اٹھانے کی مجھ میں سکت ہی نہیں ہے
ہوا کی یہ تیزی
ہوا کی یہ تندی
کڑکتی ہوئی دھوپ کی تیز برچھی
بدن کے مساموں میں چبھتی ہوئی برف کی تیز سوئی
کڑی بارشوں میں
ہر اک لمحہ گھلتی بدن کی یہ مٹی
ہمیں سب کی زد پر
ہمیں سب کا لقمہ
خلا لمحہ لمحہ
مرے سوکھے سینے کا بڑھتا چلا جا رہا ہے
میں وہ راز اب تک
جنھیں اپنے سینے میں محفوظ رکھے ہوئے ہوں
بہت مضطرب ہیں نکلنے کو باہر
اب اس بوجھ سے میرے بچنے کی صورت یہی ہے
میں گذرے ہوئے خشک موسم کی پتی
ہاتھ میں آنے والی رتوں کے تھما دوں
زمیں، آسماں، چاند، سورج، ہوا
سمندر، پہاڑوں کے یہ سلسلے
سب کے کانوں میں اک دوسرے کا ہر اک راز کہہ دوں
پھر آپس میں اک دوسرے کو لڑا دوں
اور سالم نکل جاؤں میں درمیاں سے

فاروق شفق

سونے سے پہلے کا اک منظر

ابھی کچھ ہی پل میں
ایک بے نام خاموش آندھی چلے گی
ستارے پگھل کر سیہ پانیوں میں گریں گے
زمیں پر سیہ، زرد چادر تنے گی
ہر اک سطحِ روئے زمیں کی
کہیں سے بھی دیکھیں
بس اک جیسا منظر دکھائی پڑے گا
اندھیرے میں تحلیل ہو جائیں گے بام و در سب
زمیں سے لگے سارے منظر ملیں گے
ہر اک شخص کو
ایک بے جان، ہموار ٹکڑا زمیں کا ملے گا

بدن، دست و پا کا نشاں تک نہ ہوگا
یہاں سے وہاں تک
فقط سبز آنکھیں ہی گردش کریں گی
ہر اک شخص دیکھے گا اک دوسرے کو
نہ حرکت کرے گا نہ لب ہی ہلیں گے
ابھی
بس ذرا دیر میں
ٹھیک سونے سے پہلے
ایک بے نام خاموش آندھی چلے گی

سید احمد شمیم

غزلیں

میں گزر جاؤں گا آگے، راستہ رہ جائے گا
میرے پیچھے حادثوں کا سلسلہ رہ جائے گا
پیکرِ الفاظ بے صوت وصدا رہ جائے گا
خون کا ہر قطرہ بدن میں چیختا رہ جائے گا
میں کبھی ہو جاؤں گا بس نام اک بھولا ہوا
ہاں ترے پلکوں میں عکسِ حادثہ رہ جائے گا
وہ جو گذرا تھا یہاں سے اب نہ لوٹے گا کبھی
اونگھتا دروازہ ساری شب کھلا رہ جائے گا
کوئی رت آئے مقدر ہے لباسی ہے شمیم
اس شجر پر جیت کا موسم سدا رہ جائے گا

کبھی جو شب گیلی ہو گئی ہے
تو صبح چمکیلی ہو گئی ہے
ابھی تھی منھ بند اک کلی وہ
کھلی تو بھڑکیلی ہو گئی ہے
گھٹا ابھی اٹھی ہے مست ہو کر
ندی بھی جوشیلی ہو گئی ہے
ہوا میں بجنے لگی ہے پایل
بہار البیلی ہو گئی ہے
دراز پلکوں کا ذکر آیا
تو بات نوکیلی ہو گئی ہے
سوال سننے سے پہلے ہی کیوں
نگاہ شرمیلی ہو گئی ہے
شمیم کوئی غزل سناؤ
کہ رات زہریلی ہو گئی ہے

ھار عابد

۵۰/۱۰۱ کرنیل گنج، کانپور، یو۔پی۔

غزلیں

، دشت نہ دریا نہ اک سراب تھا میں
جو آنکھ تو دیکھا کہ بے نقاب تھا میں
بچے دانہ تھے آنکھوں کے وہ بھی کرتا کیا
ں نواح میں بھٹکا ہوا سا خواب تھا میں
ہمت سمیٹے تھا اپنی باہوں میں
رخ سے زمانے میں کامیاب تھا میں
جو جسم سے باہر تو دیکھتا کیا تھا
کے ہاتھ میں بکھری ہوئی کتاب تھا میں
ب لمحہ تھا جس نے کہ پاش پاش کیا
بتِ بحر کی موجوں کا اضطراب تھا میں
ے وجود کی آخر بساط ہی کیا تھی
جھپکتے ہوا گم وہ نقشِ آب تھا میں
سکا نہ مرے سر سے بے حسی کا بوجھ
کے سینے پہ یعنی بہت عذاب تھا میں
ہ رنگِ تصرف کا پیرہن عابد
نگاہ میں جیسے شئے خراب تھا میں

لمحوں کی سرخ و زرد ہوائیں عجیب تھیں
رنگوں میں بانٹنے کی سزائیں عجیب تھیں
بے چہرہ گردنوں کو لیے پھر رہے تھے لوگ
رکھتی نہ تھیں جواز خطائیں عجیب تھیں
بے نور آسماں تھا بے رنگ تھی زمیں
ہونٹوں پہ تھرتھراتی دعائیں عجیب تھیں
یوں ہی پکار اٹھا تھا پہاڑوں کے درمیاں
ٹکرا کے جو کبھی آئیں صدائیں عجیب تھیں
چاروں طرف مکان کے سیلن تھی داغ داغ
سورج کے راستے میں گھٹائیں عجیب تھیں
باندھے تھے کیا طلسم خلاؤں کے آئینے
پرچھائیاں تھیں سر پہ فضائیں عجیب تھیں
ہر بارِ ہفت رنگ پہ عابد تھا اختیار
موسم کی مٹھیوں میں بلائیں عجیب تھیں

سید احمد شمیم

غزلیں

میں گزر جاؤں گا آگے، راستہ رہ جائے گا
میرے پیچھے حادثوں کا سلسلہ رہ جائے گا
پیکرِ الفاظ بے صوت و صدا رہ جائے گا
خوں کا ہر قطرہ بدن میں چیختا رہ جائے گا
میں کبھی ہو جاؤں گا بس نام اک بھولا ہوا
ہاں ترے پلکوں میں عکسِ حادثہ رہ جائے گا
وہ جو گذرا تھا یہاں سے اب نہ لوٹے گا کبھی
اونگھتا دروازہ ساری شب کھلا رہ جائے گا
کوئی رت آئے مقدر بے لباسی ہے شمیم
اس شجر پر جیت کا موسم سدا رہ جائے گا

کبھی جو شب گیلی ہو گئی ہے
تو صبح چمکیلی ہو گئی ہے
ابھی تھی منہ بند اک کلی وہ
کھلی تو سج کر کیلی ہو گئی ہے
گھٹا کبھی اٹھی ہے مست ہو کر
ندی کبھی جوشیلی ہو گئی ہے
ہوا میں بجنے لگی ہے پایل
بہار البیلی ہو گئی ہے
دراز پلکوں کا ذکر آیا
تو بات نوکیلی ہو گئی ہے
سوال سننے سے پہلے ہی کیوں
نگاہ شرمیلی ہو گئی ہے
شمیم کوئی غزل سناؤ
کہ رات زہریلی ہو گئی ہے

مبارک شمیم

اظہار عابد

۵۰/۱۰۱ کرنیل گنج، کانپور، یو۔پی۔

غزلیں

پہاڑ، دشت نہ دریا نہ اک سراب تھا میں
کھلی جو آنکھ تو دیکھا کہ بے نقاب تھا میں

دریچے وا نہ تھے آنکھوں کے وہ بھی کرتا کیا
نفس نژاد میں بھٹکا ہوا سا خواب تھا میں

چہار سمت سمیٹے تھا اپنی بانہوں میں
تمام رخ سے زمانے میں کامیاب تھا میں

ہوا جو جسم سے باہر تو دیکھتا کیا تھا
ہوا کے ہاتھ میں بکھری ہوئی کتاب تھا میں

عجیب لمحہ تھا جس نے کہ پاش پاش کیا
سکوتِ بحر کی موجوں کا اضطراب تھا میں

مرے وجود کی آخر بساط ہی کیا تھی
پلک جھپکتے ہوا گم وہ نقشِ آب تھا میں

اتر سکا نہ مرے سر سے بے حسی کا بوجھ
زمیں کے سینے پہ یعنی بہت عذاب تھا میں

دیا نہ رنگِ تصرف کا پیرہن عابد
تری نگاہ میں جیسے شئے خراب تھا میں

لمحوں کی سرخ و زرد ہوائیں عجیب تھیں
رنگوں میں بانٹنے کی سزائیں عجیب تھیں

بے چہرہ گردنوں کو لیے پھر رہے تھے لوگ
رکھتی نہ تھیں جواز خطائیں عجیب تھیں

بے نور آسماں تھا بے رنگ تھی زمیں
ہونٹوں پہ تھرتھراتی دعائیں عجیب تھیں

یوں ہی پکار اٹھا تھا پہاڑوں کے درمیاں
ٹکرا کے جو کبھی آئیں صدائیں عجیب تھیں

چاروں طرف مکان کے سیلن تھی داغ داغ
سورج کے راستے میں گھٹائیں عجیب تھیں

باندھے تھے کیا طلسم خلاؤں کے آئینے
پرچھائیاں تھیں سر پہ فضائیں عجیب تھیں

ہر بادِ ہفت رنگ پہ عابد تھا اختیار
موسم کی مٹھیوں میں بلائیں عجیب تھیں

غزلیں

سلطان شاہد

تشنگی بے قرار ہے یارب
ہر طرف انتشار ہے یارب
پھول پتے زمیں پہ گرتے ہیں
سبز موسم کی ہار ہے یارب
گھر میں آتی تھی خوشبوئیں لے کر
اب ہوا میں غبار ہے یارب
دور تک منظروں میں بے رنگی
دور تک ریگ زار ہے یارب
پاؤں میں تھکن کی زنجیریں
سر پہ سورج سوار ہے یارب
خواب کی مسکراتی پریوں پر
اب کے اختیار ہے یارب
اس صدی میں ہمارے جینے کا
واقعہ یادگار ہے یارب
قید ہیں اپنے دائروں میں سبھی
تو بھی سرحد کے پار ہے یارب
ایک جگنو ہی کالی شب میں بھیج
ہر طرف انتظار ہے یارب

عبد الحمید

طاقِ آئینہ پہ اک آنکھ دھری کب سے ہے
پوچھیئے کس سے کہ حیراں نظری کب سے ہے
اب تبسم کو مرے لوگ سمجھتے ہیں فریب
ٹوٹ جانے پہ بھی یہ شاخ ہری کب سے ہے
جب کھلی آنکھ کسی شخص سے پوچھا میں نے
پچھلی منزل پہ یہاں نوحہ گری کب سے ہے
ہم سے مت پوچھ کہ ہم بھول چکے ہیں اب تو
اے ہوا! تو ہی بتا تو سفری کب سے ہے

ایڈیٹر "آہنگ"
جنگ جیون روڈ، گیا

...ری، فروری ۷۹ء

...لام حیدری

الف ۔ لام ۔ میم ۔

کھڑکیاں بند ہیں، کواڑ بند ہے، سفر جاری ہے، دو رفتار، تین رفتار —— زمین کی اپنی رفتار ہے، اس ٹرین کی اپنی رفتار ہے اور میرا ذہن ...

جو بات کرنے کو جی چاہے اور بے اختیار چاہے، اور زبان نہ کھلے —— اور زبان نہ کھلے، ...ر بات کرنے کو جی چاہے، اور ایسا کہ بات نہ کرکے —— لب نہ کھول کر جرم کر رہا ہوں، تو کیا کرنا ...ہیے؟ کیا کرنا چاہیے؟

چپ رہو —— چپ رہو، کیونکہ لب کھولنے کا سلسلہ دار تک چلا جاتا ہے،
اور چپ ہونے کا سلسلہ بزدلی سے شروع ہوتا ہے ... بزدلی تک چلا جاتا ہے ——
چپ رہو ... کیونکہ چپ رہ کر ...

ایک جرم وہ ہوتا ہے، جو آدمی خود کرتا ہے اور خود ہی اپنے آپ کو سزا دیتا ہے، اسے برداشت ...چاہیئے، خود سہہ لو ... خود جھیل جاؤ ... چپ رہو ...

سو چپ رہ کر جو جرم کر رہے ہو، اس سے ان سبھوں کا بھلا ہوگا جو تمہارے پیارے ہیں ... ...ہارے پیارے ہیں اور اس پیار کے لئے تم نے کوئی شرط نہیں رکھی ہے، پیار کے لئے پیار کرنے والے ...رط نہیں رکھتے ... سو چپ رہ کر تم خود ہی کو سزا دے لو ... اپنے پیاروں کو سزا دینے کا تمہارا حق ...یں ہے۔ تم کو کوئی حق ہے؟

میرا حق کیا ہے، میرا حق صرف حق ہے یا یہ کسی ذمہ داری سے پھوٹتا ہے؟

اپنے آپ سے بات کرنے والے دراصل اپنے خول میں بند رہتے ہیں اور ... اور باہر کی دنیا ...ں کی توں رہتی ہے، اس پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اور پھر دستک ہوتی ہے، کوئی کواڑوں کو پیٹتا ہے، ...تا ہے، آواز دیتا ہے، پکارتا ہی چلا جاتا ہے ——

کواڑ کھول دوں تو؟

تو تم آنے والوں کو نہیں روک سکو گے ــــ میں کن کن کواڑوں کو بند رکھوں؟
ہر دروازے پر دستک دی جا رہی ہے،
ہر کواڑ کھولے جانے کے لئے چیخ رہی ہے۔
کوئی ملنا چاہتا ہے، کوئی مجھ سے کچھ کہنا چاہتا ہے، کوئی مجھ سے کچھ سننا چاہتا ہے، کوئی مجھ سے کچھ پوچھنا چاہتا ہے...
لیکن میں کواڑ کھول دوں تو پتہ نہیں کون آجائے؟ میں اندازہ بھی نہیں لگا سکتا کہ کون آنے والا ہے، کون آنے والا ہے؟
میرا دشمن؟
میرا دوست؟
کوئی اجنبی؟
دوستو! تم مت آؤ کیونکہ تمھارے اور میرے درمیان ماہ وسال کے بے شمار پردے پڑے ہیں... کیونکہ میرے تمھارے درمیان یادوں کی خوشبو کی کئی پرتیں ہیں، کیونکہ میرے تمھارے درمیان خلوص اور بدگمانیوں کی تاریخوں کے ملبے پڑے ہوئے ہیں، کیونکہ میرے اور تمھارے درمیان بے شمار موسم ہیں، جاڑے ہیں کہ جب ہم ایک لحاف میں چار چار پڑے ہوئے اس امر پر غور کرتے تھے کہ انقلاب کیا ہوتا ہے؟ کہ ہم میں سے دو جو روپوش یہاں، اس چھوٹی سی کوٹھری میں پڑے تھے، جو ایک پولیس انسپکٹر کے کوارٹر کی کوٹھری ہے، "ماں کو تم نے بتایا تھا کہ تم روپوش ہو رہے ہو؟" "ماں کو؟" "ہاں ویسے ہی جیسے تم نے اپنی ماں کو بتایا تھا کہ اس کے کوارٹر میں تم مجھے پچھلے چھ دنوں سے چھپائے ہوئے ہو اور میرا نام تم نے اسے غلط بتا دیا ہے ــــ دوستو! تم ہرگز مت آنا کیونکہ تھاؤزنڈ گارڈن (THOUSAND GARDEN) کے ہرے بھرے جنگلوں میں ہونے والے ان جلسوں کی حرارت کم ہو گئی ہے، یا ختم نہیں ہوئی ہے، کیونکہ دوستو، کسی ملک کی ایمبیسی میں کام کرنا اور دودھ کا پینا اس جاڑے کی رات میں اس لحاف کا مقابلہ نہیں کر سکتا، جس میں ہم چار گرم ہیں۔ اور اس پتھروں پہاڑوں، قبیلوں، دریاؤں، تیر کمان کے علاقے کی سردی باہر چاہے ناکامی پر سر پٹک رہی ہو، مگر ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتی... دوستو، میرے پاس مت آؤ کیونکہ میں... کیونکہ میں ان دنوں اپنے اس پروجیکٹ پر کام کر رہا ہوں کہ اگر ریل لائنوں پر لکڑی کے SLEEPER کی بجائے کنکریٹ کے سلیپرز کی ریلوے وزارت سے اجازت مل گئی تو... ریل

... اور ریل کے پہئے ... اور انقلاب اور —— PRESTRESSED CONCRETE سلیپرز تک کا سفر
اتنا ہی لمبا تھا جتنا اس لحاف سے ایمبیسی کی نوکری اور ووڈکا —— اس طور پر مت کو اٹھ بیٹھو۔
مرکزی سرکار کے کسی ڈائرکٹوریٹ میں ڈپٹی ڈائرکٹر تک پہنچنے کے بعد اس لحاف کو یاد رکھنا
بھی مشکل کام ہے اور بھولنا بھی مشکل —— سو دوستو! تم مت آؤ ...

تو کیا تم دستک دے رہے ہو؟
مسٹر نثار —— ! تم نے کبڈی کے پالے کو چھو کر مجھے مار ڈالا ... یہ پالا گھنگھروؤں کے اس
شہر سے اسپات کے اِس شہر تک ہے؛
ہر بار جب تم ایک پالے کو چھو لیتے ہو تو تمھارا کوئی دوست مر جاتا ہے، میں تو مر ہی گیا ...
اور پھر میں نے پالے کو اس پار سے دیکھا کہ مرے ہوؤں کی قطاریں کھڑی ہیں ... ایک میں بچ گیا ہوں ...
ایک میں ... کیونکہ اگر میں نہ بچ رہتا تو ان مرے ہوؤں کو کون دیکھتا —— مرے ہوؤں کو دیکھا کب جاتا
ہے، مگر میں ...
میں نے ان کو گننے کی بہت کوشش کی مگر —— میں جب گننے لگتا ہوں تو مجھے ہر چہرہ ایک سا
لگنے لگتا ہے، اور میں گنتی بھول جاتا ہوں ... اور میں حیران تمام قطاروں کو دیکھتا چلا جاتا ہوں اور جب
مسٹر نثار —— تم تک پہنچتا ہوں تو مجھے سارے کے سارے تمھارے ہی جیسے لگنے لگتے ہیں ——
اس عظیم الشان بلڈنگ کے ایک دریچے پر ہم دونوں بیٹھے ہیں، جس بلڈنگ کے در و دیوار سے
علم و دانش کی کرنیں پھیلتی ہیں اور تمھاری مس ریوا بیڈمنٹن کے ہر اسٹروک کے بعد دریچے کی طرف
دیکھتی ہے ... کیوں دیکھتی ہے؟ وہ جب دیکھتی ہے تو تمھارا چہرہ دمک سا جاتا ہے ... ریوا کا کارک جال
میں پھنس جاتا ہے تو وہ دریچے کی طرف دیکھنے کی بجائے زمین پر نظریں گاڑ دیتی ہے۔
مسٹر نثار!
کالے گاؤن (GOWN) کی قطاریں تم بھی کھڑے ہو، میں بھی کھڑا ہوں، نلنی بھی ہے، ٹوپو
بھی ہے، ریوا بھی ہے، پرشوتم بھی ہے، ألیو بھی ہے ... اور ڈائس پر سے باری باری نام پکارے جا
رہے ہیں۔
اور رول (ROLL) کیا ہوا کاغذ لئے ہوئے کالے گاؤن (GOWN) اور گلابی اسکارف کالے
لوگ آؤٹر گیٹ (OUTER GATE) سے باری باری باہر نکل رہے ہیں ...
میرے پاس چند تصویریں ہیں، اس میں ایک تصویر وہ ہے جس میں کالے گاؤن پہنے ہوئے تم

ہو، میں ہوں، اور بس ریوا ہے۔ میں نے حال ہی میں اسے انلارج (ENLARGE) کرایا ہے کیونکہ مجھے ماضی اب ENLARGE ہی صورت میں نظر آتا ہے، اس تصویر میں تم اپنے چشمے میں سے اسے جھانک رہے ہو، جیسے تمھاری آنکھوں اور منظر کے درمیان کچھ حائل نہیں، شیشہ بھی نہیں... تمھارا اسکارف تھوڑا سا کندھے سے کھسک گیا ہے اور تم اس طرح مسکرا رہے ہو، جیسے تم رونا چاہ رہے ہو... آج مجھے ایسا لگ رہا ہے، ورنہ یہ تصویر تو ہمیشہ ہی سے دیکھتا چلا آرہا ہوں، کبھی ایسا نہیں لگا تھا۔ پھر میں ہوں — پھر ریوا ہے، سنجیدہ فکر میں ڈوبی ہوئی — مسکراتی ہوئی، یہ مسکراہٹ کچھ کہنا چاہتی ہے، یا شاید کہہ چکی ہے، یا شاید مسکراہٹ کو الفاظ کا لباس پسند نہ ہو، اس لئے وہ صرف مسکرا رہی ہے... ریوا کی مسکراہٹ میں آج بھی کوئی تبدیلی نہیں آئی ہے، کیونکہ وہ الفاظ میں مقید نہیں ہو سکتی، وہ سیدھے دل میں اتر کر دھڑکن میں تبدیل ہو گئی...

پھر تم نے...

پھر تم نے سٹر شار پالا چھو لیا...

اور ریوا مر گئی...

اور میں مر گیا...

اور کالے گاؤن اور گلابی اسکارف والے، ہاتھ میں رول کیا ہوا کاغذ لئے ہوئے سارے کے سارے مر گئے... پرشو تم

اُلیو...

ٹوپو...

ریوا سے میری ملاقات بمبئی میں ہوئی جہاں وہ ایٹمک انرجی کے محکمے میں کام کرتی ہوئی میڈم کیوری جیسی لگ رہی تھی... تم نے پالا چھو کر اسے مار نہ دیا ہوتا تو سچ مچ تم اس پر عاشق ہو جاتے، مگر تم نے تو پالا چھو لیا اور دیکھا بھی نہیں کہ... تم دیکھتے بھی کیا؟ تم دیکھنا بھی چاہتے تو کیا دیکھ پاتے... شب گزیدہ سحر میں کچھ نظر کہاں آتا ہے... اجالا ایسا ہوتا ہے؟ ایسا ہوتا ہے اجالا...؟ داغ داغ... میلا میلا... یہ اجالا تھا...؟

الم نصیبوں کی صبح ایسی ہی ہوتی ہے!

فریب خوردہ کی صبح ایسی ہی ہوتی ہے!

سحر زدوں کی صبح . . .

زندگی مسٹر شار کبڈی کا کھیل نہیں ہے، عشق بھی کوئی حقیقت نہیں ہے، حقیقت وہ ہے جو جبر ہم پر مسلط کر دیتا ہے . . . جو اقتدار اور حکم ہم پر تھوپ دیتا ہے، وہی حقیقت ہے . . . وہی میرا تمھارا اور ریوا کا نصیب ہے، وہی میرا، تمھارا اور ریوا کا حق ہے . . . جبر کو قبول کر لینے کا نام نصیب ہے . . .

میں اپنے آپ سے باتیں کرتا ہوں اور بے تحاشہ دروازے پر دستک ہو رہی ہو اور میں خوف سے کواڑ نہ کھولوں، کواڑ کھولنے کی جرأت اپنے اندر نہ پاؤں تو اسے . . .

تو اسے نظام کہتے ہیں . . . نظام دستک کی آواز نہیں سنتا، وہ بہرہ ہوتا ہے، مطلق العنان ہوتا ہے، استبدادی ہوتا ہے، وہ کسی کو آنے کے لئے . . .

مجھے کتنا ڈر لگتا ہے!

ڈر میرا مقدر ہے!

مقدر پر میرا یقین ہے!

اگر مقدر پر یقین نہ ہوتا تو آدمی مرجاتا ہے

مرجاتا ہے ——

مجھے آج تک یہ پتہ نہیں چل سکا کہ آدمی کب مرجاتا ہے؟ پیدا ہونے کو مرنا کیوں نہیں کہتے؟ دنوں اور مہینوں اور برسوں میں جینے کو جینا کیوں کہتے ہیں؟

زندگی کا ایک سال کم ہو جاتا ہے کم بخت سالگرہ کا جشن مناتے ہیں۔

کیک کھاتے ہیں . . .

سو مرجانے کے بارے میں کون جانے کون سی بات صحیح ہے؟

ریوا ایٹمک انرجی کے محکمے میں کام کرتی ہے، اور اس کا شوہر سوشیل اپنا ایک تھری اسٹار ہوٹل چلاتا ہے . . .

ٹوپو بہت بڑے سے عہدے والے کے بچوں کی ماں بن کر بڑی کوٹھی کے لان میں بیٹھی مالی کو ہدایت دیتی رہتی ہے۔

پرشوتم اعداد و شمار کا ماہر بن کر مرکزی سرکار کی جانب سے پتہ نہیں کہاں بھیج دیا گیا ہے، وہ اعداد و شمار کے ان ماہرین میں سے ہے جو منصوبوں کے جانی دشمن ہوتے ہیں اور کوئی منصوبہ اس

سکے، بغیر نہیں بن پاتا، اور جب بن جاتا ہے تو پرشوتم کے اعداد و شمار اسے بتاتے ہیں کہ پہلے والے اعداد و شمار غلط تھے، کیونکہ آبادی کے بڑھنے کی رفتار کا تخمینہ غلط تھا...

تخمینہ صحیح کب ہوا ہے؟

اور میں ـــــ؟

دن بھر تجارتی امور میں اپنی مہارت کی جھوٹی دھونس جمانے کے لئے اپنے کھوکھلے پن سمیت پھر اپنے آپ سے باتیں کرنے لگتا ہوں... یہ سب کیا ہے؟

یہ ٹنڈر کیا ہے؟

یہ بل کیا ہے؟

میں کہاں ہوں؟

انکم ٹیکس کے محکمے میں میرا کیا کام ہے؟

'سارا شہر' میری دھونس کا شکار ہے اور مسٹر نشار! تم جانتے ہو کہ میں...

میں اپنے آپ سے لڑتا ہوں، لڑتے لڑتے تھک جاتا ہوں، لہولہان ہو جاتا ہوں...

اور ڈر کے مارے دستک کی آواز سے سہم کر اور بھی سمٹ جاتا ہوں، میں کواڑ تک نہیں جاتا، نہیں جا سکتا... مجھے دستک سے ڈر لگتا ہے، کیونکہ دستک کے ساتھ کوئی نام نہیں ہوتا، نام بھی اب یاد نہیں، بے نام بھی یاد نہیں... میں؟

میں مسٹر نشار بند کمرے میں محفوظ محسوس کرنے کو اپنی زندگی کا حاصل سمجھتا ہوں! میں بند کمرے کی باہر کی دنیا سے ڈرتا ہوں... سہما سہما سا اس کمرے کے اندر خود کو ڈرا ہوا محسوس کرنے کے باوجود، محفوظ تصور کرتا ہوں۔

دستکو! بند ہو جاؤ ـــــ دستک دینے والو، واپس جاؤ..

کواڑیں کیوں چیخ رہی ہیں؟

"ہوا یہ تھا کہ ایک دیو نے بادلوں کو قید کر لیا تھا اور ساری زمین، تمام دھرتی جھلستے ہوئے صحرا کی مانند تپ رہی تھی اور اس دیو کا نام...

اس دیو کا نام تاریخ کے مختلف ادوار میں بدل جاتا ہے، مختلف افراد کے لئے بدل جاتا ہے۔

میرے لئے اس دیو کا نام کاروبار ہے۔ میں بھی بادل کا ٹکڑا ہوں۔ اور مجھے دیو نے قید کر لیا ہے اور

دھرتی کا وہ حصہ جس پر اپنی پھواریں ڈال کر میں اسے شاداب زرخیز بنا دیتا وہ حصہ جلتے ہوئے صحرا کی طرح اپنی لو میں مجھے جھلسا رہی ہے۔ یہ لو، میرے اندر گھس گئی ہے، یہ لو، میری روح تک کو چٹخا رہی ہے مگر دیو مجھے قید سے نجات نہیں دیتا...

تم بھی بادل تھے ___ اور تم بھی، کسی ایسے ہی دیو کی قید میں ہو اور تمھارے نہ برسنے سے کیا کیا سوکھ گیا، پتہ نہیں تمھیں اس کا علم ہے یا نہیں ___ مسٹر نثار، بہت کچھ جھلس گیا، برسو، برسو۔

مگر دیو کی قید میں چلے جانے کے بعد تم نہیں برس سکتے۔ تم... مسٹر نثار... دیو کو پہچانتے ہو؟

پرشوتم کو اعداد و شمار کے دیو نے قید کر لیا۔ اور تب سے وہ... تب سے ایک خطہ زمین جھلس رہا ہے، مگر پرشوتم کو پتہ نہیں ہے کہ وہ قید میں ہے، اسے تو یہ بھی علم نہیں ہے کہ وہ بادل ہے، کہ وہ بارش لا سکتا ہے کہ وہ دھرتی کو زرخیز بنا سکتا ہے...

کہ دیو لکیروں کا قید نہیں، وہ بادلوں کو قید کر لیتا ہے اور زمین کو تپا دیتا ہے اور چنگھاڑتا ہے ... اور قید خانے کے دروازے پر پہرہ دے رہا ہے... میں نہیں نکل سکتا،

مسٹر نثار تم نہیں نکل سکتے... اور کون نکل سکتا ہے ___

دستک دستک...!!

یا کواڑیں بج رہی ہیں... یا مسٹر نثار...

اندر کو ڈھونڈو... اندر کی بنتی کرو... پوجا کرو... کیونکہ بادل کو قید کرنے والے دیو سے وہی نبرد آزما ہو سکتے ہیں... وہ سوم پی کر اس خونخوار اور نابکار دیو سے لڑ سکتے ہیں... وہ بادلوں کو اس دیو کی قید سے آزاد کرا سکتے ہیں...

اندر کو یاد کرو... ان کے چرن چھو لو...

پوری دھرتی جھلس رہی ہے... اس لئے اندر جی مہاراج...

ساری دھرتی کے بادلوں کو قید سے رہا کرائیے... پھر دھرتی سیراب ہو جائے گی، پھر دھرتی خوشگوار ہو جائے گی اور تب تمام سادھو سنت بہت سی دعائیں دیں گے... اور دھرتی کے سینے سے کونپلیں پھوٹیں گی... جو مستی میں سر دھنیں گی، اور تمام دنیا رقص کرے گی...

کوئی اندر سوم پی کر بادلوں کو قید کرنے والے دیو سے آخری لڑائی لڑ لیتا...

لڑائی شروع ہو چکی تھی... لڑائی ___

دنیا کے ½ حصے کے بادلوں کو رہائی مل گئی تو وہاں ٹوٹ کر بارش ہوئی اور ریگ زار اور برفستان جو بے آب و گیاہ تھے کھل اٹھے، تمام سادھوؤں سنتوں کے ہاتھ دعاؤں کے لئے اٹھ گئے ــــ!

وہ بڑا سا ہال تھا جہاں سیتا تھی، سیتا تھی اور اس جیسی کئی لڑکیاں تھیں اور دو ڈھائی سو اُبلتے کھولتے نوجوان تھے اور ابلتی کھولتی تقریریں تھیں۔۔۔

یووکوں پر بھی ذمہ داری عائد ہوتی ہے، سیتا بول رہی تھی۔۔۔

اور بیہوش گنگولی سن رہا تھا اور ڈھائی سو یووکوں کے کان سن رہے تھے اور وہ جانتے تھے کہ چالیس کروڑ آبادی کی دھرتی کے بادل کو قید کر کے دیو کہاں بیٹھا تھا۔۔۔

پھر یہ سب جلوس کی شکل اختیار کر گئے، آگے وشوناتھ تھا، اس کے بغل میں اندر دیو تھا۔۔۔ سب کے سب سوم پی کر نکلے تھے، سب کے سب۔۔۔ سادھوؤں سنتوں کے ہاتھ دعاؤں کے لئے اٹھ چکے تھے، قدم آگے بڑھتے جا رہے تھے، جوش بڑھتا چلا جا رہا تھا اور وہ جگہ نزدیک آتی جا رہی تھی، ہر قدم اس جگہ کو نزدیک کرتا جا رہا تھا اور ہر قدم کے نیچے دھرتی اس لئے ملائم ہوتی جا رہی تھی کہ اس کے بچے آرام سے ماں کے سینے پر چلتے جائیں۔۔۔

وشوناتھ کے سر سے خون گرنے لگا۔۔۔

سیتا کا بایاں ہاتھ ڈنڈے سے فریکچر ہو گیا۔۔۔

اندر دیو کاندھے کو پکڑ کر ایک پہلو سے گر کر کراہنے لگا۔۔۔

دیو اکیلا نہیں تھا، اس کی فوج نے لاٹھیاں برسائی تھیں اور سیتا مجھ سے چمٹ کر غصے سے بولی ــــ

"لو یہ جھنڈا۔۔۔ کیونکہ میرے ہاتھوں میں چوڑیاں ہیں۔۔۔ تمہارے ہاتھوں میں تو چوڑیاں نہیں ہیں!"

میں حیران جھنڈا لئے کھڑا رہا۔۔۔ مگر کسی لاٹھی کے ضرب سے میری کلائی اینٹھ گئی جھنڈا گر گیا، اچھا تھا کہ میرے ہاتھ میں چوڑیاں نہیں تھیں۔۔۔

سیتا نے سچ کہا تھا، تمہارے ہاتھوں میں تو چوڑیاں نہیں ہیں۔۔۔

اب یہ دوسرا شہر ہے۔۔۔ اب یہ وہ شہر ہے، جہاں بادل کا ایک ٹکڑا ابھی نظر نہیں آیا، کیونکہ وہ سب سختی سے قید کر دیئے گئے ہیں۔۔۔

... شاید ۴ بجے تھے رات کے ... بہرحال چار بجے تھے اور اندھیرا بہت تھا، سردی اپنے شباب پر تھی، میں اپنی رضائی میں گھسا ہوا بے خبر سو رہا تھا، سونے کے لئے ان دنوں کامپوز کا رواج نہیں تھا، یا شاید میری ڈکشنری میں کامپوز کا لفظ ہی نہیں تھا، پھانسی کے تختے پر بھی نیند آ سکتی تھی،

دروازے پر دستک ہوئی،

یہ وہ دن تھے جب دستک سے ڈر نہیں لگتا تھا، یا جب میں نے دستک کو اپنا مقدر نہیں سمجھا تھا ... جب لگتا تھا، دنیا بدل سکتی ہے ... بہتر بنائی جا سکتی ہے، اسے میں بہتر بنا سکتا ہوں، کیونکہ میری کلائی پر پلاسٹر تھا اور پیشانی پر وہ چھوٹا سا زخم ابھی پوری طرح بھرا نہیں تھا، جو اقتدار نے لگایا تھا اور جس اقتدار کے جبر کے آگے میں سینہ سپر ہو جانے کا حوصلہ رکھتا تھا ... میں ان دنوں آزاد بادل تھا اور دھرتی کے چھوٹے چھوٹے حصوں کو جھلسنے سے بچانے کے لئے چھڑکاؤ کرتا تھا، دیو مجھے قید نہیں کر سکتا تھا۔

اس لئے میں دروازے پر دستک کی اس آواز سے بیدار ہو گیا، میں بیدار ہی رہا کرتا تھا ... اور تب میں نے بے جھجک دروازہ کھول دیا — بے خوف ...

میرے دونوں ہاتھوں میں لوہے کی چوڑیوں میں لگی ہوئی زنجیر پہنا دی گئی — مجھے سیتا یاد آئی ...

پھر ایک آہنی دروازہ بند ہو گیا، کیونکہ اقتدار کا جبر مجھ پر حاوی ہو گیا تھا۔

اس آہنی دروازے کی موٹی موٹی لوہے کی سلاخوں کے باہر بہت اونچی دیوار تھی مگر یہ دیوار مجھے شیشے کی دیوار لگتی، جس کے پیچھے میں سب کچھ دیکھ سکتا تھا ...

میں تو ان دنوں فرازِ دار سے بھی کارواں در کارواں دیکھتا تھا ...

تب میں نے اپنی گرم شیروانی فرش پر بچھا دی اور اپنے آپ سے باتیں کئے بغیر سو گیا، ان دنوں اپنے آپ سے باتیں کرنے کی عادت نہیں پڑی تھی، سیکڑوں ہزاروں سے باتیں کرنے والا تنہا اپنے آپ سے کیا باتیں کرتا؟

اور تم سطرنشار لکیروں کے کھلاڑی تھے کہ لکیر کے اس پار یوں چلے گئے، جیسے میں نہیں ہوں —

ریوا نہیں ہے!

سیتا نہیں ہے

سیتا نہیں ہے

پیوش گنگولی نہیں ہے

مرنیال نہیں ہے۔

جیسے تاج نے مرمریں نزاکتوں کی ساری رعنائیاں کھو دی ہیں، جیسے اجنتا اور ایلورا اور موہنجوداڑو بے معنی بتوں کی طرح خاموش ہو گئے ہوں، جیسے قطب مینار اپنی بلندیوں کی پستیوں میں دفن ہو گیا ہو، جیسے اللہ ایک بار پھر زمین میں دفن کر دیا گیا ہو ـــــ

تم نے سنا تھا، جامع مسجد سے تکبیریں بلند ہوئی تھیں!

اللہ اکبر

اللہ اکبر

اللہ بڑا ہے! اس سے بڑا کیا ہے؟

اور ریوا

ریوا ایک لڑکی تھی، بس لڑکی تھی اور ہر رزلٹ کے بعد ہم دونوں کا منہ چڑھا دیتی تھی، لڑکی جس نے پانے اور کھونے کا حساب نہیں رکھا، جس نے تم سے پایا کیا؟ اور دیا کیا؟ مگر تم نے سب کچھ چھوڑ کر ادھر کا رخ کر لیا ـــــ

میری پلاسٹر کی ہوئی کلائی میں لوہے کی چوڑی زنجیر سمیت تمھیں یاد ضرور آئی ہوگی۔

پھر ایسا ہوا اسٹر نثار

جبر نے ایک بے پناہ آتش فشاں کا منہ کھول دیا اور بے پناہ کثرت سے ہر دو لوگ ایک طرف کو چل پڑے، جانا کہیں تھا مگر چل پڑے کہیں اور کے لئے ـــــ کہاں؟ کیوں؟

جبر اور اقتدار نے ان باتوں کا جواب کہاں دیا، کوئی جواب نہیں دیا، صرف اپنے اقتدار کی سرحدوں کو بڑھا دیا، اختیارات کو پھیلا دیا اور تم سب سمٹ گئے . . . سب سمٹ گئے۔

میں ـــــ! اور میں؟

میں آج تک یہی سوچ رہا ہوں کہ لکیر کیا ہوتی ہے؟

لکیر کلیجوں کو چیر دیتی ہے، لکیر جسموں کو کاٹ دیتی ہے، لکیر . . .

ہاتھ کی لکیریں میرے ہاتھ میں ہیں ـــــ مٹھی بند کر لوں تو میری مٹھی میں ہیں، مگر میری مٹھی میں کہاں؟ میرے اختیار میں کہاں؟ تمھارے ہاتھ کی لکیروں کے بارے میں نہیں کہہ سکتا ـــــ

راجہ کے ملک سے ہوتے ہوئے جب تم ساحلی شہر پہنچے تو ان میں سے کس کا تم نے کیا مطلب نکالا۔

مفہوم نکالنے کا کام کروڑوں کا کب رہا ہے اس لیے . . .

اس لئے مسٹر شمار تم نے ٹھیک کیا، لکیر کا مفہوم خود نکالا اور یوں لکیروں کے عالم و فاضل بن لئے،

میرے اس ہلتے ڈولتے کمرے کی کھڑکیوں، دروازے پر دستکیں رکتی ہی نہیں ہیں، دروازے پر، ہر کھڑکی پر . . . اور ان دستکوں کی آواز پر میں زبان نہیں کھول سکتا کیونکہ مجھ میں سکت نہیں، شاید مجھ میں حوصلہ نہیں، شاید مجھ میں ہمت نہیں . . . شاید میرے ہاتھوں میں آہنی چوڑیاں نہیں . . .

اس بستر پر یا تخت پر لیٹا ہوا میں محسوس کر رہا ہوں،

میں اپنے چاروں ہاتھ پاؤں سمیت کسی فتح مند "اعلیٰ نسل" کے فوجی کمانڈر کی جمع کی ہوئی اس مخصوص نسل سے تعلق رکھتا ہوں جسے دھرتی سے نابود کر دینے کا عزم 'اعلیٰ نسل' کے فتح مند کمانڈر نے کر لیا ہے۔

دنیا کے پانچویں حصے کے کئی حصے پر اپنا تسلط جما لینے کے غرور سے چور 'اعلیٰ نسل' کے فوجی کمانڈر نے بادلوں کو قید کر لینے کا عزم صمیم کر لیا ہے اور . . .

میں نابود کر دیئے جانے والی نسل کا ایک فرد اب ایسے راستے پر لے جایا جا رہا ہوں، جو آگے جا کر دو حصوں میں بٹ جاتا ہے۔

اقتدار نے اجازت دے رکھی ہے کہ اس دو راہے پر پہنچ کر کوئی اپنے داہنے والے راستے پر جانا چاہے تو بائیں والے راستے پر جائے . . . ایک بھیڑ ہے، گردن لٹکائے . . . اور اس دو راہے پر پہنچنے سے پہلے سبھی آپس میں مشورے کر رہے ہیں کہ دائیں چلنے میں بہتری ہے یا بائیں چلنے میں . . . ؟

شوہر بیوی سے پوچھتا ہے، ماں بیٹے سے پوچھتی ہے، بہن بھائی سے پوچھتی ہے، بہو ساس سے پوچھتی ہے،

دوست دوست سے پوچھتا ہے،

دشمن دشمن سے پوچھتا ہے،

کون کس سے پوچھتا ہے ؟

کیا پوچھتا ہے . . . ؟

چلنا 'اعلیٰ نسل' کے فتح مند نے ہم سب کا مقدر بنا دیا . . کسی ایک راستے پر تو جانا ہی ہے، بائیں جا سکتے ہیں، دائیں بھی جا سکتے ہیں . . . چلتے چلتے . . . دو راہے تک تو ساتھ ہیں . . . پھر . . .

دائیں نہیں بائیں چلو . . .

"کیونکہ میرا دل کہتا ہے۔۔۔داہنے جتنے بھی جائیں گے۔۔۔وہ غلط ہیں، کیونکہ وہ راستہ گیس چیمبر کا راستہ ہے۔"

"نہیں گیس چیمبر کا راستہ بائیں ہے۔۔۔میں جانتا ہوں۔۔۔سچ میں جانتا ہوں"

"بکواس بائیں لیبر کیمپ ہے۔۔۔جہاں جی تو سکتے ہیں۔۔۔"

"داہنے لیبر کیمپ ہے۔۔۔قید ہے مگر زندہ تو رہیں گے۔۔۔"

زندہ رہنا کسے کہتے ہیں؟

"گیس چیمبر کیا ہوتا ہے، آٹھ سال کا ایک لڑکا، اپنی چودہ سال کی بہن سے پوچھتا ہے۔"

"تم بس میری انگلی پکڑ کر چلو۔۔۔اور خاموش رہو۔۔۔"

شوہر بیوی کو رائے نہیں دیتا۔

بیوی شوہر کو بے وقوف سمجھتی ہے۔

ماں بیٹے کو بے وقوف سمجھتی ہے ـــــ!

"لیبر کیمپ کیا ہے؟" ایک چھ سال کی بچی اپنی ماں سے پوچھتی ہے۔

"چپ رہ۔۔۔لیبر کیمپ کی بچی۔۔۔"

محبوبہ عاشق کا ہاتھ چھوڑ کر ایک راستے پر ہو لیتی ہے اور محبوبہ سوچتی ہے اس کا عاشق بے وقوف ہے کہ گیس چیمبر کی طرف جا رہا ہے۔

۔۔۔یہ فہم کا معاملہ ہے۔

فہم اس دو راہے پر آکر ٹھٹکی کھڑی ہے!

بھائی بہن کو آواز دیتا ہے۔۔۔

ادھر مت جاؤ۔۔۔میری بات مانو۔۔۔

سہ راہے پر کھڑا فوجی فتح مند غرور، تمکنت اور تضحیک آمیز مسکراہٹ کے ساتھ دونوں راستوں پر جاتے ہوئے ہجوم کو دیکھ رہا ہے۔۔۔

"میرا دل کہتا ہے، داہنے راستے پر جائیں گے تو گیس چیمبر ہی میں پہنچیں گے۔۔۔اس لئے۔۔"

"میرے اندر کی آواز کہتی ہے 'سچ' مجھے رات خواب میں کسی نے بتایا تھا کہ دائیں طرف کا راستہ گیس چیمبر کا راستہ نہیں ـــ میرا خواب کبھی جھوٹا نہیں ہوتا ـــ"

کسی نے کسی کی بات مانی؟

کسی نے سبھی تو کسی کی بات نہیں مانی !
مگر بات . . .
بات کی کوئی تشریح نہیں تھی . . .
منطق بھی نہیں تھی ، پھر کوئی کیوں کسی کی بات مانتا ؟
دل کہتا ہے . . . دل کہتا ہے . . . کیا جانتا ہے کدھر گیس چیمبر ہے ـــ ؟ اور اعلیٰ نسل کے فتح مند کمانڈروں نے ہر راستے کا رخ گیس چیمبر کی طرف کر رکھا تھا !
" . . . . "
اب دیکھو . . . مگر مجھے سمت کیا معلوم ؟
اب اس کھڑکی پر دستکیں ہو رہی ہیں ـــ ؟
رکو . . . رکو . . . کیوں کھڑکیاں پیٹ رہے ہو ۔
جب کہ جانتے ہو ، میں کھڑکی نہیں کھولوں گا ـــ میں دروازہ نہیں کھولوں گا . . .
میرا دل کہتا ہے ۔
" دشمن ہوگا "
" اجنبی ہوگا "
دل کہتا ہے ـــ دل کو زبان کس نے بخشا . . . ؟ دل کی زبان . . .
آنکھ کی زبان . . .
قلم کی زبان . . .
زبان . . .
ایک زبان نہیں کھلتی ، ہر چند کہ دروازے پر دستک ہو رہی ہے ، کھڑکیاں ، اب کھڑکیاں نہیں رہیں ، دستک کی آواز بن گئی ہیں ـــ مسلسل ـــ متواتر . . .
پھر دل کی زبان . . . آنکھ کی زبان . . .
قلم کی زبان . . .
اتنی ساری زبانیں کھل جائیں تو دروازوں کو پیٹنے والے کب تک دروازوں کو پیٹتے رہیں گے ؟
زبان کیا کہے گی . . . کیا کہے گی ؟
سبیتا ! تم ہو ؟

پرشوتم! تم ہو؟

کون ہو؟

کون سی زبان میں پکار رہے ہو... سمجھ نہیں پاتا...

تم میرے دوست ہو... چاہے دشمن ہو... چاہے اجنبی ہو... کیا سمجھ گئے؟

کیوں کہ زبان تو چودہ سو سال پرانے الفاظ بھی نکال سکتی ہے، زبان تو الفاظ بنائے بغیر حرف کو معنی سمجھ کر ادا کر سکتی ہے، بغیر یہ پرواکئے کہ حرف کے معنی تم آج سمجھو گے یا چودہ سو سال بعد؟ یا آج سمجھو گے اور چودہ سو سال بعد بھول جاؤ گے اور اپنے جذبۂ احترام کو فہم کا بدل سمجھ کر قناعت کر لو گے...

بتاؤ الف کے معنی!

بتاؤ لام کے معنی!

بتاؤ میم کے معنی!

احترام پر قناعت کرنے والو... فہم کو کہاں چھوڑ آئے؟

عقیدت اور دانش کو ایک سمجھ کر تم کس خانے میں رکھے جاؤ گے؟

لکیر کے معنی سمجھ میں نہیں آئے تو مٹھیاں باندھ لینے سے حاصل؟ کیونکہ مٹھیوں میں کتنا سما سکتا ہے؟ مقدار پر یقین کرنے والو ——— مٹھیوں میں کیا ملے گا؟ ایک حرف ———

دو حرف

تین حرف

چار حرف

اور چودہ سو سال کے اندر ہی معنی مثلِ روح غائب؟ پھر؟

حرف موجود

معنی بھی موجود

کیا ہوا تمھاری فہم کو؟ تم کو حق پہنچتا ہے کہ معنی نہ جانو یا نہ سمجھو تو لفظوں کو بے معنی بتاؤ، لفظوں کے خالق کو ابہام پرست کہو... تم جو ایک حرف کے معنی کے لئے سرگرداں رہے اور معنی کو نہ پا سکے،

احترام کرو، حرف کا، لفظ کا، تحریر کا ——— کہ خالق احترام کے لئے ہوتا ہے۔ تمھاری نکمی فہم کے تقاضوں کا نشانہ نہیں ہوتا...

کون سی کھڑکی کھولوں؟

کون سادروازہ وا کروں ؟ ایک لمحے کے لئے مجھ میں قوت آجاتی تو میں اٹھتا، چلتا . . . اور کوئی ایک کھڑکی کھول دیتا
مگر نہیں معلوم کون اندر آجائے ؟

جھناک ـــ جھناک ـــ کس مزدور نے گھنگھروؤں سے بھرے ہوئے بوروں کو پٹک دیا ، یہ پوری روڈ ہے جس کے کنارے گھنگھروؤں کی دوکانیں ہیں، آڑھت ہے اور گھنگھروؤں کے اس شہر میں . . .
قلعہ ٹوٹا ہوا کھنڈر ہے، مگر اس کی پتلی پتلی اینٹیں کچھ کہنا چاہتی ہیں ، بادشاہ کے بارے میں قلعہ کے بارے میں کسی قیدی کے پاؤں کی بیڑیوں کی جھنکار قلعہ کی جیل کی ٹوٹی ٹوٹی دیواروں سے آرہی ہیں ،شام کے بعد لگتا ہے قلعہ کو آسیب گھیر لیتے ہیں ، یا یہاں جن روحوں نے اپنے جسم چھوڑے تھے، رات کے رات یہاں آجاتی ہیں ـــ جبھی کوئی قلعہ پر رات کو کوئی نہیں آتا جہاں سب سے اونچی دیوار پر ایک چراغ ہر جمعرات کو جلتا نظر آتا ہے ـــ چراغ ،
"یہ چراغ کون جلاتا ہے"
"محلہ نوشیان کے موذن سے کسی نے پوچھا ـــ"
"سورہ یٰسین پڑھو . . . اور ایسے سوالات نہ پوچھا کرو میاں صاحبزادے ۔"
آؤ ، آؤ ـــ

میں نانا ابا کے حکم کی تعمیل میں اینٹ کے فرش والے برآمدے سے جہاں میں اپنی دلہن امّی کے ساتھ بیٹھا انہیں تکیہ غلاف پر پھول بناتے دیکھ رہا تھا . . . ان کے پاس حاضر ہوگیا ۔
اور وہاں اس شہر میں ایک مولوی اللہ بخش ہوا کرتے تھے ، جن کا نام قصبے کے مدرسوں میں بہت اعزاز و احترام سے لیا جاتا تھا، ان سے زیادہ ان کی سار اور گوشمالی مشہور تھی . . . چھدری ہوئی لمبی سی داڑھی، کچھ بال سفید کچھ کالے ـــ ہاتھ میں عصائے مولوی . . .
"تمھارے مولوی صاحب کہہ رہے تھے کہ تم حساب میں جی نہیں لگاتے اور بہت کمزور ہو
" نانا ابا نے دریافت کرنے کے خیال سے کم اور سرزنش کے خیال سے زیادہ مجھے بغور دیکھا
"اگر تجھے ضد ہے کہ حساب نہیں سیکھے گا تو مولوی اللہ بخش کو بھی ضد ہے کہ تجھ جیسے گدھے کو بھی حساب سکھا کر ہی رہے گا ـــ"
مولوی اللہ بخش کا گدھا حساب سیکھتا رہا، مگر خود مولوی اللہ بخش اسے گمراہ کر رہے تھے ، وہ ان کی کہی ہوئی بچوں کی نظمیں پڑھتا اور گاتا تھا اور ضرب اور تقسیم کے تمام گروں کو سیکھ کر بھولتا

۱۴۔ وہ نظمیں، آم کا باغ، گرمی کا موسم — تتلی —
مولوی اللہ بخش روز روز پیدا نہیں ہوتے —
یکے مرغ دیدم...
... سے روایت ہے کہ ایک بار... حاضر ہوئے اور دریافت فرمایا کہ...
چلو یاد کرو — کسر کے حساب کے لئے —
پہلے توڑیئے کو شک پھر کا نشانی توڑیئے
ضرب پھر تقسیم پھر جوڑ باقی توڑیئے
مگر مولوی اللہ بخش کے گدھے نے یاد کیا!
کسی نے یہ سقراط سے جا کے پوچھا —
... لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری
برف کا طوطا — ایک پیسہ
برف کا راجہ — ایک پیسہ
برف کا راجہ آدھا ہرا ہوتا ہے اور آدھا لال — پتے پر رکھا ہوا راجہ پگھلنے لگتا ہے جلدی ارے جلدی کھاؤ اسے ورنہ پانی ہو جائے گا —
پریمی حلوائی کے پیڑوں نے قصبے میں دھوم مچا رکھی ہے،
میں پریمی حلوائی کو پہچانتا ہوں۔ اس کے پیڑوں کے مزے کو فائیو اسٹار ہوٹل کے اچھے سے اچھے کھانے بھی نہیں مٹا سکتے ہیں، دھیلے میں ایک پیڑا... اور پیسے میں دو... وہ پیسہ جارج پنجم کا تھا... پیڑا پریمی کا تھا!
خاموش!
خاموش!
کیومرث اپنے غار سے نکل کر کیکاؤس بن چکا ہے۔ ایران کی سلطنت کی طوران سے ٹھن چکی ہے...
کیکاؤس اقلیم ایران میں ماژندران کو شامل کرنا چاہتا ہے۔ وہ تسخیر کے لئے چل پڑا ہے...
رستم؟
کیکاؤس نے سوچا ہے — ہر فتح کا سہرا رستم کے سر جانے سے اس کی خودداری کو ٹھیس لگتی

ہے، وہ شہنشاہ ایران ہے ماژندراں کو شامل کرنا چاہتا ہے، وہ تسخیر کے لئے چل پڑا...

رستم؟

کیکاؤس نے سوچا ہے — ہر فتح کا سہرا رستم کے سر جانے سے اس کی خودداری کو ٹھیس لگتی ہے۔ وہ شہنشاہ ایران ہے، ماژندراں کو چٹکی میں مسل کر رکھ دے گا۔

درخش کیانی آگے آگے ہے اور وہ ایرانی پہلوان جن کے دبدبے سے زمین لرزتی تھی آگے بڑھ رہے ہیں... گیو، گودانہ،... آگے بڑھ رہے ہیں — آگے جہاں دیو نژادوں کی حکومت ہے، ان کا پہرا ہے، دیو سپید پر فتح پانا ہی آخری فتح ہے...

ایرانی شاہانہ جلال کے ساتھ لشکر کیکاؤس بڑھتا جارہا ہے، ایک منزل، دو منزل...

کیکاؤس ماژندراں میں قید ہوگیا— شاہانہ جلال منتشر ہوگیا۔ ایران کا تخت اجڑ گیا —

کم بخت دستک دینے والو! تھوڑی دیر رکو — ان دستکوں سے حاصل؟ میں کہاں ہوں! دیو نژادوں میں قید ہوں؟...؟

میں تو تخت پر مجبور ولاچار پڑا ہوں، چل کر دروازے تک نہیں جاسکتا کہ دستک دینے والوں کو دروازہ کھول کر دیکھ لوں — انھیں دیکھوں، پہچانوں... اور...

میں رستم نہیں ہوں کہ ہفت خواں طے کرکے ماژندراں پہنچ جاؤں اور دیو سپید کو ہلاک کر دوں اور کیکاؤس کو چھڑا لوں اور درخش کیانی غرور سے بلندی پر لہرانے لگے —

کون ہے؟

کون ہے؟

دیو سپید؟

جادوگر؟

اژدہا؟

کیا میں کیپسول میں غلط تاریخ کو بند کرکے زمین میں دفن کرنے کے زمانے کا آدمی ہوں یا میں سام اور نریمان کے ساتھ جی رہا ہوں —

کوئی مجھے سیمرغ کے پر دیتا...

کہ میں اسے جلا کر سیمرغ کو بلاتا اور اسے بتاتا کہ میرے جسم پر کتنے زخم ہیں، کہ میری روح زخموں سے چور ہے، کہ مجھ پر قلب کا دورہ پڑ چکا ہے، کہ مجھے سلیپنگ پل کے بغیر نیند نہیں آتی... کہ میں زمین یا

تخت پر نہیں سو سکتا، میں ایر کنڈیشنڈ ہی میں جی سکتا ہوں، میں فائیو اسٹار ہوٹل کی لکژیریز کے بغیر ایک پل نہیں جی سکتا۔

اور میں زخموں سے لہولہان ہو گیا ہوں، پورا جسم مع روح ایک پھوڑے کی طرح دکھتا ہے، ٹیس مارتا ہے، یہ رستم کے زخم نہیں ہیں، یہ ان دیکھے ہتھیاروں کے زخم ہیں سیمرغ کے پاس اس لیے شاید کوئی مرہم ہو۔ ضرور ہوگا ـــ کیوں سیمرغ ہے نا؟

"بے ایرا ـــ ایک پگ اور لاؤ ـــ 'بے ایرا'۔۔ ایک دم سے جلدی، کیوں کہ میں ابھی طوران جاتے ہوئے گورخر کا شکار کرکے چقماق سے آگ جلا کر اسے بھوننے والا ہوں اور تب۔۔ گورخر۔۔ ہاہا اسکاچ اور گورخر، بھونا ہوا گورخر۔

"یہ پیٹر اسکاٹ نہیں چلے گا۔۔ خالص اسکاچ چاہیے، پورا پگ چاہیے۔ جالدی کرو۔۔ ایساکارو بے ایرا پٹیالہ پگ لے آؤ۔۔"

"ہوں ـــ ایک ہی تیر میں گورخر کو گرا دیا ہے اور اب اسے سینکوں گا تو اسکاچ کا مزا ـــ سیستان سے توران جاتے ہوئے ـــ بے ایرا ـــ بے ایرا جالدی کرو ـــ"

میں چوتھے سمندری سفر پر ہوں تاجروں کے ساتھ اور پھر یوں ہوا کہ ناخدا کی غلطی سے میرا جہاز ڈوب گیا اور میں اس جزیرے تک بہتے بہتے اس تختے پر آگیا ہوں اس تختے پر۔۔

چپ رہو ـــ خاموش۔

کھڑکیوں کو اس طرح مت پیٹو، اکم بختو۔۔ اس جزیرے میں تو آرام سے رہنے دو۔۔

یہاں انگور بہت ہیں ـــ میں نے ان کو نچوڑ کر ایک بڑے پھل کے سوکھے ہوئے خول میں ایک پیڑ کی ڈال سے لٹکا دیا ہے۔۔

"بیارا ـــ بے آرا۔۔"

اس بڑے سے پہاڑ کی چوٹیوں پر بڑے بڑے شترمرغ کیوں منڈلا رہے ہیں؟ پھر یہ کچھ دیر کے لیے پہاڑ پر اترتے ہیں، کھاتے ہیں اور پھر اڑ جاتے ہیں۔۔

میں نے پہاڑ پر چڑھنا شروع کر دیا ہے۔۔

آج تین دن سے پہاڑ پر چڑھ رہا ہوں، مگر ابھی بہت نیچے ہوں، انگور اب میرے جھولے میں کم رہ گئے ہیں اور انگور کی شراب بھی کم ہے ـــ مجھے تین دن شاید اور چوٹی کی سطح پر پہنچنے میں لگیں گے۔

تین دن کے مزید سفر کے اختتام پر میں چوٹی کی سطح پر کیا دیکھ رہا ہوں ـــ؟

یہاں تو ہر طرف ہیرے، زمرد، لعل اور جواہر بکھرے ہیں . . . ان میں بڑے بڑے بھی ہیں اور چھوٹے چھوٹے بھی . . .

اور لوگ کشتیوں سے پہاڑ کے کنارے پر آتے ہیں اور گوشت کے بڑے بڑے لوتھڑے غلیل نما کسی بڑی سی چیز سے اس پہاڑ پر پھینکتے ہیں، جنہیں شتر مرغ اٹھائے جاتے ہیں اور کشتی والے تیروں سے ان کو مار کر گرا دیتے ہیں اور گوشت کے لوتھڑوں میں چپٹے ہوئے ہیرے جواہر اور لعل لے لیتے ہیں ــــ

اور تب لوگو!

میں نے گوشت کے ایک بڑے سے لوتھڑے کو پیٹھ پر باندھ لیا اور اپنا جھولا بڑے بڑے جواہرات سے بھر لیا، اپنے پھٹے کپڑوں کی پوٹلیوں میں، جواہرات کو بھر کر گلے اور کمر میں لپیٹ لیا . . .

پہاڑ پر چپکا اوندھا پڑا رہا . . . کہ ایک شتر مرغ نے مجھے گوشت کا لوتھڑا سمجھ کر اٹھا لیا

کشتی والوں نے اپنے تیروں کا رخ میری طرف کر دیا ــــ میں چلایا . . . تیر مت چلاؤ . . . میں آدمی ہوں، تیر مت چلاؤ . . .

پھر لوگو! انھوں نے تنی ہوئی کمانوں کو ڈھیلا کر لیا اور تیر اپنے ترکش میں واپس لے لیا ــــ

شتر مرغ میرے بوجھ سے تھک کر ایک بڑے مکان کی چھت پر اترا تو میں نے جلدی سے اپنے آپ کو رہا کر لیا ــــ

اتنے بڑے بڑے جواہرات اس شہر کے لوگوں نے کبھی دیکھے ہی نہیں تھے، ان میں سے چند میں نے حاکم شہر کو نذر کیے اور باقی کے بازار میں اتنے دام لگے . . . اتنے دام لگے . . .

کہ میرے چوتھے سمندری سفر نے مجھے مالدار ترین آدمی بنا دیا۔

لوگو! سفر وسیلۂ ظفر ہوتا ہے کہ اس میں صعوبتیں بھی ہیں مگر تقدیر کی گرہیں کھل جاتی ہیں . . .

"بے ایرا ــــ، یہ کتنے بجے ہیں؟"

"سر! ستائیس روپے ہیں ــــ"

"تو یہ ستائیس تمھارے ہیں ــــ! تم نے جی خوش کر دیا ــــ میں طوران پہنچ کر تمھاری سفارش افراسیاب سے کر دوں گا ــــ"

آج مجھے ایک ضروری خط لکھنا ہے:

". . . تو پیاری بہن!

بات یہ ہے کہ تم وہاں اجنبی گئی تھیں اور اجنبی ہی رہیں بلکہ ایسا ہوا کہ

انھوں نے تمھیں دشمن سمجھ لیا، کیونکہ تم اپنی اور غیر مٹی کا فرق بھول گئیں، تم نے دونوں مٹیوں کی خوشبو کا فرق محسوس کرنے کی کوشش نہیں کی، مگر میں ان معاملات پر کیا بات کروں؟ تم کوئی اکیلی تھوڑا ہی ہو، تم نے اپنی جیسی ہزاروں کو بے حرمت ہوتے دیکھا اور سنا... ان کے ہاتھوں کی چوڑیاں ٹوٹ گئیں، ان کی کوکھ اجڑ گئی ــــ تمھارا کیا ہوا؟

تمھارا یہ بھائی دن رات اس تردد میں رہا کہ پتہ نہیں تم کس حال میں ہو... میں تمھارے پاس نہیں آسکتا اور پتہ نہیں تم آؤ گی تو کس حال میں آؤ گی ــــ آجاؤ تو پھر میں باقی سفر پورا کرا دوں...

پوری بات نہ میں لکھ سکتا ہوں، نہ تم لکھ سکتی ہو، مگر پوری بات تم بھی جانتی ہو، میں بھی جانتا ہوں، اس لئے تم کسی صورت سب کے ساتھ آجاؤ ــــ"

آج مجھے سپلائی کا ایگریمنٹ کرنا ہے۔

"میں فلاں، پروپرائٹر فلاں...

اور...

میں کام وقت پر مکمل نہ کر سکوں تو کلاز نمبر، کے مطابق بچے ہوئے کام کی رقم کا ــــ فی صد ماہ بطور جرمانہ... زرِ ضمانت سے کاٹ لیا جائے گا۔

آج مجھے اداریہ لکھنا ہے:

"ملک میں ایسا لگتا ہے دو ٹکوں میں دو صدیاں بیت گئی ہوں دو ٹیگ پہلے جسے دو سو روپے تنخواہ ملتی تھی وہ اوسط زندگی گذار لیتا تھا اور آج آٹھ سو تنخواہ میں سے دو سو صرف مکان کا کرایہ ہوتا ہے، ساٹھ روپے ماہوار سے کم پر کھانا پکانے کے لئے نوکر نہیں ملتا ہے... دو سو... اور بچوں کی تعلیم... جمہوریت میں تعلیم بھی مہنگی ہوتی ہے اور یونیورسٹی کا معیار دن بدن گر رہا ہے...

وزیر اعظم نے کہا ہے..."

اردو کانفرنس میں تقریر کرتے ہوئے میں نے کہا تھا:

"اردو کو گھروں میں زندہ رکھئے (میرے گھروں میں کوئی بچہ اردو نہیں جانتا) کیونکہ یہ گھروں میں ہی اجنبی ہوتی جا رہی ہے۔ یونیورسٹیوں اور کالجوں میں اردو

ایم۔اے کی پڑھائی سے اردو پروفیسروں کی بڑھتی ہوئی تعداد سے اردو زندہ نہیں ——
رہے گی (میرا بھائی ریڈر ہے اسے پروفیسر بنوانا ہے) یہ تو گھروں میں زندہ رہے گی...
گھروں میں اردو کی جڑیں مضبوط کیجیے ——!"

"ٹھہرو! ٹھہرو!"
مگر یہ الفاظ میرے حلق سے باہر کہاں نکل پاتے ہیں، یہ حلق سے نکلیں تب تو کوئی سے گا یہ محض لبوں
سے باہر آتے ہیں اور ہواہیں تحلیل ہوجاتے ہیں اور کوئی نہیں ٹھہرتا ——
دروازہ پیٹے چلا جارہا ہے، کھڑکیاں بجتی چلی جارہی ہیں،
کون ہو بھائی؟
کوئی آواز نہیں آتی، سوائے دستک کی آواز کے،
میں آوازیں پہچان سکتا ہوں مگر دستک کی آواز کیسے پہچانوں؟
قدموں کی چاپ... قدموں کی چاپ...
"ریوا آرہی ہے! سالے ریوا آرہی ہے، چپ رہو!
"کیسے پہچانا؟"
"قدموں کی چاپ سے!"
"بہت اچھے! عرفان کی کون سی منزل ہے یہ؟ کہ قدموں کی چاپ تک پہچان لیتے ہو ——
عشق مجازی!"
وہ منزل تھی کہ قدموں کی چاپ پہچان کر تم ریوا کے استقبال میں کھڑے ہوجاتے تھے اور میں
مسٹر نثار! تم ابھی کس منزل میں ہو؟ ریوا کس منزل میں ہے؟
مسٹر نثار! صمد حسین کا ایک فون مجھے ملا تھا، سالے نے بہت ساری گالیاں دیں اور تب بتایا کہ
تم سے اس کی ملاقات نیویارک میں ہوئی تھی... صمد حسین جو ہمارے ساتھ انگریزی میں بی اے فیل ہو
گیا تھا... اور تب کسی امریکی یونیورسٹی میں پتہ نہیں کس الم غلم مضمون میں پروفیسر ہے، اور مسٹر نثار وہ
صمد حسین امریکی انگریزی بولتا ہے تو لگتا ہے، وہ آج بھی اتنی ہی انگریزی جانتا ہے، جتنی بی اے میں فیل
ہوتے وقت جانتا تھا۔ وہ کئی کتابوں کا مصنف ہے، ریسرچ کر چکا ہے... نیویارک میں تم اس سے ملے
تھے...
مگر تم ادھر سے ہوتے ہوئے راجہ کے ملک گئے اور پھر وہاں سے...

تو تم مجھ سے نہیں ملے کیونکہ میں . . .

کیونکہ میں تو تمھارے دوسری بار پالا چھو لینے کے بعد مر گیا تھا، پھر تم مردے سے کیوں ملتے ؟

تم نے اچھا کیا مسٹر نثار، ماضی کو یاد کرنا، اس سے جذباتی طور پر منسلک رہنے کو بیماری کا نام دیا جاتا ہے . . . اور اس بیماری میں، میں گرفتار ہوں ـــــ ریوا بھی شاید . . . شاید . . .

ریوا، پانچ بجے شام میں اپنے شوہر کے تھری اسٹار ہوٹل کی تیسری منزل کے ایر کنڈیشنڈ فلیٹ میں کبھی کبھی سی آتی ہے، تو اس وقت اس کا شوہر تیسری منزل چھوڑ چکا ہوتا ہے، کیونکہ اسے تھری اسٹار ہوٹل کی چھٹی منزل پر اپنے چیمبر میں بے شمار کام ہوتے ہیں . . .

"میں قادری !

"اپنی زندگی سے بہت خوش ہوں، میری بچی دہرہ دون میں ہے اور میرا بچہ اجمیر کے ایک اچھے اسکول میں ہے . . . وقت کو میں قید نہیں کر سکتی تھی . . . کون قید کر سکتا ہے سو وقت بہتا جا رہا ہے . . ."

"سچ مجھے بڑی خوشی ہوئی تم سے مل کر . . . کتنے دنوں بعد ملے ؟ براڈوے کی ملائی . . . مشتان بھنڈار کے رس گلے . . . ریوا میری جانب نہیں دیکھ رہی تھی، وہ تو کھڑکی کے پار 'براڈوے' کے پاس اس نالے کو شاید پار کر رہی تھی جو . . . قادری ! کبھی لگتا ہے وقت دھیرے دھیرے بہہ رہا ہے، کبھی لگتا ہے تیزی سے بھاگ رہا ہے . . . کبھی لگتا ہے وقت کہاں سے آتا اور کہاں جاتا ہے، براڈوے . . . کیا یہ رسٹوراں ابھی ہے ؟"

"نہیں اس کا مالک مر چکا ہے، پھر وہ شہر بہت ترقی کر گیا اور براڈوے کی جگہ پر 'اسکینڈل پوائنٹ' نام کا ایک بار اور رسٹوراں کھل گیا ہے۔"

'اسکینڈل پوائنٹ' ریوا نے دہرایا۔

"براڈوے . . . براڈوے اب کہاں ہو سکتا ہے، اب ہر قدم پر ایک پوائنٹ ہے اور ہر قدم پر اسکینڈل ہے، اب آدرش نہیں ہے، اب راستے نہیں ہیں، اب سنگ میل نہیں ہیں، اب منزل . . . مگر قادری اتیس سال بعد بھی تم میں کوئی CHANGE نہیں ہے ؟

مگر تم میں بھی CHANGE کہاں ہے، مجھے تو لگتا ہے، تم کلاس کی بنچ پر بیٹھی ہو اور اپنی بنرجی کا انگلش لکچر سن رہی ہو . . . ریوا نے مجھے غور سے دیکھا اور پھر کہا . . .

"کوئی CHANGE نہیں ؟ اس نے گردن کو ایک ایسی مسکراہٹ کے ساتھ جھٹکا، جس میں تیس سال کا کرب تیس سال کی تلاش کے آبلے مسکرا رہے تھے . . .

"قادری! بس مجھے دس منٹ دو، میں تمہارے لئے ناشتہ لگواتی ہوں اور ذرا WASH

کرلوں"... وہ ڈرائنگ روم سے ملحق ایک کمرے میں چلی گئی،

میں نے ایک ہندی رسالہ ٹیبل پر سے اٹھالیا۔

اردو کے ایک مشہور کوی کی "گجلوں" کو پڑھنے لگا ___

ہندی میں گجلوں کے امکانات پر اداریہ پڑھا... ریوا آگئی تھی ___

ناشتہ بھی آگیا تھا...

ریوا نے مجھے غور سے دیکھتے ہوئے کافی کا گھونٹ لیا ___

"قادری! ایک بار بشوا ناتھ یہاں آیا تھا، تمہارا ذکر آیا تو کہنے لگا، قادری لاکھوں کا آدمی ہے،

سرمایہ دار ہوگیا ہے... تم نے لکچراری کب چھوڑی؟

"لکچراری تو میں نے چھ سال کی... پھر میں سرمایہ دار بن گیا، بشوا ناتھ ٹھیک کہتا تھا، کیونکہ

بشوا ناتھ یا کوئی بھی میرے اندر کے اس قادری کو نہیں دیکھ سکتا، جس کے بارے میں تم کہا کرتی تھیں...

قادری ہماری تحریک کی جان ہے اور اس کے اندر ایک فنکار ہے... تو ریوا ہوا یہ کہ فنکار کو سرمایہ داری

نے دبا دیا اور تب وہ قادری مرگیا، جو تحریک کی جان تھا مگر ریوا یہ اندر کا فنکار... اس نے مجھے بڑی

اذیتیں دی ہیں، یہ مجھے ہر کام پر ٹوکتا ہے، ہر قدم پر روکتا ہے اور..."

ریوا نے مجھے بہت غور سے دیکھا... اور لمبی سانس لے کر کہا ___ "ہوں!"

"تو قادری، بات یہ ہے کہ جب راستے تنگ گلیاں بن جائیں اور ہر طرف اسکینڈل پوائنٹ

ہوں تو... مگر تم مجھے لکھ پتی نہیں لگتے ___؟"

"یہ میری دوسری بدنصیبی ہے ___ مجھے لکھ پتیوں کے بازار میں ایک لیکھک سمجھا جاتا ہے

اور لیکھک جو اصلی لیکھک نہیں ہیں، مجھے چیمبر آف کامرس کا وائس پریسیڈنٹ سمجھتے ہیں... ریوا!

آدمی، آدمی کو نہیں سمجھتا... آدمی اپنے آپ کو نہیں سمجھ پاتا... ریوا کی نظریں کھڑکی کے پار

اس پیڑ پر جمی ہوئی تھیں، جن کے پتے فالسئی رنگ کے تھے...

"اک بات پوچھوں؟" میں نے ریوا سے اجازت طلب کی۔

"کمال ہے... کیا اس کے لئے تمہیں مجھ سے اجازت لینی ہوگی؟ اور پھر کہتے ہو کوئی CHANGE

نہیں..."

اصل میں CHANGE کا کوئی نام نہیں ہوتا، شاید اس کا کوئی چہرہ بھی نہیں ہوتا ___ یا شا

ہوتا ہو! مجھے لگتا ہے اس کا صرف اثر پڑتا ہے، اس کا سایہ ہوتا ہوگا۔۔۔خیر، اپنا سوال پوچھو۔۔۔میں تو تم سے ملنے کے بعد اس کمرے میں نہیں ہوں۔

"پھر تم کہاں ہو"؟

"یہی تمھارا سوال ہے؟"

"نہیں، سوال یوں ہی اٹھ کھڑا ہوا ہے۔۔۔ویسے میں پوچھنا چاہتا تھا — کہ تم نے ہائر اسٹڈیز کے لئے فزکس کو کیوں چنا؟ تم تو اتنی بار 'شاید' جوڑتی ہو ہر بات میں کہ لگتا ہے تم پر سائنس نے کوئی اثر ہی نہیں ڈالا۔۔۔پھر فزکس کیوں؟"

"ریوا اچانک بہت زور سے ہنسی۔۔۔

"ایک وقت ہوتا ہے، جنون کا، پاگل پن کا — اور یہ وقت شاید سب پر گذرتا ہے، جس پر پچیس تیس سال بعد غور کیا جائے تو کوئی معنی سمجھ میں نہیں آتے — اور آج اس کے کوئی معنی نہیں نکلتے۔۔۔"

خاموش ہو کر ریوا اٹھی اور کھڑکی کے پاس کھڑی ہو کر اندھیرے میں چھپڑکے ہوئے جگنوؤں کی طرح کے شہر کو دیکھنے لگی — وہ کہاں تھی؟ زمان و مکاں کی قید سے آزاد۔۔۔خاموش ریوا۔۔۔پاگل۔۔۔وہ کن جگنوؤں کے جنگل کو کس اندھیرے میں گھور رہی تھی؟

پھر وہ مڑی۔۔۔اور کہنے لگی۔۔۔

"تم پر کیا وہ پاگل وقت نہیں آیا تھا۔۔۔آیا تھا۔۔۔تم پر بھی آیا تھا۔۔۔میں اس کی گواہ ہوں جبھی تو تم نے جمہوریت کے سورج کی پہلی کرن کو موٹی دیواروں کے پار دیکھا تھا، دیواریں پاگل پن ہی میں شیشے کی دیواریں لگتی ہیں، ورنہ ایسے تو باہر جمہوریت کا پہلا آفتاب طلوع ہو رہا تھا اور تم موٹی دیواروں کے اندر اسے تلاش کر رہے تھے۔۔۔تم اس تک نہیں پہنچے، وہ تم تک نہیں پہنچا۔۔۔مگر تمھارے سینے میں کون سا چراغ تھا جس نے اس سورج کے اندھیرے کو ہرا دینے کی بات سوچی تھی۔۔۔ہر اندھیرے۔۔۔

"میری بات پوچھی ہے تم نے؟"

"میں نے تو — کے بعد سائنس چھوڑ کر آرٹس لینے کا ارادہ ہی کیا تھا، انگریزی آنرز کے ساتھ مگر ان دنوں۔۔۔تمھیں یاد ہوگا۔۔۔ان دنوں۔۔۔کرسٹوفر کاڈول ہمارے درمیان ادبی تنقید کا ارسطو سمجھا جاتا تھا در ہم ILLUSION AND REALITY کے درمیان جھول رہے تھے۔۔۔ ....ILLUSION

ہُنہہ!"

ریوا کچھ دیر خاموش کافی کی پیالی کو گھورتی رہی . . . پھر نظریں نیچی کر کے پتہ نہیں قالین کو اتنے غور سے کیوں دیکھنے لگی . . .

تب حضرت نثار نے بڑے جوش میں آکر میرے گھر کے کھانے کی میز پر گھونسہ مار کر کہا۔

"فزکس کے بغیر کاڈول کو سمجھا نہیں جا سکتا . . . نتیجے میں جھنجھنا کر کئی چھوٹے بڑے پلیٹ ڈائننگ ٹیبل پر سے لڑھک کر ٹوٹ پھوٹ گئے . . ."

ریوا یہ کہہ کر اس طرح ہنسی جیسے مسرت کا سارا عطر اس نے اپنی ہنسی میں حل کرنے کے بعد اذیت کی تلخی بھی اس میں ملا دی ہو . . .

فزکس کے بغیر . . .

"تو قادری! تم بھی تو تھے اس وقت . . . تو میں نے حضرت نثار سے پوچھا —

"آپ نے فزکس کا مطالعہ کب کیا؟

حضرت نثار . . . حضرت نثار نے کہا تھا، یہ اس کی بد قسمتی ہے کہ سائنس کا طالب علم نہیں رہا ہے . . . ورنہ وہ یقیناً فزکس کا مطالعہ کرتا . . .

"صرف کاڈول کو سمجھنے کے لئے؟" میں نے پوچھا تھا —

حضرت نثار نے کہا تھا —

"صرف لگا کر تم کاڈول کی اہمیت کو کم کرنا چاہتی ہو، یا میری بے بسی کا مذاق اڑانا چاہتی ہو . . . مارکسی تنقید ہی سائنس اور خصوصاً فزکس کی مدد کے بغیر نہیں سمجھی جا سکتی اور . . . ایک اور ایک مقصد کے لئے آدمی پوری زندگی وقف کر دیتا ہے . . . آگہی کی خاطر آدمی دنیا کی کتنی نعمتوں سے محروم رہ کر اذیتیں مول لیتا ہے . . . اور تم . . . ریوا . . .؟"

ریوا نے قالین سے نظریں ہٹا کر مجھ پر گاڑ دیں اور محرومانہ طنزیہ ہنسی بکھیر کر بولی . . . ایسے کہ وہ جیسے مجھے نہیں خلا میں دیکھ رہی ہے . . .

"وہ پاگل پن کس پر نہیں چھاتا؟ . . . اور کاڈول راستے ہی میں کہیں چھوٹ گیا" . . . اور فزکس میرے اور ادب کے درمیان آگیا — فزکس، کوئی رشتہ نہیں بنا سکا — اور اب اتنی دیر سے مجھے پتہ چلا کہ کاڈول کا فزکس کا مطالعہ مبتدیوں جیسا تھا . . . ناقص . . . ناکمل . . ."

اتنی دیر میں تو پاگل زمانہ ماضی بن چکا تھا اور جب آگہی آئی تو میں نے ایٹمک انرجی میں خود کو کام کرتے پایا . . . حضرت نثار موٹر سروس چلانے کا کام سنا ہے کرنے لگے تھے — انھیں جغرافیائی علم

کی سیاست زدگی نے شاید بتایا کہ جب ایک ملک کے بیچ کوئی لکیر کھینچ دے تو اس پار موٹر سروس کا ہی کام کرنا چاہئے... شاعری، انقلاب، کاؤدل... ا... ا... ا... ا —"

ریوا نے قہقہہ لگایا...

میں نے غور سے ریوا کو دیکھا...

"تمہارے لئے تھوڑی اسکاچ لاؤں قادری؟"

وہ اٹھی اور اندر کمرے سے اسکاچ لے آئی... گلاس میں اسکاچ انڈیلتی ہوئی بولی...

"ایک دو پگ میں کوئی حرج نہیں اور قادری، میں تو بارہ بجے تک یوں ہی کوئی کرائم اسٹوری، کوئی جاسوسی ناول پڑھتی رہتی ہوں —"

"آج تم آگئے ہو تو لگتا ہے میں اس پہاڑی علاقے کے کم آباد شہر کی چوڑی سڑک پر آگئی ہوں، جس پر براڈوے تھا، جس پر ہمارے جلوس نکلا کرتے تھے اور ان پر لاٹھی چارج ہوا کرتا تھا اور وہاں — وہ جو نظام صاحب ہمارے مقدمے مفت میں لڑتے تھے، وہ کسی فرقہ وارانہ فساد میں مارے گئے... یہ سب کیا ہے قادری... وہ... نظام صاحب... رائے کتنی بار سلاخوں کے اندر گیا اور وہ اسے باہر لائے — اور... وہ کون پاگل تھے جنہوں نے ہمارے اس شہر کو... خیر چھوڑو... کن کن شہروں اور شاہراہوں کا ماتم کیا جائے۔

"لو... تم ابھی تک گلاس خالی نہیں کر پائے؟"

"نہیں... بس رہنے دو!"

"تمہاری "بس رہنے دو" کی عادت ابھی تک چھوٹی... آج تم کتنے دنوں بعد ملے ہو — اور وہ بھی یوں کہ تم سے مجھے..."

"ایسا کرو... قادری کہ تم آج رک جاؤ... میں چاہتی ہوں تم سے اکٹھے تیس سال کی باتیں کروں۔ مجھے فرصت ہی فرصت ہے۔ میرے شوہر سے تم چند منٹوں کے لئے ملے ہو، جانتے ہو وہ کتنا ذہین آدمی ہے، میں اس کی ذہانت سے دنگ ہوں... وہ تھری اسٹار ہوٹل کو اس طرح چلاتا ہے جیسے کوئی معمولی سا کام ہو... اور قادری! اس نے مجھے کیا نہیں دیا... کیا نہیں دیا... یہ کہتے کہتے مجھے لگا ریوا کی آنکھیں شاید بھیگ گئیں اور وہ اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلی گئی —

مگر وہ جلد ہی لوٹ آئی...

"لو دیکھو، کتنا خوبصورت ٹیبل لیمپ ہے، اسے میرا تحفہ سمجھو اور اپنی بیوی کو دے دینا پتہ

نہیں اسے پسند آئے گا یا نہیں ... تمھیں تو پسند ہے ؟"
اور آج تم رک ہی جاؤ ...
"رک جاتا ... تم کہتیں اور میں نہ رکتا ... مگر میرا آج ہی ریزرویشن ہے ، گیارہ بجے رات میں ...
ریوا بجھ سی گئی ...
"بات یہ ہے ریوا ... کہ میں کاروباری مصروفیتوں کے نیچے ایسے دب گیا ہوں جیسے کوئی ملبہ ہوں اٹھنا چاہتا ہوں مگر مجھے کاروبار کے بوجھ اٹھنے نہیں دیتے ... یہاں تک کہ میں ... میں ماضی کو صرف سایوں کے روپ میں دیکھ پاتا ہوں ..."
"سنہ اندھیرے تم نے ، میں نے ، نشار نے ، مرنیال نے ، ریکھو نے ، اردن کمار نے اور سب نے اس ریلوے پل کے نیچے انقلاب کو دیکھنے کے لئے ساری رات آنکھوں میں کاٹ دی تھی ، اور ساری رات ریلوے لائن کے اوپر آرمی کے سپاہی کے بوٹ کی آوازوں پر غصے سے اپنے دانت بھینچ لیتے تھے ... صبح کا انتظار تھا جو اپنے جلو میں انقلاب لا رہی تھی ، ۹ر مارچ ... مارچ ... ہمارے دلوں کی ہر دھڑکن ۹ مارچ کی تال پر دھڑک رہے تھے ...
مگر ...
تمھیں یاد ہے ریوا ۹ر مارچ کی صبح کو کھڑکھڑاتی ہوئی ٹرین پل کے اوپر پٹریوں پر گذر گئی ... اور ہم نے پورب سے جاتی ہوئی اس ٹرین کی آواز کیسی حسرت اور شکست خواب کے کیسے اذیت ناک احساس کے ساتھ دیکھا تھا ..."
خواب ... سارے کے سارے خواب جھنجھنا کر شیشے کے برتنوں کی طرح ٹوٹ ٹوٹ کر ہمارے آنکھوں میں گڑ گئے ، کیونکہ ہم نے اچانک محسوس کیا کہ ہماری آنکھوں میں کچھ گڑ رہا ہے ، ساری رات کا انتظار
ساری رات کے خواب ...
ریل آگئی ...
جیسے کوئی قیامت آگئی ...
اور انقلاب ؟
میں ٹرین میں بیٹھا ہوں اور میں ایر کنڈیشنڈ کوپے میں میرے سوا کوئی نہیں ہے ۔ ساری کھڑکیاں بند ہیں ، دروازہ بند ہے ، میں نے سب کو مضبوطی اور احتیاط کے ساتھ بند کر دیا ہے ۔
اور ہر کھڑکی کے پاس کوئی کھڑا ہے

ہر کھڑکی پر کوئی آواز دے رہا ہے
یہ کون سا اسٹیشن ہے...
یہ کون سا اسٹیشن ہوگا، جو کھڑکھڑاتا ہوا گذر گیا
یہ ہفت خواں کی کون سی منزل ہے... کون سی منزل ہے یہ؟
کوئی اژدہا؟
کوئی دیو سپید؟
کوئی جادوگر؟
کیکاؤس جانتا ہے، اس کا غلام رستم آئے گا۔
کیونکہ غلام، غلام ہوتا ہے —
اور صرف وہی اپنے سہراب کے سینے میں خنجر گھونپ سکتا ہے! ☐

ذری، فروری، ۱۹۷۹ء

۲۹۸/۱۹ مورج منشن، ٹاپ فلور،
شاستری مارگ، کرلا، بمبئی-۷۰۰۰۴

مومن مشتاق صدیقی

آسیب

ہمالیہ کی طرح بلند، گنگا کی طرح پوتر اور آکاش کی طرح اسیم ـــــ یہ مضبوطی لیکن اف ـــــ وہ مضبوط تھا لیکن بے حد تھکا ہوا۔ قریباً دو سال سے وہ جانے کن کن چیزوں کے درمیان گھرا ہوا تھا اور یہ گھیرا دن بدن تنگ ہوتا اور سکڑتا جا رہا تھا دس برس کا شور و ہنگامہ، گندگی، سڑاند اور بو اور ڈھیر ساری جس میں اگلے ہوئے الفاظ کیڑوں کی طرح کلبلا رہے تھے ـــــ نہ جانے اس کے ساتھ کیا ہونے والا تھا۔ اپنے آپ سے اسے وحشت سی ہوگئی تھی اکثر راہ چلتے چلتے وہ چونک جاتا جیسے کوئی اس کے وجود پر مسلط ہونے کی کوشش کر رہا ہو ہر جگہ ـــــ ٹرینوں میں، بسوں میں، آفسوں میں، سڑکوں پر فلموں میں، اخباروں میں، ریڈیو پر، ٹیلی ویژن پر ہر جگہ بس ایک ہی وژن ـــــ وژن ـــــ اور وژن۔

راستوں پر اسے اپنے سامنے تاروں کی باڑھ نظر آتی اور اس کے درمیان سے گذرتے ہوئے وہ الجھ جاتا ـــــ ہاتھ پاؤں چلائے جاتا لہو لہان ہو جاتا ـــــ اور اسے خون میں ڈوبا ہوا دیکھ کر زمانے سے اس کے ہمراہ رہتے ہوئے پڑوسی اجنبی بن جاتے ـــــ بیوی بے حال ہو جاتی ـــــ "تم راستہ بدل کیوں نہیں دیتے؟" ـــــ وہ اسے سمجھاتی۔ سبھی لوگ صحیح سلامت اپنے اپنے گھروں کو واپس لوٹ آتے ہیں ـــــ تمھیں یہ کیا ہو جاتا ہے؟ کہیں تم پر کسی کا سایہ تو نہیں پڑ گیا؟ ـــــ سایہ ـــــ آں ہاں ـــــ لیکن تمھیں کیسے معلوم ہوا وہ بجلی کی طرح کوندتا۔ دروازے اور کھڑکیوں کو خوب ہلا ہلا کر دیکھتا برابر بند تو ہیں؟ سب لوگ جلدی سو جاتے لیکن اس کی آنکھوں میں تو کرچیاں گھس گئی تھیں نیند کہاں تھی؟ جو جاگ رہے تھے وہ دیواروں کے درمیان تھے۔

بارہ بجے وہ چونک پڑا۔ کسی کے آنے کی آہٹ ہو رہی تھی ـــــ قدموں کی چاپ نہیں بڑی عجیب سی آواز تھی ـــــ جبٹ ـــــ جیٹ ـــــ چپٹ ـــــ کوئی کھڑکی کے پاس آکر کھڑا ہو گیا گھڑی کی ٹک ٹک بند ہو گئی۔ وقت رک گیا ـــــ اس نے اپنی ساری قوت کو ایک مرکز پر سمیٹا اور کھڑکی کی طرف چھلانگ لگائی مگر وہاں کوئی بھی نہ تھا ـــــ سامنے لگا ہوا گلاب کا پودا سوکھتا جا رہا

تھا اور گلی کی دیوار پر آفسٹ پر چھپے ہوئے بڑے بڑے خوبصورت پوسٹر لگے ہوئے تھے ـــــ اور ـــــ لوگ سو رہے تھے۔

صبح اس نے اپنی بیوی سے کہا ــــ "سنو وہ سایہ کل پھر آیا تھا میں نے اسے اپنی آنکھوں سے دیکھا لیکن مجھے جاگتے دیکھ کر وہ غائب ہوگیا آج میں ساری رات جاگوں گا ہو نہ ہو وہ کوئی آسیب ہی ہے میں اسے زندہ پکڑوں گا۔" یہ لو کھانا اور سیدھے سیدھے کام پر جاؤ۔ بیوی تنک کر بولی۔ تم کوئی نئی بات نہیں بتلا رہے ہو ــــ سب جانتے ہیں اس کے بارے میں اور سب ڈرتے ہیں اس سے صرف تمھارے ہی گھر نہیں ہر گھر میں وہ چکر لگاتا ہے لوگ سر شام ہی دروازے بند کرکے سو جاتے ہیں ــــ تمھیں معلوم نہیں بھینٹ چڑھانے کا زمانہ آگیا اسے بھینٹ مل جائے گی وہ چلا جائے گا۔ آج تنخواہ کا دن ہے تم جلدی گھر آنا ــــ بیوی کی باتیں اس نے سنی ان سنی کردیں اور جاتے جاتے کہا ــــ "تم دیکھ لینا ــــ آج وہ نہیں یا میں نہیں۔

گھڑی کا پنڈولم پہلے آہستہ ہوا پھر چلتے چلتے رک گیا ــــ پھر گلاب کا پھول سوکھ کر اپنی ٹہنی سے الگ ہوگیا اور سناٹے میں وہی مخصوص آواز ابھری ــــ چٹ ــــ چٹ ــــ چٹ ــــ سایہ آرہا تھا وہ دم سادھے خاموشی سے اسے دیکھتا رہا اور اس کے دیکھتے ہی دیکھتے وہ سایہ راشن کے ڈبے میں اتر گیا ــــ بڑی پھرتی سے وہ اٹھا اور دوسرے ہی لمحے اس نے ڈھکن کو مضبوطی سے بند کردیا ــــ بعد میں آہستہ آہستہ اس نے ڈھکن کو کھولا۔ اندر کچھ بھی نہ تھا بس مٹھی بھر موٹے موٹے چاول کے دانے اندر پڑے ہوئے تھے۔ گھبرا کر اس نے نظریں دوڑائیں سایہ اب کپڑا رکھنے کی پیٹی میں گھس رہا تھا تیر کی طرح وہ وہاں پہنچا مگر اس کے ہاتھوں میں صرف پھٹے ہوئے کپڑے ہی آئے اور ابھی وہ ان کپڑوں سے الجھ ہی رہا تھا کہ سایہ پیسہ رکھنے کے ڈبے میں گھستا ہوا نظر آیا اس نے ڈبے کو کھنگال ڈالا اندر کچھ بھی نہ تھا ساری تنخواہ غائب تھی۔ چٹ ــــ چٹ ــــ چٹ ــــ سایہ کھڑکی کے راستے باہر جارہا تھا چیختا چلاتا وہ اس کے پیچھے دوڑا خلاف توقع وہ سایہ بڑی بے جگری سے مڑا اور اس کے سامنے آگیا اس کے پنجے پیچھے کی طرف تھے اور ایڑیاں سامنے کی طرف وہ اسے دیکھ کر مسکرایا اور ہلکے ہلکے قدموں سے باہر نکل گیا ــــ چٹ ــــ چٹ ــــ چٹ۔ بغیر سوچے سمجھے اس نے سایے پر چھلانگ لگادی اور پوری قوت سے اسے اپنی گرفت میں لے لیا۔ تبھی اس کا سر کسی سخت سی شے سے ٹکرایا۔ اپنے ہونٹوں پر اس نے نمکین خون کا ذائقہ بھی محسوس کیا بڑی مشکل سے اس نے سر اٹھایا تو دیکھا کہ وہ دیوار سے لپٹا اسے اپنی گرفت میں لینے کی کوشش کررہا ہے اور دیوار پر آفسٹ پر چھپے ہوئے بڑے بڑے پوسٹر لگے ہوئے ہیں اور ــــ لوگ ــــ

سو رہے ہیں۔

زخم کافی گہرا تھا ــــ نہ جانے وہ کب تک بے ہوش رہا اور جب اسے کچھ ہوش آیا تو اس نے دیکھا چاروں طرف بڑی چہل پہل ہے۔ لوگ دھومیں مچا رہے ہیں وہ گھر سے باہر نکل آیا شور و ہنگامہ اپنے عروج پر تھا ــــ وہ سایہ جو شراب کی طرح ہمارے وجود پر مسلط تھا اس سے ہمیں مکتی مل گئی ہے ۔۔۔ اسے بتایا گیا۔

کیا سچ مچ ؟ ۔۔۔ مارے خوشی کے وہ کانپنے لگا۔ ذہن میں نہیں اور ہاں کے درمیان بڑی زبردست جنگ ہونے لگی۔

"وہ مافوق الفطرت سایہ جو انسانی گرفت سے بالاتر نظر آتا تھا قابو میں آگیا ہے۔ اسے ایک بوتل میں بند کر کے شہر کے سب سے اونچے مینار پر نصب کر دیا گیا ہے کہ لوگ دیکھیں اور عبرت حاصل کریں ــــ" اگر تمھیں دیکھنا ہے تو آؤ ــــ تم بھی آؤ ــــ" آوازوں نے اسے بلایا۔ اس نے دیکھا شہر کے لوگ جوق در جوق بلند مینار کی طرف جا رہے ہیں ــــ وہ بھی ان میں شامل ہو گیا۔

بلند مینار چاروں طرف سے الکٹرک کے کھمبوں اور تاروں سے گھرا ہوا تھا ان پر بے شمار کوؤں نے اپنے گھونسلے بنائے تھے اور تاروں میں بے شمار چمگادڑیں پھنسی ہوئی تھیں اور ان کے درمیان مینار کے سب سے اونچے حصے پر ایک بہت بڑی بوتل نصب تھی اور چاروں طرف انسانوں کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔

"دیکھیے ــــ بوتل میں بند یہ سایہ کیسا چھٹپٹا رہا ہے ؟ ــــ"

"اس کے ناخن ــــ کتنے تیز اور نوکیلے ہیں ــــ"

لاوڈ اسپیکر سے اناؤنسمنٹ ہو رہا تھا۔ اسے کچھ نظر نہ آیا۔ وہ مینار سے کافی دور تھا ــــ دھکے دیتا اور دھکے کھاتا وہ مینار کے قریب پہنچنے کی کوشش کرنے لگا۔

"اس کا چہرہ دیکھیے ــــ کتنا زہر خیز اور بھیانک ہے ــــ"

"غور سے اس کی آنکھوں میں دیکھیے ــــ کتنا زہر ہے اس میں ــــ یہ وہی سایہ ہے جو ۔۔"۔ لاوڈ اسپیکر سے مسلسل آواز آتی رہی۔

مینار کے قریب پہنچ کر اس نے اپنی آنکھوں کو اچھی طرح مسلا ــــ صاف کیا۔ دونوں ہاتھوں کو دوربین کی طرح آنکھوں سے لگایا اور سایہ کو دیکھنے کی کوشش کی مگر اتنے قریب اور اتنے غور سے دیکھنے کے بعد بھی اسے کچھ نظر نہ آیا صاف شفاف خالی بوتل ہی نظر آئی ــــ اس کے اندر کچھ بھی نہ تھا اس نے آنکھوں پر سے ہاتھ

ہٹائے اور قریب کھڑے ایک آدمی سے دریافت کیا ـــــ " بھائی صاحب ـــــ کیا وہ سایہ آپ کو نظر آرہا ہے ؟ ـــــ " وہ آدمی چونک پڑا جیسے سانپ نے اسے ڈس لیا ہو ـــــ اس کی آنکھوں میں ڈر، حیرت اور خوشی کی چمک پیدا ہوئی پھر دوسرے ہی لمحہ وہ چمک اداسی میں بدل گئی ۔ ادھر ادھر دیکھ کر وہ اس کے بالکل قریب آگیا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر آہستہ سے کہا ۔ دوسری لو ۔ آنکھیں پتھرا گئیں ۔ میں کب سے اسے دیکھنے کی کوشش کر رہا ہوں پر اب تک تو وہ سایہ مجھے نظر نہیں آیا بوتل بالکل خالی ہے ۔ اس میں تو کچھ بھی نہیں ہے ـــــ " یہ سُن کر اس کا بدن کانپنے لگا ـــــ اسے لگا جیسے سرد اور گرم ہوائیں بیک وقت اس کے جسم سے ٹکرا رہی ہیں اپنے چاروں طرف اس نے نظریں دوڑائیں ـــــ سبھی لوگ چپکے چپکے ایک دوسرے سے سرگوشیاں کر رہے تھے آنسوؤں کی چمک صاف طور سے ان کی آنکھوں میں دیکھی جا سکتی تھی ۔

ـــــ بلند مینار پر بوتل اسی طرح نصب ہے ۔ لوگ حیرت بھری نگاہوں سے بوتل کی طرف دیکھ رہے ہیں ۔ بوتل میں بند سایہ کسی کو نظر نہیں آرہا ہے ـــــ اور ـــــ لاؤڈ اسپیکر پر اناؤنسمنٹ برابر جاری ہے ۔ □

چودھری محمد نعیم
انگریزی کہانی
ترجمہ: وارث رشید قدوائی

اچھوت

شہر سے ذرا ہٹ کر ایک اور بستی تھی جس میں کچی مٹی کی دیواروں پر اوپلے سوکھ رہے تھے۔ یہ بھنگیوں کی بستی تھی۔ شہر کی صفائی ان کا آبائی پیشہ تھا۔ شہر کی غلاظت، کوڑا کرکٹ اور انسانی فضلہ یہ لوگ گدھوں پر یا ہاتھ سے کھینچنے والے ٹھیلوں پر لاد کر شہر سے باہر پھینک آتے تھے، ان کی عورتیں بھی اسی طرح کماتی تھیں۔ سڑکوں پر جھاڑو دینے کے علاوہ گھروں، غسل خانوں اور پاخانوں کی صفائی کرتے ان کی پشتیں گذر گئی تھیں۔ معزز گھروں کے اندر بھی جہاں ان کے مردوں کا گذر ممکن نہ تھا۔ ان کے بچے گھر ہی پر رہتے تھے سوروں کو چراتے مرغیاں پالتے اور دھما چوکڑی مچاتے تھے۔ عام شہریوں کو ان بھنگیوں کے وجود کا احساس بھی شاید ہی کبھی ہوتا ہو۔ ہاں اتفاق سے کبھی وہ کام پر نہ پہنچیں تب ہر طرف ہائے ہائے ہونے لگتی تھی جیسے اس سال جب ان لوگوں نے تنخواہ بڑھانے کے لئے ہڑتال کر دی تھی تو سارے شہر میں ایک تہلکہ مچ گیا تھا۔ شہر میں چاروں طرف غلاظت کے ڈھیر لگ گئے کیا گھر کے اندر کیا باہر ہر طرف گندگی اور تعفن پھیل گیا۔ تین ہی دن میں شہر والوں نے گھٹنے ٹیک دیئے —— ان دنوں میں خود ان بھنگیوں پر کیا بیتی تھی —— ؟ کچھ بھی نہیں۔ ان کو صفائی کرنے والوں کی عدم موجودگی کا احساس بھی نہیں ہوا۔ ان کے گھروں کے پاس تو کھیت تھے ہی۔ گیہوں کے کھیت۔ ارہر کے کھیت، گنّے کے کھیت اور پھر کائی سے بھرے ہوئے پانی کے جوہڑ بھی کچھ دور نہیں تھے۔ یہ لوگ تو صدیوں سے انہی کھیتوں کو رفع حاجت کیلئے استعمال کرتے آئے تھے اور اس وقت بھی کرتے رہے جب شہر کے عالیشان مکانوں میں سڑاند سے ناک نہیں دی جاتی تھی۔ بستی کے قریب ہی اینٹ اور سیمنٹ کے بنے ہوئے پکے پاخانے جو میونسپلٹی نے ازراہِ عنایت بستی کے مکینوں کے لئے تعمیر کئے تھے شاید ہی کبھی اپنے صحیح مصرف کے لئے استعمال ہوئے ہوں۔ میونسپلٹی کے معزز ممبر نے بڑے طمطراق سے ان پاخانوں کا افتتاح تو کر دیا تھا مگر وہ ہنوز غیر استعمال شدہ تھے۔ بھنگیوں کے بچے ان میں آنکھ مچولی کھیلتے تھے یا کبھی کبھی رات گئے محبت کے ستوائے جوانی کا کھیل کھیلنے آ جاتے تھے۔ کبھی میونسپلٹی کا چپراسی کوئی نوٹس چسپاں کر جاتا تھا، ہاں الکشن کے زمانے میں جب امیدواروں کے دوروں کی ریل پیل ہوتی تو

ضرور ان پاخانوں کی صفائی قابل دید ہوتی۔

ان گھروں سے ذرا پرے کھلے میدان میں ایک بوڑھا پیپل کا درخت کھڑا تھا۔ سوکھا، سہما ہوا۔ پتوں کا نام و نشان نہیں۔ گنی چنی شاخیں تپتے ہوئے سورج کی تپش سے نہ پناہ دے سکتی تھیں نہ سایہ۔ گرمی ہو یا سردی، برسات ہو یا تپتے ہوئے سورج کی تمازت۔ ہر وقت اس پیپل کی بلند شاخوں پر چند گدھ گردنیں تانے ضرور بیٹھے رہا کرتے تھے۔ بڑے بڑے کھردرے جسم والے مکروہ شکل گدھ جو ہر دم سڑے ہوئے گوشت کی تاک میں گردنیں موڑے زمین کو تکتے رہتے تھے۔ مردہ جانوروں کی لاشیں پھینکنا بھی تو ان ہی بھنگیوں کا کام تھا۔ اس کام میں انھیں خاصی منفعت ہو جاتی تھی۔ مردہ جانور اٹھانے کی اجرت بھی ملتی تھی اور کھال و ہڈیوں کے دام الگ کھڑے ہو جاتے تھے۔ رہا ان مردہ جانوروں کا گوشت تو وہ گدھوں کے حصہ میں آجاتا تھا جو پیپل پر بیٹھے ہوئے اپنے رزق کی طلب میں ہر دم موجود رہتے تھے۔ کبھی کبھی انتظار سے اکتا کر آسمان کی بلندیوں میں پرواز کر جاتے۔ اپنے طاقتور بازوؤں کی سلطانی قوتِ پرواز کا سکہ جمانے کے لئے۔ اور پھر جیسے ہی کوئی لقمۂ تر زمین پر نظر آتا وہ چکر لگاتے ہوئے اڑان بھرتے اور نعش پر جھپٹ پڑتے۔

ایک چوڑی سڑک بستی کے گھروں کے سرے اور بنجر میدان کے پاس سے گذرتی ہوئی شہر کی طرف جاتی تھی۔ بستی کا شہر سے فاصلہ کوئی بیس میل کے لگ بھگ ہوگا۔ اس لئے اس سڑک پر سواریوں کی آمد و رفت کی بڑی کثرت رہتی تھی۔ خاص طور پر دفتر کے اوقات پر تو بڑی ہی بھیڑ رہتی تھی۔ صبح صبح دفتر جانے والے لوگ جب بستی میں کھیلتے ہوئے یا سوروں کے پیچھے بھاگتے ہوئے ننگ دھڑنگ بچوں کو دیکھتے یا سرخ سفید مردہ گوشت کی بوٹیاں نوچتے ہوئے لال لال گردنوں والے گدھوں پر نظر ڈالتے تو اس کریہہ منظر سے ان کا جی برا ہو جاتا اور نفرت سے منہ پھیر لیتے۔ شام کو جب تاریکی بستی کو نگل لیتی تھی اور چراغ کی مدھم روشنی کسی جھروکے سے جھانکتی تو پیپل کا پیڑ تاروں کی چھاؤں میں بس ایک مہیب سایہ بن جاتا۔ اس وقت سڑک پر چلنے والے مسافر اطمینان کا سانس لیتے ہوئے گھروں کی راہ لیتے۔

آج بھی ہمیشہ کی طرح بہت سے گدھ پیپل کے پیڑ پر آسن جمائے بیٹھے تھے۔ چند ایک تو سورج کی پو پھٹنے سے قبل ہی آموجود ہوئے تھے باقی بھی بہت سارے سورج چڑھتے چڑھتے آدھمکے۔ رامو نے جب اپنی کوٹھری کے دروازہ سے نکل کر اس جمگھٹ پر نگاہ ڈالی تو ایک معنی خیز مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر آگئی۔ وہ جانتا تھا کہ یہ کس تاک میں بیٹھے ہیں۔ اس کا گدھا آج مر گیا تھا نا۔ بوجھ ڈھوتے ڈھوتے بیچارہ گدھے کے جسم پر زخم ہی زخم ہو گئے تھے جو بڑھتے بڑھتے ناسور بن گئے تھے جن سے خون اور پیپ کی دھاریں

بہتی رہتی تھیں ۔ پھر سارے جسم میں زہر باد ہو گیا اور اب اس کی اکڑی ہوئی لاش پڑی تھی ۔ جس پر مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں ۔ اور ادھ کھلے منھ کے اندر اور باہر جسم پر رینگ رہی تھیں ۔ سورج کی پہلی کرن کے ساتھ ہی گِدھوں کو تر نوالے کی موجودگی کا احساس ہو گیا تھا اور موقع کی تاک میں پیپل کی شاخوں پر براجمان تھے ۔ دھیلک جو حوصلہ مند تھے وہ تو کھسکتے کھسکتے دسترخوان تک جا پہنچے تھے مگر بچوں کی موجودگی میں دعوت کے آغاز کی ہمت نہ پڑی اور مایوسی اور صبر کے ملے جلے جذبات کے ساتھ وہ الوان نعمت کے منتظر ہو بیٹھے تھے ۔ یہ تو معلوم ہی تھا کہ دعوت کا وقت آخر آ ہی جائے گا ۔

رامو بس چند ہی لمحے اپنے دروازہ پر ٹھہرا ۔ گدھے کے مردہ جسم پر بھنکتی ہوئی مکھیوں پر ایک نگاہ ڈال کر وہ آگے بڑھا ، گدھے کی گردن میں پڑی ہوئی پرانی رسی کھول کر احتیاط سے دھوتی کے ساتھ کمر میں ٹھونس لیا ۔ آخر یہ معمولی چیزیں اس کے کام آنے والی تھی ۔ پھر گدھے کی مردہ لاش کو ٹانگوں سے پکڑ کر ادبڑ کھابڑ زمین پر گھسیٹتا ہوا لے چلا ۔ اتنی بھاری لاش کا گھسیٹنا بھی تو آسان کام نہیں تھا ۔ چھوٹے بڑے روڑے اور جھاڑ جھنکاڑ اس کی مشکل میں اضافہ کر رہے تھے ۔ اس کے منھ سے گالیوں کی بوچھار ہو رہی تھی اور اس کے پیچھے شور مچاتے تالیاں بجاتے ہوئے بچوں کا گروہ تھا ۔ کچھ پڑوسی بھی شور و غل سن کر اپنی اپنی جھونپڑیوں سے نکل پڑے ۔ گِدھوں نے رامو کو پیپل کی طرف آتے دیکھا تو کچھ نے پہلو بدلے ، گردنیں گھمائیں اور ایک ایک کر کے بلند آشیاں سے زمین پر اتر آئے ۔ پر امید نگاہوں سے دیکھتے ہوئے ایک حلقہ باندھے رامو کے جلوس میں شریک ہو گئے ۔ بوجھ پھینک کر رامو چار قدم بھی نہ گیا ہو گا کہ انھوں نے چونچیں مار مار کر مردہ انتڑیاں باہر نکال ڈالیں ۔ دعوت عام شروع ہو گئی ۔ پھر کوّے بھی شریک طعام ہو گئے جو لاش کے چاروں طرف پھدک پھدک کر گدھوں کی زد سے بچ بچ کر اپنا حصہ بٹانے لگے ۔ کبھی گدھوں کی یورش سے گھبرا کر اڑ کے دور جا بیٹھتے ۔ دعوت کی کشش پھر کھینچ لاتی تو دسترخوان کے ٹکڑے چننے لگتے ۔ نہ گِدھوں کو کوؤں کی پرواہ تھی نہ کوّے ہی گدھوں سے بہت زیادہ خوف زدہ تھے ۔ جیسے دونوں نے رواداری اور پر امن بقائے باہمی کے اصول کو اپنا لیا ہو ۔

سامنے سڑک ٹریفک کی وہی رفتار تھی ۔ بسیں ، کاریں ، اسکوٹر سڑک کے سینے پر دندناتے ہوئے دوڑ رہے تھے ۔ سواریاں ان گِدھوں کو اور کوؤں کو لاش کی بوٹیاں نوچتے ہوئے دیکھ کر کراہیت سے منھ پھیر لیتے ـــــ اچانک ایک بڑا بھیانک حادثہ ہو گیا ـــــ دو تیز رفتار موٹریں ایک دوسرے سے ٹکرا گئیں ۔ پیچھے آنے والی کاروں کے بریک چیخنے لگے ۔ ایک گاڑی کی پٹرول کی ٹنکی پھٹ گئی اور ایک زبردست دھماکے کے ساتھ الاؤ کی طرح جلنے لگی ۔ کاروں کے دروازے دھڑا دھڑ کھلے اور بند ہوئے ۔ لوگ تیزی سے الٹی ہوئی کاروں کے ڈرائیوروں کو بچانے کے لئے دوڑ پڑے ۔ پر دیر بہت ہو چکی تھی ۔ بمشکل دو جلی ہوئی لاشوں کو برآمد

کیا جا سکا۔ ان کو احترام کے ساتھ گھاس پر سڑک کے کنارے رکھ دیا گیا۔ بستی کے لوگ جائے حادثہ پر اکٹھا ہو گئے تھے ان ہی میں سے ایک پولیس اسٹیشن میں رپورٹ کرنے کے لئے بھاگا۔ رفتہ رفتہ ٹریفک پھر روانہ ہو گئی۔ سڑک پر گذرتی ہوئی کاریں جلتے ہوئے ملبے سے کترا کر اپنی راہ لیتی صرف بھنگیوں کا مجمع لاشوں کی نگرانی اور پولیس سے نپٹنے کے لئے باقی رہ گیا۔ بھیڑ چھٹ گئی۔

دھماکے کی آواز سے سہم کر درختوں کے سارے پرندے اڑ گئے۔ کوؤں نے قریب کے گنے کے کھیت میں پناہ لی۔ اور وہیں سے کائیں کائیں کر کے صدائے احتجاج بلند کر رہے تھے۔ گدھ البتہ اپنی روایتی بے نیازی سے ہوا میں بلند ہو کر فضا میں چکر لگانے لگے۔ پھر جوں ہی ان کی تیز نگاہوں نے زمین پر رکھی ہوئی انسانی لاشوں کو دیکھا تو پیر سکوڑے پر پھیلائے ہوئے ایک ایک کر کے زمین پر اترنے لگے۔ لاشوں سے کچھ فاصلہ پر بکھر گئے۔ لوگوں کی صورتیں تو جانی پہچانی تھیں لہٰذا بے خوف وہ آگے بڑھنے لگے۔ گردنیں تانے ہوئے پر پھڑپھڑاتے ہوئے۔ نیم دائرہ کی شکل میں آگے بڑھنے لگے۔ حلقہ چھوٹا ہونے لگا تب بھنگیوں نے شور مچانا شروع کر دیا۔ اور ہاتھ ہلا ہلا کر چیخ چیخ کر گدھوں کو بھگانے لگے۔ گدھوں کے لئے سخت اچنبھے کی بات تھی۔ یہ لوگ تو پہلے تو ایسے نہ تھے۔ پرانے رفیقوں کی اس بے مروتی پر کچھ گدھ تو رک گئے اور کچھ دھیمے پڑ گئے سوالیہ انداز میں گردنیں موڑ کر حیرت سے تکنے لگے۔ جیسے ان کے احساسات کو چوٹ لگی ہو۔ بھنگیوں کا مجمع ان کو گندی گندی گالیاں دے رہا تھا ان کی ماؤں اور بہنوں کے عجیب عجیب رشتے جوڑنے کا اعلان کر رہے تھے ستمگروں نے تو بے مروتی کی حد ہی کر دی اور ڈھیلے پتھر اٹھا کر مارنے لگے۔ اس اچانک حملہ کا گمان بھی نہ ہو سکتا تھا۔ بڑی انوکھی بات تھی کہ ہمیشہ کے مہربان دوست آج یوں آنکھیں پھیر لیں۔ آخر ان میں نفرت اور دشمنی کہاں سے اور کیوں آ گئی تھی۔ پہلے تو کبھی ایسا نہ ہوا تھا۔ ! آخر گدھوں نے میدان چھوڑ دیا۔ بھاگنے لگے۔ اس گھبراہٹ میں شاید بھول گئے کہ اپنی طاقت مردانہ بھی ہے۔ اڑنے کی بجائے پھدک پھدک کر بے تحاشا اپنے قدیم دوستوں سے دور بھاگنے لگے۔ اس بھاگم بھاگ میں دو بار گدھ تو ایک دوسرے ہی سے الجھ پڑے۔ آخر کار ایک ایک کر کے اپنی پرانی جائے پناہ پیپل کے درخت کے نیچے جمع ہو گئے۔ دشمنوں کی زد سے نکل آئے۔ تب انھوں نے اپنے دشمنوں کی طرف سے منہ پھیر لیا اور گدھے کی لاش پر متوجہ ہو گئے جس کو چھوڑ کر نئے دسترخوان کی طرف بھاگے تھے۔ جلد ہی کوے بھی آپہنچے یہ سب اپنے پیٹ کی آگ بجھانے میں مست تھے کہ ان کو خبر بھی نہ ہوئی کہ کب پولیس آئی اور کب سوختہ لاشوں کو اٹھا کر لے گئی۔ □

نور محمد یاس
۱۴۔ ملیا محل لین
بھوپال ۴۶۲۰۰۱

غزلیں

دھوپ میں آنکھیں ہیں نظریں چھاؤں پر
رنگ ہنستے ہیں مری ایذاؤں پر
شہر کا ماحول بوجھل دیکھ کر
اڑتے پھرتے ہیں پرندے گاؤں پر
سوچتے ذہنوں پہ چھائے دھند کیوں
گرد جمتی ہے کہیں دریاؤں پر
دوش پر ہے ذات کا بارِ عظیم
خود گرا پڑتا ہوں اپنے پاؤں پر
ایک دنیائے حقیقت چھا گئی
سب خیال و خواب کی دنیاؤں پر
بن گئیں زنجیر قاتل کے لئے
شک تھا اس کو ہاتھ کی ریکھاؤں پر
مجھکو کس کے شہر کا دھوکا ہوا ؟
ایک سپنوں کے سنہرے گاؤں پر

جسم اس کا کہ پھول جیسا تھا
ہاتھ لگتے ہی دھول جیسا تھا
روز آپس میں ہم جھگڑتے ہیں
یہ کبھی کوئی اصول جیسا تھا
اکثر آواز دی صلیبوں نے
کب مگر میں رسول جیسا تھا
ایک کانٹا مری ہتھیلی میں
چبھ کے نکلا تو پھول جیسا تھا
خواب ادھورے جو رہ گئے تھے، انھیں
یاد رکھنا ہی بھول جیسا تھا
گفتگو تھی کہ جامۂ ابہام
اختصار اس کا طول جیسا تھا
جانے کیوں آگ سے بنا سورج
ڈوبتے وقت پھول جیسا تھا
یاس نے قہقہے لگائے بہت
آج وہ کچھ ملول جیسا تھا

شہزاد عثمانی
۱۹۶- چونا بھٹی، مالیگاؤں

جاوید شہبازی
۸۳۱- ترکمان گیٹ، علی گڑھ

غزلیں

زندگی ہے پُر شکستہ
سانس کا یہ گھر شکستہ
پتھروں کو شکل دے کر
خود رہا آذر شکستہ
کھا گئے ہیں بستیوں کو
شہر کے منظر شکستہ
خوبصورت شہر میں بھی
گن رہا ہوں گھر شکستہ
تو نہیں تو کون یہ پھر
ہے مرے اندر شکستہ
اب خیال و فکر جیسے
پنچھیوں کے پر شکستہ

پیغام بن کے حلقۂ ترسیل میں رہا
انسان تھا مگر دلِ جبریل میں رہا
محبوس اپنی ذات کی زنبیل میں رہا
اک چشمِ سحر ساز کی تحویل میں رہا
شبنم پہ انعکاس رہا میرا اور میں
خورشیدِ عکس ریز کی قندیل میں رہا
ہر اک سے چاہتا تھا میں توضیحِ زندگی
ہر شخص اپنی بات کی تفصیل میں رہا
خود اپنی شخصیت مجھے مصلوب سی لگی
غرق اس قدر ارادت انجیل میں رہا
تکمیلِ آگہی کبھی جس سے نہ ہو سکی
وہ شخص اپنے درک کی تاویل میں رہا

شاہد میر
لکچرر گورنمنٹ کالج بناس واڑا، ۳۲۷۰۰۱

سرور عثمانی
یونین بینک آف انڈیا گیا (بہار)

غزلیں

یہ زرق برق بدن کا لباس کیا کرتا
اکھڑ چکی تھی زمیں سے اساس کیا کرتا

سنا کے درد بھرے اقتباس کیا کرتا
میں اپنے ساتھ جہاں کو اداس کیا کرتا

ہزار چاہا ملاؤں نگاہ سورج سے
گھنے شجر تھے مرے آس پاس کیا کرتا

یہ اور بات کہ اب مزاج خوں ہے زہر آلود
لبھا رہی تھی لہو کی مٹھاس کیا کرتا

بکھر چکی تھی رگ و پے میں تشنگی شاید
سمندروں سے مگر التماس کیا کرتا

آتے جاتے موسموں کا سلسلہ باقی رہے
روز ہم ملتے رہیں اور فاصلہ باقی رہے

کھا گئیں دریا کی موجیں خواب آور گولیاں
بادبانوں کے لئے پاگل ہوا باقی رہے

آسماں نیلے سمندر کی طرح پیاسا نہیں
حشر تک میرے لہو کا ذائقہ باقی رہے

کل کوئی بوڑھا مصور مجھ سے ملنے آئے گا
اے مرے منصف ابھی تھوڑی سزا باقی رہے

آنے والی نسل خود پہچان جائے گی مجھے
پتھروں کے شہر میں میری صدا باقی رہے

شاعری کرتے رہو، لیکن رہے اتنا خیال!
دشمنوں سے دوستی کا حوصلہ باقی رہے

تقویم

(تبصرہ کے لیے ہر کتاب کی دو کاپیاں بھیجنا ضروری ہے۔ دوسری صورت میں ادارہ تبصرہ شایع کرنے سے معذور ہوگا۔ ادارہ)

ادبی تحقیق : مسائل اور تجزیہ ○ رشید حسن خاں ○ ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ ○ ۲۵ روپے

اردو بڑی مفلوک الحال زبان رہی ہے۔ سرپرستی حاصل ہونا تو بڑی بات ہے حمایت کا میسر آنا بھی امر محال ہے۔ یہ "زبان الغربا" آج بھی ہاتھ سے لکھی جاتی ہے اور فرسودہ ترین طریقے سے چھاپی جاتی ہے، اس لئے نہ کسی کو متوجہ کر پاتی ہے اور نہ توجہ کی مستحق قرار پاتی ہے۔ چنانچہ کاتب کی سہو کی ذمہ داری مصحح صاحب نہیں لیتے، اور سہل پسند کاتب و سنگ ساز حضرات بہت سی تصحیحات کو ربر سے مٹا دیا کرتے ہیں۔ انجام کار ہماری زبان میں معتبر نسخوں کا وجود عنقا سا رہا ہے۔ ادھر جب علمی کام شروع ہوا تو فنِ تحقیق کو بھی کاملاً سائنسی بنانے کی کوشش کی گئی جس کے خود اپنے اصول و ضوابط ہیں۔ اب یہاں پھر وہی رونا کہ یہ اصول و ضوابط کیا ہیں؟ بہت ڈھونڈیئے تو پروفیسر گیان چند جین کے کچھ مضامین اور ڈاکٹر خلیق انجم کی ایک کتاب (متنی تحقیق) کل کائنات ہے۔ اب جا کر اس قحط کا کچھ ادر ازالہ رشید حسن خاں کی تازہ کتاب "ادبی تحقیق : مسائل و تجزیہ" سے ہوا ہے۔ رشید حسن خاں اردو کے چند معتبر ترین محقق میں سے ہیں، اس لئے ان کی تصنیف کا اعلیٰ ترین معیار کی حامل ہونا عین توقع کے مطابق ہے۔

"ادبی تحقیق" دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلا حصہ اصولی مضامین پر اور دوسرا حصہ عملی جائزاتی مقالات پر مشتمل ہے۔ پہلے حصہ میں پانچ مقالات ہیں جن کے عنوانات اس طرح ہیں: کچھ اصول تحقیق کے بارے میں، غیر معتبر حوالے، تحقیق سے متعلق بعض مسائل، تدوین اور تحقیق کے رجحانات، حوالہ اور صحت متن۔ دوسرے حصہ کے مقالات کے عنوانات یہ ہیں: دیوان غالب صدی ایڈیشن، اردو شاعری کا انتخاب، علی گڑھ تاریخ ادب اردو۔ رشید حسن خاں نے ابتدائیہ ہی میں واضح کر دیا ہے کہ بیشتر مضامین مختلف اوقات میں لکھے گئے تھے، اس لئے تکرار کو نظر انداز کرنا ہوگا۔

"ادبی تحقیق" میں بہت سے امور وہ پیش کئے گئے ہیں جو یہ واضح کرتے ہیں کہ کیا ہونا چاہئے لیکن ان کے متوازی ان امور کو بھی پیش کیا گیا جو اس طرف اشارہ کراتے ہیں کہ کیا نہیں ہونا چاہئے۔ ان دونوں پہلوؤں کی

وضاحت بے حد ضروری تھی کیونکہ ہمارے یہاں تحقیق کا اور وہ بھی (خلیق انجم کی اصطلاح میں) متنی تحقیق کا حال کاتبوں اور سنگ سازوں کی ستم رانیوں کے مقابلہ میں کہیں زیادہ قابلِ رحم ہے۔ کیا کیا بوالعجبیاں سرزد ہوتی ہیں اور کیا کیا سفاہتیں عریاں ہوتی ہیں۔ عبرت کے لئے رشید حسن خاں نے بڑے بڑے جغادریوں کو برسرِعام لاکر کھڑا کر دیا ہے۔ جب عبرت ناک مقالوں کا انبار لگ جاتے تو آدمی جھنجھلا اٹھتا ہے، چنانچہ رشید حسن خاں بھی عاجز آکر چند ایک مقامات پر تلخ کام ہوگئے ہیں۔ وہ بھی کیا کریں تصور تو سارا محققوں کی ملاوٹ (ADULTERATION) کے دھویں کا ہے۔ (معافی چاہتا ہوں! ایسی تحقیقات کے مطالعہ کے وقت نہ معلوم کیوں مجھے حقّے کا کڑوا دھواں ستانے لگتا ہے۔ ملاوٹ کے دھویں کی ترکیب کچھ اسی مصیبت میں گڑھ گئی)۔

'ادبی تحقیق' خاصے خشک موضوع پر ہے، لیکن یہ رشید حسن خاں کے اندازِ بیان کا حسن ہے کہ وہ قاری میں غیر معمولی تشویق پیدا کر دیتے ہیں۔ ان کا کوئی دعویٰ بے دلیل نہیں ہوتا، اور دلیل بھی مسکت ہوتی ہے۔ انھوں نے خود اپنے لئے چند اصول سختی کے ساتھ متعین کر لئے ہیں جن کی پاسداری وہ املا سے حوالے تک کرتے ہیں۔ اپنی بات وہ کبھی گنجلک انداز میں پیش نہیں کرتے، وہ ہمیشہ اس امر کی کوشش کرتے ہیں کہ قاری ان کے مافی الضمیر سے شرحِ صدر کے ساتھ آگاہ ہو جائے تحقیق کو اس قدر قابلِ مطالعہ بنانا رشید حسن خاں کا کارنامہ ہے۔

رشید حسن خاں کا متنی تحقیق سے کچھ 'وفاداری بہ شرطِ استواری' کا سا تعلق استوار ہو گیا ہے تنقید اور جائزاتی تحقیق کی ہجو ملیح سے لے کر تعلیل تک پر بھی انھیں چین نہیں آیا ہے۔ خیر یہ اپنی اپنی پسند ہے لیکن میں تو ان کے تنقیدی مضامین کو بھی معیاری تصور کرتا ہوں۔ سیاسی وسماجی پس منظر پر انھوں نے بار بار گرفت کی ہے (ص ۵۹ س ۱۹ - ص ۹۵ س ۱۷ - ص ۹۸ س ۶ تا ۸ - ص ۱۰۰ س ۲ - ص ۱۰۳ س ۱۲ - ص ۱۰۴ س ۳) باتیں تو انھوں نے سب صحیح کہی ہیں لیکن وہ متنی تحقیق کار، جو کاتب و سنگ ساز کو اپنا معلّمِ تحقیق مانتے ہیں (ملاحظہ ہو ادبی تحقیق کا مقالہ "دیوان غالب صدی ایڈیشن) ان کی صف میں آخر آپ معاشرتی تحقیق کاروں کو کیوں نہیں رکھتے۔ ان سیاسی وسماجی پس منظر بیان کرنے والوں سے ذرا یہ تو پوچھئے کہ انھوں نے سماجی علوم کا اصولی وعلمی مطالعہ کس حد تک اور کتنا کیا ہے؟ اس لئے مسئلہ یہ نہیں ہے کہ متنی تحقیق برتر ہے یا سیاسی وسماجی تحقیق بلکہ حقیقت یہ ہے کہ بے علم گھس پیٹھئے دونوں ایوانوں میں غدر مچائے ہوئے ہیں۔ اس کی سرپیٹ لینے والی مثالیں خود رشید حسن خاں نے دی ہیں۔ مثلاً ادبی تحقیق کے صفحہ ۲۷۱ سے ۲۷۴ تک پڑھ ڈالئے اور یہ بتائیے کہ جو حضرات اپنے جوار سے آگاہ نہ ہوں وہ سیاسی وسماجی پس منظر سے کیا آگاہ ہوں گے۔ جس شخص کے نزدیک تدبیر اور دور اندیشی، ستائے جانے اور مفت خوری، لوٹ اور ملک گیری اخلاقی نقطۂ نظر سے قابلِ سرزنش ہوں وہ اخلاقیات سے کتنا بہرہ ور ہوگا، یا جو بدنصیب جبر وظلم کو مسلم آئینِ حکمرانی کے مسلمہ اصول تصور کرتا ہو، یا جو حضرت معین الدین چشتی، حضرت بختیار کاکی، حضرت گنج شکر، حضرت نظام الدین چشتی اور حضرت شیخ نصیر الدین چراغِ دہلی (رحمہم اللہ) کا مذاق جیرات جور کہہ کر اڑاتا ہو (علی گڑھ تاریخ ادب اردو ص ۶۷) اسے آپ سماجی یا تاریخی علوم کا عالم کیسے کہیں گے؟ اس سے سیاسی وسماجی تحقیق کی تعلیل نہیں ہوتی بلکہ فردِ متعلق کی جہالت و خباثت کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ اوروں کے بارے میں علم نہ ہو تو قابلِ معافی لیکن حضرت چراغِ دہلی "مورخ" کے جوار کے تھے صرف چند میل کے فاصلہ کے اور 'مورخ' ہی کی طرح شیوخِ اودھ کے خاندان سے تھے۔ سب جانتے ہیں کہ وہ صاحبِ جائداد خاندان سے تھے اور ہندوستان میں اپنے

خاندان میں پہلے اور آخری شخص تھے جنھوں نے ترک دنیا کی ورنہ وہ گھر گرہستے نہیں تھے۔ تفو بر تو اے عقل و دانش! ایسے کم سواد لوگ یہ بھی معلوم کرنے کی زحمت نہیں کرتے کہ اصل حقیقت کیا ہے۔ مثلاً ایک اور صاحب نے موخر الذکر بزرگ کو 'چراغِ دہلی' کے بجائے 'چراغ دہلوی' لکھا ہے (ص ۲۶۴ س ۳) جیسے یہ لقب نہیں شاعر کا تخلص ہے۔ چہ خوب!

رشید حسن خاں نے املا کو غیر معمولی اہمیت دی ہے، مگر لطف یہ ہے کہ کاتب صاحب ان کو بھی جل دے گئے ہیں۔ وہ شخص جو لفظِ مرکب "بیش تر" (ص ۹۵ س ۱۷) کو الگ الگ لکھنا پسند کرتا ہو، اس کی کتاب میں الفاظِ متغائر "بیاض میں" (ص ۴۳ س ۸) کو مرکب "بیاضمیں" بنا دیا ہے۔ وائے بر حالِ تو! اس کے علی الرغم املا کے سلسلہ میں رشید حسن خاں کو چھیڑنے کو دل چاہتا ہے۔ انھوں نے "بوالہوس" اور "بوالعجبی" کو سادہ پیراہن کر دیا ہے، یعنی "بل ہوسی" (ص ۷ س ۷) اور "بل عجبی" (ص ۱۸۱ س ۱) لکھا ہے لیکن خفیف الحرکاتی، راقم الحروف، بسم اللہ، فی الحال، غلط الکاتب (!) وغیرہ میں سے "ال" کی تحریف نہیں کی ہے۔ آخر کیوں؟ اصول املا تو یکساں ہونا چاہئے نا؟

رشید حسن خاں نے "علی گڑھ تاریخ ادب اردو" کے بارے میں لکھا ہے کہ "راقم الحروف نے اسی زمانے میں اس پر تبصرہ کیا تھا۔ جس کے بعد اس جلد کو واپس لے لیا گیا تھا"۔ یہ سنی سنائی بات معلوم ہوتی ہے کیونکہ شعبۂ اردو یا علی گڑھ تاریخ ادب اردو کے دفتر سے ایسا کوئی مراسلہ جاری نہیں ہوا تھا، البتہ یونیورسٹی پبلی کیشن ڈویژن نے کتاب سپلائی کرنی بند کر دی تھی۔ یہ عمل بھی رشید حسن خاں کے مضمون کی اشاعت کے بعد نہیں ہوا تھا بلکہ شاید انھیں یاد ہو کہ ان کے مضمون سے پہلے میرا مضمون "علی گڑھ تاریخ ادب اردو" پر مئی ۱۹۶۳ء میں شایع ہوا تھا، اور کتاب کی سپلائی میرے مضمون کے شایع ہونے سے پندرہ دن پہلے ہی بند ہو گئی تھی کیوں کہ اس کی تمسخر آمیز غلطیوں کا احباب کے حلقوں میں چرچا ہونے لگا تھا، اور میں اس کا خمیازہ علی گڑھ میں پورے پندرہ سال سے بھگت رہا ہوں۔

'ادبی تحقیق' علمی موضوعات میں سب سے زیادہ فراموش شدہ موضوع پر معیاری اصولی کتاب ہے، جسے رشید حسن خاں جیسے مخلص اور صادق ماہر فن نے اپنے وسیع مطالعات و تجربات کے ماحصل کے طور پر پیش کیا ہے۔ ہمیں یقین ہے اس کتاب کا اپنے استحقاق کے مطابق اعتراف ہوگا اور یہ فن تحقیق میں سنگ میل ثابت ہوگی۔

——— ابن فرید

ایلیٹ کے مضامین

○ مترجم ڈاکٹر جمیل جالبی ○ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی ○ قیمت ۲۵ روپے

جدید اردو تنقید کا مطالعہ کرتے ہوئے ہمیں بار بار یہ احساس ہوتا ہے کہ مغربی تنقیدی افکار و نظریات سے آگاہی ہمارے لئے ناگزیر ہو گئی ہے۔ لاتعداد حوالے، اقتباسات اور اشارے ہمیں قدم قدم پہ بے بس کر دیتے ہیں۔ وہ فن جو ہم نے براہِ راست مغرب سے اکتساب کیا ہے اس کے لئے یہ ایک فطری عمل تھا کیوں کہ اس کے لئے بنیادی اصول ہمیں دیارِ غیر میں ہی میسر آتے ہیں لیکن ہمارے اکثر قارئین کے لئے اصل متن کا مطالعہ اکثر دشوار ہو جاتا ہے۔ اگر زبان کی دشواری معدوم ہو جائے تو پرائی بات سمجھنے میں بھی بڑی حد تک آسانی ہوتی ہے۔ اس احساس نے اردو میں معیاری کتب کے ترجموں کی طرف باصلاحیت اہل قلم کو متوجہ کیا ہے۔ جدید اردو تنقید کے تقاضوں کا احترام کرتے ہوئے ڈاکٹر جمیل جالبی نے ایلیٹ کی تنقید و فکر کو ترجمہ کے لئے منتخب کیا ہے۔

ایلیٹ کا نام ہر اردو نقاد سند اعتبار کے طور پر کم از کم ایک آدھ بار ضرور لے لیتا ہے۔ اب مجھ جیسا ہر قاری یہ جاننا چاہتا ہے کہ ایلیٹ کون ہے؟ کیا لکھتا ہے؟ کیسا لکھتا ہے؟ یہ ترجمہ ایسے ہی قاریوں کے لئے ہے۔ جالبی کے ذہن میں بھی شاید ان قاریوں کا لحاظ تھا چنانچہ یہ کتاب صرف ایلیٹ کے مضامین کا ہی ترجمہ نہیں ہے بلکہ ایلیٹ پر عمدہ تعارفی کتاب بھی ہے۔ دو دیباچوں کے بعد کتاب کا پہلا حصہ ایلیٹ کا ہمہ پہلو مطالعہ ہے۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ جالبی نے جب تنقیدی مضامین کا ترجمہ کیا ہے تو وہ ایلیٹ کو صرف بحیثیت نقاد متعارف کراتے لیکن اس طرح ایلیٹ کا مطالعہ نامکمل رہتا۔ اس لئے انھوں نے اسے ہر اس پہلو سے متعارف کرایا ہے جس سے وہ انگریزی ادب میں اپنا مقام رکھتا ہے۔ یعنی بحیثیت شاعر، ڈراما نگار اور ادیب بھی! ان مطالعوں میں جالبی نے اس کا اہتمام بھی کیا ہے کہ ان کی تحریروں کا مختصر اور جامع تعارف بھی ہو جائے۔ دوسرے حصہ میں جالبی نے ایلیٹ کے اہم مضامین کے ترجمے پیش کئے ہیں۔ ان مضامین کو انھوں نے شعوری طور پر تین ضمنی حصوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ پہلا حصہ شاعری سے، دوسرا حصہ نظریہ و فکر سے اور تیسرا حصہ تنقید سے متعلق ہے۔ ان مضامین کے متن سے بحث کرنے کی چنداں ضرورت نہیں ہے اور نہ انتخاب مضامین پر اظہار رائے کی ضرورت ہے کیوں کہ یہ سارے مضامین وہ ہیں جن سے ہمارے ہمارے مغرب سے مستفاد نقاد اچھی طرح متعارف ہیں اور جن کے بکثرت حوالوں کی وجہ سے قاری ان تک رسائی چاہتا ہے اس لئے میں صرف ترجمہ کے بارے میں کچھ عرض کروں گا۔ جالبی نے مضامین کا مکمل ترجمہ نہیں کیا ہے بلکہ ہر مضمون کے صرف اتنے حصے کا ترجمہ کیا ہے جو اردو قارئین کے مطالعہ کے لئے اہم ہے۔ ممکن ہے کہ ہم یہ سوچیں کہ جالبی نے بعض مقامات پر کسی اہم جملہ کو نظر انداز کر دیا ہے لیکن یہ انفرادی و اختلافی صوابدید بھی ہو سکتی ہے۔ مضامین کے ترجمہ میں انھوں نے امکانی حد تک یہ کوشش کی ہے کہ ترجمہ رواں ہو اور قاری کو ترجمہ پن کا احساس نہ ہو۔ کتاب کے آخر میں مفصل کتابیات اور ایلیٹ کی مختصر سوانح بھی شامل ہے۔ اردو کے طالب علموں اور تحقیقی کام کرنے والوں کے لئے یہ ضمیمے خاصے اہم ہیں۔

'ایلیٹ کے مضامین' کا یہ چوتھا ایڈیشن ہے جو بہت خوبصورت، عمدہ کاغذ اور مضبوط جلد کے ساتھ شایع کیا گیا ہے۔ مترجم کے ساتھ ہم ناشرین کو بھی مبارکباد پیش کرتے ہیں۔

——— ابن فرید

کتابیاتِ اقبال

○ رفیع الدین ہاشمی ○ اقبال اکادمی پاکستان لاہور ○ ۴۰ روپے

صرف اقبال صدی میں (دروغ برگردنِ راوی) اقبال پر تقریباً تین سو کتابیں اور خاص نمبر شایع ہوئے ہیں۔ ان میں اچھا برا سب کچھ ہے اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اقبال پر ان کی زندگی ہی میں بہت کچھ لکھا جانے لگا تھا لیکن گزشتہ چالیس سال میں ان پر اتنا لکھا گیا ہے کہ تصنیفات کا نام یاد رکھنا بھی محال ہو گیا ہے۔ بعض بدنصیب / خوش نصیب ایسے بھی ہوتے ہیں جن کو یہ ہفت خوان بھی طے کرنا پڑتا ہے، کچھ اپنے لئے اور کچھ ان کے لئے جو 'ماہرِ اقبال' سے پوچھتے کہ "ڈھونڈوں کہاں یہ میں؟" رفیع الدین ہاشمی نے 'کتابیاتِ اقبال' انھیں کی چارہ جوئی کے لئے ترتیب دی ہے۔

کتابیات (BIBLIOGRAPHY) علم کتب خانہ (LIBRARY SCIENCE) میں خود ایک فن ہے۔ اس کے کچھ بنیادی تقاضے ہوتے ہیں جن کا ہمارے مصنفین، محققین اور ناشرین قطعاً خیال نہیں رکھتے۔ کبھی مصنف کا نام لکھ دیا کبھی کتاب کا نام۔ اگر اتنی زحمت کی کہ دونوں معلومات فراہم کر دیں تو ناشر، مقام اشاعت، سن اشاعت، ایڈیشن کا

حوالہ اور صفحات کی تعداد کا حوالہ قطعاً غیر ضروری تصور کرتے ہیں ۔ ناشر حضرات تو بالخصوص سنِ اشاعت اور ایڈیشن کے حوالہ کو فضولیات گردانتے ہیں، چنانچہ اردو کتب و رسائل کے حوالے اتنے مہمل ہو جاتے ہیں کہ اکثر اوقات اصل مآخذ تک پہنچنا مشکل ہو جاتا ہے ۔ ان دقتوں کے باوجود ہاشمی نے کتابیاتِ اقبال فنی نقطۂ نظر سے ترتیب دی ہے ۔ انھوں نے عرضِ مرتب میں فنِ کتابیات کے اصولوں پر بحث کرنے کے علاوہ پیش رفت کتابیاتِ اقبال کا تنقیدی جائزہ بھی لیا ہے ۔ کتابیاتِ اقبال کو انھوں نے چند حصوں میں تقسیم کر دیا ہے اور تمام تصنیفات کی تکنیکی درجہ بندی کی ہے ۔ آپ جس نوعیت کا حوالہ چاہیں متعلقہ حصہ میں بہ آسانی تلاش کر سکتے ہیں ۔ یہاں بھی کامیابی نہ ہو تو آخر میں اشاریہ سے مدد لیجیے جو نام مصنف، مرتب، شخص، مقام اور کتاب کے نام کے لحاظ سے تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے ۔ ہاشمی نے کتاب و رسالہ کے مشمولات کی تفصیل بھی دی ہے البتہ جہاں ایسا ممکن نہیں ہو سکا وہاں انھوں نے یہ بیان کر دیا ہے کہ اس کی معذوری کی وجہ کیا ہے (مثلاً بالواسطہ حوالہ) ۔ کتابیات کے چھپتے چھپتے بھی جو تفاصیل ہاشمی کو میسر آگئی ہیں انھیں انھوں نے ضمیمے میں شامل کر لیا ہے ۔ صحتِ متن کا اہتمام کرنے کے لئے ہاشمی نے آخر میں ' اغلاط نامہ ' شامل کر لیا ہے لیکن پھر بھی کچھ اغلاط باقی رہ گئی ہیں ۔

"کتابیاتِ اقبال" سنجیدہ علمی و فنی کام ہے ۔ اس کے لئے جس ریاض و استقلال کی ضرورت ہے اس کا ثبوت ہاشمی ہی دے سکتے تھے ۔ اب آپ بہ آسانی ہر اس حوالہ کو اپنی مطالعہ کی میز پر اپنی دسترس میں پا سکتے ہیں جو اقبال پر دنیا کی کسی بھی زبان میں ۱۹۷۷ء تک اقبال کی یا اقبال پر تصنیف سے متعلق ہے ۔ مجھے حیرت اس امر پر ہے کہ ہاشمی نے علم کتاب خانہ کا درسی مطالعہ نہ کرنے کے باوجود ایسا معیاری فنی کام کیسے کر لیا ۔

کتاب ٹائپ میں اعلیٰ سفید کاغذ پر شایع کی گئی ہے ۔ اہتمام طباعت میں بھی حسن ہے ۔

——— ابنِ فرید

اضافی تنقید

○ کرامت علی کرامت ○ اردو رائٹرس گلڈ، الٰہ آباد ○ غیر مجلد ۲۵ روپے مجلد ۳۰ روپے

کتاب کے جزو ' اضافی ' میں کرامت کے پیشہ ورانہ علم (ریاضیات) کی جھلک ہے ۔ شاید انھوں نے آئن سٹائن کے نظریۂ اضافیت کو اپنی کتاب کے نام میں ملحوظ خاطر رکھا ہے لیکن میرا ذہن اسے اضافی کے بجائے اطلاقی کے تناظر میں دیکھتا ہے ۔ اردو ادب کے ساتھ پیشہ وروں نے ایک زیادتی یہ کی ہے کہ اسے صرف یک علمی مطالعہ تک محدود کر دیا ہے ۔ چند کشیں اور چند فنی کرتب بازیاں ادبی تنقید کہلاتی ہیں ۔ دوسرے علوم کا تذکرہ بھی منھ کا مزہ بدلنے کے لئے کیا جاتا ہے لیکن اس کے لئے بنیادی شرط یہ ہوتی ہے کہ جس علم پر کرم فرمایا جا رہا ہے اس سے واقفیت قطعاً نہ ہو ورنہ ادبی ستر پارہ پارہ ہو جائے گا ۔ مغربی فکر اور مغرب کے مسائل کو ہم نے اپنی ادبی رسم بنا لیا ہے لیکن کاش ہم نے یہ بھی سوچا ہوتا کہ ہم ان کی دور رس ادبی علمی روایات کو بھی اردو میں اپنا لیں اور اپنے طور پر اپنے ادب پر وسیع و ہمہ جہت کام کریں ۔ ان میں سے ایک اہم علمی روایت اردو ادب کا بین العلوی مطالعہ (INTER DISCIPLINARY STUDY) ہے ۔ اس فریضہ کو ایسے ہی اہل علم انجام دے سکتے ہیں جنھوں نے ادب کے علاوہ دوسرے علوم کا بھی بالاستیعاب مطالعہ کیا ہو جیسے رچرڈز، ہربرٹ ریڈ، ڈبلیو ڈبلیو ہارڈنگ اور ایچ ۔ ڈی ڈنکن وغیرہ نے کیا ہے ۔ مجھے اس کا اعتراف ہے کہ یہ خالص ادبی تنقید نہ ہو گی لیکن یہ بھی اردو ادب کے ساتھ انصاف نہ ہوگا کہ اس کے مستور خزانہ کو دوسرے علوم پر کھولنے سے محروم رکھا جائے ۔

اس طرح ہم اپنے ادب کی بے پناہ علمی صفات کو مفلوج کر کے رکھ دیں گے اور اس کے امکانات کو محدود کر دیں گے۔ مجھے اس امر کا احساس ہے کہ اس داد فریاد سے بعض حلقوں میں اشتعال پھیلے گا اس لئے میں ان چند مخلصوں کو بس غنیمت سمجھتا ہوں جنھوں نے سود و زیاں سے بے نیاز ہو کر اپنے طور پر بین العلومی مطالعہ شروع کیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اردو ادب کی اس نوعیت کی خدمت بھی اپنا اعتراف جلد کرائے گی۔

'اضافی تنقید' میں ایسے مضامین کافی تعداد میں ہیں جو ادبی تنقید ہی ہیں۔ ان میں وسعتِ قلب اور مروت کا خاصا مظاہرہ ہے۔ مجھے کرامت کے وہ مضامین زیادہ اہم معلوم ہوتے ہیں جن میں انھوں نے فن اور تکنیک وغیرہ کا علمی اور کمیتی مطالعہ کیا ہے۔ ان مضامین میں ہی ان کی بین العلومی مطالعہ کی بے پناہ صلاحیت جلوہ نما ہوتی ہے۔ اضافی تنقید میں "شعری تنقید میں اضافیات" کی حیثیت اساسی مطالعہ کی ہوگی۔ اسی طرح سنسکرت شعریات POETICS سے استفادہ کر کے انھوں نے اردو تنقید کے لئے غور و فکر کے نئے زاویے فراہم کر دیئے ہیں۔ ادبی تنقیدی مضامین میں انھوں نے ایسی باتیں بھی کہی ہیں جن سے اختلاف کیا جا سکتا ہے، لیکن انھوں نے جو بات بھی کہی ہے اس کے دلیل کا اہتمام کیا ہے (یہ روش اب متروک ہوتی جا رہی ہے)۔ ماریتیں سے کرامت کو عشق سا معلوم ہوتا ہے۔

'اضافی تنقید' اردو میں جرأت مندانہ اقدام ہے۔ ہم اس کا استقبال اس حیثیت سے بالخصوص کرتے ہیں کہ اس کے ذریعہ بین العلومی مطالعہ کی روایت آگے بڑھتی ہے۔

—— (ابن فرید

سطور (یک موضوعی خصوصی شمارہ) ○ مرتب کمار پاشی ○ ۱۳۲۷ دہلی گیٹ، نئی دہلی ۲ ○ ۶ روپے

جدید فن کاروں میں بہر حال محمد علوی کو یہ سبقت حاصل ہوتی ہے کہ سب سے پہلے (ن۔م۔ راشد کو چھوڑ کر) ان پر ان کی زندگی میں خصوصی شمارہ شایع ہوا ہے۔ یہ ابتدار خوش آئند ہے، اگر یہ سلسلہ جاری رہ سکے تو ہم عصر ادیبوں، شاعروں اور نقادوں کا سنجیدہ و جامع مطالعہ ممکن ہو سکے گا اور مستقبل کے لئے بہت کچھ فیصلہ کرنے کو چھوڑا جا سکے گا۔

علوی اچھے شاعر ہیں۔ بیان اور خیال دونوں میں سادہ کاری ہے۔ ان کے یہاں ترکیب اور نظم یا شعر کی شناخت میں انوکھا پن ہے۔ وہ اس طرح بے تکلف اور بے تصنع انداز میں موضوع کی گرفت کرتے ہیں کہ عام سی بات بھی خاصی چلبلی محسوس ہوتی ہے۔ وابستگی ان کی عزیز ترین خواہش ہے چنانچہ وہ گھر، کمرہ، بستر، رات روشنی تک پہنچ کر پھر تاریکی میں گم ہو جاتے ہیں تاکہ خواہش حصول کی چلچلاتی ہوئی دھوپ میں سلگ نہ اٹھے۔ یہ احتیاط ان میں مدھم، دھیما میٹھا پن پیدا کر دیتی ہے جس کے ذریعہ وہ گرد و پیش کی بے نیازی کی کھردری تلخی کو اپنی مسکراہٹ میں محلول کر لیتے ہیں۔ کبھی جب ایسی شوخ مسکراہٹ کی تنتا جاگتی ہے تو علوی کے مطالعہ کو دل چاہتا ہے۔

سطور کے اس یک موضوعی خصوصی شمارہ میں محمد علوی پر تین خاکے مجتبیٰ حسین، زبیر رضوی اور مخمور سعیدی کے لکھے ہوئے ہیں ان میں خاصی خمار آلود بے تکلفی ہے۔ مضامین میں شمیم حنفی، محمود ہاشمی، بلراج کومل اور شمس الرحمٰن فاروقی کے مقالات خاصے اچھے اور سیر حاصل ہیں۔ شمیم حنفی، محمود ہاشمی اور بلراج کومل کے مضامین میں علمی توازن اور گہرائی ہے شمس الرحمٰن فاروقی کے مضمون کے مطالعہ کے وقت تھوڑے سے انتخاب کی ضرورت ہوگی تاکہ صرف اتنا حصہ مطالعہ

میں آسکے جتنا علوی سے متعلق ہے۔ باقی مضمون 'حشو زشری' ہے۔ فاروقی مضمون کے شروع میں لکھتے ہیں: "بعض بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں، جو ایک دو چار برس تک ترقی کرتے ہیں، پھر ٹھہر جاتے ہیں۔ یعنی ان کے ارتقار میں وہ منزل آجاتی ہے جسے PLATEAU کہا جاتا ہے لیکن پلیٹو کے تصور میں جمود کا شائبہ نہیں بلکہ عمودی ارتقار کے بجائے افقی ارتقار کی کیفیت ہوتی ہے۔" فاروقی نے اگر برائن و ہارٹلر (BRYN AND HARTLER) کا مطالعہ کیا ہوتا تو وہ ایسی غیر علمی بات نہ کہتے۔ ارتقار بہر نوع ارتقار ہوتا ہے خطِ مرتفع (PLATEAU) نہیں ہوتا۔ وارث علوی کا مضمون اگر مکمل ہوتا تو واقعی اہم ہوتا۔ موجودہ صورت میں یہ نقادوں اور بشیر بدر کے خلاف غم و غصہ کا اظہار معلوم ہوتا ہے۔ نظموں کے تجزیہ کے حصہ میں بشر نواز، ابوالکلام قاسمی، صادق اور شمیم احمد کے تجزیے فکر انگیز ہیں۔ علوی سے بھرپور تعارف ان کے کلام کے انتخاب اور تازہ کلام سے ہوتا ہے۔ کمار پاشی نے اختتامیہ اس طرح لکھا ہے کہ جیسے یہ حاصل مطالعہ ہو۔

سطور کا یہ یک موضوعی خصوصی شمارہ حسنِ ترتیب اور علمی بردباری کا مظہر ہے۔ امید ہے کہ کمار پاشی ایسی جرآتیں آیندہ بھی کرتے رہیں گے۔

——— ابنِ فرید

جامِ شعور

○ سید اطہر حسین ○ گورنمنٹ نرسری کمپاؤنڈ، مال روڈ، لکھنؤ ○ ۱۶ روپے

سید اطہر حسین گذشتہ کئی برسوں سے کمشنر اور سکریٹری ریوینو کے عہدوں پر فائز ہیں۔ وہ ملک کی سب سے زیادہ جاذب توجہ سول سروسز میں بیس بائیس برسوں سے کام کر رہے ہیں۔ بہت سی اردو اور انگریزی کتابوں کے مصنف ہیں، مگر زیرِ تبصرہ کتاب چوں کہ ایک شعری مجموعہ ہے اس لئے اس کا تعلق نہ ان کی اعلیٰ درجہ کی ملازمت سے ہے اور نہ مذہبی اور قومی مسائل پر ان کی تحریر کردہ کتابوں سے۔ شاعری اپنی شناخت صرف اور صرف اپنے وسیلے سے کراتی ہے اور شاید یہی سبب ہے بالعموم مادی اور جذباتی سطح پر آسودہ حال اشخاص شاعری کا کچھ نہیں بگاڑ پاتے۔ میں نے بگاڑنے کا لفظ اس لئے بھی استعمال کیا ہے کہ بڑی شاعری مروجہ اسالیب، زبان کے پامال ڈھانچے اور کلیشے کے فریب سے چھٹکارا پانے اور تخلیق کی ایک نئی دنیا دریافت کرنے کے بعد ہی وجود میں آتی ہے ——— جامِ شعور میں اگر آنند نراین ملا اور عمر انصاری کی آرا شامل نہ ہوتی تو شاید مجھے اس وضاحت کی ضرورت نہ پیش آتی ——— ان تعیمی رایوں سے شاعر کی قدر و قیمت میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا ——— جب کہ اس مجموعہ میں بعض ایسی بھی خوبیاں ہیں جن کی نشان دہی شاعر کی صحیح قدر و قیمت کے تعین میں معاون ثابت ہو سکتی ہے۔

سید اطہر حسین بنیادی طور پر کلاسیکی لب و لہجہ کے شاعر ہیں۔ غزل کی غنائی صفت اور تغزل کو اپنی شاعری کی اساس کے طور پر اپناتے اور برتتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ لفظیاتی سطح پر کسی نئے استعارے اور علامت کی تخلیق نہ کرنے کے باوجود اس مجموعہ کی غزلیں روایت کی دھیمی آنچ کا احساس دلاتی ہیں جو اس صنف کا طرۂ امتیاز ہے۔ اطہر صاحب میر کی روایت کے شاعر ہیں اسی لئے ان کی غزلوں میں عقلی اور فکری بنیادوں کے بجائے حسی اور جذباتی سطح زیادہ نمایاں ہے۔ وہ جب کتاب کے سرنامے پر یہ شعر لکھتے ہیں ؎

میری غزل کی حقیقت بس اتنی ہے اطہر
یہ حادثے ہیں جو قلب و نظر پہ گذر گئے

تو قاری بے ساختہ میر کو یاد کرنے پر مجبور ہوتا ہے ؎

مجھ کو شاعر نہ کہو میرؔ کہ صاحب میں نے / درد و غم کتنے کیے جمع تو دیوان کیا

سید اطہر حسین صاحب مذہب کو کبھی حسی اور جذباتی سطح پر قبول کرتے دکھائی دیتے ہیں اس لئے جگہ جگہ مذہبی تعبیرات اور تلمیحات کا استعمال بھی ملتا ہے۔ ویسے عام انسانی اقدار پر ان کا غیر تشکیک آلودہ ایقان کبھی انھیں ماورائی دنیا کی سیر کراتا ہے اور وہ اسی سبب پراسرار شعری فضا قائم کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ چند اچھے شعر آپ بھی ملاحظہ کریں۔

کبھی جو شمع فروزاں، دھواں اٹھا دل سے / بساط الٹ گئی جس کی میں ایسی محفل ہوں

دور سناٹے میں جو ایک صدا آتی ہے / سوچتا ہوں نہ ہو یہ کوئی فریب آواز

اے وحشتِ دل ساتھ ہے کوئی تو ہمارے / ویرانی برستی ہے جو دیوار سے، در سے

شعری مجموعہ خوبصورت کتابت وطباعت اور عمدہ کاغذ سے آراستہ کیا گیا ہے۔ یہ شاعری پرانے لب ولہجہ اور روایت کے احترام کا خوبصورت نمونہ ہے جسے کلاسیکی پسند اور رچا ہوا مذاق رکھنے والوں میں خاصی مقبولیت حاصل ہوگی۔

—— سید امین اشرف

ننگی دوپہر کا سپاہی

(افسانوی مجموعہ) ○ سلام بن رزاق ○ نیو رائٹرس پبلی کیشنز، ۵۹/۱۱ پائپ روڈ، کرلا، بمبئی ۴۰۰۰۷۰ ○ آٹھ روپے

شاعری اور فکشن میں کون سی صنف اول درجے کی ہے اور کون دوسرے اور تیسرے درجے کی؟ اس جھگڑے نے شاعری کا تو کچھ نہ بگاڑا مگر فکشن کو یہ نقصان ضرور پہنچایا ہے کہ پچھلے چند برسوں میں اردو فکشن میں مرصع اور داد طلب زبان کے استعمال کی شعوری کوششیں زیادہ ہونے لگی ہیں۔ ایک طرف ہندی میں ناول اور افسانے کی زبان کو زیادہ سے زیادہ نکھشنایا جارہا ہے تو دوسری طرف اردو کے بعض ادیب فکشن کی زبان کو شعری لب ولہجہ اور بناؤ سنگھار سے قریب کرکے اسے افسانویت سے دور کر رہے ہیں۔ مجھے اس تمہید کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ سلام بن رزاق کی کہانیوں میں مجھے یہ نقص شاذ و نادر ہی نظر آتا ہے اور اس اعتبار سے اگر میں یہ کہوں تو حق بجانب ہوں گا کہ سلام بن رزاق اپنی پیڑھی کے ان بہت سے نوجوان افسانہ نگاروں سے بڑی حد تک مختلف ہیں جن کی کہانیوں میں 'کہانی' کے علاوہ اور سب کچھ ہوتا ہے۔ انھیں یہ نہیں معلوم کہ شاعری اور افسانے میں زبان کا رول قدرے مختلف ہوتا ہے۔ نثر کی کسی بھی صنف میں خیال بنیادی حیثیت رکھتا ہے جب کہ شاعری میں یہ اساسی حیثیت خیال کے بجائے زبان کو حاصل ہوتی ہے۔

اس مجموعہ میں پندرہ کہانیاں شامل ہیں جن میں چار پانچ حیرت انگیز حد تک موضوع کی یکسانیت (میں یہاں موضوع کی اکائی نہیں کہہ رہا ہوں) کی غمازی کرتی ہیں۔ باضمیر انسان کا انفرادی وجود، انفرادیت کو باقی رکھنے کی جد و جہد اور بالآخر جسم و جان کے رشتے کو برقرار رکھنے کے لئے معاشرہ کی منفی قوتوں کے سامنے ہتھیار ڈال دینا" سلام بن رزاق کا بنیادی مسئلہ ہے۔ چنانچہ "پتّا" میں اپنے ہمزاد مادّی وجود کے آگے سپرانداز ہونے والا 'میں'، 'بیعت' میں ایک بار پھر شکست کھاتا ہے —— یہی کردار 'کالے ناگ کے پجاری' میں بھی اسی طرح ابھرتا ہے اور 'انجام کار' میں 'میں' حالات سے سمجھوتہ کرتے میں ہی اپنی عافیت سمجھتا ہے —— ان افسانوں میں موضوع کی یکسانیت کے باوجود تکنیک کا تنوع یقیناً افسانہ نگار کے حق میں جاتا ہے۔ سلام بن رزاق کہانی کی تکنیک، ساخت اور بنت کے معاملے میں خاصے ہوشیار ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ان چند کہانیوں میں موضوع اور ایک جیسے ماحول کے باوجود ایک تازگی کا احساس ہوتا ہے اور ہر کہانی اپنی الگ شناخت

میں آگے جتنا علوی سے متعلق ہے۔ باقی مضمون حشو و زوائد ہے۔ فاروقی مضمون کے شروع میں لکھتے ہیں: "بعض بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جو ایک دو چار برس تک ترقی کرتے ہیں، پھر ٹھہر جاتے ہیں۔ یعنی ان کے ارتقا میں وہ منزل آ جاتی ہے جسے PLATEAU کہا جاتا ہے لیکن پلیٹو کے تصور میں جمود کا شائبہ نہیں بلکہ عمودی ارتقا کے بجائے افقی ارتقا کی کیفیت ہوتی ہے۔" فاروقی نے اگر برائن و ہارٹلر (BRYN AND HARTLER) کا مطالعہ کیا ہوتا تو وہ ایسی غیر علمی بات نہ کہتے۔ ارتقا بہر نوع ارتقا ہوتا ہے خطِ مرتفع (PLATEAU) نہیں ہوتا۔ وارث علوی کا مضمون اگر مکمل ہوتا تو واقعی اہم ہوتا۔ موجودہ صورت میں یہ نقادوں اور بشیر بدر کے خلاف غم و غصہ کا اظہار معلوم ہوتا ہے۔ نظموں کے تجزیہ کے حصہ میں بشر نواز، ابوالکلام قاسمی، صادق اور شمیم احمد کے تجزیے فکر انگیز ہیں۔ علوی سے بھرپور تعارف ان کے کلام کے انتخاب اور تازہ کلام سے ہوتا ہے۔ کمار پاشی نے اختتامیہ اس طرح لکھا ہے کہ جیسے یہ حاصل مطالعہ ہو۔

سطور کا یہ یک موضوعی خصوصی شمارہ حسنِ ترتیب اور علمی بردباری کا مظہر ہے۔ امید ہے کہ کمار پاشی ایسی جرأتیں آئندہ بھی کرتے رہیں گے۔

——— ابن فرید

جامِ شعور

سید اطہر حسین ○ گورنمنٹ نرسری کمپاؤنڈ، مال روڈ، لکھنؤ ○ ۱۶ روپے

سید اطہر حسین گذشتہ کئی برسوں سے کمشنر اور سکریٹری ریونیو کے عہدوں پر فائز ہیں۔ وہ ملک کی سب سے زیادہ جاذبِ توجہ سول سروسز میں بیس بائیس برسوں سے کام کر رہے ہیں۔ بہت سی اردو اور انگریزی کتابوں کے مصنف ہیں، مگر زیرِ تبصرہ کتاب چوں کہ ایک شعری مجموعہ ہے اس لئے اس کا تعلق نہ ان کی اعلیٰ درجہ کی ملازمت سے ہے اور نہ مذہبی اور قومی مسائل پر ان کی تحریر کردہ کتابوں سے۔ شاعری اپنی شناخت صرف اور صرف اپنے وسیلے سے کراتی ہے اور شاید یہی سبب ہے بالعموم مادی اور جذباتی سطح پر آسودہ حال اشخاص شاعری کا کچھ نہیں بگاڑ پاتے۔ میں نے بگاڑنے کا لفظ اس لئے بھی استعمال کیا ہے کہ بڑی شاعری مروجہ اسالیب، زبان کے پامال ڈھانچے اور کلیشے کے فریب سے چھٹکارا پانے اور تخلیق کی ایک نئی دنیا دریافت کرنے کے بعد ہی وجود میں آتی ہے ——— جامِ شعور میں اگر آنند نراین ملا اور عمر انصاری کی آرا شامل نہ ہوتی تو شاید مجھے اس وضاحت کی ضرورت نہ پیش آتی ——— ان تعظیمی رایوں سے شاعر کی قدر و قیمت میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا ——— جب کہ اس مجموعہ میں بعض ایسی بھی خوبیاں ہیں جن کی نشاندہی شاعر کی صحیح قدر و قیمت کے تعین میں معاون ثابت ہو سکتی ہے۔

سید اطہر حسین بنیادی طور پر کلاسیکی لب و لہجہ کے شاعر ہیں۔ غزل کی غنائی صفت اور تغزل کو اپنی شاعری کی اساس کے طور پر اپناتے اور برتتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ لفظیاتی سطح پر کسی نئے استعارے اور علامت کی تخلیق نہ کرنے کے باوجود اس مجموعہ کی غزلیں روایت کی دھیمی آنچ کا احساس دلاتی ہیں جو اس صنف کا طرۂ امتیاز ہے۔ اطہر صاحب میر کی روایت کے شاعر ہیں اسی لئے ان کی غزلوں میں عقلی اور فکری بنیادوں کے بجائے حسی اور جذباتی سطح زیادہ نمایاں ہے۔ وہ جب کتاب کے سرنامے پر یہ شعر لکھتے ہیں ؎

میری غزل کی حقیقت بس اتنی ہے اطہر
یہ حادثے ہیں جو قلب و نظر پہ گذر گئے

تو قاری بے ساختہ میر کو یاد کرنے پر مجبور ہوتا ہے ؎

مجھ کو شاعر نہ کہو میر کہ صاحب میں نے — درد و غم کتنے کئے جمع تو دیوان کیا

سید اطہر حسین صاحب مذہب کو بھی حسی اور جذباتی سطح پر قبول کرتے دکھائی دیتے ہیں اس لئے جگہ جگہ مذہبی تعبیرات اور تلمیحات کا استعمال بھی ملتا ہے۔ ویسے عام انسانی اقدار پر ان کا غیر تشکیک آلودہ ایقان بھی انھیں ماورائی دنیا کی سیر کرا لیتا ہے اور وہ اسی سبب پراسرار شعری فضا قائم کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ چند اچھے شعر آپ بھی ملاحظہ کریں ؎

کبھی جو شمعِ فروزاں، دھواں اٹھا دل سے — بساط الٹ گئی جس کی میں ایسی محفل ہوں

دور سناٹے میں جو ایک صدا آتی ہے — سوچتا ہوں نہ ہو یہ کوئی فریب آواز

اے وحشتِ دل ساتھ ہے کوئی تو ہمارے — ویرانی برستی ہے جو دیوار سے، در سے

شعری مجموعہ خوبصورت کتابت و طباعت اور عمدہ کاغذ سے آراستہ کیا گیا ہے۔ یہ شاعری پرانے لب و لہجہ اور روایت کے احترام کا خوبصورت نمونہ ہے جسے کلاسیکی پسند اور رچا ہوا مذاق رکھنے والوں میں خاصی مقبولیت حاصل ہوگی۔

——— سید امین اشرف

ننگی دوپہر کا سپاہی

(افسانوی مجموعہ) ○ سلام بن رزاق ○ نیو رائٹرس پبلی کیشنز، ۵۹۰/۱۱ پائپ روڈ، کرلا، بمبئی ۷۰۰۰۴۰ ○ آٹھ روپے

شاعری اور فکشن میں کون سی صنف اول درجے کی ہے اور کون دوسرے اور تیسرے درجے کی؟ اس جھگڑے نے شاعری کا تو کچھ نہ بگاڑا مگر فکشن کو یہ نقصان ضرور پہنچایا ہے کہ پچھلے چند برسوں میں اردو فکشن میں مرصع اور داد طلب زبان کے استعمال کی شعوری کوششیں زیادہ ہونے لگی ہیں۔ ایک طرف ہندی میں ناول اور افسانے کی زبان کو زیادہ سے زیادہ نکشنایا جا رہا ہے تو دوسری طرف اردو کے بعض ادیب فکشن کی زبان کو شعری لب و لہجہ اور بناؤ سنگھار سے قریب کر کے اسے افسانویت سے دور کر رہے ہیں۔ مجھے اس تمہید کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ سلام بن رزاق کی کہانیوں میں مجھے یہ نقص شاذ و نادر ہی نظر آتا ہے اور اس اعتبار سے اگر میں یہ کہوں تو حق بجانب ہوں گا کہ سلام بن رزاق اپنی پیڑھی کے ان بہت سے نوجوان افسانہ نگاروں سے بڑی حد تک مختلف ہیں جن کی کہانیوں میں 'کہانی' کے علاوہ اور سب کچھ ہوتا ہے۔ انھیں یہ نہیں معلوم کہ شاعری اور افسانے میں زبان کا رول قدرے مختلف ہوتا ہے۔ نثر کی کسی بھی صنف میں خیال بنیادی حیثیت رکھتا ہے جب کہ شاعری میں یہ اساسی حیثیت خیال کے بجائے زبان کو حاصل ہوتی ہے۔

اس مجموعہ میں پندرہ کہانیاں شامل ہیں جن میں چار پانچ حیرت انگیز حد تک موضوع کی یکسانیت (میں یہاں موضوع کی اکائی نہیں کہہ رہا ہوں) کی غمازی کرتی ہیں۔ باضمیر انسان کا انفرادی وجود، انفرادیت کو باقی رکھنے کی جد و جہد اور بالآخر جسم و جان کے رشتے کو برقرار رکھنے کے لئے معاشرہ کی منفی قوتوں کے سامنے ہتھیار ڈال دینا "سلام بن رزاق کا بنیادی مسئلہ ہے۔ چنانچہ "ننگا" میں اپنے ہمزاد مادی وجود کے آگے سپر انداز ہونے والا 'میں'، 'بیعت' میں ایک بار پھر شکست کھاتا ہے ——— یہی کردار 'کالے ناگ کے پجاری' میں بھی اسی طرح ابھرتا ہے اور 'انجام کار' میں، حالات سے سمجھوتہ کرنے میں ہی اپنی عافیت سمجھتا ہے ——— ان افسانوں میں موضوع کی یکسانیت کے باوجود تکنیک کا تنوع یقیناً افسانہ نگار کے حق میں جاتا ہے۔ سلام بن رزاق کہانی کی تکنیک، ساخت اور بنت کے معاملے میں خاصے ہوشیار ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ان چند کہانیوں میں موضوع اور ایک جیسے ماحول کے باوجود ایک تازگی کا احساس ہوتا ہے اور ہر کہانی اپنی الگ شناخت

رکھتی ہے۔ سلام بن رزاق اس اعتبار سے بھی پذیرائی کا استحقاق رکھتے ہیں کہ انھوں نے اپنی پیڑھی کے اکثر نام نہاد جدید افسانہ نگاروں کے برخلاف ادب کا مطالعہ کیا ہے۔ افسانوی ادب کے صنفی مزاج کو سمجھنے کی کوشش کی ہے اور نئی کہانی کے نام پر بعض ہیئت پسند ادبی رسائل کی پسند و ناپسند کو ملحوظ خاطر رکھے بغیر اپنی کہانی کی دنیا خود بنانے کی کوشش کی ہے جب کہ علامت اور تجرید کو نئی کہانی کی پہچان کے طور پر قبول کرنے اور برتنے والے اپنی روایت سے نابلد نوجوان کہانی کاروں نے نئی کہانی کی شکل و صورت بڑی حد تک مسخ کر دی ہے کہ کھرے کھوٹے کی شناخت کے سارے وسائل مشتبہ ہو کر رہ گئے ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہ سمجھا جائے کہ میں اکہری، سپاٹ اور قدیم طرز کی کہانیوں کی وکالت کر رہا ہوں۔ مجھے اس کا اعتراف ہے کہ اس نسل میں کم از کم آٹھ دس افسانہ نگار ایسے ضرور ہیں جو نئی کہانی کی آبرو بننے کی صلاحیت رکھتے ہیں لیکن تعجب کی بات یہ ہے کہ اب تک ان میں سے صرف دو چار اپنی انفرادیت منوا سکے ہیں۔ اس کساد بازاری میں سلام بن رزاق نے جس طرح خود کو وقتی فیشن سے محفوظ رکھ کر افسانہ نگار کی حیثیت سے اپنے منصب کو پہچاننے کی کوشش کی ہے یہ کم اہم بات نہیں۔

اس مجموعہ کی اشاعت سے پہلے جب بھی میں نے ادبی رسائل میں سلام کی کوئی کہانی پڑھی مجھے ایک طرح کی تازگی کا احساس ہوا اور اس احساس نے افسانہ نگار سے بعض توقعات وابستہ کرائیں۔ مگر اس مجموعہ کے مطالعہ کے بعد میں اپنے اس تاثر کو نہیں چھپانا چاہتا کہ ایک ساتھ کئی کہانیاں پڑھنے کے بعد میری ان توقعات کو ٹھیس پہنچی ہے، ممکن ہے اس کی وجہ یہ ہو کہ میں نے ان سے کچھ زیادہ امیدیں وابستہ کر لی ہوں گی۔ میں نے پہلے بھی کہا ہے کہ سلام بن رزاق اپنے محدود مسائل کی تلاش تکنیک کے نئے پن اور ٹریٹمنٹ سے ضرور کرتے ہیں مگر آخر اس کی کیا وجہ ہے کہ صرف چار یا پانچ موضوعات یا مسائل ان کے یہاں بار بار آتے ہیں؟؟ ــــــ شاید صرف اپنے اور اپنے جیسوں کی زندگی اور مسائل کا احساس۔ یا پھر اپنے عہد کو چند مسائل کے ساتھ مخصوص سمجھنا اور انھیں مسائل میں عصری آگہی دیکھنا ــــــ یا تجربہ اور مشاہدہ کی کمی؟ پتہ نہیں کیا؟

"ننگی دوپہر کا سپاہی" میں شامل اکثر کہانیاں اپنی علامتی اور استعاراتی سطحیں ضرور رکھتی ہیں۔ سلام بن رزاق علامتی کہانیوں کو برتنے میں اس لئے بھی نسبتاً زیادہ کامیاب دکھائی دیتے ہیں کہ ان کی اکثر علامتیں کہیں نہ کہیں استعاراتی حیثیت سے بھی ابھرتی ہیں اور نتیجہ کے طور پر ابہام کی وہ صورت نہیں پیدا ہونے پاتی جو اکثر کہانی کے لئے مہلک ثابت ہوتی ہے۔ اس کا بت، زنجیر ہلانے والے، قصہ دیو جانس جدید، حمام، کالے ناگ کے پجاری، علامتوں کے محتاط اور فنکارانہ استعمال کی عمدہ مثالیں ہیں ــــــ زنجیر ہلانے والے، اس ہیبت ناکی اور خوف و دہشت کی کہانی ہے جو آج کے انسان کا مقدر ہے۔ یہ کہانی اس حقیقت کو بھی پیش کرتی ہے کہ دلوں کے اندر پلنے والا خوف ایک ذاتی مسئلہ ہونے کے باوجود اجتماعی اور سماجی مسئلے میں کیوں کر تبدیل ہو جاتا ہے۔ 'واسو' مادی اور روحانی زندگی کے تصادم کی کہانی ہے۔ دوسری سطح پر یہ تصادم فرد اور جماعت کے تصادم میں تبدیل ہو جاتا ہے ــــــ یہ بلاشبہ اس کتاب کی نمایاں ترین کہانی ہے 'البم' اور 'بجوکا' نفسیاتی کہانیاں ہیں ــــــ 'البم' علائق سے ماورا ہو کر اپنی شناخت کی خواہش پر منتج ہوتی ہے تو 'بجوکا' ازدواجی زندگی کی یکسانیت سے پیدا شدہ اکتاہٹ کو پیش کرتی ہے۔ اس میں جنسی ناآسودگی کے مسئلے کو بھی زیریں لہر کی طرح شروع سے آخر تک باقی رکھا گیا ہے ــــــ ننگی دوپہر کا سپاہی کتابی اور حقیقی یا عملی زندگی کے بُعد کو پیش کرتا ہے۔ اس کا بت خود ساختہ مزعومات کی ناکامی اور اس سے ابھرنے والے حوصلہ اور قوت ارادی کو ظاہر کرتا ہے، اور اس طرح مجموعہ کی واحد کہانی ہے جو منفی اقدار کی تردید کر کے ایک مثبت قدر کا اثبات کرتی ہے۔

چلتے چلتے ایک بات کہتا جاؤں کہ اگر اس کتاب کو گذشتہ چند برسوں میں شائع ہونے والے چند ممتاز افسانوی مجموعوں میں سے ایک کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ مگر اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہ قاری سلام بن رزاق کو اس سے کہیں بہتر اور بلند دیکھنے کی خواہش رکھتا ہے۔

ــــــ ابوالکلام قاسمی

جستجو ○ عنایت حسین عیدن و سید رحمت اللہ ○ انجمن ادب اردو، دی نیشنل اردو انسٹی ٹیوٹ، موریشس۔

موریشس بحرِ ہند کا وہ جزیرہ ہے جو ایک خود مختار ملک کی حیثیت بھی رکھتا ہے۔ چونکہ وہاں کی آبادی کا بڑا حصہ مہاجر ہندوستانیوں کی آبادی پر مشتمل ہے اس لئے بھارت کی مشترکہ تہذیب و تمدن کا عکس اور زبانوں کا چلن موریشس کے لئے قدرتی بات ہے۔ ہر چند کہ موریشس کی قومی زبان اردو یا ہندی نہیں مگر ان زبانوں کے سمجھنے اور بولنے والے جگہ جگہ ملتے ہیں اور حکومت کی طرف سے اردو اور ہندی کی بقا، اور ترویج و ترقی کے لئے وسائل بھی فراہم کئے جاتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ روز بروز ان زبانوں کا چلن بڑھ رہا ہے اور نئی نسل بڑے ہی ذوق و شوق سے ان کی طرف متوجہ ہو رہی ہے۔

ہندی کے ساتھ اردو زبان و ادب سے دلچسپی رکھنے اور جاننے والے لوگوں کی تعداد مزید بڑھ رہی ہے۔ "جستجو" ایسے ہی چند فعال اور اردو زبان و ادب سے وارفتگی کی حد تک محبت کرنے والوں کی کاوش کا نتیجہ ہے۔ کہنے کو تو یہ ایک رسالہ ہے لیکن اس کی پیش کش، مواد کی فراہمی اور ترتیب و تدوین کی سلیقہ مندی نے اسے ایک کتابچہ کی حیثیت دے دی ہے۔ چونکہ عنایت حسین عیدن علی گڑھ کے تعلیم یافتہ ہیں اور ان کی ادارت میں "علی گڑھ میگزین کا شعرائے علی گڑھ نمبر" نکل چکا ہے اس لئے انھیں اس میدان کے لئے نہ صرف یہ کہ ناآزمودہ کار بلکہ نو آزمودہ کار بھی نہیں کہا جا سکتا۔ سید رحمت اللہ کے تعاون سے عنایت حسین عیدن نے محنت و کاوش اور سلیقہ مندی سے مضامین، افسانے اور شعری تخلیقات یکجا کر کے "جستجو" کی شکل میں موریشس کے اردو دوستوں کی ذہنی ضیافت کا سامان فراہم کیا۔

اس میں شک نہیں کہ "جستجو" کی مشمولات سے اس کا اندازہ ہوتا ہے کہ موریشس میں کہنہ مشق اور منجھے ہوئے اردو لکھنے والوں کی کمی ہے مگر یہی کیا کم ہے کہ اس رسالہ کو ڈاکٹر اطہر پرویز جیسے ہمہ جہت ادیب، عنایت حسین عیدن جیسے مرتب اور صابر گودڑ جیسے نوجوان افسانہ نگار کا تعاون حاصل ہے۔ "جستجو" میں محمد حنیف کنہائی کی کہانی ایک سوالیہ نشان بن کر ابھرتی ہے۔ "داغ" اور "کریم چچا" بھی اچھی کہانیاں ہیں۔ شعری حصہ نسبتاً کمزور ہے مگر اس بات کا عکاس بھی کہ وہاں کے شعراء نئے شعری رجحانات سے واقف نہیں ہیں ــــ "تنقید" کے عنوان سے ڈاکٹر اطہر پرویز نے اس شمارے میں شامل ادب پاروں کا تنقیدی جائزہ لیا ہے جو نئے لکھنے والوں کے لئے ایک مفید سلسلہ ثابت ہو سکتا ہے۔ "جستجو" کے سارے لکھنے والے ان معنوں میں غیر معمولی ہمت افزائی کے مستحق ہیں کہ وہ اردو کے علاقوں سے اس قدر دور ہو کر بھی اس زبان کی خدمت انجام دے رہے ہیں ــــ عام وسائل کی کمی اور موریشس میں اردو پریس کے نہ ہونے کے سبب رسالہ میں بعض کمیاں نظر آتی ہیں مگر وہاں کے سیاق و سباق میں ادبی رسالہ کے نام کی کسی چیز کا سامنے آنا بھی کچھ کم اہمیت نہیں رکھتا ــــ انجمن ادبِ اردو کو اپنی حکومت کے تعاون اور سرپرستی کی سخت ضرورت ہے کہ یہ نونہال آرزو ایک سایہ دار درخت بن سکے۔

ــــ ابوالکلام قاسمی

موصولہ کتب:

۱۔ فصیلِ شب (شعری مجموعہ) خاطر حافظی۔ دانش محل امین الدولہ پارک، لکھنؤ۔ ۶ روپے
۲۔ بھوپال ایک خواب (افسانوی رپورتاژ)۔ عبدالرحیم نشتر۔ نشتر پبلی کیشنز، نیا بازار، کامٹی۔ ۴ روپے
۳۔ جہاں اور بھی ہیں (شعری مجموعہ)۔ نازش پرتاب گڈھی۔ بزم اردو، بیگم وارڈ، پرتاپ گڈھ۔ ساڑھے چار روپے۔
۴۔ غزلیات اقبال۔ ترتیب: سید ظہیر عباس رضوی۔ خیابان پبلی کیشنز، ۱۰۵ نشان پاڑہ روڈ، دوسری منزل، بمبئی ۴۰۰۰۰۹ ساڑھے چھ روپے
۵۔ بالک باغ (بچوں کے لئے نظمیں)۔ عزیز صدیقی۔ معیار ادب بکڈپو، گلی بیس ہزاری، گوجرپورہ، بھوپال۔ چھ روپے
۶۔ سہ رنگ (ادبی رسالہ)۔ مدیران: ابو اللیث جاوید وغیرہ۔ اردو بھون، اسلام پور، مظفر پور۔ دو روپے
۷۔ وقارِ سخن (شعری مجموعہ)۔ وقار سالوی۔ تاج پبلشرز، دہلی۔ دس روپیہ۔

بازدید

٭ نئی کہانی سے متعلق آپ نے چند سوالات اٹھا کر بحث کا جو سلسلہ شروع کیا ہے وہ نئے تخلیق کار، کہانی کے نئے پارکھوں اور مجھ جیسے نئے طالب علموں کے لئے بے حد مفید ہے جس کے لئے ہم سب آپ کے احسان مند ہیں۔ اس بحث کی سب سے اچھی بات یہ ہے کہ آپ نے ایک نقاد اور ایک تخلیق کار کے خیالات یکجا کر دیئے ہیں تاکہ پڑھنے والے دونوں کے خیالات سے بیک وقت مستفیض ہو سکیں۔ اس بار کہانی کی بحث میں تین نام اور نظر آئے تو دلچسپی بڑھی۔ پہلا نام علیم اللہ حالی کا ہے جنھوں نے کہانی سے متعلق اچھی باتیں اٹھائی ہیں۔ ڈاکٹر سید حامد حسین صاحب نے کہانی کو ایک دوسرے زاویے سے دیکھا ہے لیکن عبدالحمید صاحب کی بحث پر بحث پڑھ کر طبیعت مکدر ہو گئی۔ بحث کے اس انداز نے اچھی خاصی چلتی ہوئی بحث میں بے لطفی کا ماحول پیدا کر دیا۔ چند باتیں اس ضمن میں میں بھی عرض کرنا چاہتا ہوں۔

عبدالحمید صاحب کی مکمل بحث ڈاکٹر سید محمد عقیل کے خلاف ہے۔ اپنے طور پر کہانی کے بارے میں انھوں نے کچھ نہیں لکھا۔ اختلاف کا پیدا ہونا عین ضروری ہے۔ یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ لکھنے والا خواہ کتنا ہی بڑا نقاد ہو اس کی تمام باتوں سے اتفاق کر لیا جائے۔ لیکن بات کی کھال نکال کر پورے مضمون میں محض نقائص تلاش کرنا آسان ترین فعل ہے۔

اگر عبدالحمید ڈاکٹر عقیل صاحب کو قدیم و فرسودہ قسم کا قاری سمجھتے ہیں تو ان کا قیاس بالکل صحیح ہے ورنہ اتنی بات تو طے ہے کہ آج کی کہانی کے سلسلے میں جب آج کے قاری کی بات ہوگی تو بات کرنے والے کے ذہن میں سنجیدہ اور پڑھا لکھا ہی قاری ہوتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ہم اسے عبدالحمید کی طرح ترازو میں نہیں تولتے۔

عبدالحمید صاحب خود کو کیا سمجھتے ہیں؟ قاری یا فن کار؟ اگر قاری کا وجود نہیں تو وہ کیا ہیں؟ اگر وہ ایسے قاری ہیں جن کی ذہانت تمام پڑھے لکھے لوگوں سے بالاتر ہے تو بہتر یہ ہے وہ نئے افسانے سمجھنے کے لئے کوئی شرح چھاپ دیں تاکہ یونیورسٹی کے کم پڑھے لوگ اس سے استفادہ کر سکیں کیوں کہ یونیورسٹی میں اب علم کہاں؟

اگر اس بحث کا مقصد یہ ہے کہ عقیل صاحب کو افسانے کی معلومات نہیں، وہ کم علم آدمی ہیں، جدیدیوں کا علم ان سے بہت افضل ہے اور عبدالحمید صاحب بھی چونکہ نئے نئے جدیدیئے ہوئے ہیں اس لئے جدیدیوں کے اسی اصول پر عمل کر کے شہرت حاصل کرنا چاہتے ہیں کہ "پڑھے لکھے لوگوں پر حملے کرو خود بخود مشہور ہو جاؤ گے" جیسا کہ کچھ جدیدیے کچھ کرتے رہتے ہیں تو ہمیں تسلیم ہے کہ عبدالحمید کا علم ڈاکٹر عقیل صاحب کے علم سے افضل ہے۔ اس بحث کی ضرورت نہیں ہے۔

علی احمد فاطمی، الٰہ آباد

٭ ستمبر تا دسمبر کے مشترکہ شمارے میں "نئی کہانی" پر بحث کہانی کے حوالے سے تاریک گوشوں پر روشنی ڈالتی ہے۔ "اپنی مٹی کا ادب" میں سلیم شہزاد نے ماضی، حال اور مستقبل کے تحت ہندوستانی عصری ادب اور جدیدیت کی خاص بحث کی ہے اور ہندوستان کے جدید اردو شاعروں کو نمایاں طور پر نظام کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ میں نے ذیلیات کی فہرست میں صفحہ ۲۳ پر فضا ابن فیضی کا نام ہے لیکن اندر منظومات میں فضا صاحب کہیں بھی نظر نہیں آئے۔ ادبی ڈائجسٹ صفحہ ۲۲ پر سلیم احمد (پاکستان) موجود ہیں اور فہرست میں ان کا وجود ہی نہیں ہے۔ بہر حال منظومات اور افسانوں کا معیار بھی کافی بلند ہے۔

قاضی حسن رضا، گلبرگہ

جلد ۴ شمارہ ۲

دوماہی

الفاظ

مارچ، اپریل سنہ ۱۹۷۹ء

زر سالانہ ——— دس روپے
فی کاپی ——— دو روپے

چیف ایڈیٹر

ابوالکلام قاسمی

پرنٹر پبلشر ——— اسدیار خاں
مطبوعہ ——— اسرار کریمی پریس [illegible]
کتابت ——— ریاض [illegible]
سرورق ——— انوار انجم

مینیجنگ ایڈیٹر

اسدیار خاں

مقام اشاعت:
ایجوکیشنل بک ہاؤس
مسلم یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱

پتہ: دوماہی الفاظ ایجوکیشنل بک ہاؤس
مسلم یونیورسٹی مارکیٹ [illegible]

آئینہ

الفاظ

اداریہ

میں نے الفاظ کے پہلے شمارے (اگست، ستمبر ۱۹۷۶ء) میں جدیدیت اور ترقی پسندی سے متعلق بحث کا آغاز کرتے ہوئے ادب میں ادعائیت اور قطعیت کے تباہ کن اثرات کی بات کہی تھی اور جدید ادیبوں میں ترقی پسند ادیبوں جیسے ادعائیت پسندانہ رویہ کی نشاندہی کی تھی۔ میں نے کسی اور موقع پر یہ بھی کہا تھا کہ ادیب صرف اپنی ذات یا ذات کے حوالے سے اپنی تخلیق کے ساتھ کمیٹڈ ہوتا ہے ـــــ شاید یہی وجہ ہے کہ جب 'الفاظ' کے پچھلے شمارے میں اداریہ کی جگہ علی گڑھ کے فسادات کی طرف اشارہ کرنے والا ایک معنی خیز شعر شایع ہوا اور اندر کے صفحات پر اس مخصوص صورت حال سے متعلق بعض تخلیقات کو جگہ دی گئی تو ادیبوں کے ایک حلقے میں کچھ ایسے مسرت آمیز اطمینان کا اظہار کیا گیا جیسے 'الفاظ' نے ادب میں وابستگی کے تصور کو عملی طور پر قبول کر لیا ہو۔ اس کے برعکس دوسرے حلقے میں کچھ پریشانی کے آثار نظر آئے گویا یہ رسالہ اب ادب کے بجائے سماج کی خدمت پر مامور ہو گیا ہو۔ حالانکہ یہ نہ کوئی اطمینان کی بات تھی اور نہ کسی پریشانی کی ـــــ جب بھی اور جہاں کہیں بھی خارجی صورت حال داخلی ذات کا حصہ بنے گی وہاں ناوابستگی کے باوجود داخل اور خارج کی دوئی مٹتی ہوئی نظر آئے گی۔ ویسے اگر آپ اصولی سطح پر وابستگی یا کمٹ منٹ کی بات کیجئے تو میں یہ کہوں گا کہ فکشن تو شاید اس بار گراں کو برداشت کر بھی لے مگر شاعری کسی بھی سطح پر اپنے آپ کو ایسی کسی چیز سے ملوث کرنا پسند نہیں کرے گی ـــــ شاعری تو ایسی ظالم چیز ہے کہ وہ اپنے خود مکتفیانہ وجود کے سامنے غیر ذات تو غیر ذات خود شاعر کی ذات کو بھی پس پشت ڈال دیتی ہے۔ پچھلے پندرہ بیس سال کے غیر وابستہ شعراء کی تخلیقات پر ایک طائرانہ نظر اس کے ثبوت کے لئے کافی ہوگی کہ اس مختصر سی مدت میں اردو میں جتنی متنوع اور رنگا رنگ شاعری وجود میں آئی ہے اردو کی تاریخ میں اتنے کم عرصے میں ہماری شاعری کبھی اتنے SHADES کے ساتھ سامنے نہیں آئی ـــــ یہ الگ بات ہے کہ اپنے سارے تنوعات کے باوجود اس زمانے کی شاعری میں فیشن زدگی اور اندھی تقلید کے نمونے بھی منظر عام پر آئے مگر ایسی چیزیں امتداد وقت کے ساتھ خود ہی از کار رفتہ ہو جاتی ہیں اس لئے ان کو زیر بحث لانے کی ضرورت ہی نہیں۔

آخر میں ایک بات کہتا چلوں کہ کبھی مقصدیت یا وابستگی اور کبھی ناوابستگی کا سلسلہ ادب میں ابتدا ہی سے چلتا رہا ہے مگر آپ پوری دیانتداری سے ادبی تاریخ پر نظر ڈالیں تو اندازہ ہوگا کہ ہر دور میں بہتر شاعری کا تناسب خود مکتفی تخلیق کاروں کے یہاں زیادہ رہا ہے۔

ـــــ ابوالکلام قاسمی

مارچ، اپریل، ۷۹ء

سلیم احمد　　　　پاکستان

ایک سچے شاعر کا المیہ

سچا شاعر ہمیشہ ایک ایسے آدمی کی طرح ہوتا ہے جو طوفان میں گھرا ہوا ہو، اس کی کشتی ٹوٹ چکی ہو اور تیرنے کے سہارے کے لئے ایک تختہ بھی نہ ہو۔ کوہ پیکر موجیں اس کے وجود کو اتھل پتھل کر رہی ہوں اور وہ اپنے جسم و روح کی ساری قوتوں کے ساتھ گرداب فنا سے نکلنے کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہا ہو۔ شاعری طوفان وجود سے لڑنے کا نام ہے۔ لسان الغیب خواجہ حافظ شیرازیؒ نے شاعری کی اس کیفیت کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

شب تاریک و بیم موج، و گردابِ چنیں حائل
کجا دانند حالِ ما سبکسارانِ ساحل ہا

عام آدمی شاعر سے اس لئے مختلف ہوتا ہے کہ وہ ساحل کے حصارِ عافیت میں زندگی بسر کرتا ہے۔ اس کی زندگی اتھلی پرسکون اور پایاب ہوتی ہے۔ وہ طوفان سے ناآشنا ہوتا ہے اور اس لئے کبھی وجود کی گہرائیوں میں نہیں اتر سکتا۔ سائنسداں کہتے ہیں کہ زمین کبھی لاوا تھی، پھر ٹھنڈی ہونی شروع ہوئی اور ٹھنڈی ہو کر اس کی سطح منجمد ہو گئی لیکن زمین کی تہہ میں ابھی تک گرم گرم ابلتا ہوا لاوا موجود ہے اور جب کبھی وہ جوش مارتا ہے تو زلزلہ آجاتا ہے۔ شاعری انسانی وجود کے اس زلزلے سے پیدا ہوتی ہے۔ عام آدمی اپنے وجود کی تہہ سے ناواقف ہوتا ہے اور ٹھنڈی اور مردہ زمین پر کاہلی سے چلتا پھرتا رہتا ہے۔ بودلیئر نے کہا تھا کہ خوف و خطر سے بے نیاز ہو کر قعرِ عمیق میں کود پڑو۔ اقبال نے کہا ہے:

خدا تجھے کسی طوفاں سے آشنا کر دے

غالب کہتا ہے:

دامِ ہر موج میں ہے حلقۂ صد کامِ نہنگ

یہ سب سچے شاعر کے اسی تجربے کے نا تمام بیانات ہیں۔ میں اس مضمون میں اقبال کی شاعری کو اسی نقطۂ نظر سے دیکھوں گا اور کوشش کروں گا کہ ان کے شاعرانہ تجربے کی اس مخصوص نوعیت کو آپ کے سامنے

پیش کروں جس کے بغیر اقبال فلسفی متکلم، سیاسی مفکر، ماہر اقتصادیات سب کچھ ہو سکتے تھے، شاعر نہیں ہو سکتے تھے۔

اقبال کی شاعری کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ فکر کی شاعری ہے۔ مداح اسے اقبال کی تعریف سمجھتے ہیں لیکن مخالف اسی بات کا سہارا لے کر ان پر فلسفہ موزوں کرنے کا الزام لگاتے ہیں۔ یہ دونوں نقطہ ہائے نظر اقبال تک، اس اقبال تک جو اول و آخر شاعر تھا، نارسائی کا نتیجہ ہیں۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ اقبال نے، جو بقول خود اقبال سے آگاہ نہیں تھا۔ اس نارسائی کو محکم کرنے میں مدد دی ہے۔ اقبال جب اپنے شاعر نہ ہونے کا اعلان کرتے ہیں تو اس سے ان کے سطحی مداحوں اور بے ہنر مفسروں کو اقبال کی اس توہین کا موقع ملتا ہے جو ہمیشہ ایک ابلہانہ تعریف کے رنگ میں اپنی تہذیب دشمنی کا اظہار کرتی ہے۔ بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ شاعرانہ تجربے کی ایک نوعیت ایسی بھی ہے جہاں شاعر اپنے وجود کی ان گہرائیوں سے آشنا ہوتا ہے جس کے سامنے اظہار کی ساری قوتیں ہیچ معلوم ہوتی ہیں۔ اور چونکہ شاعری تجربے اور اظہار کا ایک پیچیدہ مرکب ہے اس لئے شاعر کبھی کبھی اپنے شاعر ہونے سے منکر بھی ہو جاتے ہیں مثلاً میر جیسے سراپا شاعر نے بھی کہہ رکھا ہے کہ:

ہم کو شاعر نہ کہو میر کہ صاحب ہم نے
درد و غم کتنے کئے جمع تو دیوان کیا

یہ شاعری کا انکار نہیں ہے سوائے شاعری اس "چیزے دگر" کا اقرار ہے جو شاعرانہ تجربے ہی کا ایک حصہ ہے، اقبال کے شاعر ہونے سے انکار کے نتیجے کے طور پر ہم اقبال کے زندہ تجربات کو، ان تجربات کو جو اس کے وجود کی گہرائیوں سے پیدا ہوئے تھے اور اس کے خون گرم کا ایک حصہ تھے، بنے بنائے نام نہاد خیالات کی صورت میں دیکھتے ہیں اور ہم میں سے بعض اس تحقیق پر خوش ہو جاتے ہیں کہ اقبال نے یہ خیالات کہاں سے اڑائے ہیں۔

تمہید طویل ہوتی جا رہی ہے اس لئے آیئے اپنے موضوع کا آغاز کریں۔ میرے سامنے بنیادی سوال صرف ایک ہے۔ اقبال کے باطن میں اقبال کی شاعری کا سرچشمہ کہاں ہے؟ وہ کون سا مرکزی مسئلہ ہے جس سے ان کے وجود میں وہ طوفان یا زلزلہ پیدا ہوتا ہے جو ان کی شاعری کی بنیاد ہے۔ اس مسئلے کے ساتھ ہم تجربات کے اس پورے نظام کو بھی دیکھیں گے جو طوفان کی چھوٹی بڑی موجوں کی طرح اقبال کے پورے شعری تجربے کی تشکیل کرتا ہے۔ اقبال کے مسائل کا سوال آتا ہے تو کچھ لوگ "زندگی" کا نام لیں گے۔ کچھ "خودی" کا، کچھ "عشق" کا، کچھ "حرکت و عمل" کا، کچھ "قوت" کا اور میں ان سے انکار نہیں کروں گا۔

بظاہر یہ اقبال کے موضوعات بھی ہیں اور مسائل بھی۔ لیکن دراصل میں نے جس مسئلے کے بارے میں استفسار کیا تھا وہ کچھ اور تھا۔ طوفان میں گھرا ہوا آدمی کیا کرتا ہے؟ اپنے تحفظ کے لئے ہاتھ پاؤں مارتا ہے، اور مثل مشہور ہے کہ ڈوبتے کو تنکے کا سہارا، اقبال کے یہ موضوعات، جن کا ابھی ذکر ہوا ہے، اقبال کے وہ سہارے ہیں، جن سے وہ طوفان میں تحفظ تلاش کرتے ہیں۔ میرا سوال ان سہاروں کے بارے میں نہیں بلکہ اس طوفان کے بارے میں ہے جس سے اقبال کی شاعری اور اس کے یہ موضوعات پیدا ہوتے ہیں۔ اپنی بات کی مزید وضاحت کے لئے میں کچھ مثالیں پیش کرتا ہوں۔

محمد حسن عسکری نے کسی جگہ لکھا ہے کہ میر کا مرکزی مسئلہ "دنیا" اور حالی کا "دنیاداری"۔ حالی کو فی الحال چھوڑیئے۔ لیکن میر کے مخصوص تجربات کی نوعیت کچھ ایسی تھی کہ وہ دنیا سے بالکل کٹ کر رہ گئے تھے۔ ان کا اپنے ماحول۔ انسانوں اور روزمرہ زندگی کے واقعات و حوادث سے کوئی تعلق باقی نہیں رہا تھا، اس لئے ان کے وجود کی سب سے بڑی ضرورت دنیا سے اس ٹوٹے ہوئے تعلق کو دوبارہ جوڑنا تھا۔ ان کی روح کا یہی تقاضا ان کی شاعری کی اساس ہے۔ میر اپنے اس مسئلے کے ساتھ جب شاعری کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو اس سے میر کی وہ مخصوص کائنات پیدا ہوتی ہے جو کارگہہ شیشہ گراں سے بھی نازک ہے اور میر نے اس کائنات کی تخلیق صرف اپنے خیالات کے ذریعے نہیں کی ہے بلکہ ان کی شاعری کی فضا، لب و لہجہ، اسلوب، یہاں تک کہ زبان کا استعمال تک اس کی تخلیق میں حصہ لیتا ہے، اس کے مقابلے پر غالب کی شاعری کا مرکزی مسئلہ خود ان کی ذات ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ غالب دنیا میں اتنے جذب ہوگئے تھے کہ دنیا اُن کی ذات کے لئے خطرہ بن گئی تھی۔ اس لئے میر کے برعکس غالب کا مسئلہ دنیا سے رشتہ جوڑنا نہیں بلکہ توڑنا ہے:

اپنی ہستی ہی سے ہو جو کچھ ہو
آگہی گر نہیں غفلت ہی سہی

میر کی طرح غالب کے وجود کی یہ ضرورت بھی ان کی کائنات شاعری کے ذرے ذرے میں ظاہر ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ اپنے اسلوب تک میں اپنے آپ کو دنیا سے الگ کر لیتے ہیں۔ میں میر انیس کے بارے میں ایک جگہ لکھ چکا ہوں کہ ان کی شاعری کا مرکزی مسئلہ انسانی رشتے ہیں۔ میر انیس نے انسانی رشتوں کو اپنے وجود میں اس طرح زندہ کیا ہے کہ ان کی پوری شاعری اُن کے احساس سے ایک دھڑکتے ہوئے دل کی طرح ہے، لیکن میر انیس انسانی رشتوں کی یہ شاعری اس لئے کر سکے کہ ان کی روح کا سب سے بڑا احساس انہی رشتوں کی ناپائداری ہے۔ اتنا کافی ہے۔ ان کی مثالوں سے یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ

رخصت اے بزمِ جہاں سوئے وطن جاتا ہوں میں
آہ اس آباد ویرانے میں گھبراتا ہوں میں

لوگ کہیں گے یہ ایمرسن کا ترجمہ ہے، لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ترجمے کے لئے اس نظم کا انتخاب اقبال کی ہی نفسی کیفیت کو ظاہر کرتا ہے۔ مجھے احساس ہے کہ یہ صرف اشارے ہیں، کوئی واضح ثبوت نہیں، لیکن اقبال کی شاعری کی داخلی شہادت کی روشنی میں یہ بات ناقابلِ تردید ہے کہ موت اقبال کی نفسیات کا سب سے گہرا مسئلہ ہے۔ ایک ایسا مسئلہ جسے اقبال کبھی پوری طرح حل نہیں کر سکے۔ چنانچہ کسی خارجی محرک کی عدم موجودگی میں یہ کتنا زیادہ قرینِ قیاس معلوم ہوتا ہے کہ اس کا تعلق ان کے بطون ذات سے ہے۔ موت کی خواہش اقبال کے اندر موجود تھی اور اقبال اس سے لڑنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اقبال کی خود سے یہ لڑائی ان کی پوری شخصیت کا نمایاں ترین پہلو ہے۔ وہ شاعر ہیں اور شاعری کے خلاف ہیں۔ فلسفی ہیں اور فلسفے کے خلاف ہیں، عالم ہیں اور علم کے خلاف ہیں عقل کے پتلے ہیں اور عقل کے خلاف ہیں۔ ڈبلیو۔ بی۔ ییٹس نے کہا تھا کہ دوسروں سے لڑنے سے خطابت پیدا ہوتی ہے اور خود سے لڑنے سے شاعری۔ اقبال کی اپنی ذات سے لڑائی ان کی شاعری کی بنیاد ہے۔ اقبال موت کی خواہش کے باوجود موت سے لڑتے ہیں۔ یہی ان کی شاعری کا سب سے بنیادی محرک ہے۔

میں نے کہا ہے کہ موت اقبال کی شاعری کی بنیاد ہے۔ اب اس کے ساتھ ایک اور مسئلے کو دیکھئے۔ اقبال ایک زمانے میں شاعری ترک کر دینا چاہتے تھے۔ بظاہر اس کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ وہ شعر و شاعری کی افادیت کے قائل نہیں رہے تھے اور اسے کارِ بے کاراں تصور کرنے لگے تھے۔ لیکن اقبال نے جیسی شاعری کی ہے اس کی روشنی میں یہ مسئلہ اتنا آسان نہیں رہتا۔ وہ اتنے بڑے شاعر ہیں کہ ہم یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ ان کے دل میں ترکِ شاعری کا خیال کیوں پیدا ہوا؟ ہمیں اقبال کی بات کو تیسرے درجے کے سماجی اصلاح پسندوں اور بازاری قسم کے لیڈروں سے نہیں ملانا چاہیئے۔ اقبال جیسے شاعر سے زیادہ اس بات کو کون جانتا ہے کہ شاعری اپنے وجود کو پا جانے کا نام ہے۔ تو کیا اقبال ترکِ شاعری کر کے اپنے وجود سے بھاگنا چاہتے ہیں؟ اقبال اپنی خواہش کے باوجود شاعری ترک نہیں کر سکے اور یہ اعتراض کرنے پر مجبور رہوئے کہ "میرے قلب کی کیفیت بعض اوقات ایسی ہو جاتی ہے کہ میں شعر کہے بغیر نہیں رہ سکتا۔" ان لوگوں کو، جو اچھے یا بُرے کسی بھی معنی میں اقبال کی شاعری کے منکر ہیں، اقبال کے اس قسم کے اعترافات کو زیادہ توجہ کے ساتھ دیکھنا چاہیئے۔ اقبال شاعری چھوڑنا چاہتے تھے تو اس کی وجہ کہیں یہ تو نہ تھی کہ وہ اس تجربے کے اظہار سے ڈرتے تھے، جس نے انہیں اپنے وجود کی اندرونی تہوں میں موت سے دوچار کر دیا تھا۔ میرے نزدیک جس طرح اقبال کی شاعری ان کی خواہشِ مرگ سے لڑائی کا نتیجہ ہے، اسی طرح ان کی ترکِ شاعری بھی اسی خواہش سے لڑنے کا ایک مظہر تھی۔ اقبال شاعری نہیں چھوڑ سکے اور

موت سے دوچار ہوکر زندگی کے اور پرستار ہوگئے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ انھوں نے اپنے ذہنی عمل کے ذریعے ایک ایسی چیز کو، جو انہیں شاعری اور زندگی دونوں میں منفیت کی طرف لے جاسکتی تھی، ایک مثبت قوت میں بدل دیا۔ اقبال کی شاعری خواہش مرگ کی منفیت کو زندگی کے اثبات میں بدلنے کا عمل ہے۔

اب ہم اس مسئلے کو ایک اور زاویئے سے دیکھتے ہیں۔ افلاطون نے کہا تھا کہ فلسفہ موت کی تیاری کا نام ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ موت سے پہلے مرجاؤ۔ مہاتما بدھ کی زندگی موت سے دوچار ہوکر انہیں نروان کی طرف لے گئی۔ ہائیڈیگر کہتا ہے کہ انسان اپنے حقیقی وجود کو موت کے روبرو ہوکر ہی پاسکتا ہے۔ اقبال بھی موت ہی کے ذریعے اپنے حقیقی وجود تک پہونچتے ہیں۔

اس بحث کی حدود میں حقیقی وجود اور غیر حقیقی وجود کے کیا معنی ہیں؟ ہم اس انسان کی مثال کرچکے ہیں جو کسی سہارے کے بغیر طوفان سے لڑنے کی کوشش کر رہا ہو۔ حقیقی انسان ہے۔ اس انسان کو دریا کی حقیقت بھی معلوم ہے اور خود اپنی بھی۔ وہ جانتا ہے کہ وہ کتنا کمزور اور کتنا طاقتور ہے۔ ہر قسم کے مصنوعی تحفظ سے آزاد ہوکر وہ اپنی حقیقت کے روبرو دریا کی حقیقت سے دوچار ہے اور اس کے طوفان میں خود اپنی توانائی کے ذریعے زندہ رہنا چاہتا ہے۔ طوفان سے مقابلے کی کشاکش میں وہ اپنے جسم و روح کے ذرے ذرے سے آشنا ہوجاتا ہے اور اس خودآگہی کے ذریعے وہ قوت پیدا کرتا ہے جو مانگے تانگے کی چیز نہیں، خود اس کے وجود کی قوت ہے، اس کے مقابلے پر وہ آدمی جو ساحل پر کھڑا ہوکر طوفان کو دور سے دیکھتا ہے، غیر حقیقی آدمی ہے، وہ ایک مصنوعی تحفظ کے تودے پر کھڑا ہوکر صرف ایک تماشائی کی طرح ہے۔ اس پر ابھی دریا اور اس کے طوفان کی حقیقت نہیں کھلی اور چونکہ وہ اس کی حقیقت سے ناآشنا ہے اس لئے خود اپنے وجود کو بھی نہیں جانتا۔ وہ اگر کوئی طاقت محسوس بھی کرتا ہے تو ایک مستعار طاقت ہے جیسے کسی مفلوج انسان کی بیساکھی، ابھی اس کی زندگی کمزور سہاروں سے باہر نہیں نکلی۔ آپ اس انسان کو اچانک ساحل سے دھکا دے دیجئے۔ وہ بچاؤ بچاؤ چلائے گا اور ہاتھ پاؤں مارنے لگے گا، لیکن جب اس کو معلوم ہوجائے گا کہ اس کا بچاؤ باہر سے نہیں ہوسکتا تو پھر وہ اپنے وجود کی پوری قوت سے پانی میں ابھرنے کی کوشش کرے گا۔ تب اسے معلوم ہوجائے گا کہ وہ کیا ہے اور دریا کیا ہے؟ وہ حقیقی انسان بننے لگے گا۔ ہرمن ہیس نے کہا ہے کہ انسان اپنے مصائب کے ذریعے وجود میں آتا ہے۔ نٹشے کہتا تھا کہ ہمیشہ خطرے میں زندہ رہنے کی کوشش کرو۔ یہ سب اسی انسان کی واردا تیں ہیں جو غیر حقیقی انسان سے حقیقی انسان بن رہا ہے۔ اقبال زندگی کے شاعر ہیں اس لئے کہ موت کے طوفان کی شدت و قوت کو اپنے وجود کی گہرائیوں میں دریافت کرچکے ہیں۔ زندگی، قوت اور عمل یہ سب موت کے چیلنج کا جواب ہیں۔ اقبال نے موت کو محسوس کیا ہے اور اس کی ہمہ گیر قوت کے سامنے اپنی کمزوریوں کے اندر سے اپنی قوت پیدا کی ہے۔ میں نے

کہا ہے کہ اپنی کمزوریاں کے اندر سے، یہ ایک اہم بات ہے یہی قوت ہمیشہ کمزوری کے باطن سے پیدا ہوتی ہے، ہمیں اقبال کی کمزوریوں کا اندازہ ان مقامات سے ہوتا ہے جہاں وہ " تو " سے مخاطب ہوتے ہیں اور ان کے " تو " کے پیچھے " میں " چھپا ہوا ہوتا ہے۔ وہ ساری کمزوریاں جو دوسروں میں نظر آتی ہیں مثلاً بے عملی، جذبے کی کمی، شدید اور مستقل خواہشات کا فقدان وہ سب ان کی اپنی کمزوریاں بھی ہیں۔ اقبال نے انھیں اپنے ذریعے دوسروں میں دریافت کیا ہے اور اقبال ان سے لڑتے ہیں۔ یہ لڑائی اقبال کی شاعری کی روح ہے، اسی لڑائی کے ذریعہ وہ حقیقی شاعر بھی بنتے ہیں اور حقیقی انسان بھی۔

اقبال، اپنے تجربے کے ذریعے اپنی اور اس لئے سارے انسانوں کی سب سے بڑی کمزوری دریافت کرتے ہیں۔ موت ـــ موت، ناپائیداری، بے ثباتی۔ یہ کمزوری اپنے جواب میں ثبات کی خواہش پیدا کرتی ہے۔ اقبال اس کی تعمیم کر دیتے ہیں۔ انسان کو ثبات کی طلب ہے۔ اقبال کے سارے مرکزی تصورات اسی تعمیم سے پیدا ہوتے ہیں۔ ثبات کی طلب افراد کو بھی ہے اور اقوام کو بھی۔ اقبال کی فکر کا بڑا حصہ اسی طلب کے ذرائع سوچنے پر صرف ہوا ہے، بہت جلد وہ اس نتیجہ پر پہونچ جاتے ہیں کہ قوموں کو اگر کوئی ثبات حاصل ہو سکتی ہے تو صرف کسی دستور حیات کے ذریعے۔ دستور حیات کے بغیر قومیں زندہ نہیں رہ سکتیں، بلکہ دستور حیات کی عدم موجودگی ہی قوموں کی موت ہے۔ اقبال کے نزدیک وہ دستور حیات، جو اقوام کو ثبات عطا کر سکتا ہے، اسلام ہے۔ اس کا ثبوت وہ تاریخ سے پیش کرتے ہیں ـــ " یونان و مصر و روما سب مٹ گئے جہاں سے " ـــ سب مٹ گئے لیکن مسلمان باقی ہیں ـــ مسلمان اس لئے باقی ہیں کہ ان کے پاس ایک ایسا دستور حیات ہے جو خود خدا نے انسان کو عطا کیا ہے۔ اقبال کے نزدیک دنیا کی دوسری قومیں بھی اسلام کے ذریعے ثبات حاصل کر سکتی ہیں اور فرد کے لئے اقبال کا پیغام یہ ہے:

چناں بزی کہ اگر مرگ تست مرگ دوام
خدا ز کردۂ خود شرمسار تر گردد

فرد کس طرح زندہ رہ سکتا ہے؟ یہ اقبال کی فکر کا دوسرا بڑا مسئلہ ہے۔ اقبال کے نزدیک فرد خودی کے استحکام کے ذریعے زندہ رہتا ہے۔ ان کے نزدیک انسانی ذات کے دو پہلو ہیں۔ ایک پہلو وہ جس کے ذریعے وہ عام کاروبار حیات میں وہ شریک ہوتا ہے اور دوسرا پہلو وہ جس کے ذریعے وہ اقدار کی تخلیق کرتا ہے۔ انسانی ذات کا وہ پہلو، جس کا تعلق عام زندگی سے ہے، فنا پذیر ہے۔ وہ پہلو، جو اقدار کی تخلیق کرتا ہے، ایک طرح کا دوام رکھتا ہے۔ مولانا حامد حسن قادری نے ایک مرتبہ اقبال پر اعتراض کرتے ہوئے لکھا تھا کہ اقبال حیات بعد الموت کو خودی کے استحکام کا نتیجہ سمجھتے ہیں اور ان کے نزدیک خودی کا استحکام اور عدم استحکام ہی کا فرد مومن کا امتیاز پیدا کرتا ہے۔

گویا دوسرے لفظوں میں اقبال کے نزدیک حیات بعد الموت اس کے لئے ہے جو خودی کے استحکام کے ذریعے مومن بنا۔ جب قرآن حکیم میں حیات بعد الموت کا فرد مومن دونوں کے لئے ہے اور دونوں کے لئے جنت و دوزخ میں " خالدین فیھا ابداً " کا حکم لگایا گیا ہے۔ یہ اعتراض کئی لحاظ سے اہم ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اقبال حیات بعد الموت کے عقیدے کو روایتی معنوں میں تسلیم نہیں کرتے۔ یہ کوئی استحقاق نہیں ہے جو بلا تخصیص ہر فرد انسانی کو حاصل ہو۔ چنانچہ خطبات میں انھوں نے صاف لکھا ہے کہ نوع انسانی ابدیت کی امیدوار ہے۔ بہرحال اقبال کے نزدیک موت سے تحفظ خودی کے استحکام کا آخری ثمر ہے۔ خودی کے استحکام کے لئے اقبال عشق و عمل، فقر و استغنا اور اسی قسم کی دوسری اقدار کی تخلیق ضروری سمجھتے ہیں۔ یہ سب " جہاں بزی " کی تفسیریں ہیں۔

میں نے مضمون کی ابتدا میں کہا تھا کہ میرے سامنے بنیادی سوال صرف ایک ہے۔ اقبال کے باطن میں اقبال کی شاعری کا سرچشمہ کہاں ہے۔ یہ سوال میں نے اس پس منظر میں اٹھایا تھا جس سے اقبال جیسے شاعر کا یہ المیہ پیدا ہوا کہ ان کے مداح اور مخالف دونوں اس بات پر متفق نظر آتے ہیں کہ وہ شاعر نہیں تھے۔ مداح انہیں شاعری سے بلند تر سمجھتے ہیں، مخالف شاعری سے کم تر۔ چنانچہ کبھی کہا جاتا ہے کہ وہ شاعری تو کر نہیں سکے منظوم خیالات البتہ پیش کئے ہیں۔ اقبال جیسے شاعر کے ساتھ ہمارا یہ سلوک اقبال کا المیہ تو ہے ہی شاعری اور ہماری تہذیبی زندگی کا بھی المیہ ہے۔ ہم اقبال جیسے شاعر کی قدر شاعرانہ حیثیت سے نہیں کر سکے تو تہذیبی مظاہر کی کیا کر سکیں گے۔ میں نے اقبال کی شاعری کی بنیاد ان کے تجربے کی گہرائی میں اتر کر تلاش کرنے کی کوشش کی ہے لیکن یہ حرف آخر نہیں۔ اس سے اختلاف بھی کیا جا سکتا ہے اور جہاں تک اندازہ ہے، اختلاف کیا بھی جائے گا لیکن اصل یہ مسئلہ نہیں ہے کہ میں نے یا کسی نے ان کی شاعرانہ واردات کی تشخیص کس مسئلے کے ذریعے کی ہے۔ اصل مسئلہ ان کو شاعر سمجھ کر ان کی شاعرانہ حقیقت اور حیثیت کو سمجھنے کی کوشش کرنا ہے۔ میں نے ایک ابتدائی کوشش کی ہے اور خدا کا شکر ہے کہ حرف آخر کہنے کا خبط مجھے کبھی نہیں رہا۔ □

ریڈر شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ
نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

شمیم حنفی

مخدوم محی الدین

فیض اور مخدوم شعر کے اُس تصور پر ایک مستقل طنز کی حیثیت رکھتے ہیں جو تجربے کی سیاسی جہت کو تخلیقی سرگرمی کے غیر شاعرانہ بُعد سے تعبیر کرتا ہے۔ ہر تجربہ، وہ سیاسی ہو یا غیر سیاسی، انسانی ہوتا ہے۔ پس ایسے تجربات سے، جو کسی نہ کسی سطح پر سیاسی واردات کا اظہار کرتے ہیں، آنکھیں پھیر لینے کا مطلب یہ ہوا کہ انسانی وجود کی کلیت کا شعور خام اور ناقص ہے۔ اُردو شعر و ادب کے مفسروں کا ایک خاصا بڑا حلقہ ادیب کی آزادی اور ادب کے جمالیاتی عمل کے نام پر سیاست کو نفرت اور خوف کی نظر سے دیکھتا رہا ہے۔ اس نوع کے مفسروں نے غالباً اس مفروضے کو جزو ایمان بنا لیا ہے کہ شعر کی تخلیق کا سلسلہ فرانس کے علامت گزیدہ شاعروں کے ساتھ منقطع ہو گیا۔ انھیں اس حقیقت کے اعتراف میں بھی تامل ہوتا ہے کہ فرانس کے ان باکمالوں کی بظاہر "غیر سیاسی" شاعری دراصل ایک سیاسی واقعے کے اندوہناک ردعمل کا نتیجہ تھی۔ اسی ردعمل کا روشن پہلو جرمن اتباعیت کی شکل میں سامنے آیا۔ اب رہی یہ بات کہ اتباعیت کے اِس میلان کی ترجمانی کرنے والوں میں کسی کو وہ اعتبار نہ مِل سکا جس کے حامل بودلیر اور اس کے سلسلے کے دوسرے تمام شعراء ہوئے تو یہ مسئلہ دراصل تخلیقی ہنرمندی کا ہے۔ اسے ادب کے سیاسی اور غیر سیاسی رول کی بحث میں الجھانا محض تنگ نظری ہے۔

یہی ہنرمندی ادب کی تخلیق کرنے والوں کو اعتماد کی وہ قوت بخشتی ہے جس کا اظہار برنارڈ شا نے ان الفاظ میں کیا تھا کہ جو لوگ اس بات پر اصرار کرتے ہیں کہ ادب مقصد سے عاری ہوتا ہے انھیں یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ ادب میں مقصد کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوتا۔ مقصد کے معنی و مفہوم کے باب میں قیاس آرائیاں حسب توفیق کرتے رہیئے۔ بہرحال یہ طے ہے کہ شعر و ادب کے مقاصد و مناہج تخلیق کی استعداد کے تابع ہوتے ہیں اور اس استعداد کی توانائی کے بغیر خود کو پوری طرح منکشف اور متعین نہیں کر سکتے۔

سچی شاعری کی ایک پہچان یہ بھی ہے کہ وہ اپنے مخالف تک سے داد وصول کر لیتی ہے۔ گورکی نے اسی پہچان کو ادب کی بنیادی صداقت سے تعبیر کیا تھا اور یہ کہا تھا کہ کسی فن پارے کے مرکزی تصور سے

یکسر منحرف ہونے کے باوجود ہم جن اسباب کی بنا پر اس کی قدر کرتے ہیں دراصل اُنھیں میں ادب کی جمالیات کا رمز پنہاں ہوتا ہے۔ سچی شاعری پڑھنے والے کو قائل کرنے تک محدود نہیں رہتی، اسے مکمل طور پہ فتح کرلیتی ہے، اس طرح کہ اُس کے تعصبات کا بنا بنایا ڈھانچہ مسمار ہو جاتا ہے اور وہ اپنے اسلحے پھینک کے بالآخر خود کو اُس پراسرار تجربے کے حوالے کر دیتا ہے۔

بساطِ رقص کے دیباچے میں اپنے قاری سے خطاب کرتے ہوئے مخدوم نے کہا تھا:

زمان و مکاں کا پابند ہونے کے باوجود شعر بے زماں ہوتا
ہے اور شاعر اپنی ایک عمر میں کئی عمریں گذارتا ہے۔

زمان و مکاں سے لازمانیت کی طرف یہ سفر اسی امر کی نشاندہی کرتا ہے کہ سچی شاعری محض واقعات کی اسیر نہیں ہوتی، نہ ہی سچا تخلیقی تجربہ اس تجربے کا عکس محض ہوتا ہے جس کا تعلق ہماری زندگی اور وجود کی بیرونی سطحوں سے ہو۔ شاعر کا تجربہ اس کی بصیرت اور استعداد میں آمیز ہونے کے بعد اُسی وقت مکمل ہوتا ہے جب اسے اظہار کی مناسب ترین ہیئت مل جائے۔ اس نقطے پر اُس کی فکر اور اُس کے اسلوب بیان کی ثنویت ختم ہو جاتی ہے اور لفظ و معنی کے عقد باہمی سے ایک ایسی اکائی جنم لیتی ہے جسے ہم شعر یا نظم کہتے ہیں۔ یہی اکائی اس شاعر کا شناس نامہ ہوتی ہے اور اسی کو ہم زمان و مکاں کے ایک ننھے سے دائرے کو توڑ کر لازمانیت کی بے حساب فضاؤں میں گرم پرواز دیکھتے ہیں۔ مخدوم کا یہ قول کہ شاعر اپنی عمر میں کئی عمریں گذار دیتا ہے اس پراسرار سچائی کا اظہار ہے کہ شعر میں، اس کے تمام تر مادی انسلاکات کے باوجود، فوری (IMMEDIATE) اور معینہ حوالوں سے گریز یا ان کی قید سے رہائی کی محسوس توانائی بھی شامل ہوتی ہے۔ اپنے تاریخی تجربوں کے حوالے سے شعر کہنے والا گریز کے اس عمل میں حقیقتوں سے انکار کا مرتکب نہیں ہوتا بلکہ ٹھہری ہوئی حقیقتوں کو اپنی فنی بصیرت کی تمازت سے پگھلا دیتا ہے۔ پھر یہ حقیقتیں اس کے تجربے کا بنیادی پتھر ہونے کے باوجود نہ تو اس کی سرگرمی میں مانع ہوتی ہیں نہ ہی شعر کے قاری سے اپنی اولین (ORIGINAL) ہیئت کی پہچان کا مطالبہ کرتی ہیں۔ اسٹیفن زوئیگ کے نام ایک خط میں گورکی نے لکھا تھا کہ "فن کار جو تصویر یا اختراع کرتا ہے لوگوں تک اس سے کہیں زیادہ بہتر اور دلچسپ بنا کر لیجاتا ہے جیسا کہ انھیں خدا نے یا خود انھوں نے یا تاریخ نے بنایا تھا" غالبًا اسی تصور کی بنیاد پر گورکی نے بالزک کو ایک ہی سانس میں حقیقت پسند اور اسی کے ساتھ ساتھ حقیقت سے دور بھی ٹھہرایا تھا۔ اس رمز کو سمجھنا نہ تو ان لوگوں کے لئے ممکن ہے جو شعر کو اوّل و آخر ایک اجتماعی سرگرمی کا اشاریہ سمجھتے ہیں نہ ہی ان کے بس کی بات ہے جو حقیقت کی سیاسی بنیادوں کو شعری کردار کے لئے ہلاکت آفریں تصور کرتے ہیں۔

مخدوم نے قارئین سے اسی خطاب میں یہ بھی کہا تھا کہ شاعر" بہ حیثیت ایک فردِ معاشرہ حقیقتوں سے متصادم اور متاثر رہتا ہے۔ پھر وہ دل کی جذباتی دنیا کی خلوتوں میں چلا جاتا ہے۔ روحانی کرب و اضطراب کی بھٹی میں تپتا ہے، شعر کی تخلیق کرتا ہے اور داخلی عالم سے نکل کر عالمِ خارج میں واپس آتا ہے تاکہ نوعِ انسانی سے قریب تر ہو کر ہمکلام ہو۔ باہمہ اور بے ہمہ کا یہی وہ نکتہ ہے جسے زوال یافتہ ادیب" انا" یا" انفرادیت" سے تعبیر کرتا ہے"۔ "انا" کے لفظ کو مخدوم سے قطع نظر، ان سے یکسر مختلف رویہ رکھنے والے گروہ لوٹیگورز تک شاید ایک مرض سمجھتے تھے۔ بہر نوع یہاں الفاظ کی بحث سے الگ ہو کر اگر نقطۂ نظر کے سوالات پر غور کیا جائے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ مخدوم کے نزدیک شعر گوئی کا عمل شاعر کے باطن اور خارج کی ایک کبھی نہ ختم ہونے والی پیکار اور بیرونی دنیا سے بیک وقت اُس کے ربط اور اُس کے انقطاع دونوں سچائیوں کی جانب اشارہ کرتا ہے۔ مخدوم نے بساطِ رقص کا انتساب" محبت اور محنت" کے نام کیا ہے۔ اس مجموعے کی پہلی نظم عشقیہ ہے :

دلوں میں اژدہامِ آرزو لب بند رہتے تھے
نظر سے گفتگو ہوتی تھی دَم الفت کا بھرتے تھے
نہ ماتھے پر شکن ہوتی نہ جب تیور بدلتے تھے
خدا بھی مسکرا دیتا تھا جب ہم پیار کرتے تھے (طور)

اُن کی آخری نظم رُت (۱۹ مئی ۱۹۶۹ء) بھی ایک واضح عشقیہ آہنگ رکھتی ہے :

دل کا سامان اٹھاؤ
جان کو نیلام کرو
اور چلو
درد کا چاند سرِ شام نکل آئے گا
کیا مداوا ہے ؟
چلو درد پیو
چاند کو پیمانہ بناؤ
رُت کی آنکھوں سے ٹپکنے لگے کالے آنسو
رُت سے کہہ دو
کہ وہ پھر آئے

چلو
اُس گل اندام کی چاہت میں بھی کیا کیا نہ ہوا
درد پیدا ہوا درماں کوئی پیدا نہ ہوا

مخدوم کا غبی ترین قاری بھی اس حقیقت سے واقف ہے کہ مخدوم کی شاعری کے تناظر میں محبت یا عشق کے مفاہیم وہ نہیں جو روایتی قسم کی عشقیہ غزل سے منسوب کئے جاتے ہیں۔ مخدوم کا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے محنت اور محبت کو دو الگ الگ منطقوں کے طور پر برتنے کے بجائے دراصل محنت کو بھی محبت کے سحر، لطافت اور برگزیدگی کا استعارہ بنا دیا اور اس طرح اپنی تخیل اور اپنے تجربوں کی تعینیت کے مابین مفاہمت کی ایک راہ نکالی۔ ایسا نہ ہوتا تو ان کی حقیقت پسندی اس درجہ بلیغ اور رمز آمیز نہ ہوتی اور ان کی خطیبانہ نظموں میں نغمے کا وہ ارتعاش نہ ہوتا جو مشرق، آزادی وطن، مسافر، سپاہی، انقلاب، اسٹالن اور ان سب سے زیادہ جنگ آزادی کے آہنگ میں محسوس کیا جا سکتا ہے۔ سرخ سویرا کی یہ تمام نظمیں ہرچند کہ موضوعاتی ہیں اور ان کی اساس ایسے تجربوں پر قائم ہے جو ایک واضح اور غیر ذاتی معنوی تناظر رکھتے ہیں لیکن مخدوم نے انھیں اپنے لہجے کی غنائیت سے ایک جمالیاتی تجربہ بنا دیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ راشد کے استثنا کے ساتھ مخدوم کے ہم عمروں میں کسی دوسرے اُردو شاعر نے لفظ کے صوتی امکانات اور جہتوں سے شناسائی اس طور پر نہیں حاصل کی۔ مخدوم کی ان نظموں میں آہنگ معنی کا حصہ بن گیا ہے اور معنی کے اکہرے پن کے باوجود وہ آہنگ کی مدد سے انھیں ایسے قاری کے لئے بھی دلچسپ بنا دیا ہے جس کے تقاضے شاعری سے صرف ذہنی نہیں ہوتے۔

خیال کو جب تک جذبے کی سطح تک نہ پہونچایا جائے۔ کم از کم ضمنی اعتبار سے اس کی قدر و قیمت کچھ زیادہ نہیں ہوتی۔ خیال کی نثریت، استدلال اور معروضیت پر غالب آنے کے لئے اس کی ماہیت میں اس نوع کی تبدیلی کی شرط ناگزیر ہے۔ مخدوم نے ایک خاص سرگرم سیاسی زندگی گذاری۔ اپنے مقاصد سے ان کی وابستگی محض دانشورانہ نہ تھی۔ اس وابستگی کو انھوں نے اپنا ایمان بنا لیا تھا۔ ان کی پوری شخصیت ان کے سماجی اور سیاسی معتقدات کے دائرے میں ضم ہو گئی تھی اور ان کی فکر اور عمل کا ہر زاویہ ان کی ذات کا اظہار تھا۔ اس طرح ذات سے غیر ذات تک مخدوم نے جو سفر کیا اس کی نوعیت سرتاسر شخصی ہے۔ خیال اور عمل کی ایسی مکمل یکجائی مخدوم کے معاصرین اور رفقا کے یہاں کمیاب ہے۔

یہی وجہ ہے کہ مخدوم کی شاعری اپنی فکر، جذبے اور اس کے اظہار ان تمام سطحوں پر ایک گہری اور روشن سچائی کے احساس سے شرابور ہے۔ یہ سچائی ان کی نظموں کو محض وسیلہ نہیں رہنے دیتی۔ انھیں ایک تابناک اور دلآویز فنی تجربہ بنا دیتی ہے جس کی تحسین کے لئے ان کے افکار سے اتفاق و اختلاف کی بحث غیر ضروری ہو جاتی ہے۔ مقاصد کی جدو جہد کے جس دور میں مخدوم عملی اور سماجی اعتبار سے زیادہ سرگرم رہے۔ انھوں نے شعر گوئی اگر موقوف نہیں کی تو کم ضرور کر دی۔ خیال کو جذبے کی سطح تک لے جانے یا اسے واقعے کی بساط سے اُٹھا کر ایک دیرپا اور دور رس حقیقت کا رتبہ دینے کے لئے ضروری ہے کہ تجربے کے بے محابا اظہار سے دامن بچایا جائے اور ایک نیم متصوفانہ استغراق اور دھیان کے ذریعہ اس کی تہذیب کی جائے۔ شاید اسی لئے مخدوم کی خطیبانہ نظموں میں بھی نفرت، تشنج اور غصے کا تاثر ناپید ہے۔ شعر گوئی ان کے لئے کسی سماجی فرض کی یکسر شعوری تکمیل نہیں تھی۔ ان الفاظ میں کہ "سماجی تقاضے پُر اسرار طریقے سے شعر لکھواتے رہے ہیں"۔ مخدوم نے شعر کی فنی ترکیب اور اس کے تخلیقی پس منظر سے وابستہ اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ مائیکا فسکی نے اپنی ڈائری میں اپنے شعری رویے اور طریق کار کے بارے میں اپنے ذاتی تاثر کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا تھا :

> میں اپنے طور پر عقیدہ رکھتا ہوں کہ بہترین شعری کارنامہ کمیونسٹ انٹرنیشنل کے سماجی احکام کے مطابق ہی لکھا جائے گا، اور یہ کہ وہ کارنامہ پرولتاری طبقے کی فتح کا یقین دلائے گا۔ یہ کارنامہ نئے اور چونکا دینے والے لفظوں میں پیش کیا جائے گا جو سب کی سمجھ میں آسکیں۔ یہ کارنامہ اس وقت معرضِ وجود میں آئے گا جب اس کی ضرورت ہو گی اور ہوائی ایکسپریس ڈاک سے ایڈیٹر کو بھیجد یا جائے گا۔

اور پھر اس سے آگے بڑھ کر اس نے یہ بھی لکھا تھا کہ :

> بہر نوع شاعری کی تعینِ قدر کا کام جو کچھ میں نے ابھی کیا ہے اس سے کہیں زیادہ نازک اور پیچیدہ ہے۔ میں جان بوجھ کر اپنے خیال کو آسان بنا رہا ہوں، پھیلا رہا ہوں اور بڑھا چڑھا کر بیان کر رہا ہوں...... پھر آخر نظم کیونکر لکھی جاتی ہے؟ نظم کی تخلیق کا کام سماجی احکام ملنے سے بہت پہلے شروع ہو جاتا ہے اور شاعر کا شعور اس سب سے

بالکل بے خبر ہوتا ہے۔ نظم کی تیاری کا کام بغیر کسی مزاحمت کے جاری
رہتا ہے اور ایک طے شدہ مدت میں کوئی نظم پارہ اسی صورت میں لکھا
جا سکتا ہے جب پہلے ہی سے اس کے لئے مناسب شعری توانائیاں
یکجا کی جا چکی ہوں

ں یہ بات سامنے آتی ہے کہ فنی تجربے کی تکمیل کے معاملے میں صرف خیال یا تجربے کی حقیقت پسندی
ور خیر اندیشی کوئی معنی نہیں رکھتی۔ مارکس نے تخلیقی زبان اور ہیئت کو "روحانی انفرادیت" کا نشان
رار دیا تھا۔ مخدوم انفرادیت کے لفظ سے گریزاں تھے کہ ان کے نزدیک یہ لفظ "زوال یافتگی" کا
طیہ تھا۔ انھیں شاید اس واقعے کی خبر نہ ہو سکی کہ "روحانی انفرادیت" کی اصطلاح ادب کے سیاق
ں اس شخص نے وضع کی تھی جو انسان کی اجتماعی ترقی میں عقیدہ رکھتا تھا اور تیسری دنیا کے باشندوں
ے لئے اس ترقی کا شاید سب سے بڑا نقیب اور مفسر تھا۔ بہر نوع مخدوم کی نظموں کی ترکیب اور تاثر
ا احاطہ کیا جائے تو یہ حقیقت روشن ہوتی ہے کہ مخدوم نے اجتماعی تجربوں کے اظہار میں ایک ذاتی بُعد
ی دریافت، اُس فنی ہنرمندی ہی کی وساطت سے کی جسے ہم اُن کی انفرادیت کا نشان کہہ سکتے
یں۔ اس طرح ان کا سفر اپنے باطن سے شروع ہوا اور اسی پہ ختم ہوا۔ سُرخ سویرا کی نظموں میں
ندھیرا اور گل تر کی نظموں میں قید، چارہ گر، چاند تاروں کا بن، رقص، چپ نہ رہو، سناٹا،
نت جگہ، وقت ـــــ بے درد مسیحا، اور بعد کی نظموں میں وُدّہٗ موت جس کا پس منظر دیت نام
ہے، ان کے فن کی اسی سچائی کی تصدیق کرتی ہیں۔ یہ کاغذ پر لکھی ہوئی نظمیں نہیں جو صرف پڑھی جائیں
لکہ نغمے ہیں جو سماعت کے راستے دِل میں اتر جاتے ہیں اور لفظوں میں مقید ہو کر بھی فن کی آزاد
ور بے کراں آبادیوں کی خبر لاتے ہیں۔ وُدّہٗ موت کے یہ مصرعے دیکھئے:

اس تباہی کی گذرگاہ سے چل
یہ کوئی رستہ ہے جس رستے میں
نہ کوئی پھول نہ پتّہ
نہ کوئی پیڑ نہ پھل
اک ہیولائے سیاہ
حدِ نظر
جس طرف دیکھو کھنڈر

موت کا درّہ ہے تیزی سے گذر
شام کا چہرہ ہے خوں آلودہ
اور خورشید ہوا، قلزم ظلمات میں حل
دشت خاموشی سے جب گذروگے
کئی امیدوں کی لاشوں سے گذرنا ہوگا
اس اندھیرے سے نکل
دامن کوہ میں چپ چاپ اتر آئی ہے رات
اور رستوں سے چمٹ جاتی ہے
سائے مٹ جاتے ہیں
پھر وہی کرب و کراہ
پھر وہی نالہ و شیون
وہی چیخیں وہی آہ
چیخیں اس زخمیٔ گم گشتہ کی
زندگانی نے جسے کاٹ لیا
ایسے اُجڑے ہوئے رستے سے ذرا آگے چل

یہ لفظ نہیں، نعرہ یا خطاب نہیں، ایک عقیدہ اور خواب ہے جس نے حروف کی لکیروں کے ساتھ ساتھ رنگوں اور نواؤں کی زبان پائی ہے۔ مارکس نے کہا تھا: "شبنم کا ہر قطرہ جس میں سورج کا عکس جھلکتا ہے رنگوں کی ایک بے نہایت نمائش سے جگمگاتا ہے، پھر روح کا سورج تو اس سے کہیں زیادہ افراد اور اشیاء میں منتشر ہو سکتا ہے۔" مخدوم کی اس نظم میں بھی تجربے کے ایک نقطے سے مختلف سمتوں میں سفر کے لئے ہزارہا کرنیں پھوٹی ہیں اور ان کے ذریعہ رنگوں کے ایک حیرت کدے کا باب سامنے آیا ہے۔ مغنی کے دل پر جو کچھ بھی گذری ہوگی اس کا اندازہ ہم آپ آسانی سے لگا سکتے ہیں یا اس کا افسانہ مخدوم کی کتابِ زندگی کے صفحات پر منتشر دیکھ سکتے ہیں۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ یہاں مغنّی کے آنسو، اس کا احتجاج اور اس کا ایمان ایک نغمے میں ڈھل گیا ہے، کچھ اس طرح کہ مغنّی کے ساتھ ساتھ اسکے چاروں طرف بکھرے ہوئے مظاہر بھی گرم نوا ہو گئے ہیں۔ یہاں واقعہ واقعہ نہیں رہ گیا، ایک غم آلود مترنم جذباتی اور حسّی ماحول بن گیا ہے۔ جمالیاتی تجربے کی آزادی کا راگ الاپنے والے بھی اس ماحول میں سانس لے سکتے ہیں۔ ▯

مسعود عالم

شعبۂ اردو
مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

نیا اردو افسانہ: مسائل اور موضوعات

یہ اعلان کہ کہانی کی موت ہو چکی ہے یا یہ کہ پریم چند کے افسانے روایتی ہیں اور تخلیقی ادب کے اعلیٰ معیار تک نہیں پہونچتے، چونکا دینے والی باتیں تو ضرور ہیں لیکن صداقت پر مبنی نہیں ہیں۔ اسی طرح عصری تعصبات کی بنا پر ادب کو قدیم اور جدید کے خانوں میں بانٹ کر جدید کے مقابلہ میں قدیم کو مسترد کر دینا یا ہر جدید چیز کو کمتر درجہ کی چیز قرار دینا زیادتی ہے۔

ہر عہد کا اپنا ایک مزاج ہوتا ہے، اس کے اپنے تقاضے ہوتے ہیں، اور ہر سچا فن کار اپنی فنی تخلیقات میں روحِ عصر کی ترجمانی کرتا ہے۔ پرانے ادیبوں کے رویوں کو عمومی اور سطحی قرار دینے سے کسی گروہ کی جارحانہ سرشت کی تسکین تو ہو سکتی ہے لیکن گمرہی کی فضا عام ہونے کا اندیشہ بڑھ جاتا ہے۔ اسلاف کے کارناموں کو ہلکا کر کے پیش کرنا نا سپاسی اور حق ناشناسی ہے۔ دنیا میں ہوتا چلا آیا ہے کہ ہر نئی نسل پرانی نسل پر خطِ تنسیخ کھینچنا اپنا فرضِ منصبی سمجھتی ہے اور ایسا کرنے والے شاید بہت زیادہ قصوروار بھی نہیں کیونکہ یہ ردِ عمل ہوتا ہے پرانی نسل کے ناصحِ مشفق بننے کا۔ سچ تو یہ ہے کہ نہ تو ہر پرانی چیز قابلِ تعریف ہے اور نہ ہر نئی چیز قابلِ ستائش بلکہ حقیقت کہیں درمیان میں ہے۔ دکھ درد پہلے بھی تھا اور آج بھی ہے۔ عرفانِ ذات کے بحرِ نہاں میں انسان پہلے بھی گم تھا اور آج بھی ہے، زندگی پہلے بھی حسین تھی اور آج بھی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ کچھ چیزیں قدرِ مشترک کے طور پر ہر عہد اور ہر صورتِ حال میں موجود رہتی ہیں۔ یہ قدرِ مشترک جس فن کار کے ہاتھ آجاتی ہے وہ زمانے کے حصار کو پار کر جاتا ہے۔

اردو کے نئے افسانے میں صنعتی اور سائنسی تہذیب کے نتیجے میں پیدا ہونے والی زندگی کا جو خاکہ ملتا ہے اس کی بنیاد براہِ راست تجربہ اور مشاہدہ پر اتنی نہیں جتنی کہ تقلید اور مصنوعی تجربہ پر ہے۔ علم و فن کی ارزانی اگر ایک نعمت ہے تو ایک مصیبت بھی ہے۔ ہمارے ملک میں جہاں جہالت اور افلاس اب بھی عام ہے اور جہاں صنعتی تہذیب کا شعور بھی برائے نام ہے، ایسے میں جب جدید ترین ادبی رجحانات کا اظہار فرضِ عین خیال کیا جاتا ہے تو ایک عجیب مضحکہ خیز صورتِ حال پیدا ہو جاتی ہے۔ ہمارے مخصوص

معاشرتی اور سیاسی حالات میں در آمد کی ہوئی ان اقدار و افکار کا مصنوعی اظہار کسی طور پر مستحسن نہیں قرار دیا جا سکتا جو مغرب کے صنعتی ماحول کی پیداوار ہیں۔ یہ سچ ہے کہ سائنس حیرت انگیز ترقی اور ایجادات کی وجہ سے مشرق و مغرب کے چند ایک مسائل کسی حد تک مماثلت رکھتے ہیں لیکن اپنی اپنی مخصوص روایات کے سبب داخلی اور خارجی اعتبار سے کچھ ایسے امتیازات بھی ہیں جن کو کسی حال میں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

صنعتی معاشرے کا ایک کافی نمایاں پہلو جسے جدید عالمی ادب اور خاص طور سے افسانوی ادب میں ایک مستقل موضوع کی حیثیت حاصل ہوئی، یہ ہے کہ مادی ترقی کی ہوس اور عقلیت پرستی نے انسان کو جذباتی اعتبار سے نکما کر دیا ہے اور یہ کہ بیسویں صدی دراصل جذبات کے فقدان کی صدی ہے۔ اس ذہنی، جذباتی اور تہذیبی صورتحال نے مغرب کے افسانوی ادب پر بہت گہرا اثر ڈالا۔ اردو ادیبوں کا ایک بہت بڑا حلقہ مغربی ادیبوں کے تجربے کے حوالے سے ان مسائل کی طرف متوجہ ہوا۔ ہرچند کہ ہمارا معاشرہ ابھی تہذیبی بحران کے اس موڑ پر نہیں پہونچا ہے جہاں مغربی تہذیب سرگرمیاں دکھائی دیتی ہے تاہم اردو کے افسانوی ادب میں اُن تمام مسائل کا عمل دخل نظر آنے لگا جو آج کے مغربی ادب میں پائے جاتے ہیں۔ اس کے تحت اُردو افسانہ میں جن میلانات کی اشاعت ہوئی وہ اس طرح ہیں:

(۱) قدروں کی شکست کا تصور۔ (۲) منظم نظریات سے نا آسودگی۔ (۳) فرد کے جذباتی کھوکھلے پن کا تصور۔ (۴) جذبات سے عاری معاشرے میں تنہائی، لاحاصلی، احتجاج، افسردگی، لامقصدیت اور بےسمتی کے احساسات۔

نئے افسانہ نگاروں نے انسان کے جن مسائل کو اپنا موضوع بنایا ہے وہ خالصتاً ذاتی نوعیت رکھتے ہیں۔ ذاتی مسائل جب تک سماجی معنویت کے جوہر کو قبول نہ کریں ان کی اہمیت اور قدر و قیمت مشکوک رہتی ہے۔ اسی وجہ سے تنہائی، مایوسی، قدروں کی شکست، منظم نظریات سے نا آسودگی، لاحاصلی، بےسمتی اور لامقصدیت سے متعلق وہ تمام تصورات جو نئے افسانہ نگاروں کے یہاں موضوع کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں، اگر ایسے فرد کی روداد بن جائیں جو باہر کی دنیا سے کوئی علاقہ نہیں رکھتا اور ہر سماجی اور تہذیبی رشتے کے وجود سے انکار کرتا ہے تو اس عظیم الشان روایت سے بھی الگ ہو جاتے ہیں جس کا اصل الاصول روح عصر کی ترجمانی ہے افسانہ میں جب جدید میلانات کا ذکر کیا جاتا ہے تو اس سے غالباً یہ مراد ہوتی ہے کہ افسانوی

ادب کے اُن پہلوؤں سے بحث کی جائے جو انجمن ترقی پسند مصنفین کی حقیقت نگاری اور اس کے برعکس حلقۂ اربابِ ذوق کی داخلیت پسندی دونوں سے انحراف کا پتہ دیتے ہیں۔ ہر تجربہ کسی نہ کسی شکل میں روایت سے مربوط ہوتا ہے اور اگر تجربہ پرستی کی رو اس حد تک بڑھ جائے کہ روایت سے اس کا کوئی تعلق باقی نہ رہے تو یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ایسے تجربے کبھی دور رس نتائج کے حامل نہیں ہوسکتے۔ ممکن ہے کہ اس قسم کے تجربات وقتی شہرت کا سبب بن جائیں لیکن ان کی چمک دمک بہت جلد ماند پڑ جاتی ہے۔

تقسیم کے بعد برصغیر میں جن سماجی اور سیاسی مسائل نے جنم لیا وہ ذہنوں کو ہلا دینے والے تھے۔ کچھ عرصے کے بعد جب ذرا ٹھہراؤ پیدا ہوا تو افسانہ نگار اور دوسرے ادیبوں اور فن کاروں کی طرح معاشرہ سے کٹ کر اپنی ذات میں کھو گیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بدلے ہوئے حالات اور ان حالات کی جارحیت نے لوگوں کو مجبور کیا کہ وہ اپنی ذات کا جائزہ لیں۔ فسادات کی ہولناکی اور نقل وطن نے لوگوں کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا اور ایسا محسوس کیا جانے لگا کہ فرد غیر محفوظ ہے چنانچہ ادیب بڑی حد تک اپنی ذات کے حصار میں مقید ہو گیا۔ اس طرح اُردو افسانہ کا نیا روپ تجریدی، علامتی اور تمثیلی شکلوں میں ظاہر ہوا۔ ویسے نئے افسانہ کو ترقی پسند عہد کی حقیقت نگاری کا ردّ عمل قرار دیا جا سکتا ہے۔ نیا افسانہ چونکہ علامتی اور تجریدی ہے لہٰذا ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جو کچھ پیش کیا جا رہا ہے وہ، وہ نہیں ہے بلکہ کچھ اور ہے۔ بعض اوقات اظہار میں علامت اس کو اور پیچیدہ بنا دیتی ہے لہٰذا اس کا تعین مشکل ہو جاتا ہے کہ افسانہ نگار کیا کہنا چاہتا ہے۔ اس عہد کے بیشتر افسانہ نگاروں نے اپنے ادبی شعور کی عمارت آئیڈیالوجی اور اقدار کی شکست کے تصور پر قائم کی ہے۔ ان کی مثال اندھیرے میں راستہ بھولے ہوئے مسافر کی سی ہے جو اپنے گرد و پیش سے بالکل نامانوس ہے اور نہیں جانتا کہ وہ کس سمت میں جا رہا ہے اور اس اندھیرے سے اس کو نجات ملے گی بھی یا نہیں۔ کچھ ایسے ہی اسباب کی بنا پر خالص ادب کا تصور پیدا ہوا۔ اس تصوّر کی ترجمانی کرنے والے اپنے کو ہر زاویہ نظر اور ہر نظریہ سے آزاد خیال کرتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ کسی بھی انسان کا عمل اس کا انفرادی عمل ہونے کے باوصف اجتماعی عمل کا ایک حصّہ ہوتا ہے۔ بعض افسانہ نگار مجرّد طریقے سے مسائل پر غور و خوض کرتے ہیں اور شاید اسی کی بنیاد پر وہ اپنے کو سب سے الگ تھلگ سمجھتے ہیں۔ لیکن خیال کی کوئی رو صرف فرد کی ذات کے سرچشمے سے نمودار نہیں ہوتی کیونکہ ہر ذات بہرصورت ایک وسیع تر

اجتماعی حقیقت ہی کا ایک حصہ ہوتی ہے اور اپنی تمام تر انفرادیت کے باوجود خارجی اثرات سے اپنے کو محفوظ نہیں رکھ سکتی۔

نئے افسانہ نگاروں کا وہ گروہ جو سماجی شعور کے اس تصور کی گرفت سے جو ترقی پسند افسانہ نگاری سے مخصوص تھا اپنے کو آزاد سمجھتا ہے لیکن اپنی تمام انفرادیت پسندی اور ذاتی تجربہ سے وفاداری کے باوجود ناوابستگی کو بھی ایک وابستگی کی شکل میں پیش کرتا ہے۔ یہ لوگ با جماعت ہونے سے انکار کرتے ہیں اور اصرار کرتے ہیں کہ ان کی تخلیقات صرف ان کے ذاتی تجربوں سے تعلق رکھتی ہیں لیکن روایتوں اور نظریوں کی یکسانیت نے انھیں ایک محدود حلقہ کا رکن بنادیا ہے۔ یہ زندگی کو صرف اپنی ذات تک محدود سمجھتے ہیں اور جزو میں جزو کی حقیقت دریافت کرنے پر ناز کرتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ عالمی سیاست کے جبر اور ایک نئے اسلوب حیات کی وجہ سے جغرافیائی اور تاریخی امتیازات کی حدیں ختم ہوتی جارہی ہیں۔

ترقی پسند افسانہ نگاروں نے عالمی سیاست اور سرمایہ داری کے خلاف ہونے والی عالم گیر جدوجہد کو اپنا موضوع بنایا تھا۔ اس کے علاوہ ان تمام مسائل پر بھی روشنی ڈالی تھی جو بین الاقوامی صورت حال سے وابستہ ہیں لیکن فرق یہ ہے کہ ترقی پسندوں کے پاس ایک واضح سماجی شعور تھا اور اظہار عمل کی راہیں صاف اور روشن تھیں جبکہ نئے افسانہ نگاروں کا وہ گروہ جو ذاتی شعور کو سماجی شعور کی ضد سمجھتا ہے نہ تو کسی واضح سمت کا پتہ دیتا ہے اور نہ کسی سماجی مقصد کا۔ ہندوستان کی سماجی اور سیاسی صورت حال کے چیلنج سے زیادہ یہ گروہ اپنی ذاتی جذباتی اور نفسیاتی الجھنوں کی زد پر ہے۔ مغرب میں سماجی مقصد سے بے گانگی ادب کا ایک غالب تصور بن چکی ہے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اس کی تہ میں بعض سیاسی مصلحتیں بھی پوشیدہ ہیں لیکن تیسری دنیا کے باشندے جو ابھی زندگی کے معمولی معیاروں کے حصول کی جدوجہد میں مصروف ہیں اس قسم کی ادبی سرگرمی کے پردے میں صرف ایک محدود ذہنی تعیش یا جذباتی انفعال کو راہ دیتے ہیں اور اپنے تمام تر دعوؤں کے باوجود وہ اپنے تخلیقی تجربوں کو اپنی ذات کے محدود شعور ہی سے غذا بہم پہونچاتے ہیں حقیقت کا محض فن کارانہ انکشاف کافی نہیں ہوتا تاوقتیکہ یہ انکشاف ہماری بصیرت میں کوئی قابل قدر اضافہ نہ کرے اس کی حقیقت صرف ایک ذاتی جذباتی مشغلہ رہ جاتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود نئے افسانے میں اس قسم کی بھی کافی مثالیں پائی جاتی ہیں جن میں نئے انسان کے ذہنی اور جذباتی المیے کی عکاسی کی گئی ہے اور جن سے نئی زندگی اور نئے معاشرے کے روحانی اور جذباتی خلا پر روشنی

پڑتی ہے۔ ان میں بعض کوششیں بہت کامیاب ہیں اور بعض ہیئت تجربوں اور ان سے پیدا ہونے والے ابہام کے سبب قابل اعتنا نہیں۔ ان پر فنی اور لسانی نقطۂ نظر سے بحث کی جاسکتی ہے جو اس وقت اس مضمون کے موضوع سے خارج ہے۔

بحیثیت مجموعی نیا افسانہ زندگی میں منفی رویوں کی تبلیغ کے باوجود اس سے مکمل لاتعلقی اختیار کرنے میں ناکام رہا ہے۔ البتہ یہ تعلق اگر مثبت شکل اختیار کرسکے تو یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ حاضر افسانوی ادب تاریخی اور سماجی شعور کو آگے بڑھانے میں مدد کرسکتا ہے۔ □

فضا ابن فیضی
مئوناتھ بھنجن، اعظم گڑھ

غزلیں

(۱)

اب وہ چوکھٹ ، نہ دعا کی دہلیز
میں ہوں اور اپنے انا کی دہلیز

تو ہی دستک دے کہ ابھرے کوئی گونج
چپ ہے حرف اور نوا کی دہلیز

یہ بدن اور نفس کا رشتہ
زندگی بھی ہے ہوا کی دہلیز

خستہ پائی کا ٹھکانا منزل
راہیں نقش کفِ پا کی دہلیز

ہم بھٹکتے رہے گلیوں گلیوں
دو قدم پر تھی فنا کی دہلیز

اب کہاں چھوڑ کے جاتی آخر
بوئے گل ، بادِ صبا کی دہلیز

ہے نکھرنا ، تو پسو اور ، کہ ہے
وقت ، سفاک حنا کی دہلیز

اس نے کھولے ہی تھے کرتے کے بٹن
جگمگا اٹھی قبا کی دہلیز

کچھ بتوں سے بھی مراسم رکھو
بت کدہ بھی ہے خدا کی دہلیز

منہ سے کچھ بولیں معانی سے کہو
لفظ ہیں ، صوت و صدا کی دہلیز

آخرِ کار فضا تم بھی ہوئے
اپنی ہی خاکِ نوا کی دہلیز

(۲)

توبھی اک لفظ، گردابِ معانی سے نکل آ
کیوں جزیرے سا ہے یوں محصور، پانی سے نکل آ

یہ جو تیری ذات ہے خود ایک پیچیدہ عمل ہے
کائنات و وقت کی ریشہ دوانی سے نکل آ

جلتے انگاروں سے لاعلمی کی ٹھنڈی ریت اچھی
آ مری بستی میں، دشتِ نکتہ دانی سے نکل آ

دیکھنا! منھ سے جو نکلی بات، دنیا لے اڑے گی
ہو اگر ممکن، حصارِ خوش بیانی سے نکل آ

تیری ہی موجیں ہیں، تیرے پاؤں کی زنجیر کب ہے
تو جو دریا ہے تو زندانِ روانی سے نکل آ

تجربہ ہے تو بزعمِ خود، اچھوتا سا، نیا سا
میں تو جب جانوں، روایت کی کہانی سے نکل آ

بے نفس جی، کیا ضروری ہے صبا کی پیروی بھی
یہ جھمیلے چھوڑ، فکرِ گل فشانی سے نکل آ

اے فضاؔ ڈھونڈھ اور کوئی مملکت فنِ غزل کی
میرؔ و غالبؔ کے حدودِ حکمرانی سے نکل آ

(۳)

کیا بتائیں کہ کس رہ گذر کی گرد ہوئے
ہم ایسے لوگ، خود اپنے سفر کی گرد ہوئے

نجات یوں بھی بکھرنے کے کرب سے نہ ملی
ہوئے جو آئنہ، سب کی نظر کی گرد ہوئے

یہ کن دکھوں نے، چم و خم تمام چھین لیا
شعاعِ مہر سے، ہم بھی، شرر کی گرد ہوئے

سب اپنے اپنے افق پر چمک کے تھوڑی دیر
بجھے، تو دامنِ شام و سحر کی گرد ہوئے

پکار کر کہہ کے ہمیں چھاؤں، جی نہ بہلے گا
بچے جو دھوپ سے، پائے شجر کی گرد ہوئے

ہمیں بھی بولنا آتا ہے، پھر بھی ہیں خاموش
کہ ہم ترے سخنِ مختصر کی گرد ہوئے

دھلا سا چہرہ بھی، کچھ ماند پڑ گیا آخر
ہوئے نہ اشک، مری چشمِ تر کی گرد ہوئے

شریر و تند ہوا تھی کہ رو معانی کی
تمام لفظ، لبِ معتبر کی گرد ہوئے

یہ رات کتنی پر آشوب ہے، فضاؔ نہ کہو
قلم کی راہ چلے ہم ہنر کی گرد ہوئے

سلیم منزل منظور پورہ
اورنگ آباد

قاضی سلیم

ننھی سلمہ سے متاثر ہو کر....

آج کے بعد اگر جینا ہے
آج کا سب کچھ تج دینا ہے
ایک جھلک میں
ایک جھپک میں
زخمی چھلنی اس پیکر کو
اپنے لہو کی آگ میں جل جانے دو
—— گل جانے دو
ہمک ہمک کر
لہک لہک کر
ارمانوں سے باہر آؤ
اپنے آپ سے آگے بڑھ جاؤ
سیماؤں سے پار اتر
—— دیکھو
کیسی کھلی فضا ہے
ہر شے میں جیسے آنے والی دنیاؤں کا بیج چھپا ہے
بیجوں میں پیڑ سنہرے پیڑ
پیڑوں کے ہر کھوڑ میں
پنچھی انڈے سیتے ہیں
انڈوں کے خول سے آنے والی
—— بے آواز سروں کی گونج سنو
اور ان سے اپنے گیت بُنو

ناصحہ سلیمہ

چیخ

تم وہاں
—— کیسے مارے گئے
خون کے گرم چھینٹے مرے دامن چاک پر
ایک ہزار ایک سو میل اڑکر گرے
نیند اور جاگ کے بیچ
—— سکرات میں
رات بھر گرز پڑتے رہے
قبر کی داب سے
اک کٹا سر
—— اچھل کر مری گود میں آگرا
کون جانے
—— تم کس کے بیٹے
—— مرے باپ کا تم سے ناطہ ہے کیا
اور وہ مارنے والا
—— مرا کون لگتا ہے
ست جگ کی روحو
تم غیب کی ساری آوازیں سنتی ہو
—— سب جانتی ہو
بتاؤ
اسوروں کے ہاتھوں کو کیلاش تک
—— پہونچنے کی ہمت کہاں سے
دیوتا کا سنگھاسن
بیلچی اور علی گڑھ سے کیا دور تھا

ست جگ کی روحو
کیا تم نے دیکھا
گنگا کی اس ماتا میں کوئی طوفان اٹھا؟
رانچی کے اسٹوپ میں کوئی رخنہ پڑا؟
لال قلعہ کی بنیاد پر کوئی تیشہ بڑھا
اور سہادری پر
—— فرشتوں کے پر پھڑپھڑائے
وہ ابابیلیں سب کیا ہوئیں
کیا تمھارے گرم صحرا میں اب کنکری کوئی باقی نہیں
لگتا ہے
—— پیدائی کا وہ سارا خزانہ
سادھو سنتوں کو، ولیوں کو اور صوفیوں کو
—— بنانے میں اس دیس نے صرف کر ڈالا
—— اپنی مٹی کے بدلے
نرک کی آگ سے لوگ بننے لگے ہیں

ست جگ کی روحو
جاؤ چھپ جاؤ تم بھی
—— الورا ایجنتہ کی اندھی گپھاؤں میں
—— اور دھیان میں گم رہو
میری آغوش میں یہ کٹا سر
موت کے اس طرف جھانک آیا ہے
—— غیب کی ساری آوازیں سنتا ہے
—— اب یہ مرے جسم پر آلگا ہے

مظہر امام

اسسٹنٹ اسٹیشن ڈائرکٹر
ٹیلی ویژن سنٹر، سری نگر

کشمیر کی غزلیں

یہ تجربہ بھی کروں، یہ بھی اٹھاؤں میں
کہ خود کو یاد رکھوں، اس کو بھول جاؤں میں
فریب کاریں کچھ تو ہے، کوئی بات تو ہے
کہ جان بوجھ کر اتنے فریب کھاؤں میں
وہ بے لباس سہی، جامہ زیب کتنا ہے
ابھرتے چاند کو پوشاک کیا پنھاؤں میں
وہ پل کہاں ہے جو دنیا سے جوڑتا تھا مجھے
جو پاؤں تجھ کو، تو سب سے قریب آؤں میں
کبھی تو ہو مرے احساس کمتری میں کمی
کبھی تو ہو کہ اسے کھل کے یاد آؤں میں
وہ شخص ہے کہ نسیم سحر کا جھونکا ہے
بکھر ہی جاؤں جو اس کو گلے لگاؤں میں
اذاں کے بعد دعا کو جو ہاتھ اٹھائے وہ
امام! اپنی نمازیں بھی بھول جاؤں میں

دل اکیلا ہے بہت لالۂ صحرا کی طرح
تم نے بھی چھوڑ دیا ہے مجھے دنیا کی طرح
چھوڑ کے جاؤ نہ یوں عہد گذشتہ کی طرح
بن کے امید رہو، وعدۂ فردا کی طرح
تم ہوا ہو تو بکھیرو مجھے ساحل ساحل
موج ہو تو بہا دو مجھے دریا کی طرح
پاس رہتے ہو تو آتا ہے جدائی کا خیال
تم مرے دل میں ہو اندیشۂ فردا کی طرح
بیچ میں کچھ تو رہ و رسم تکلف رکھو
اجنبی یوں نہیں ملتے ہیں شناسا کی طرح

صلاح الدین پرویز

گھر

کوئی تو درختوں سے آواز دیتا
تو جنگل میں رکتے
اداسی کے جاڑے میں سوکھے درختوں کی کچھ ٹہنیاں ڈھونڈ لیتے
بدن کی انگیٹھی سے کوئی جلا ادھ بجھا کوئلہ توڑ لیتے
تو کچھ دیر تک سرخ پرچھائیوں میں
کھلی گرمیوں کی کھلی چھت پہ لیٹے ہوئے سورجیں بھول جاتے
کوئی تو درختوں سے آواز دیتا
تو جنگل میں رکتے
گھنی جھاڑیوں کے اندھیروں کو آنکھوں میں بھرتے
گھنی جھاڑیوں کے اندھیروں میں آنکھیں بناتے
پرندوں کی ننھی دعاؤں کو آنکھوں سے چنتے
پرندوں کی ننھی دعاؤں کی شبنم سے ہونٹوں کی پیاسی بھگوتے
کوئی تو درختوں سے آواز دیتا
تو جنگل میں رکتے
ہوا کے بدن کو بڑی زور سے کاٹ لیتا
ہوا کی چیختی ہوئی چیرتی کسمساہٹ کو یوں زور سے کھینچ لیتے
کہ خود دور تک ٹوٹ جاتے
ہوا کی طرح پھر ہوا میں کہیں جڑ ہی جاتے

بہت دن تلک ایسی کتنی کتھائیں کتھی ہیں

کہ ہم اک بڑے شہر میں سو رہے ہیں
پریشاں پلیٹوں میں کچھ سینڈوچ اور کچھ ہم رکھے ہیں
سیاہی کے چہرے پہ سونے کی آنکھیں بٹھائے
بہت دیر تک نیند میں نیند کی گولیاں کھا رہے ہیں
ہوائی جہازوں کو پیٹھوں پہ رکھے ہوئے
پھر کسی دوسری نیند میں جا رہے ہیں
(گھر میں سبھی جاگتے ہیں
فلو کے لحافوں میں لپٹے ہوئے
کھانستے ہیں)

کوئی تو درختوں سے آواز دیتا
زمیں پر اترتے
کسی کے حسینہ بدن کے سمندر میں خود کو چھپا کر
بڑی دیر تک روتے رہتے
یہاں تک کہ اسکول کی گھنٹیاں بجنے لگتیں
بچے آجاتے
آنکھوں میں حیرت سنبھالے ہوئے گھر میں گھستے
ہمیں غور سے دیکھتے!
اور ہم خوبصورت دنوں کی حسین یادگاروں کو بانہوں میں بھر کر
بڑی زور سے ہنسنے لگتے

کوئی تو درختوں سے آواز دیتا
تو جنگل میں رکتے
تو جنگل میں ہم اپنا اک گھر بناتے

پروین شاکر
اے ۵۶، بلاک ایچ، نارتھ ناظم آباد
کراچی پاکستان

اے جگ کے رنگ ریز .....

اے جگ کے رنگ ریز
مری بھی اوڑھنی رنگ دے
میں پنگھٹ پر کیسے جاؤں
بھیگے پلو سے ہاتھوں کو بچاتی سکھیاں
مجھ پر ہنستی ہیں
میں نے سو سو جتن کیے
پر مجھ پر روپ نہ آیا
کیسر پنکھڑی، حنا کے پتے، ہارسنگھار کا ڈنٹھل
اور کسم کے پھول
سب آنچل میں بندھے رہ گئے
کوئی مرے کام نہ آیا
گھتے پاتے گئے اکارت
پیتی کا پیار بھی میری کایا بدل نہ پایا
رہی مری چنری پھیکی کی پھیکی
ہاں ـــــ بس اک رت ایسی آئی تھی
جب مجھ پر ہریالی ٹوٹ کے چھائی تھی
تن کے سندر بن میں ساتوں رنگ کے پھول
کھل اٹھے تھے
لیکن پہلی ہی بارش میں
جل گئے سارے پھول
ایک ذرا سی دھوپ ہوئی
اور پل بھر میں سب دھول
دھوپ کڑی تھی یا پھر رنگ ہی کچے تھے
اب تک جان نہ پائی
بس اتنا بھر دیکھ سکی ہوں
اے جگ کے رنگ ریز
تری مٹھی میں دھنک ہے
بادل، جل، آکاش، چندرما، کمل، چنبیلی، دروب
اودا، اجلا، نیلا، پیلا، سرخ، روپہلا، سبز
اتنے سارے رنگوں میں مرے نام کا کوئی رنگ تو ہوگا
خسرو مرشد!
اپنے ہاتھ سے میرے تن پر ملا
اور جو تجھے یہ بھی نہ
مجھے اپنے رنگ م

پروین شاکر

....برمن بلاشدی

کچے ذہن اور کچی عمر کی لڑکیاں
اپنی خوبی میں
مائع جیسی ہوتی ہیں
جس برتن میں ڈالی جائیں
اسی شکل میں
کیسے مزے سے ڈھل جاتی ہیں
کیسا چھلکنا، کیسا ابلنا اور کہاں کا اڑنا
اور ایک میں ہوں — پتھر اور شوریدہ مزاج
کاسۂ خالی میں بے وجہ سما جانے کی بجائے
اب سے اس قوت سے ٹکرانا چاہوں کہ
ظرف تہی کی گونج سے اس کا بھرم کھل جائے

میں نے آئینے کو کب جھٹلایا ہے
ہاں گہنے مجھ پر بھی اچھے لگتے ہیں
لیکن جب بھی ان کا مول مجھے یاد آجاتا ہے
کنگن بچھو بن جاتے ہیں
اور پازیبیں ناگ کی صورت میرے پاؤں جکڑ لیتی ہیں
بہت ہی میٹھے بولوں کا جزو اعظم
جب حالتِ خام میں مجھ کو نظر آجاتا ہے
دہشت سے مری آنکھیں پھیلنے لگتی ہیں
اور اس خوف سے میری ریڑھ کی ہڈی جمنے لگتی ہے
کہ
ان ہی مادر زاد منافق لوگوں میں
مجھ کو ساری عمر بسر کرنی ہے
کبھی کبھی ایسا بھی ہوا ہے
میں نے اپنا ہاتھ اچانک
کسی اور کے ہاتھ میں پایا
لیکن جلد ہی میری ضرورت سے زاید بے رحم
بصارت نے یہ دیکھ لیا
یا تو میرے ساتھی کی پرچھائیں نہیں بنتی ہے
یا پھر، مٹی پر
اس کے پنجے اس کی ایڑی سے پہلے بن جاتے ہیں
انسانوں کی سایہ رکھنے والی نسل ناپید ہوئی جاتی ہے
شام کے ڈھل جانے کے بعد
جب سایہ اور سایہ کناں دونوں بے معنی ہو جاتے ہیں
میں مکروہ ارادوں والی آنکھوں میں گھر جاتی ہوں
اور اپنی چادر پہ تازہ دھبے بنتے دیکھتی ہوں
کیوں کہ مجھ کو ایک ہزار راتوں تک چلنے والی کہانی کہنا نہیں آ
میں
آقائے ولی نعمت کو خود اپنی مرضی بھی بتانا چاہتی ہوں!

رونق نعیم
جواہر لال نہرو روڈ
رانی گنج ۷۱۳۳۴۷

سبز تحفظ

میری آنکھوں میں پتنگے پھڑپھڑاتے تھے
اور میرے حلق میں
چھپکلی کی دم
نیلے موسموں کی کالی مسافت میرا پیچھا کرتی تھی
میں زرد ساعتوں کے ہاتھوں
اخبار میں ایک ٹنڈر دینا چاہتا تھا
مجھے گز بھر سبز تحفظ کی ضرورت ہے
کہ مجھے کیکٹس نے آواز دی
اور کہا
سنو!
میرے گلے میں کچھ پتھر ڈال دو

کالک

بصارت کے ڈیم ٹوٹ چکے ہیں
سماعت کا پل اکھڑتا چلا جا رہا ہے
ریڈیو بند کرو
کہ اس کی آوازوں میں
کسی آسیب کی پرچھائیں
دھاڑنے لگی ہے

اندھیرے میں
میرا گھر ڈوبنے لگا ہے
اور میرے گھر میں
میرا شہر
اس لیے کہ چوراسی گھنٹوں سے
میرے شہر میں
سورج کے منہ پہ
کالک لگی ہوئی ہے

محمد یسین

علی گڑھ ۷۸ء

(۱)

شہر تہذیب میں
سرخ آواز کے دائرے
خامشی لب زدہ آرزو کی طرح نطق کے جھونپڑوں
میں مکیں

راستوں پر بڑی دیر سے
گشت کی ننگی ٹکڑیاں
سلگتے ہوئے بام و در کی امیں
چلمنوں سے جھلکتی ہوئی زرد تکبیر کی روشنی
سالہا سال کی جو کھی سازشوں کا چلن
جسم و جاں کی کدورت کا ابہام
حرف گیری کی آسودگی کا کفن
ایک ناگفتہ الزام ....

(۲)

وہ
لشکر ساتھ لے کر جا رہا تھا
اس کے دشمن
پرچموں پر بے گناہی کی عبارت لکھ چکے تھے
وہ ان کو قتل کر دینے کے درپے تھا
وہ قاتل آگہی
رنگ و بو کا
اس کے چاروں سمت لوہے کے صدف تھے
اس کے سینے میں خودی کی آبرو کا
کوئی قطرہ بھی نہیں تھا ....

(۳)

قبیلے کے جواں شب خوں کی تیاری میں ہیں
بوتلیں، پتھر، لہو میں کھولتا تیزاب
نیزے، برچھیاں
معصومیت کے اشک آلودہ صحیفے
کرفیو کی زد میں بوڑھے برہمن کا گھر
حرم خانے کا پتھر، سنگ اسود
کٹ چلے پر سخت پہرہ
دوستوں میں دشمنوں کو ڈھونڈتی آنکھیں
پرانے اعتمادوں کی شکن میں
آئینے کی کرچیاں
"مرے بت خانے میں تو گاڑ دو کعبے میں برہمن کو"

دو اہی الفاظ
انڈر سکریٹری چیف منسٹر سکریٹریٹ
سری نگر

سلیم شہزاد

صلیب سے صلیب تک

سمندروں کے منتھ میں سات رنگ زہر ابل پڑا ہے
اور ایسا کوئی دیوتا نہیں
جو اس کو اپنے کنٹھ میں اتار لے
صداقتیں تمام رنگ کے عذاب میں گھری ہوئی ہیں
سقراطیسی سات رنگ زہر سے فرار
اور تمام عینکوں پہ گرد ہے
نہیں ہے کوئی بت شکن
جو آگ میں کھلائے پھول
عذاب، سات رنگ زہر کا عذاب
تیاگ، بج وشال واہمہ ہے
گوتم اوم شانتی کی منتر آگ میں بھسم
پیلاطوس قہقہے لگا رہا ہے
ظلمتوں میں کالے چور
منصب فراز دار پار رہے ہیں
یہ کہانیوں میں جینے والے
کاغذوں پہ ثبت سارے نام
پیلیا کے روگ میں ہیں مبتلا
صلیب سے صلیب تک
جو ان گنت چراغ جل رہے تھے
بجھ گئے ہیں

ص ب ۶۳۶ خیبر شمالی
سعودی عرب

طارق جامی

غزلیں

ڈوبا ہوں تو کس شخص کا چہرہ نہیں اترا
میں درد کے قلزم میں کبھی تنہا نہیں اترا
زنجیرِ نفس لکھتی رہی درد کی آیات
اک پل کو مگر سکھ کا صحیفہ نہیں اترا
انسان معلق ہیں خلاؤں کے بھنور میں
اشجار سے لگتا ہے کہ دریا نہیں اترا
سنتے تھے کہ اس پیڑ سے ٹھنڈک ہی ملے گی
شاخوں کے دریچے سے تو جھونکا نہیں اترا
پتھرائی ہوئی آنکھوں پہ حیراں نہ ہو اتنا
اس شہر میں کوئی بھی تو زندہ نہیں اترا
صحرائے بدن کو تھی طلب سائے کی لیکن
اک شخص بھی معیار پہ پورا نہیں اترا
سورج کی طلب پر کئی نذرانے دیے ہیں
گھر کے در و دیوار سے سایہ نہیں اترا

بکھرے جذبے پڑے سڑتے رہے نفرت کی کھائی میں
کہ جتنے ذہن تھے، وہ سب رہے اپنی بڑائی میں
زمیں ہر لحظہ ہے مصروف اندر کی بُنائی میں
نہ جانے کتنی صدیاں گندھ چکی ہیں اس چٹائی میں
درختوں کی طرح موسم تھا چھپے کی امانت میں
کسی کے ہاتھ کنگن ہو رہے تھے جب کلائی میں
مری مانو تو اب کچھ دیر کو باہر نکل آؤ
کہیں تم گھُل نہ جاؤ اپنی شخصیت کی کائی میں
نہ مجھ سے دھول جھاڑی جا سکی خود اپنے پیڑوں کی
اگر چہ عمر بھر لکھتا رہا، اپنی صفائی میں
جزیروں کی طرح تقسیم ہوتا جا رہا ہے ذہن
سمٹتے جا رہے ہیں لوگ اپنی اک تہائی میں

عشرت ظفر
نیو واچ سنٹر
۱۰/۳۰۲ خلاصی لائن، کانپور

غزلیں

نمِ یقیں تہِ خاکسترِ گماں رکھئے
سرابِ شب کے پیالے میں آبِ جاں رکھئے
لہو میں دھوپ کی سفّاک فصل روشن ہے
سفر میں ساتھ نہ کوئی سائباں رکھئے
کرے گی آنکھ ہی سیراب کشتِ تشنہ لبی
یہ آبشار اسی طرح سے رواں رکھئے
پڑیں گے سایۂ شمعِ چہار رنگ پہ ہاتھ
یہ چھاؤں سبزۂ بے داغ میں نہاں رکھئے
وہ جس کے جسم کی رنگت ملے گلابوں سے
نواحِ ریگ میں باقی وہی نشاں رکھئے
نکل سکے گا نہ ساحل گرفتِ طوفاں سے
اب ایک عمر سمندر میں کشتیاں رکھئے
بکھر نہ جائیں کہیں لوگ شہر کے عشرت
مرے پروں میں یہ کہسار سا دھواں رکھئے

گرفتِ آئینۂ رہ گذر میں تنہا ہوں
کوئی بھی ساتھ نہیں میں سفر میں تنہا ہوں
نہ آسماں، نہ سمندر، نہ کہسار و زمیں
نواحِ سلسلۂ بال و پر میں تنہا ہوں
رگوں میں دوڑ رہا ہے ہراسِ شعلۂ زرد
سیاہ رات ہے اور میں شجر میں تنہا ہوں
ہے میرے چار طرف میرے ہی وجود کا رنگ
مثالِ سبزۂ روشن کھنڈر میں تنہا ہوں
چلو شرارِ غزل کو ہوائیں دو عشرت
کہ ایک عمر کے بعد آج گھر میں تنہا ہوں

پرتپال سنگھ بیتاب

۲ نظمیں

(۱)

اس طرف سے اس طرف
پاگل ہوا میں دوڑتا پھرتا ہوں
اس کہسار پر
وہ جڑی
جس کے لئے بھیجا گیا ہوں
اس کو میں پہچانتا بھی تو نہیں ہوں
اس جگہ لاکھوں طرح کی بوٹیاں ہیں
کیا کروں ؟
ہاتھوں پہ یہ کہسار اٹھایا بھی نہیں جاتا
کہ میں تو ......
اور وہ ہے بے ہوش " میں " اس پار
چیلیں اب تک اس کے سر پر
منڈلانے لگی ہوں گی
مرے بازو ....
مری دم ....
ہوا سے میرا رشتہ ....
اف ....
مجھے کوئی ....

(۲)

ہم نقابوں سے نکل کر
ڈھونڈتے ہیں خود کو جب
حمام میں
ضابطوں کو بھول کر
اک ذائقے کی کھوج میں
جنگل کا ماضی چھانتے ہیں
یا کبھی ....
چھپ کر نقابوں میں
کلب کے رقص میں
خود کو سہلاتے ہیں
تو پھر.....
ماضی کا وہ لمبا سفر.......
لاکھوں طرح کے جانور ......
ایک اک کرکے
ہم گذر جاتے ہیں سب میں سے
یا رہی
ایک ایک کرکے
سب گذر جاتے ہیں ہم میں سے

(۳)

نظر اس طرف کرتے کرتے
سبھی تتلیاں اڑ گئیں
فضا میں بکھرتے ہوئے رنگ
جانے کہاں کھو گئے
سر مرا پہلے ہی
برف میں دھنس چکا تھا
وہاں آکے
آنکھوں سے بھی یخ سفیدی برسنے لگی
یاد رکھنا
یوں ہی دوڑتے رہنا
میرا مقدر جو ٹھہرا
تو اک دن
مرے سر پہ انعام رکھنا پڑے گا

غنی بنگل اسٹورس
انصاری وارڈ، بھنڈارا
۴۴۱۹۰۴

عبدالرحیم نشتر

غزلیں

جو تو نہیں تو بدن میں ہوس کا زور ہے کیوں
کٹی پتنگ تو پھر انگلیوں میں ڈور ہے کیوں
یہ اٹھتی گرتی صدائیں تو روز آتی ہیں
ڈرا ہوا مرے سینے میں ایک چور ہے کیوں
لہو تو اس کے بدن میں بھی دوڑتا ہوگا
مری ہی چار دیواری میں ایسا شور ہے کیوں
زمیں پہ اور بھی اشجار لہلہاتے ہیں
ہوا کا چلتا ہوا تیر میری اور ہے کیوں
فقیہہ شہر اسی بات سے پریشاں ہے
کہ ناچتا ہوا جنگل میں کوئی مور ہے کیوں
بدن کھلا ہی نہیں اور ذہن جاگ اٹھا
گگن پہ چاند نہیں ہے تو پھر چکور ہے کیوں
یہ کون آگیا خالی مکان میں نشتر
سماعتوں میں گئے موسموں کا شور ہے کیوں

پکارتی ہے مجھے بانہہ کھولے میری زمیں
یہ میرے پیروں کو جکڑے ہوئے ہے کیسی زمیں
مری شکست میں اہل وطن کا ہاتھ تو ہے
اڑائے خاک کبھی مجھ پہ تو میری اپنی زمیں
اسی زمیں پہ مرے خون کی پھوار گرے
کہ ہے یتیم مجاہد کی ماں یہ پیاسی زمیں
میں ان گزرتے ہوئے موسموں سے پوچھ تو لوں
بدل گئی کہ ابھی تک ہے وہ سنہری زمیں
ہمارے جسم پہ سجتے ہیں یہ کپاس کے پھول
ہمیں نکھار رہی ہے یہ کالی کالی زمیں
اسی میں اپنا پسینہ، اسی میں اپنا لہو
ہمارے واسطے آغوش وا کرے گی زمیں
زمیں بھی لیتی ہے کروٹ نہ بھول لئے نشتر
"حساب دوستاں" آخر چکا ہی دے گی زمیں

غیاث احمد گدی
فتحپور لین، جھریا (بہار)

چہرہ، بے چہرہ

"چلو گوریا کو پکڑیں"
"چلو ـــــ!"
"لیکن... کہیں ممی نے دیکھ لیا تو ـــــ؟"
"نہیں دیکھیں گی۔ اوپر چڑھ جاؤ۔"
"نہیں مجھے ڈر لگتا ہے ـــــ"
"کس بات سے؟ ممی سے ـــــ؟"
"نہیں ـــــ"
"پھر کس سے ـــــ؟"

"بس یونہی تجھے پتہ نہیں نا۔ ایک دن میں روشن دان تک پہنچا تھا۔ اندر ہاتھ ڈالا تو کسی نرم نرم، گرم گرم چیز سے میری پوریں چھو گئیں۔ اچھا لگا، سارے بدن میں جیسے کوئی گرم ہوا سرسرانے لگی ہو۔ بہت اچھا لگا۔ یقیناً وہی تھی۔ میں نے پانچوں انگلیوں کے چنگل میں اسے پکڑا تو اندر سے چیں چیں کی آوازیں بھی آئیں۔ روشن دان سے ہاتھ نکال کر دیکھتا ہوں تو سر سے پاؤں تک سہر گیا۔"

"کیوں گوریا نہیں تھی؟"

"تھی، بہت ذرا سی، پر نہیں اگے تھے ابھی، سرخ سرخ جلد کے گرد نیلی رگیں لپٹی ہوئی تھیں۔ وہ سانس لیتی تو صاف لگتا ہوا اندر باہر آ جا رہی ہے۔"

"اور؟"

"... اس کی آنکھیں بند تھیں روشنی کے کارن۔ میں نے دوسرے ہاتھ سے روشنی کو روکا تو دھیرے سے آنکھیں کھول دیں۔ ایک پل ادھر ادھر دیکھا پھر میری طرف ایسے مڑ مڑ دیکھنے لگی ... وہ رک گیا۔

لڑکی جو محویت اور دلچسپی سے اس کی باتیں سن رہی تھی، اس کے چہرے کی طرف ایک ٹک دیکھتی رہی جب ذرا دیر ہوگئی تو بولی۔

"مڑ مڑ کیسے دیکھنے لگی ؟"

"پتہ نہیں۔! پر مجھے عجیب سا لگا۔ جیسے مجھے پہچاننے کی کوشش کر رہی ہو۔ جی چاہا چپکے سے اسے بیڑی جگہ رکھ کر کمرے سے بھاگ جاؤں۔ لیکن ہمت کرکے میں نے وہ ننھے ننھے سفید موتیوں والی کڑی جو میں نے گڑیا کے ایک پاؤں سے اتاری تھی، اس کے پاؤں میں پہنا دی۔ ہانپتا ہوا نیچے کودا، اور دوڑتا ہوا ماں کے پاس بیٹھ گیا۔"

"پھر کیا ہوا ___ ؟"

ماں نے، جو آٹا گوندھنے میں مصروف تھی ہاتھ کی پشت، میرے سر پر پھیرا، اور پوچھ لیا۔

"ہانپ کیوں رہا ہے ___ ؟"

"کوئی بات نہیں ممی، یونہی بھاگتا ہوا آرہا تھا۔ تو سامنے تماشہ دکھانے والا ملا۔ وہی جس نے ہمارے آنگن میں بھالو کو نچایا تھا۔ جس کی پیٹھ پر تم نے مجھ کو ۔ ۔ ۔" مجھے تعجب ہوا۔ گوریا کے پاس سے بھاگنے کے بعد اچانک مجھے بھالو والا بہانہ کیسے سوجھ گیا۔"

لڑکا ذرا دیر کے لئے چپ ہوگیا۔ اور خلاء میں گھورتا ہوا ذرا افسردگی سے بولا۔

"تمہیں پتہ نہیں نا۔ میں جب بہت چھوٹا تھا تو بہت کمزور تھا۔ کسی نے ممی سے کہا کہ اسے بھالو کی پیٹھ پر بٹھاؤ تو صحت بنے گی "

لڑکی زور زور سے ہنسنے لگی ___ "جبھی تم اتنے موٹے مشٹنڈے ہو ___ !"

مگر مجھے بہت ڈر لگ رہا تھا۔ بھالو کی ناک کو تماشہ والے نے نتھ دیا تھا۔ اور پتلی رسی کو ہاتھ میں لئے کھینچتا دوسرے ہاتھ سے ڈگڈگی بجاتا تھا۔ اس کی پشت پر میں بیٹھا تھا جبھی بھالو نے پلٹ کر ایک بار عجیب نظروں سے مجھے دیکھا "

"اتنے دنوں بعد گوریا کے بے بال و پر بچے نے جب مجھے گھور کر دیکھا تو اچانک مجھے بھالو کی آنکھیں یاد آگئیں۔

"دونوں ایک جیسی تھیں۔ ؟" لڑکی نے تعجب کا اظہار کیا۔

"نہیں ___ بڑا فرق تھا۔ ایک دم الٹ۔ جیسی ممی اور ڈیڈی کی آنکھوں میں تھا۔ !"

"تیرے ڈیڈی تجھے پیار کرتے تھے ___ ؟"

"ہاں پر ممی بہت کرتی تھیں۔ حالانکہ ڈیڈی نے مجھے کبھی نہیں پیٹا۔ اور ممی کثر مار پیٹتی تھیں، پر جانے کیوں لگتا ممی مجھے بہت چاہتی ہیں۔ اور ڈیڈی .... ڈیڈی بھی چاہتے ہیں .... لیکن ..... لیکن ....."

وہ لڑکا رکا تو لڑکی نے لیکن کی وضاحت چاہی۔

"پتہ نہیں، مگر مجھے لگتا ڈیڈی ہر چیز میں اس چیز کے علاوہ بھی کچھ ڈھونڈتے رہتے ہیں۔"

انھیں دنوں وہ رنگین گوریا لاکر ان کے سامنے رکھ دی۔ "ڈیڈی اس کا پورٹریٹ بناؤ۔"

"رنگین گوریا ـــــ؟ پر گوریا تو رنگین ہوتی ہی نہیں۔" لڑکی نے کرید کے انداز میں پوچھا۔

"ہاں ـــــ اسے ہم نے رنگ دیا تھا، میں اور میری چھوٹی بہن نمو ....."

"نمو اور میں ایک سنسان دوپہر میں کھیل رہے تھے کہ کہیں سے ایک گوریا آکر ہمارے قدموں کے پاس گر گئی۔ نمو نے لپک کر اسے پکڑ لیا اور مجھے دکھاتے ہوئے کہا دیکھو بھولو بھیا اس کے پاؤں میں ....."

"میں نے ہاتھ میں لے کر دیکھا تو اس کے پاؤں میں ننھے ننھے سفید موتیوں کی رنگ تھی۔ تب مجھے یاد آیا کہ مہینوں پہلے میں نے ایک گوریا کو گھونسلے سے نکالا تھا جس کے بدن پر ابھی پر نہیں اگے تھے اور میں نے اس کے پاؤں میں نمو کی گڑیا کے پاؤں والی رنگ پہنادی تھی۔

گوریا کو ہاتھ میں لیا تو اس کا گرم گرم جسم ہانپ رہا تھا اور وہ آنکھیں گھما گھما کر میری طرف یوں دیکھ رہی تھی گویا مجھے پہچاننے کی کوشش کر رہی ہو۔ میں نے دیکھا اس کا وہ پاؤں جس میں کڑی تھی سوج کر موٹا ہو گیا تھا اور اس میں سے لہو چھلکا پڑ رہا تھا۔

میں نے کسی طرح اس کے پاؤں سے رنگ نکال کر پھینک دی۔ گوریا کو اڑانے لگا تو نمو نے روک لیا۔

"نہیں بھولو بھیا کھیلیں گے ـــــ اسے اڑاؤ نہیں۔"

"بڑی کھیلیں گی۔... چل ہٹ مرجائے گی۔ کیسے مڑ مڑ دیکھ رہی ہے۔" بھولو بھیا نے کہا۔

"بھولو بھیا تجھے دیکھ رہی ہے۔"

"کیوں ـــــ؟" میرا دل دھک سے رہ گیا۔ حالانکہ اس میں چونکنے جیسی کوئی بات نہیں تھی۔

"پتہ نہیں ـــــ پر ایسا لگتا ہے جیسے تجھے جانتی ہے۔"!

"لا تو۔ اسے اڑائے دیتا ہوں ـــــ" میں نے اس کے ہاتھ سے لینا چاہا۔

"نہیں ابھی نہیں بھولو بھیا۔ ابھی کھیلیں گے۔ چلو اس کے پروں کو رنگ دیں۔"

"رنگ دیں" ـــــ؟

"ہاں! ڈیڈی کے رنگوں سے رنگ دیں گے تو وہ اور اچھی لگے گی"—! یہ تجویز مجھے
پسند آئی۔

پھر ہم نے ڈیڈی کے کمرے میں جا کر ۔ پتلے برش سے اسے کئی رنگوں میں رنگ دیا۔ [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible] گئی۔

[illegible] واپس لوٹ آیا۔

[illegible]

کوئی بات [illegible]
ہمارے آنگن میں بھالو کو [illegible]
سے بھاگنے کے بعد اچانک مجھے بھالو [illegible]
لڑکا ذرا دیر کے لئے چپ ہو گیا۔ اور [illegible]
"تمھیں پتہ نہیں نا۔ میں جب بہت چھوٹا تھا تو بہت [illegible]
کی پیٹھ پر بٹھاؤ تو صحت بنے گی "
لڑکی زور زور سے ہنسنے لگی —"جبھی تم اتنے موٹے مشٹنڈ [illegible]
مگر مجھے بہت ڈر لگ رہا تھا۔ بھالو کی ناک کو تماشے والے نے
ہاتھ میں لئے کھینچتا دوسرے ہاتھ سے ڈگڈگی بجاتا تھا۔ اس کی پشت پر میں بیٹھ
کر ایک بار عجیب نظروں سے مجھے دیکھا "
"اتنے دنوں بعد گوریا کے بے بال و پر بچے نے جب مجھے گھور کر دیکھ [illegible]
کی آنکھیں یاد آگئیں۔
"دونوں ایک جیسے تھے [illegible]

[illegible] ڈیڈی کے ہاتھ سے گڑیا کو چھین لیا۔ چہ چہ ...!
[illegible] ... [illegible] ڈیڈی کے [illegible]
پہلے اس کے رنگ تو صاف کر دو۔ ورنہ اس کے بچے ...! ڈیڈی نے بیٹھے بیٹھے کہا۔ ہاں بچی کہا۔

پر یہ رنگ پانی سے تو چھوٹنے کا نہیں پینٹنگ والے رنگ ہیں ——!

"تارپین سے چھڑالو ——!

لیکن جب ممی تارپین سے گوریا کے رنگ آتار رہی تھی . . . وہ چپ ہو گیا۔

"رنگ آتار رہی تھی تو کیا ہوا ——؟"

. . . وہ مرگئی ——؟"

—— ؟ لڑکی یکایک چونک اٹھی اس نے گہری نظروں سے لڑکے کی طرف دیکھا——

لڑکا یہ بول کر پھر چپ ہو گیا۔

[illegible] دی —— لڑکے نے ذرا دیر بعد آپ ہی آپ کہا —— وہ تڑپ

[illegible] تھا۔ مگر اُڑ کر میں نے نہیں دیکھا تھا۔ ممی دھک سے [illegible] نہیں، پھر وہ ٹھنک کر سسکیاں لیتی رہیں۔ [illegible] پھر [illegible] نہیں [illegible] کس وقت اٹھے اور [illegible]

[illegible] اپنے کمرے میں [illegible] ہیں۔ کسی [illegible] نے [illegible] لیکن انھوں نے کسی کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔

[illegible] بال والے [illegible] سے [illegible] انھیں تصویر بنانے میں مصروف پاتیں۔

ایک دن سہ پہر کو وہ آپ ہی کمرے سے باہر نکلے اور خوش خوش پہلے ممی کو اور پھر مجھے پیار سے گلے سے لگایا۔ اور ہمیں کھینچ کر اپنے اسٹوڈیو میں لے چلے۔

"[illegible] میں نے کتنی ساری [illegible] تصویریں بنائی ہیں . . . اور سب کی سب [illegible] سب کی سب گوریا کی۔

[illegible] لڑکی نے تعجب اور اشتیاق سے پوچھا۔

ہاں: صرف گوریا کے پورٹریٹ۔ پورے، کسی میں صرف اس کی گردن اور چہرہ، کسی میں اس کا صرف ڈینا، کسی میں بہت سے ننھے ننھے، چھوٹے چھوٹے، سفید پر، کسی میں پروں کی بارش سی ہوتی ہوئی۔

"ہاں! ڈیڈی کے رنگوں سے رنگ دیں گے تو وہ اور اچھی لگے گی"۔۔۔! یہ تجویز مجھے پسند آئی۔

پھر ہم نے ڈیڈی کے کمرے میں جاکر۔ پتلے برش سے اسے کئی رنگوں میں رنگ دیا۔ پروں کو لال رنگا۔ چہرے کے اوپر گردن اور ماتھے کو بلو، اور دم کو سبز کر دیا۔

پھر تو گویا ایک دم پہچان ہی میں نہیں آنے لگی... لڑکا آپ ہی آپ رک گیا۔ اور اس کی آنکھیں دور خلاء میں کھو گئیں۔

لڑکی نے اس کا بازو پکڑ کر ہلایا تو گویا وہ واپس لوٹ آیا۔

اس کی آنکھیں، وہ اسی طرح تھیں۔ بس آنکھوں سے پہچان میں آجاتی تھی کہ یہ گوریا ہے۔ پھر ہم دونوں، میں اور ننو، دوڑے دوڑے ڈیڈی کے پاس گئے۔

"ڈیڈی ڈیڈی پہچانو تو یہ کون سی چڑیا ہے"۔۔۔؟

"ڈیڈی بستر سے اٹھ بیٹھے۔ گوریا کو ہاتھ میں لے کر اس کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔ پھر اس کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھا۔

ارے یہ تو گوریا ہے ۔۔۔! رنگیں گوریا... پر گوریا تو...! انھوں نے کہا اور میں نے دیکھا کہ کئی ہفتوں کے بعد پہلی بار ان کے چہرے پر مسکراہٹ آئی ہے۔

جبھی کمرے میں ممی آگئیں۔ ہمارے قریب آکر دیکھا تو گویا چلا پڑیں۔

ارے اس کو رنگ کس نے دیا ہے۔ ارے یہ تو گوریا ہے۔۔۔

پھر ممی نے ہمارے کان پکڑ لئے۔۔۔

کس نے رنگا بتاؤ۔۔۔؟

ننو نے۔۔۔

نہیں بھولو بھیا نے۔۔۔

نہیں پتہ ہے۔ گوریا کو ستایا نہیں کرتے۔ ایسا حلیہ بنا دیا ہے سوروں نے، جب یہ اپنے بچوں کے پاس جائے گی تو وہ اسے پہچاننے سے انکار کر دیں گے۔ اور اس طرح بچے ماں کی جدائی میں روتے رہیں گے۔

لاؤ جی اسے اڑا دوں... انھوں نے ڈیڈی کے ہاتھ سے گوریا کو چھین لیا۔ چہ چہ...!

"پہلے اس کے رنگ تو صاف کر دو۔ ورنہ اس کے بچے...! ڈیڈی نے بیٹھے بیٹھے کہا۔ ہانک کہا۔

پر یہ رنگ پانی سے تو چھوٹنے کا نہیں پینٹنگ والے رنگ ہیں ——!

"تارپین سے چھڑالو ——!

لیکن جب ممی تارپین سے گوریا کے رنگ آتار رہی تھی . . . وہ چپ ہوگیا۔

"رنگ آتار رہی تھی تو کیا ہوا ——؟"

"وہ . . . وہ مرگئی ——؟"

"ایں —— ؟ لڑکی یکایک چونک اٹھی اس نے گہری نظروں سے لڑکے کی طرف دیکھا —— مرگئی —— ؟

"ہاں —— ؛ لڑکا یہ بول کر پھر چپ ہوگیا۔

جب میں نے ڈیڈی کو یہ خبر دی —— لڑکے نے ذرا دیر بعد آپ ہی آپ کہا —— وہ تڑپ اٹھے اور ممی کو ایک تھپڑ جڑ دیا۔

اس سے پہلے کبھی ڈیڈی نے ممی کو مارا نہیں تھا۔ کم از کم میں نے نہیں دیکھا تھا۔ ممی دھک سے ہوگئیں۔ غیر متوقع طمانچے نے ماں کو اکھاڑ دیا۔ لیکن وہ بولیں کچھ نہیں، چہرہ ڈھک کر سسکیاں لیتی رہیں۔

چند دنوں تک ڈیڈی خاموش رہے۔ پھر ایک دن پتہ نہیں رات گئے کس وقت اٹھے اور تصویریں بنانے والے کمرے میں گھس گئے اور اندر سے دروازہ بند کر لیا۔

تین دنوں تک بغیر کچھ کھائے پئے کمرے میں بند بند جانے کیا کچھ کرتے رہے۔ کئی بار میں نے ممی نے نمو نے انھیں پکارا۔ لیکن انھوں نے کسی کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔

ممی جب بھی جالی والے سوراخ سے جھانک کر دیکھتیں، انھیں تصویر بنانے میں مصروف پاتیں۔

ایک دن سہ پہر کو وہ آپ ہی کمرے سے باہر نکلے اور خوش خوش پہلے ممی کو اور پھر مجھے پھر نمو کو گلے سے لگایا۔ اور سبھوں کو کھینچ کر اپنے اسٹوڈیو میں لے چلے۔

"چلو چلو، دیکھو، میں نے کتنی ساری اچھی اچھی تصویریں بنائی ہیں . . . اور سب کی سب سچی ہیں" —— ؛ کمرے میں جاکر دیکھا تو واقعی بہت سی تصویریں تھیں، لیکن سب کی سب گوریا کی۔

"گوریا کی —— ؟" لڑکی نے تعجب اور اشتیاق سے پوچھا۔

ہاں: صرف گوریا کے پورٹریٹ۔ پورے، کسی میں صرف اس کی گردن اور پر، کسی میں اس کا صرف ڈینا، کسی میں بہت سے ننھے ننھے، چھوٹے چھوٹے، سفید پر، کسی میں پروں کی بارش سی ہوتی ہوئی۔

ایک تصویر میں صرف اس کی آنکھیں پینٹ کی گئی تھیں ——؟

"صرف آنکھیں —— ؟"

ہاں صرف آنکھیں، جیسے دیکھتے ہی ممی نے کہا —— کیسی آنکھیں ہیں، لگتی ہیں کچھ بولتی ہوئی ہیں۔

ڈیڈی نے کہا —— ہاں کچھ بولتی ہوئی سی، گوریا کی آنکھوں کی طرف تم نے غور سے دیکھا نہیں تھا۔ وہ بھی تو ایسی ہی کچھ بولتی ہوئی تھیں۔

ایسے ہی، جب میں تمھاری تصویر بنانے لگا اور آنکھیں بنانے کی سوچا تو مجھے محسوس ہوا گویا یہ بھی کچھ بولتی ہوئی سی ہیں —— ؟

"پر کیا بتایا تمھارے ڈیڈی نے، کیا بولتی تھیں وہ آنکھیں —— ؟ تمھاری ممی کی —— ؟"

گوریا کی آنکھیں مجھے گھنے جنگلوں سے پرے لے جائیں۔ اس صاف ستھرے میدان تک ——،
جہاں ایک نئی صبح ہو رہی ہے۔ اور سارے میں سونا ہی سونا بکھرا پڑا ہے —— ؟

"ڈیڈی نے مایوسی سے انکار میں گردن ہلاتے ہوئے کہا —— پر تمھاری آنکھیں ... ان کا مفہوم پلے نہیں پڑتا۔

جانے کیا بولتی ہیں یہ آنکھیں ...

پھر ممی ایک دم سے ناراض ہوگئیں —— پہلے گیان حاصل کرو، بھاشائیں سیکھو، آنکھوں کی انگلیوں کی پیشانی کی، چہرے پر پڑی اک اک لکیر کی ...

دونوں ذرا دیر چپ رہے۔ پھر لڑکی نے پوچھا۔

"کیا سب گوریا کی آنکھیں ایک سی ہوتی ہیں —— ؟"

جواب میں لڑکے نے کہا۔ صرف ٹکٹکی لگائے دیکھتا رہا۔

"بولو نا —— کیا سب ... ؟"

"شاید ... !" لڑکے نے جواب دیا۔

تب تو میں لے کر رہوں گی —— مجھے اتار دو نا دیکھیں کیا بولتی ہیں آنکھیں —— ! اس نے ایک اونچی میز کو گھسیٹ کر روشن دان کے قریب کھڑا کر دیا اور اس کے چولیں ملے پاؤں کو دونوں ہاتھ سے تھام لیا —— چڑھ جاؤ نا بھولو ... !

باہر سے نہیں، چلو اندر سے پکڑتے ہیں۔ ڈیڈی کے کمرے کی چابی لاتا ہوں" —— !

ذرا دیر بعد وہ چابی لا کر کمرے کو کھولنے لگا۔

پھر دونوں اندر داخل ہوئے۔ کمرہ اندھیرا تھا۔ دروازے کے بائیں طرف ٹٹولنے کے بعد سوئچ بورڈ مل گیا۔ روشنی ہوتے ہی کمرے کی ساری چیزیں روشن ہوگئیں۔ مگر چاروں طرف گرد تھی۔ اور جہاں تہاں مکڑوں نے جالے تن دیئے تھے۔ جن پر جہاں تہاں گوریا کے چھوٹے چھوٹے پر پھنسے ہوئے تھے۔ جبھی دونوں کی نگاہیں بھی دیوار والے روشندان پر اٹک گئیں، جہاں گوریا گردن باہر نکالے، منڈی منڈی آنکھوں سے انھیں دیکھ رہی تھی۔

"یہ ۔۔۔ وہ رہی ... !" لڑکا گویا چلا اٹھا۔

لیکن لڑکی کمرے میں بکھری ہوئی تصویروں میں الجھ گئی۔

"یہ تصویریں ... ؟"

ڈیڈی نے بنائی ہیں ۔۔۔ ؟

تمھارے ڈیڈی ... ؟ جواب سنے بغیر لڑکی نے ڈھونڈ ڈھانڈ کر کہیں سے ڈسٹر نکالا اور تصویروں پر کی گرد اور مکڑی کے جالے کو صاف کرنے لگی۔

ذرا دیر بعد جب تصویریں صاف ہوگئیں لڑکی ان میں ڈوب سی گئی۔ محویت کے عالم میں اس کی پیشانی پر تیوریاں پڑیں۔ تب لڑکے نے ٹھوکا دیا۔

"گوریا نہیں نکالو گی ۔۔۔ ؟ تم تو تصویریں دیکھنے لگیں ۔۔۔ ؟"

عجیب تصویریں ہیں ۔۔۔ ! لڑکی نے اسی محویت سے جواب دیا۔ کسی کا چہرہ صاف ہے ہی نہیں ۔۔۔ !

ہاں ! لڑکے نے اطمینان سے جواب دیا۔ ڈیڈی کہتے تھے چہرہ کیسے بناؤں۔ بنتا ہی نہیں۔ پھر ایک دن ڈیڈی نے مجھے کہا کہ آؤ آج تمھاری ایک تصویر بنائیں۔

"یہ والی" ۔۔۔ لڑکے نے پاس میں ایزل پر رکھی ہوئی ایک تصویر کی طرف اشارہ کیا۔

"میری ممی کی تصویر ہے !"

"اس کا بھی چہرہ نہیں صرف لکیریں ہیں"۔ لڑکی نے تعجب سے کہا۔ "کیا تمھاری ماں کا چہرہ .... ؟

"تھا ۔۔۔ بالکل صاف صاف تھا، آنکھیں بڑی بڑی تھیں، ناک ستواں، اور لب، اور وہ سب کچھ جو ایک عورت کے چہرے میں ہوتا ہے۔ لیکن ڈیڈی تھے کہ ... وہ لڑکا رک گیا ۔۔۔ سب کچھ ٹھیک بنا مگر چہرے پر آکر پھر ان کا ہاتھ رک گیا۔

ممی اسی طرح بے فکر سی اسٹول پر بیٹھی رہیں۔ بہت دیر ہوگئی۔ اور ڈیڈی کو ایزل کے پاس کھڑے کھڑے بہت اداس دیکھا تو پوچھا۔

"کیا ہوا ___؟ میں کب تک بیٹھی رہوں ___؟ کھانا وانا نہیں بنانا ہے کیا ___؟"
ڈیڈی نے جواب دیا۔
تمہارا چہرہ نہیں بن رہا۔
پھر ممی اور ڈیڈی میں تو تو میں میں ہونے لگی۔ ممی نے کہا تمھیں چہرہ بنانا ہی نہیں آتا۔
ڈیڈی بولے۔ نہیں بہت سوں کی طرح تمہارا چہرہ بھی وہ نہیں ہے، جو دکھائی دیتا ہے، اس کے خدوخال میں کوئی.... اس پر ممی ناراض ہو کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔ رات کو میں جاگ رہا تھا۔ دونوں میں کافی بک بک جھک جھک ہوتی رہی۔ آخر ممی بڑے ٹھہرے ہوئے گمبھیر لہجے میں بولیں۔
"میری زندگی کھلی ہوئی کتاب کی طرح ہے۔ شادی سے پہلے میں نے تمھیں ایک ایک بات بتادی تھی۔ کچھ بھی نہیں چھپایا تھا۔ پھر جس جگہ سے تم نے مجھے اٹھایا ہے وہاں کے لوگوں کی زندگیاں کیسی رہتی ہیں۔ یہ تم اچھی طرح جانتے تھے ___" ہاں جانتا تھا۔ تمہارے ایک ایک خط کو پڑھ ڈالا تھا۔ ایک ایک خیال کو چٹکیوں میں پکڑ کر دیکھا تھا۔ وہ بہت دیر چپ رہے تو ممی نے کہا گونگے ہو گئے کیا ___؟ ممی کا غصہ بڑھ رہا تھا۔
پھر بھی تمہارا چہرہ کینوس پر اتر نہیں رہا...
"اس لئے کہ تمھیں بنانا آتا ہی نہیں، چہرہ پڑھنا نہیں آتا، وہ زبان تمہارے بس سے باہر کی بات ہے، پہلے وہ زبان سیکھو پھر تصویریں بنانا ___!"
ڈیڈی خاموشی اور افسردگی سے ان کی جانب ایک ٹک دیکھتے رہے۔ جب بہت دیر ہو گئی تو ممی نے انھیں ایک مشورہ دیا۔
لڑکی سوالیہ نظروں سے لڑکے کی طرف دیکھتی رہی۔
تم اپنا چہرہ بناؤ پہلے، اور دیکھو بنتا ہے یا نہیں ___! پھر ممی نے یہ بھی کہا ___ میں کہتی ہوں وہ بھی تم سے نہیں بن پائے گا۔
اور واقعی دوسرے دن ڈیڈی نے جب اپنا چہرہ بنانے کی کوشش کی...
لڑکا خاموش ہو گیا۔ اور دیوار سے ٹنگی ہوئی ایک تصویر کو اٹھا کر لڑکی کے سامنے رکھ دیا۔
"یہ دیکھو یہ میرے ڈیڈی کی تصویر ہے ___!"
ہاں ___ ذرا توقف کے بعد لڑکی نے دھیرے سے کہا ان کا بھی چہرہ نہیں، بالکل عجیب لگتا ہے۔
پھر لڑکا اور لڑکی دونوں تصویر میں اترتے چلے گئے۔ □

(ناول "مگر" سے)

قمر احسن
اسسٹنٹ ڈائرکٹر نیشنل آرکائوز آف انڈیا
سول لائنز بھوپال

گھمسان کا بے آواز رن

(اکرام باگ کے لئے)

آنکھوں پر موٹے شیشوں اور موٹی کمانی کا چشمہ لگائے —— دھوئیں کی بے بٹی رسی کو تھامے وہ کونے میں خاموش بیٹھا تھا —— ایس۔ گوپال پٹا بھی سیتا رلیا اور تارا چند پر پھڑ پھڑاتے ہوئے اس کے سامنے سے گذرتے جا رہے تھے —— چاروں طرف آوازیں ابل ابل کر گتھم گتھا ہو رہی تھی۔ تیز تیز لہجہ میں باتیں ہو رہی تھیں —— تقریریں۔ اور مباحثے۔ لوگ چیخ رہے تھے۔ بیچ بیچ میں لگتا جیسے جانوروں کے ریوڑ کے ریوڑ مغرب کا وقت ہوتے ہی چیخنے لگے ہوں۔ بھینس۔ گائے۔ بکریاں اور مرغیاں۔ چاروں طرف آوازوں کا شور تھا۔ کسی ایک پر بھی اس کی گرفت مضبوط نہ ہو پاتی تھی آوازیں اتنی تیزی سے ایک دوسرے میں گڈمڈ ہو رہی تھیں کہ اس نے ہاتھ بڑھا کر۔ روک کر کچھ پوچھنا چاہا تو وہ انگلیوں کی درازوں سے چھینٹی نکل بھاگی۔ پیرا ماؤنٹ انڈرڈ لہوزی۔ رکی —— چیخ کر کچھ کہا۔ اور ٹپ ٹپ پلک جھپکاتی جھپاک سے گذر گئی۔ اس کے دونوں بازوؤں میں ہلکی سی حرکت ہوئی۔ اس نے اپنی تھوڑی دونوں ہتھیلیوں پر جما لی اور پھر سوچنے لگا۔ لیکن سوچ بار بار پھسل جاتی۔

گھوڑا پیدل کے ہاتھوں مارا گیا۔ اونٹ کو ہاتھی کھا گیا۔ اور ہاتھی —— شاہ گھبرایا گھبرایا چاروں طرف کھلے میدان میں —— اپنے کو دیکھنے لگا —— گھمسان کا رن پڑا ہے ایسی تباہی۔ اتنی خونریزی۔ مہرے کٹ کٹ کر ڈبے میں گرتے رہے۔

ساری بساط پر انتشار تھا۔ سب شور مچا رہے تھے۔ اور چیخ رہے تھے۔ بیچ بیچ میں جانوروں کے ریوڑ ڈکارنے لگتے۔

اس نے چونک کر اس شور پر غور کرنا چاہا کہ اچانک دورہ پڑ گیا۔ سپٹ کی آواز ہوئی۔ سارا شور اچانک معدوم۔ کوئی ہلکی سی بھی آواز نہیں۔ تمام آوازوں سے بالکل اچانک اس کا سارا رشتہ منقطع ہو گیا۔ دھیرے دھیرے سامنے کے سارے مناظر معدوم ہوئے اور تمام آوازیں جن سے شور تھا۔ چھوٹے چھوٹے دھبوں میں بدلنے لگیں —— پھر وہ آسمان بنے اور آسمان پر سفید، اودے اور کالے بادلوں

کی ٹکڑیاں بن کر تیرنے لگیں ــــ پھر پانی کے لکھوکھا چھوٹے بڑے بلبلے ساری خلا میں تیرنے لگے ۔ اور ابل ابل کر اوپر نیچے ۔ آگے پیچھے آنے جانے لگے ۔

پھر وہ بلبلے تتلیوں کے پر بننے لگے ۔ سارا آسمان ساری خلا تتلیوں کے ہزار ہا رنگوں سے بھرنے لگے ۔ شوخ ۔ ہلکے ۔ بہت ہلکے ۔ چھینٹ دار ... تتلیوں کے پر چاروں طرف سے امنڈ امنڈ کر سارے منظر کو ڈھانپنے لگے ــــ اور چھوٹے چھوٹے پتنگے نما دائرے ۔ چاروں طرف اپنے ہلکے ہلکے پر ہلانے لگے تو سارے نوزائیدہ آسمان پر رنگین لہریے چکرانے لگے ۔

بہت دیر تک بلبلے ۔ بادل کے ٹکڑے ۔ تتلیوں کے پر اور پتنگے نما دائرے ایس میں گتھم گتھا ہوتے رہے ــــ پھر گھمسان کا بے آواز رن پڑا ــــ چاروں طرف اتھل پتھل مچی رہی لیکن آوازیں معدوم رہیں ۔

دفعتاً ایک تیز چیخ کے ساتھ سارا پہلا شور آ موجود ہوا ــــ "ہم بچ گئے ــ بچ گئے ۔ شکر ہے کہ ہم بالکل محفوظ رہے"۔ ساری بساط پر انتشار تھا ــــ سب شور مچا رہے تھے ــــ وہ منہ دیوار کی طرف کئے بڑبڑاتا رہا ۔

الف نے اپنے خوف پر قابو پانے کی کوشش کی ۔ اور "ج" سے کہا ۔ شش ۔ ہوش میں آؤ ــــ وہ ہمیں بھی خوف زدہ کرنے میں کامیاب ہو رہا ہے ــــ ہمیں اس شہر کی بدلتی ہوئی صورت حال سے باخبر رہنا چاہئے ــــ اور اپنے دفاع کے لئے آمادہ ــــ کہیں ایسا نہ ہو ــــ ؟... اور شہر پر جھک گئے ــــ

یہ کیا ہوا ــــ یہ کیا ہو رہا ہے ۔ عین پولیس اسٹیشن کے سامنے یہ ہنگامہ ــــ ؟ اس نے دھوئیں کی ڈوری کا سرا تھامنا چاہا ۔ تارا بائی اینڈ ہر ٹائمس ۔ ہوا چوک میں آکر پھانسی پر چڑھ گئی ــــ "بغرا خاں ــــ دیکھ لو ۔ اگر تم بھی طغرل کی جگہ ہوتے تو تمھارا بھی انجام اس سے مختلف نہ ہوتا"۔

چلو نیچے چلو ــــ جلدی کرو ــــ الف تیزی سے لپکا ۔

پولیس اسٹیشن کے سامنے ایک سرمئی رنگ کی نیلی کھڑکی تھی ــــ جس کا کچھ حصہ اوپر کا حصہ ہی آنکھوں سے نظر آرہا تھا ــــ سارا مجمع چیخ رہا تھا اور چوک کے عین بیچ آنکھ تھا ــــ

[illegible] ہم گئے صرف مارنے والوں کی آوازیں

رہیں۔ مجمع بڑھتا جا رہا تھا۔ شور بہت تیز ہوگیا تھا۔ کہ ایک پولیس کانسٹبل مجمعے کی طرف بڑھا۔ اور دونوں ہاتھ ہلا ہلا کر کچھ چیخنے سا لگا۔

اس کانسٹبل نے آگے بڑھنے کی کوشش کی لیکن مشتعل مجمعے نے اسے پھر پولیس اسٹیشن کی طرف دھکیل دیا —— کچھ لوگوں نے مجمع چیر کر اندر جانا چاہا اور کچھ لوگ ہاتھوں سے جگہ بناتے باہر کی طرف نکلے۔ ان کی سانسیں پھولتی ہوئی تھیں اور لباس پر جگہ جگہ دھبے سے لگے تھے۔

اس نے بڑھ کر پوچھا۔ کیوں۔ کیا بات ہے۔ یہ چوک کے عین بیچ شور۔ یہ مجمع کیسا ہے۔ کیا کوئی؟

"یہ —— یہ کار والا" —— وہ تیزی سے بڑھتے گئے۔ خوانچہ والی کے چھوٹے سے معصوم بچہ کو کچل کر ختم کر دیا۔

بچہ —— ؟ وہ ان کے ساتھ تیز تیز قدم چلتا ہوا چیخا —— بچہ۔ اب کہاں ہے —— بچہ ختم ہوگیا۔ سارا بھیجہ پھٹ کر بہہ گیا۔ زمین پر صرف خون ہی خون پھیلا ہے۔ اس نے جھک کر دیکھا —— زمین پر چاروں طرف جوتے اور پیر نظر آ رہے تھے۔ آگے بڑھتے، اٹھتے پیچھے ہٹتے اور گرتے ہوئے ——

پہلا کانسٹبل دوسرے کانسٹبل کو ساتھ لے کر پھر نمودار ہوا —— اور دونوں ساتھ چیخنے لگے۔ ارے چاپ —— چوپ راؤ —— چوک کے عین بیچ دھما چوکڑی —— ہٹو۔ صاحب کی کار کے پاس کیوں مجمع لگائے ہو۔ ہٹ کر مارا ماری کرو —— اندر بہت ارجنٹ میٹنگ ہو رہی ہے۔ شہری ہنگامہ ہونے کا خطرہ ہے ——

سپاہی کی آواز سے مجمعے میں بڑی تیزی سے اتھل پتھل مچی۔ لوگ آگے پیچھے ہوئے اور دوکانداروں نے جلدی جلدی دوکانوں کے شٹر گرا دیئے —— پھر دانت نکالے، بدحواسی، شوق اور تجسس میں مجمعے کی طرف دوڑے —— اندر گھس جانے میں ناکام ہو کر ایڑیوں کے بل اچکنے لگے۔

سائیکل والے دوسری طرف کے فٹ پاتھ سے لگ کر کھڑے ہوئے پھر لطف نہ ملنے پر اچک کر سائیکلوں پر بیٹھ گئے۔ اور مجمعے کے درمیان کا منظر دیکھنے کی کوشش کرنے لگے۔

بچہ —— ؟ اس نے پھر جھک کر دیکھا۔ ٹانگیں اور جوتے آگے پیچھے ہو رہے تھے اور شفاف سڑک پر کہیں خون کا دھبہ نہ تھا ——

پہلے سے کھڑے کچھ لوگ اکتا کر پیچھے ہٹے تو بعد والوں نے لپک کر ان کی جگہ سنبھال لی۔ اچانک پھر ہلچل ہوئی —— کچھ لوگ تیزی سے نکل کر ایک طرف چھپٹے اور چیخنے لگے۔

—— اندھیر ہے —— دن دہاڑے ڈاکہ۔ اور پولیس تماشا دیکھتی رہی۔ ارے سرمئی کار والا جیسے ہی اترا اس نے اس کی جیب صاف کر دی۔ ہزاروں روپے تھے۔ اس کے چیخنے پر لوگوں نے پکڑ لیا۔

چاروں طرف سے پھر آوازیں گڈمڈ ہونے لگی تھیں۔ اس نے جلدی سے اپنے چشمے کے شیشے صاف کیے۔ پیشانی پر آئے ہوئے پسینہ کو رومال سے تھپتھپایا اور بڑھتی ہوئی دل کی دھڑکنوں کو قابو پانے کے لئے زور زور سے مٹھیاں بھینچنے لگا۔ پھر بھی سانسیں قابو میں نہ آ رہی تھیں۔

وہ ناتجربہ کار ہیں۔ دونوں ناتجربہ کار ہیں۔ انھوں نے سرد و گرم چکھا ہی نہیں ہے۔ ایسے موقعوں پر تماش بینی بھی گل کھلاتی ہے۔

شور لمحہ بہ لمحہ بڑھتا جا رہا تھا —— الف اور ج کا کہیں پتہ نہ تھا۔ اس نے اونچی سی جگہ تلاش کی اور اچک اچک کر مجمع میں دیکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ پھر نیچے آکر بے چینی سے دونوں ہاتھ ملتا ہوا جھک کر ٹانگوں کے درمیان سے دیکھنے کی کوشش کی۔ ٹانگیں اور جوتے آگے پیچھے ہوتے رہے۔ شور بپھرا ہوا تھا۔ پھر پھیل گیا —— کچھ لوگ اس کے پاس ہی سے تیزی سے گھبرائے ہوئے گذرے۔

سالے —— چھوٹا آدمی یہی کرے تو اسے بھی بند کر دیا جائے۔ کاریں گھومیں گے اور منشیات کا کاروبار کریں گے۔

اعصابی تناؤ میں اس کے دانت نکل پڑے اور شوق و تجسس میں وہ آہستہ آہستہ کار کی طرف بڑھنے لگا۔ سارا مجمع کار کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے تھا۔ اور بند شیشوں سے اندر جھانکنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کان پڑی آواز بھی نہیں سنائی دے رہی تھی۔ ایک لمحہ کو آوازیں تھمیں۔

چہ چہ۔ نہ جانے کس کا گناہ ہے۔ سالے نے کار کا شیشہ بھی بند کر دیا ہے۔ کیا پتہ زندہ ہے یا ——؟

زندہ ہے! زندہ ہے! ابھی زندہ ہے۔ دوسری طرف سے شور پھر سمٹا اور پھر پھیل گیا ——

زندہ ہے ——؟ زندہ ہے ——؟ مارو سالے کو جب تک ختم نہ ہو جائے۔ کیا سمجھ کر سالے نے اس کے جسم کو ہاتھ لگایا تھا —— ارے نشہ میں ہے نشہ میں۔

اس نے پلٹ کر دیکھا۔ الف تیزی سے مجمع میں گھس رہا تھا۔ مجمع نے پھر شور مچایا۔ اس نے لپک کر الف کو پیچھے سے پکڑ لیا۔

رک جاؤ۔ دماغ خراب ہوا ہے۔ بلا کا مجمع ہے۔ شور ہو رہا ہے۔ گھمسان کا رن پڑا ہے۔ تم ابھی قطعاً ناتجربہ کار ہو۔ مجھے دیکھو۔ تاریخ۔

الف نے اسے زور سے جھٹک دیا۔ اس کے چہرے سے ایسا لگ رہا تھا جیسے سارے شہر کے امن امان کی ذمہ داری اسی کے سر آپڑی ہو۔ آنکھوں کی چمک یکایک بڑھ گئی تھی۔ الف نے کہا۔

شش! ہوش میں آؤ ـــــ تم ہمیں مشتعل خوف زدہ کرنے کی کوشش کر رہے ہو ـــــ وہ مجمعے میں گھس پڑا ـــــ

شور پھر سمٹا تو سارا چوک کانپنے لگا۔ مجمعے نے نعرہ لگایا ـــــ

نادر شاہی نہیں چلے گی ـــــ پرجا تنتر۔ زندہ باد۔ بدکرداری۔ نہیں چلے گی۔ مزدور یونین زندہ باد۔ کام گاروں کی مانگیں۔ پوری ہوں۔ لاٹھی ڈنڈا۔ بند کرو ـــــ قوم کی طاقت۔ پرجا ہے۔ قوم کی طاقت۔

اس نے گھبرا کر فوراً جھک کر دیکھا۔ الف اکیلا مار کھا رہا تھا۔ جوتے ٹانگیں اوپر نیچے۔ آگے پیچھے ہو رہی تھیں۔ چاروں طرف آوازوں کا شور تھا۔ لوگ بے تحاشا چیخ رہے تھے۔ باتیں کر رہے تھے اور چاروں طرف انتشار تھا ـــــ الف اکیلا مار کھا رہا تھا۔

اس نے پلٹ کر ج کو متلاشی نگاہوں سے دیکھا۔ تیزی سے اس کی طرف بڑھا ـــــ

پیچھے ہٹو ـــــ جلدی کرو ـــــ وہاں اکیلا الف مار کھا رہا تھا۔ پیچھے ہٹو ـــــ تیزی سے۔

ج نے جھک کر سڑک پر دیکھنا چاہا ـــــ پھر تیزی سے اونچی جگہ تلاش کر کے مجمعے کی طرف نظر کی اور پھولی ہوئی سانسوں پر قابو پاکر مجمعے کی طرف دوڑا۔

الف کو بچانا ہے۔ وہ مار کھا رہا ہے۔ اسے بچاؤ۔ ورنہ وہ اسے مار ڈالیں گے۔

رکو۔ رک جاؤ۔ ! مجمع بے قابو ہو چکا ہے ـــــ بچہ کچلا گیا ہے۔ یا کوئی ارجنٹ میٹنگ ہو رہی ہے۔ شہر میں ہنگامہ ہونے والا ہے۔ کسی نے سرمئی کار والے کی جیب کاٹ لی ہے۔ بس۔ یا وہ رقم لے کر جا رہا تھا۔ میرے منع کرنے کے باوجود ـــــ میں جانتا ہوں۔ ـــــ ذرائع سے مجھے معلوم ہوا ہے کہ کار میں کوئی بچہ پڑا ہے۔ نوزائیدہ۔ اس کار والے نے کسی لڑکی کو چھیڑا تھا ـــــ اسی پر۔ مجمعے میں بہت سارے مزدور یونین کے لوگ ہیں۔ الف مار کھا رہا ہے۔

مجمعے کی طرف سے پھر شور اٹھا۔ کانسٹبل درمیان میں پھنسا الف کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر سنبھالنے کی کوشش کر رہا ہے۔ دوسری طرف سے مجمع اس کی طرف جھپٹا۔ ہمارا آدمی چھوڑا جائے پولیس شاہی۔ مردہ باد۔

سائیکل والے فٹ پاتھ پر اپنی سائیکلیں آرام سے نکال کر مجمعے میں گھس پڑے اور

چوک کی ساری دوکانیں دھڑا دھڑ بند ہونے لگیں۔

وہ سب بدحواس آنکھیں بند کئے چیخ رہے تھے۔ مارو کتوں کو۔ ان کی ماں کا... اس نے چشمے کے شیشے صاف کئے۔ تیزی سے ایڑیوں پر اچکا۔ کچھ دور پیچھے ہٹا پھر جھک کر نیچے سڑک پر دیکھنے لگا۔ الف کی پتلون کی دونوں مہریاں زمین پر لٹک رہی تھیں۔ مجمع نے پھر شور مچایا۔

ہمارا ساتھی۔ چھوڑا جائے۔ پولیس شاہی نہیں چلے گی۔ دیش کی طاقت پر جا ہے سے تیزی سے مجمع کو چیر کر گھسا۔ اور چیخ چیخ کر پوچھنے لگا۔

کیا بات ہے۔ کیا بات ہے۔ اسے کیوں مار رہے ہو۔ کیوں پکڑ رکھا ہے۔ یہ۔ یہ تو الف ہے۔ پہلا آدمی جس نے...

سرمئی کار کے پاس زور سے ہل چل مچی۔ دونوں سپاہی لپک کر فٹ پاتھ پر چڑھ گئے۔ اور مجمع پھر چیخنے لگا۔

یہ دوسرا آدمی آیا ہے۔ مخالف گروپ کا ہے۔ پکڑ لو سالے کو ــــ پولیس کا چمچہ ہے۔ مار ڈالو۔ جاسوس ہے۔ تیسرا بھی ہوگا۔

اس نے لپک کر سرمئی کار کے پیچھے سے دیکھا۔ الف فٹ پاتھ کے کنارے لیٹا ہوا اکھڑی اکھڑی سانس لے رہا تھا۔ اور ج 'مار کھا رہا تھا۔ شور چاروں طرف پھیل گیا تھا۔ اور ٹانگیں اوپر نیچے آگے پیچھے ہو رہی تھیں۔ شور ایک دم سمٹ گیا ــــ

انقلاب۔ زندہ باد ــــ انقلاب۔ زندہ باد ــــ

ج چیخ رہا تھا۔

میں دوسرا آدمی ہوں۔ بات کیا ہے۔ کیا بات ہے۔ سنو۔ میں دوسرا۔

اس نے اور نزدیک جانے کی کوشش کی ــــ دیکھا کہ کار کے سارے شیشے ٹوٹے ہوئے تھے۔ ہیڈ لائٹ بھی چکنا چور ہو چکی تھی۔ اور ج کی پتلون کی دونوں مہریاں زمین پر گھسٹ رہی تھیں۔

لوگ نہ جانے کہاں سے ابل ابل کر چوک میں جمع ہو رہے تھے۔ دفعتاً وہ مجمع لہریں لیتا ہوا شہر کی ایک سمت بڑھنے لگا ــــ

اس نے پھولی ہوئی سانسوں کے درمیان گھبرا کر ایک اونچی جگہ تلاش کی۔ پھر اچک اچک کر الف اور ج کو دیکھنے کی کوشش کرنے لگا۔

وہ ناتجربہ کار ہیں۔ دونوں ناتجربہ کار ہیں۔ انھوں نے سرد و گرم چکھا ہی نہیں ہے۔ پھر تیزی سے دوڑتا ہوا —— متحرک مجمعے سے بہت آگے جا کر کھڑا ہوگیا۔ یہاں خالی تِراہے پر بالکل سناٹا تھا۔ سانسوں پر قابو پا کے دونوں ہاتھ پوری چوڑائی میں پھیلا کر سڑک پر عین درمیان میں کھڑا ہوگیا۔ لیکن سڑک بہت کشادہ تھی —— ایک لمحہ میں اس نے اس کا اندازہ کر لیا —— اور تیزی سے دوڑ کر داہنی طرف آیا۔ اور ممکنہ حد تک دونوں ہاتھ پھیلا کر کھڑا ہوگیا۔ ایک نظر اپنے پچھلے بازو پر ڈالی تو احساس ہوا کہ سڑک کی بائیں طرف کا سارا حصہ ابھی کھلا ہوا ہے۔ وہ گھبرا کر سڑک کی بائیں جانب جھپٹا۔ اور دونوں ہاتھ پھیلا کر دور سامنے نظر ڈالی —— متحرک مجمع ابھی بہت دور تھا۔ وہ گھبرا کر پھر نیچے سڑک پر آ کھڑا ہوا —— اور ہاتھوں کو لکڑی کی طرح تان کر زور زور سے چیخنے لگا۔

اچانک متحرک بپھرا ہوا مجمع نظر آیا۔ اس نے پھیلے ہوئے ہاتھوں کو سمیٹ کر چشمہ کے دونوں شیشوں کو صاف کیا۔ رومال سے پسینہ تھپتھپا کر فٹ پاتھ پر آیا اور باری باری سب کو دیکھنے لگا۔ انگلی جھٹک کر سگریٹ کی راکھ گرائی۔ زور سے لمبی سی سانس لینی چاہی تو لگا جیسے گلے میں دھوئیں کی رسی تن گئی ہو۔ اس نے جلدی سے مٹھیاں بھینچ لیں۔ چہرہ سرخ ہوگیا اور سانس رکنے لگی۔ اس نے چشمہ کے شیشے صاف کرنا چاہے تو ہاتھ اور ٹانگیں کانپنے لگیں۔ اور چاروں طرف بے پناہ شور مچنے لگا۔ ساری آوازیں تیزی سے گڈمڈ ہونے لگیں۔ پھر پھٹ کی آواز کے ساتھ ہی تمام آوازوں سے اس کا رشتہ منقطع ہوگیا۔ شور کے معدوم ہوتے ہی سارا منظر ڈوبنے لگا اور آوازیں چھوٹے چھوٹے دھبوں میں بدلنے لگیں۔ پھر وہ دھبے آسمان بنے —— آسمان پر کالے اودے بادلوں کے ٹکڑے ابھرے۔ اور پانی کے چھوٹے چھوٹے لکھوکھا بلبلے تیرنے لگے۔ پھر چاروں طرف سے تتلیوں کے پروں کی بارش ہوئی اور پتنگے نما دائرے اور لہریں آپس میں گتھم گتھا ہونے لگے۔ گھمسان کا بے آواز رن پڑا۔ □

عتیق اللہ
شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی
دہلی

غزلیں

دور ہوتے ہوئے آثار سے کیا کرنا ہے
جب نظر آئے اسے دیکھ لیا کرنا ہے

آنکھ ہی آنکھ ہوں سرتا بہ قدم آنکھ ہی آنکھ
جس کا معمول یہی ہے کہ بہا کرنا ہے

کون اس [illegible] تہِ تحریر میں ہے روشن روشن
کس نے یہ سوچ لیا ہے کہ جلا کرنا ہے

جس جگہ ٹھہرے وہاں زخم سے اگ آئیں گے
بے در و سمت سفر ہے یہ چلا کرنا ہے

اُس کو راس آیا ہے ہنرِ دست کشی
ہم کو ہر حال میں اک چیخ ادا کرنا ہے

برت برت لیا ہر لمحہ رائیگاں کیا تھا
جب اس کی زد ہی میں آئے تو پھر گماں کیا تھا

پڑی تھی بر سرِ جاں پے بہ پے کوئی افتاد
کھلی نگاہ کے صدمے تھے اور زیاں کیا تھا

زمیں کی ایک کرچ بھی نہیں تھی پاؤں تلے
تو پھر وہ قہر سا چاروں طرف رواں کیا تھا

گزار آئے تمام اچھے اور برے منظر
پلٹ کے یہ بھی نہ دیکھا یہاں وہاں کیا تھا

پھنسا ہوا ہے کچھ ہڈیوں کی درزوں میں
ادا جو کر چکے اس چیخ میں نہاں کیا تھا

ناصر شہزاد

محلہ اسلام آباد ، ساہیوال (منٹگمری)
پنجاب (پاکستان)

غزلیں

نئی ، نکور ، نرالی پر
دل آیا متوالی پر
چاند گھٹا کے گھونگھر میں
خوشبو ڈالی ڈالی پر
رادھا رانی پھول سمان
ہری گئے ہریالی پر
رمے کرن رتجگے جگنو
انکھیاں کجیلی ، کالی پر
وید بخت اور ودّیا شانت
گیہوں کی کھلتی بالی پر
دھیان اک بیتے ملن کے دوار
لب چائے کی پیالی پر
کنٹھ ملے ، گجرا مہکا
رنگ رچے دیوالی پر
سرسوں سہاگن سونے سے
تیتریوں کے خالی پر
پریت میں موہ ملن کی ریت
ہے تو سہی اسے آلی پر؟

لے کے جنموں ، جگوں کی نراشا
دل نے اپنائی ہے تیری آشا
تجھ کو جیتا ، بنی تجھ سے کویتا
شبد کے چتر میں تجھ کو تراشا
منڈپوں میں نہ کہہ سنگتوں کی
دیکھ مجھ کو بنا مت تماشا
چاند چہرا ، دھلی مانگ موتی
ہونٹ امرت میں ڈوبا بتاشا
میں ندی پر رکی ، پھول چننے
باقی قصہ سبھی اس نے تراشا
جا تجھے کون چاہے ، نباہے
پل میں تولہ ہے تو پل میں ماشہ
رنگ سے ڈھنگ تک مختلف میں
مجھ کو اردو سمجھ لو کہ بھاشا
جنگلوں میں کریں جاپ جوگی
منگلوں میں بجے ڈھول تاشا
وہ سبھی مدہوش تھی میں سبھی بے سدھ
رات دریا چڑھا بے تحاشا

صدیق مجیبی

غزلیں

ہر ایک قدم خطرۂ جاں ساتھ ہے میرے
کانٹوں کی گھنی باڑھ رواں ساتھ ہے میرے

میلوں کوئی منزل ہے نہ سایہ، نہ شجر ہے
اب تیرا تصور بھی کہاں ساتھ ہے میرے

شب ہو تو اگے دل میں اداسی کا گھنا پیڑ
دن ہے تو اک آشوبِ جہاں ساتھ ہے میرے

کیا جانے کب سرد ہوئی مشعلِ مہتاب
بے نور اجالوں کا دھواں ساتھ ہے میرے

کر آئے متاعِ دل و جاں دفن تہِ خاک
سرمایۂ جاں تیرا زیاں ساتھ ہے میرے

اچھا ہے، نہ یاد آئے کہ میرا بھی خدا تھا
ہونٹوں پہ بہت تلخ بیاں ساتھ ہے میرے

چہرہ ثابت ہے نہ پندار سلامت اب کے
سرخ رو ہو گیا ہر سنگِ ملامت اب کے

پھر کھڑا ہے سرِ بازار برہنہ کوئی
دیکھیں کیا کہتی ہے میزانِ شریعت اب کے

سونپ دوں کس کو میں دستارِ فضیلت اپنی
آپڑی اس کو مرے سر کی ضرورت اب کے

میں کہ چپ چاپ، تہی دست، کھڑا تھا ششدر
آئینہ دیکھ رہا تھا مری صورت اب کے

آزری بھول گئی چہرہ نمائی کا ہنر
کسی پتھر سے نہ نکلی صورت اب کے

دشمنِ جاں تھا زمانہ تو کسے تھی پروا
اپنی ہی ذات سے لیکن ہے عداوت اب کے

اسلم آزاد
لکچرر شعبۂ اردو، پٹنہ یونیورسٹی، پٹنہ

عکس پانی پہ نہیں بن سکتے

عکس پانی پہ نہیں بن سکتے
ہونٹ پہ برف جمی ہے
تو جمی رہنے دو
دوڑتے قدموں کی حدت سے پگھلنے والو
فاصلے قرب کی دیوار نہیں بن سکتے
حوصلے ذہن میں معدوم ہوئے جاتے ہیں
خوف کی نوک پہ
رکھی ہے ہتھیلی سب کی
کون ہے جس کا لہو
اپنی عقیدت کا صلہ چاہتا ہے
سب کے سب اپنے تعاقب میں
پریشان سے ہیں
سب کی پرچھائیاں
حیرانی کے آئینے سے ٹکراتی ہیں
کسی چہرے پہ
شناسائی کا احساس نہیں
اب کسی سمت تعلق کی ہری گھاس نہیں
ہر طرف تپتی ہوئی ریت کی دیواریں ہیں
ہم جدھر جائیں گے
جلتے ہوئے لمحوں سے
پگھل جائیں گے

شعیب قاضی
مسجد زنکسار، چرچ روڈ، رانچی

شہادت

لکیریں کھینچ دو اور ——
ریگ زاروں کو صدائیں دو
بلاؤں کو نمو دو —— سنگ پاروں کو ادائیں دو
بگولوں کو بلاؤ
آسمانوں اور زمینوں
موسم و لمحات کو بھی اذن دو ذوق تکلم دو
غرض اوراق پلٹو وقت کی پرتیں ادھیڑو
ایک سے .... پھر ایک نے .... ہر ایک سے پوچھو
لہو کا ماجرا کیا ہے ؟
اجڑتی مانگ، ویراں گود، یا بے نور آنکھوں سے
نہیں تو پھر ....
سلگتے آسماں سے، سرخ ہوتی آگ سے
یا منجمد ہوتے ہوئے لمحات سے پوچھو
لہو کا ماجرا کیا ہے ؟
یہ کلیاں، نو شگفتہ پھول، برگ آرزو
کیوں کر ہوئے ہیں برف ؟
کس نے چوس لی ہے ان کی رگ رگ سے لہو کی چاشنی: پوچھو
اور گواہی دو
گواہی دو کہ تم پر بھی لہو کے ماجرے کی اک شہادت
آسماں سے آنے والے نے مقرر کی ...

حمید سہروردی

تمہارے لئے پانچ نظمیں

(۱)

تیرے سنگ رہتا میں
تجھ پر غور کرتا میں
میں ہوں صبح کا بھولا
تو بھی شام کا منظر

(۲)

نیم کے درختوں سے
تیرا میرا کیا رشتہ
تو ہے قطرۂ بارش
میں ہوں ابر کا ٹکڑا

(۳)

ٹوٹتے ہیں جب پتھر
گھر کی ساری دیواریں
مجھ پر آن پڑتی ہیں
تجھ کو کیسا لگتا ہے

(۴)

کیسے کیسے منظر ہیں
آئینہ کی صورت میں
کانچ کی رکابی میں
ننھے منّے بچّے ہیں
تو بھی ایک بچّی ہے
میں بھی ایک بچّہ ہوں

(۵)

دن تمام پھیلے ہیں
کتنے ہی فسانے ہیں
رات کی پیشانی پر
تیرا نام لکھا ہے
تو نے یہ بھی سوچا ہے — ؟

زبیر شفائی
معرفت ڈاکٹر محمد اسلم
قریشی مارگ، پوسٹ محمود آباد (اودھ)
سیتاپور

غزلیں

زیرِ پا ہے نقطۂ آخر سوادِ بے نشاں کا
اور کتنا فاصلہ ہوگا یہاں سے آسماں کا
ہر چراغ ابتدائے شب کی لو میں قید ہوں
کہکشاں نے جا ملا ہے سلسلہ دودِ رواں کا
دھوپ کے صحرا میں جلتی ریت کی یلغار پل پل
پھر سفر کرنا خطِ آثار تک وحشی دھواں کا
وہ گھنی چپ ہے کہ آوازِ نفس بھی ہے دھماکہ
لفظ ہیں از کار رفتہ تنگ ہے دامن بیاں کا
دور تک اشجارِ سایہ چاک راہوں میں کھڑے ہیں
نیم بند آنکھوں میں یہ منظر ابھرتا ہے کہاں کا
رات دن کے ساتھ گھٹتا ہی نہیں بڑھتا بھی ہوں میں
پھر زبیر اس دل میں عکسِ لغزش ہے کس فغاں کا

(ظ۔ انصاری کے لئے)

مزاجِ فکر و فن آہستہ آہستہ بدلنا ہے
مجھے کانٹوں میں تتلی کے پروں کا رنگ ملنا ہے
مرے قدموں کے نیچے ہے زمیں کا آخری کونا
اب اس کے بعد ساری زندگی پانی پہ چلنا ہے
صدف ہی بے گہر ہیں، کھولئے کیا مٹھیاں اپنی
ہتھیلی میں چمکتی ریت کا ذرہ نکلنا ہے
یہ غنچہ غنچہ خوشبو، سبزہ سبزہ اوس کی بوندیں
مجھے خود بھی نہیں معلوم کس پیکر میں ڈھلنا ہے
زبیر آواز دیتا ہے مجھے وہ خطۂ روشن
جہاں اک بار بجھنے کی سزا سو بار جلنا ہے

فرحت قادری
معروف گنج، گیا (بہار)

غزل

سکوتِ ذات بھی معیارِ زندگی ٹھہرے
کبھی تو کم سخنی شرطِ آگہی ٹھہرے
کبھی تو ریت کے پیاسے لبوں کی پیاس نہ بجھے
کبھی تو دشت میں شبنم کی پالکی ٹھہرے
کبھی تو وقت کے ماتھے کی ہر شکن ٹوٹے
کبھی تو لمحوں سے انساں کی دوستی ٹھہرے
مری تپش کو کبھی حاصل ہو برفبار فضا
دیارِ کرب میں کچھ دیر تو خوشی ٹھہرے
یونہی لبھاتا رہے مجھ کو قربتوں کا فریب
نہ مل سکو بھی تو ملنے کی بات ہی ٹھہرے
ہماری خودنگری، بت گری سے بہتر ہو
بدن انا کا کبھی معراجِ آزری ٹھہرے
علامتوں کی ردائیں اگر نہ ہوں فرحت
ہر ایک بات ہماری بھی شاعری ٹھہرے

سازش

کتنی ٹھنڈی تھی ہوا
نرم و نازک تھی
نشیلی تھی وہ البیلی ہوا
چھو کے شانوں کو گزر جاتی تھی کس شوخی سے !

میں نے ساحل کی تمنا میں
اٹھائے لنگر
بادباں کھول دیئے
سرسراتی ہوئی بہتی رہی وہی شوخ ہوا
اپنے آنچل سے سفینے کو بڑھاتی رہی
چلتی ہی رہی
میرے بالوں سے الجھتی ہی رہی

شوخیاں بڑھتی گئیں
اور ہوا تیز ہوئی
تیز تر ہوتی گئی
اور ساحل سے بہت دور
تلاطم کے پہاڑوں پہ سفینہ لائی
جہاں طوفانوں کے عفریت تھے
منجدھاریں تھیں ـــــ !

ایس۔ این۔ شاہ
لیکچرر، ویمنس پالی ٹکنیک
مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

آوازیں

آواز کو لوہے کے مختلف مرکبات پر نقش کرنے کا کام کرتا ہوں۔ یوں تو ایک ڈھنگ سے یہ کام سبھی انسان کرتے ہیں۔ اس لئے کہ ابھی کچھ دن ہوئے میرے ہی جیسے کسی شخص نے ایک لڑکی کے دماغ کے ایک حصہ پر ایک آلہ فٹ کیا تو لڑکی بول اٹھی۔ ارے ــــ مجھے دور کہیں ہارمونیکا بجنے کی آواز آرہی ہے ــــ وہ ــــ وہ بچپن میں سفید فراک ــــ پائن کے درختوں سے سوئیاں گر رہی ہیں ــــ ہلکی ہلکی ہوا چل رہی ہے ــــ

کون ہے ــــ

ــــ ارے تم ہو ــــ آؤ آشا ــــ ارے آؤ آؤ بھئی تمھیں پینے کے لئے تو میرا شوہر بے چین رہتا ہے آج کل ــــ ہا ہا ہا ہا ــــ

ــــ اچھا ــــ

ــــ ہاں ــــ یہ کمی تھی سو بھی پوری ہو گئی ــــ اس کمبخت مہیندر نے لگائی ہے یہ لت ــــ اب تو روز ہی آتا ہے اور نام تو دیکھو آشا رکھا ہے ــــ ہنہ ــــ

ــــ تو میں اپنا نام بدل دوں گی ــــ ہہ ہہ ہہ ــــ کیوں ــــ ارے چھوڑ ــــ اچھا کیا تو آ گئی ــــ اکیلے بیٹھے بیٹھے میں گھبرا جاتی ہوں ــــ اس جنگل میں ــــ کوئی بھی تو نہیں ہے پاس پڑوس میں ــــ

آپ ہی آپ چپ چاپ بیٹھی اپنے گھاؤ کریدتی رہتی ہوں ــــ انسان گھڑی دو گھڑی کسی سے بات کرلے تو جی ہلکا ہو جائے ــــ

ــــ بچی کہاں ہے ــــ

ــــ سو رہی ہے ــــ اپنے باپ کی بیٹی ہے ــــ بھلا یہ بھی کوئی ٹائم ہے سونے کا ــــ

دونوں وقت مل رہے ہیں ـــــ ہنہ ـــــ جیسے باپ ویسی بیٹی ـــــ

ـــــ بچی ہے تھک گئی ہوگی ـــــ شام ہو گئی لیمپ جلا لے دیپ ـــــ

ـــــ ہاں جلاتی ہوں آشا ـــــ تو آرام سے بیٹھ جا ـــــ یہاں ادھر آجا ـــــ جمہ سے پوچھا ہوگا گھر ـــــ میں ـــــ

ـــــ خود پہنچا گیا ہے مجھے یہاں موڑ تک ـــــ بھلا مانس بیچارہ ـــــ ہاں سب رکشے والے ایسے نہیں ہوتے ـــــ پیسے ہوں تو دے دیئے ورنہ سمجھ جاتا ہے ۔ خود ہی کہہ دیتا ہے پھر دے دینا بہن جی ـــــ

ـــــ ادھر سے کھیت کے کنارے کنارے آئی ہوگی ـــــ

ـــــ ہاں ـــــ

ـــــ اب تو سوچ لے آشا کتنی دور مجھے پیدل چلنا پڑتا ہے بچی کو اٹھائے اٹھائے ـــــ جب سڑک آتی ہے پھر اس سے آگے جمہ کا گھر ہے وہی بیچارہ روز مجھے اسکول پہنچا دیتا ہے ـــــ

ـــــ تو اسکول کے آس پاس کہیں گھر لے لے دیپ ۔

ـــــ گھر کہاں سے لے لوں بہن ـــــ بنا پیسے کے ملتا ہے گھر ـــــ کتنے اونچے کرائے ہیں ـــــ نہ کچھ کماتا ہے نہ دھماتا ہے ـــــ صبح کا نکلا شام کو گھر میں گھستا ہے ـــــ میری تنخواہ نہ ہوتی تو دو روٹیوں کے لئے بھی ہاتھ پھیلانا پڑتا بی بی ـــــ پھر بھی شکر ہے ـــــ بھگوان ـــــ میرا تو کچھ نہیں ہے مگر یہ معصوم بچی ـــــ کھانا پینا ہے ـــــ کپڑا ہے ـــــ دو دو پیسے کے کھلونے کے لئے ترستی ہے ـــــ

ـــــ ارے ارے ـــــ آنسو پونچھ دیپ ـــــ کرے گا وہ کچھ نہ کچھ آخر کب تک پھرے گا ایسے ـــــ تو گھبرا مت ـــــ دل چھوٹا نہیں کرتے ـــــ نہیں ـــــ

مجھے کیا پتہ تھا کہ گھر سے نکل کر مجھے یہ سب دیکھنا ہے ـــــ کتنا بھولا لگتا تھا ـــــ کتنے پیار سے اس نے میرا ہاتھ پکڑا تھا ـــــ مجھے کیا معلوم تھا کہ مجھے اس حال کو پہنچا دے گا ایک دن ـــــ

ابھی کچھ دن کی بات ہے وہ جو سفید بڑا سا مکان ہے نہ جہاں آبادی ختم ہوتی ہے ـــــ جہاں سے تو ادھر مڑی ہوگی نہ ـــــ وہی ـــــ تو اس مکان میں چوری ہوئی ـــــ چور جو سامان نکال کر لائے وہ سامنے والے گڈھے میں کھولا کھالا ـــــ کچھ چیزیں وہاں پھینک گئے ایک اٹیچی چھوڑ گئے

ـــــ صبح کو پولیس والے آئے دیکھ بھال ہوئی ۔

—— تھانیدار پوچھنے لگا یہ سامنے کون رہتا ہے۔ کسی نے بتایا ماسٹرنی رہتی ہیں —— شادی شدہ ہے —— آدمی کیا کرتا ہے۔

—— کچھ نہیں کرتا —— بلاؤ ماسٹرنی کو ذرا —— کیا چال چلن ہے اس عورت کا —— آشا میرا خون کھول گیا —— ہے بھگوان اب میں اس عورت ' ہوگئی —— چال چلن پوچھتا ہے میرا —— دو کوڑی کا داروغہ —— میں جسٹس سنہا کی بیٹی تو میرے باپ کو سیلوٹ کرتا —— نصیب ہے میرا کہ میں یہاں اس جھونپڑی میں چپ چاپ مصیبت کے دن کاٹ رہی ہوں —— پولیس والے تو سمجھتا کیا ہے —— ہم نے چوری کی ہے —— لو بھلا۔ کمل نہیں تھا اس وقت ——

ارے بہن وہ گھر میں رکے تب کی بات ہے نہ —— میں پھر بھی عورت ذات ہوں —— تو سوچ ذرا —— گھر میں کوئی آدمی ہو —— مرد ہو —— تو گھر کا سر پیر ہوتا ہے —— وہ جا تا بات کرتا تو معلوم ہوتا کہ کسی کے بیوی بچے رہتے ہیں یہاں —— شریف لوگ ہیں —— آخر جاتا کہاں ہے ——

دوستوں میں —— اور کہاں —— صبح ہوئی —— جو کچھ بنا تھا جلدی جلدی کھایا پیا پیٹ بھر گیا اب سارے دن غائب —— رات گئے نشے میں گھر لوٹتا ہے —— مہندر نے پلا دی تھی —— رگو کے بیٹے کا جنم دن تھا، تھوڑی سی لے لی تھی —— آج یہ تھا آج وہ تھا —— پرمٹ کی درخواست دینے گیا تھا —— نوکری کا انٹرویو دے کر آیا ہوں —— دن بھر کا تھکا ہوا ہوں —— کان مت کھاؤ —— چپ رہو —— عورتوں کو تو بک بک کرنے کی عادت ہوتی ہے —— میں کہتی ہوں آشا —— جب شادی کر کے لایا تھا تو کہتا تھا تم باتیں کتنی پیاری کرتی ہو —— اب کہتا ہے یہ عورت بولتی کتنا ہے ——

جب زیادہ کہا کہ جب تک نوکری دھندہ نہیں ہے تم گھر ہی پر رہا کرو۔ یہیں دوست آجائیں۔ آخر تم کیوں ملنے جاتے ہو وہ نہیں آسکتے —— ہم غریب ہیں مگر کچھ پانی پتہ تو دے سکتے ہیں ——

—— لو بھیا وہ اس سے بھی برا ہوا —— کیسی کیسی شکلوں کے آدمی آنے لگے —— بدمعاش بھنڈیے سے —— بھابی نمستے —— میں نے دل میں کہا ایسے ہیں اس کے دوست —— میں ان کی بھابی ہوں —— خیر میں چپ رہی کہ اس بہانے گھر میں تو رہتا ہے —— ایک دن اسکول سے آکے کیا دیکھتی ہوں کہ تاش کھیل رہے ہیں روپوں سے —— ہاں آشا

روپیوں سے ــــ یہ کیا ہو رہا ہے بھئی میرے گھر میں ــــ جب میں نے رات کو کہا کہ یہ چیز تو ٹھیک نہیں تو کہنے لگا ــــ میں تھوڑے ہی کھیلتا ہوں ــــ وہ لوگ کھیلتے ہیں آپس میں ــــ سمے کاٹنے کے لئے ہمیں کیا مطلب ــــ خیر بھئی میں چپکی ہو رہی اب تو سوچ روز تھکی ہاری بھوکی پیاسی اسکول سے آتی ان لوگوں کے لئے چائے بنا رہی ہوں ــــ پانی پلا رہی ہوں ــــ پھر کیا ہوا ایک دن ــــ میں رسوئی میں تھی ــــ چائے بنا رہی تھی ــــ مڑ کے جو دیکھتی ہوں تو منہد رکھڑا ہے ــــ مسکرا رہا ہے ــــ میں کانپ گئی ــــ وہ اپنی جیب سے نوٹ نکالنے لگا ــــ ہائے رام ــــ اس نے سمجھا کیا مجھے ــــ کیا سمجھا اس نے مجھے ــــ بے شک ــــ بے شک میں دس دس روپے کے ٹیوشن پڑھاتی ہوں ــــ پر بچے میری عزت کرتے ہیں ــــ وہ پیار سے مجھے دیدی کہتے ہیں ــــ تو سوچ آشا ــــ ذرا سوچ تو ــــ اب میں ــــ میں ــــ

ــــ رو مت دیپ ــــ نہ نہ مت رو ــــ ٹھیک ہو جائے گا سب ــــ ہمت کر ــــ نہ نہ ــــ دن چھپے روتے نہیں ہیں ــــ دیکھ اندھیرا ہو گیا ہے لیمپ کی بتی ذرا اونچی کر دے ــــ لو کپکپا رہی ہے ــــ کہیں بجھ نہ جائے ــــ □

فرحت احساس
۱۲، امیر منزل
قلعہ روڈ، علی گڑھ

پرچھائیاں پکڑنے والے

وہ کئی دنوں سے برابر سوچ رہا تھا کہ یہ بات شانتا سے کہہ دے لیکن کہہ بھی تو کیا ——— بات بھی کتنی عجیب تھی۔

ایک میز پر اس کے سامنے بیٹھی ہوئی ایک لڑکی ——— اس کے چاروں طرف بیٹھا اس کا پورا خاندان اور میز کے نیچے سے اس کے پاؤں کو چھوتا ہوا اس کا پاؤں ——— ایک ڈرا ہوا، مگر بھرپور پر اعتماد لمس ——— یہ منظر اس کی آنکھوں میں جم سا گیا تھا۔ کام کرتے کرتے جب وہ تھک جاتا وہ خوف زدہ سا پاؤں اسے اپنی طرف سرکتا ہوا محسوس ہوتا اور پھر اس کے پورے وجود پر، ایک بادل کی طرح چھا جاتا۔

اس لڑکی کو اب وہ بھول چکا تھا۔ کب اور کہاں ملا تھا اس سے یہ بھی اسے نہیں یاد تھا لیکن اس کے پاؤں کا وہ لمحاتی لمس، جس کی عمر اس کی زندگی کی ہمسفر بن گئی تھی، اس کے وجود کی پہچان بن گیا تھا۔ زندگی کی تیز دھوپ میں بیتے ہوئے دن کا ایک ایک نقش پگھل چکا تھا۔ اس کے اندر کی تمام عمارتیں ٹوٹ پھوٹ گئی تھیں ——— وہ میز، اس کی شکل، اس کی جگہ، اس پر بیٹھے تمام لوگ بدل چکے تھے لیکن وہ پاؤں، اس کا سہما پن، اس کی پر اعتماد سپردگی کا بہاؤ آج بھی بالکل یوں ہی زندہ تھا ——— بلکہ وہی تو تھا جو زندہ تھا ———

شانتا سے اس کی شادی کے کئی سال ہو چکے تھے۔ اس نے اسے کئی بچے دیئے تھے۔ اس کا گھر، اس کی بے ترتیبی شانتا کے تناسب سے مرتب ہو گئی تھی۔ اس نے اپنے جسم کا سارا تناؤ کھول کر اس کے ڈھیلے پن پر ڈال دیا تھا۔ لیکن آج تک شانتا کی کسی بات سے اسے کوئی دلچسپی پیدا نہ ہو سکی ——— بس اس کے پاؤں، بے جان، خاموش۔ انھیں میں اس کی توجہ سمٹ کر رہ گئی تھی۔

اس نے آج تک پوری شانتا کو دیکھا ہی نہ تھا۔ بستر پر پگھلتی، کھانا پکاتی۔ کپڑے دھوتی۔ بچوں کو سلاتی اور ہنستی پوری شانتا کو دیکھ کر اسے اپنا وزن کئی گنا زیادہ محسوس ہوتا ——— اسے لگتا جیسے

سارا گھر ایک بہت بڑی میز ہے جس کے نیچے سے سرکتا ہوا پاؤں، اس کا انتظار اس کے ڈرے ڈرے لمس کی سرسراہٹ سب کچھ کہیں کھو گیا ہے ـــــ اسے لے کر۔

کھانے کی میز پر وہ جب بیٹھتا اس کی آنکھیں شانتا کے پاؤں کو گھورا کرتیں ـــــ ان میں سب بالکل ویسا ہی تھا۔ اسی پاؤں جیسا۔ ویسا ہی نازک، سفید۔ دھلا ہوا، لیکن بالکل بے فکر، بے خوف جیسے اس نے سب کچھ دیکھ لیا ہو اسے کہیں آنا اور جانا نہ ہو۔ جیسے اس نے اپنی آخری زمین پہچان لی ہو ـــــ اس کا یہی اطمینان اسے بہت بوجھل کر دیتا تھا۔

یہ میز بھی بالکل ویسی ہی۔ گھر بھی ویسا ہی۔ شانتا کے پاؤں بھی ویسے ہی لیکن یہ کچھ کہتے کیوں نہیں! آگے کیوں نہیں بڑھتے؟ کیا ان کا سفر ختم ہو گیا یا انھیں سفر کا احساس ہی نہیں؟ یہ اتنے بے تیار کیوں ہیں۔ ایسے لمحوں میں اسے محسوس ہوتا کہ دور دھند میں لٹکا پاؤں اس سے دور ہوتا جا رہا ہے ـــــ کمرے کی ساری چیزیں۔ اس پر جمی گرد۔ سب کچھ ٹھہرا ہے ... ہمیشہ ہمیشہ سے اور اس کے پاؤں کٹ گئے ہیں۔ جیسے وہ سب اسی طرح کب سے بیٹھے ہیں، خاموش اور چپ ہوئے۔ اپنی اپنی گردیں لپیٹے۔ اسی کے منتظر جو آنہیں چکتا۔

دونوں میزیں ایک جیسی لیکن ایک کے نیچے ایک ڈرا سہما دھند میں لپٹا پاؤں جس میں حرکت ہے آگے بڑھتا ہے اور اس کی ساری گرد پونچھ لے جاتا ہے ـــــ دوسری کے نیچے ایک بے خوف، مطمئن، کھلی دھوپ میں چمکتا پاؤں لیکن ٹھہرا ہوا۔ جو اسے دھندلا دیتا ہے۔

شانتا کے لئے یہ بہت حیرت ناک بات تھی ـــــ

دوسرے دن شانتا نے وہی کیا ـــــ

لیکن اسے محسوس ہی نہ ہوا کہ شانتا نے اس کے پاؤں کو کب چھوا۔ اسے تعجب تھا کہ اس کے پاؤں کا تمام احساس کہاں گیا؟ لیکن کچھ دنوں بعد شانتا کے پاؤں سے اسے ایک عجیب قسم کی چبھن کا احساس ہونے لگا۔ اسے لگا وہ جب بھی میز پر بیٹھتا ہے اسے کسی سانپ کا خوف کاٹنے لگتا ہے ـــــ اور روز بروز اس کی خلش بڑھتی جاتی تھی۔

پھر ایک دن [illegible] شانتا کا پاؤں [illegible] ـــــ اس کے دل میں نفرت کی تیز کپکپی، وہ اس کے پاؤں کو [illegible] دیکھ رہا تھا ـــــ [illegible] ... آگے۔ اور آگے ..... اور ایک تیز ـــــ [illegible] کر بیٹھ گیا۔ میز الٹ گئی اور اسے لگا وہ دور دور تک پھیلا ہوا [illegible] کے پار ہوا ہے۔ ٥

عبدالصمد

علامتیں

اس روز دوست کے یہاں بیٹھا اس بات کو پکڑنے کی کوشش کر رہا تھا جس کا کوئی اور چھور نہیں تھا یا پھر تھا تو مل نہیں رہا تھا۔ میرا دوست بھی اس کام میں میری مدد کر رہا تھا کہ اچانک خبر ملی، دوست کے گھر کی سب مرغیاں مر گئیں۔ بات ہاتھ میں آتے پھسل گئی اور میں اٹھ کر گھر چلا آیا۔

گھر آکر معلوم ہوا کہ گھر کی سب مرغیاں مر گئیں۔

محلے میں نکلا تو پتہ چلا کہ محلے کی سب مرغیاں مر چکی ہیں۔

آہستہ آہستہ شہر کے سارے علاقوں سے خبریں آنے لگیں کہ مرغیاں مر رہی ہیں یہاں تک کہ ایک اندازے کے مطابق شہر میں کوئی مرغی باقی نہیں بچی۔

پھر اس بات کو قدم جمانے کے لئے کسی زمین کی ضرورت نہیں پڑی کہ شہر میں ایک ایسی بلا آئی ہوئی ہے جو بہت تیزی سے مرغیوں کو لقمے بنا رہی ہے لیکن جب تک اس کا مقابلہ کرنے کے لئے کچھ سوچا جائے، ساری مرغیاں صاف ہو چکی تھیں اور لوگ گھروں میں بیٹھ کر سانس لینے لگے تھے۔

دو تین روز کے بعد اچانک گھر کے کونے کونے سے بدبو نکلنے لگی۔ آہستہ آہستہ بدبو کے ہاتھ پیر نکل آئے اور اس نے اپنے پنجے حلق میں گاڑنا شروع کر دیئے۔ میں گھبرا کر باہر نکل آیا۔ پتہ چلا کہ پورے محلے کی یہی کیفیت ہے۔ تمام گھروں سے بدبو کونے کونے سے نکل کر ہاتھ پاؤں نکال رہی ہے اور لوگ اپنی اپنی گردنوں کو سہلاتے ہوئے بھاگ رہے ہیں۔ شہر کی خبر لی گئی تو معلوم ہوا کہ سارے شہر میں بدبوؤں کی حکومت قایم ہو گئی ہے اور لوگ بچاؤ کے لئے اندھا دھند ایک دوسرے سے ٹکرا رہے ہیں کیونکہ بدبو کے پاؤں بہت بڑے ہو گئے ہیں اور بڑھتے جا رہے ہیں۔ آخر انتظامیہ حرکت میں آئی اور بڑی بڑی اس بات کا سرا ہاتھوں میں آیا کہ گھروں، محلوں اور شہر کے تمام چوہے، بلیاں اور چھوٹے [illegible] گئے تھے اور ان کے مردہ جسموں کی بو لشکر لے کر سبھوں کے پیچھے دوڑی پھر رہی تھیں۔

صفائی کے محکمے کو جو اب بیکاری ہی کو اپنی ڈیوٹی سمجھنے لگا تھا، یہ بات رس رس کے پلائی

گئی کہ اب ان کی ڈیوٹی یہی ہے کہ وہ بدبو دور کرنے اور صفائی اختیار کرنے کی تدبیریں اختیار کریں۔ چنانچہ ان لوگوں نے اپنی نیندیں حرام کیں اور اپنی ڈیوٹی میں لگ گئے۔ جانور، چونکہ بہت چھوٹے چھوٹے تھے اور مردہ تھے اس لیے انھیں تلاش کرنے میں انھیں بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ یہ کتنا زیادتی ہوگی کہ انھیں کامیابی نہیں ہوئی۔ انھوں نے اپنی سی پوری کوشش کی، سبھی مردہ، بدبودار جسموں کو گھروں کے کونوں، محلے اور پورے شہر سے جمع کیا اور انھیں دور ـــــ بہت دور شہر کی ساری گندگی کو سمیٹتے ہوئے بڑے نالے میں جا پھینکا، جگہ جگہ دوائیاں چھڑکیں اور جن جن کونوں میں بدبو جونک کی طرح چمٹ گئی تھی، وہاں آگ لگا دی۔ پانی میں دوائیاں ڈال دی گئیں اور سارے شہر کو جھاڑ بہار کر ایک صاف ستھری فضا مسلط کر دی گئی۔

اتنا کچھ ہونے اور لوگوں کے قدرے اطمینان کا سانس لینے پر بھی ایک رات ـــــ پچھلی پہر کتوں کے رونے کی آوازیں سنی گئی۔ گھروں، محلوں اور شہر کے سارے کتے رو رو کر ساری فضا کو سر پہ اٹھائے ہوئے تھے۔ لوگوں کی نیندیں حرام ہوگئیں اور اندر سے آنے والی ہر سانس باہر آنے کی قیمت مانگنے لگی۔ رات کچھ اور اندھیری ہوگئی اور لوگ رو رو کر اپنے گناہوں کی معافی مانگنے لگے اور آسمان کی طرف دیکھنے لگے کہ شاید کوئی ایسی چیز نازل ہوگی جو یہاں تو انھیں خوش کر دے گی یا پھر ان کتوں سمیت سبھوں کو ہڑپ لے گی لیکن یہ سب کچھ نہیں ہوا اور آسمان جہاں تھا وہیں رہا۔ پھر لوگوں نے اپنے آس پاس پر امید نظروں سے بے تابانہ دیکھنا شروع کر دیا لیکن یہاں تو کوئی چیز ایسی تھی ہی نہیں جو انھیں نجات دلا سکتی اور اگر کوئی چیز تھی بھی تو وہ آسمانوں کی طرف اڑ کر چلی گئی تھی اور ادھر کبھی نہ آنے کی قسم کھائے ہوئے تھی۔

آخر خدا خدا کر کے رات اپنا منھ کالا کر گئی تب لوگوں نے دیکھا کہ شہر کے سارے کتے مر چکے ہیں اور ان کی آنکھوں اور جسموں پر کرب کے نشانات موجود ہیں اور سناٹے کا بے سر پیر کا بھوت سارے شہر میں دندناتا پھر رہا ہے۔ لوگ ایک دوسرے کے چہرے کو دیکھتے اور کچھ نہ پانے کی صورت میں اپنے ہی گریبان میں منھ ڈال لیتے۔

صفائی کے عملے پھر حرکت میں آئے اور ایک بار پھر شہر میں سکون و امان کی خوش رنگ فضا کو مسلط کرنے کی کوشش کی گئی۔ لیکن یہ سکون و اطمینان اس بھوت کا کچھ نہ بگاڑ سکے جس کا سر تھا نہ پیر تھا اور جو یقینی شہر میں موجود تھا اور کچھ پتہ نہیں تھا کہ اب اس کے کیا ارادے ہیں۔ لیکن ایک بات کی کمی تھی کہ وہ بھوت مختلف ذائقوں کا شائق تھا اور اب پورے شہر میں نہ مرغیاں تھیں نہ بلیاں تھیں،

نہ سکتے تھے بلکہ انسان اور صرف انسان رہ گئے تھے جن کا کام اب صرف انتظار کرنا رہ گیا تھا۔

اور تبھی شہر کے لوگوں نے وقت کی نزاکت کو محسوس کیا اور اپنے جسموں پر دفاع کے لباس منڈھنے لگے جس کے نیچے خوف و ہراس کا دبیز لباس چھپ گیا لیکن ابھرا ابھرا پھر بھی نظر آتا رہا۔ لوگ ایک دوسرے سے تدارک کی تدبیریں پوچھتے اور اپنی جانکاری کا پتہ دیتے کیونکہ جو کچھ بھی تھا یہاں ہونے والا تھا وہ انہی کے درمیان تھا کہیں باہر سے نہیں آیا تھا اس لئے باہر کی طرف امید لگانا جہالت تھی۔ لیکن اس وقت سوچ اور مصلحت کے تمام لباس یکسر اتر گئے جب شہر کے ایک کونے سے خبر آئی کہ ایک جوان آدمی بیٹھا بیٹھا زمین سے تین بار اچھلا اور پھر دھم سے بیٹھ گیا، پھر لیٹ گیا اور پھر اٹھ نہ سکا۔ پورے شہر میں ایک لہر سی دوڑ گئی جس نے لوگوں کی رگوں کو جکڑ لیا۔ لوگ اپنے آپ کو مکانوں میں بند کرنے لگے۔ کھانے پینے کی عادتیں بدلی جانے لگیں۔ انتظامیہ سے درخواست کی گئی اور دور دراز کے شہروں میں خطوط لکھے گئے لیکن لوگ صاف دیکھ رہے تھے کہ بے سر پیر کا بھوت سارے شہر میں دوڑا پھر رہا ہے اور بڑھتا بڑھتا اتنا بڑا ہو رہا ہے کہ اونچی اونچی دیواروں کے اندر بھی جب چاہتا ہے، جھانک لیتا ہے۔

وقت کے بوڑھوں نے یاد دلایا کہ برسہا برس پہلے ایک ایسی بلا آئی تھی جس کا تعلق زمین سے تھا جس نے سیکڑوں آدمیوں کو اپنے جبڑے کے ایک کونے میں رکھ لیا تھا۔ تب لوگ گھروں کو چھوڑ کر میدانوں میں جا بسے تھے اور وہ بلا گھروں میں قید ہو کر رہ گئی تھی۔ لیکن یہ تب ہوا تھا جب یہ بات معلوم ہو گئی تھی کہ وہ بلا میدانوں میں نہیں آئے گی اور یہاں بے سر پیر کا بھوت میدانوں ہی میں گھوم رہا تھا۔ یہ ایک اچھی بات تھی کہ گھر ابھی اتنے غیر محفوظ نہیں ہوئے تھے اور لوگ اس وقت کو ڈر رہے تھے جب میدانوں اور گھروں میں کوئی فرق نہیں رہ جائے گا اور وہ ——— وہ۔

جوان آدمی کی موت کا مسئلہ اب حل ہوا ہی چاہتا تھا اور لوگ جگہ متعین کر کے مورچہ بندی کرنے ہی والے تھے کہ دوسری جگہ سے موت کی خبر آئی اور وہ یوں کہ ایک آدمی کو بدن میں خارش سی ہوئی جو آہستہ آہستہ اتنی بڑھی کہ وہ اپنے بدن کو کھجلاتے کھجلاتے لہولہان کر کے مر گیا ——— لوگوں نے اپنے اپنے ہاتھ اپنے جسموں پر پھیرے اور اپنے دروازوں کی مضبوطی کا اندازہ کرنے لگے حالانکہ یہ بات جانتے تھے کہ بھوت کبھی دروازوں سے نہیں آتا، وہ تو اوپر سے جھانکتا ہے۔

کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو ان واقعات کو کاغذ پر جمع کر کے اور حساب لگا کر کوئی ایسا ہندسہ دریافت کرنا چاہتے تھے جو سبھوں کے لئے اجنبی ہو لیکن واقعات کے الگ الگ ہو جانے سے جمع ہو نہیں پا رہا تھا اور تفریق سے کوئی حل نکلنے کی امید موہوم تھی۔

اب اس بات میں کوئی شک نہیں رہا کہ اس بے سر پیر کے بھوت نے اپنی من مانی شروع کر دی تھی اور لوگوں کو انتظار کے کرب میں مبتلا کر کے اپنے شکار کا نشانہ کر لیا تھا۔ لوگوں کے جسموں پر گوشت پوست کی جگہ صرف سہمی سہمی آنکھیں پھیل گئی تھیں۔ یوں وقت گذاری کے لئے صفائی کی ایک مہم شروع کر دی گئی تھی۔ سڑکوں پر، گلیوں میں ہماہمی کی جگہ صفائی کی مہم چلتی تھی۔ گھروں میں گندگی کا زرد سا چہرہ بھی دکھائی دے جاتا تھا تو لوگ بے قابو ہو کر چیخ پڑتے تھے۔ اس بات کی پوری کوشش کی جا رہی تھی کہ جو سانس پیٹ سے آئے وہ پھر پیٹ میں واپس نہ جائے۔ مندروں اور مسجدوں میں اب راتوں کو بھی آبادی ہونے لگی تھی۔ سبھوں کی بس ایک ہی کوشش تھی کہ کسی طرح بھی وہ بھوت یہاں سے چلا جائے۔ مشکل یہ تھی کہ وہ ایسی صورت میں ان کے سامنے بھی نہیں تھا کہ وہ اس کے پیر ہی پکڑ سکتے۔

یہ سب کچھ جاری تھا کہ یکایک ایک اور کونے سے خبر ملی کہ ایک شخص مر گیا۔ وجہ یہ اس کے سر میں بہت تیز قسم کا درد ہوا تھا اور دیکھتے دیکھتے اندر ہی اندر سر پھٹ گیا تھا اور خون کی لکیریں چہرے کے داغ دھو گئی تھیں ـــــ سارا معاملہ ہی الٹ گیا۔ ڈور کا سرا ہاتھ میں آتے آتے پھر چھوٹ گیا اور الجھ گیا ـــــ لوگوں نے بار بار دیکھے ہوئے دروازوں کو پھر دیکھا اور اس کی مضبوطی کا اندازہ کرتے رہے۔ نیا ہندسہ دریافت کرنے کی کوشش کرنے والوں نے جمع سے کوئی امید چھوڑ دی اور تفریق سے اپنی امیدیں وابستہ کرنے لگے۔

زمانے سے برسہا برس تک لوہا لینے والوں نے بتایا کہ اس قسم کا بے سر پیر کا بھوت راتوں میں دروازوں پر دستک بھی دیتا ہے اور تین بار دستک سننے پر جو جواب دیتا ہے یا دروازہ کھولتا ہے اسے کچھ دکھائی تو نہیں دیتا لیکن وہ اگلے لقمے کے لئے منتخب ہو جاتا ہے۔ یہ سن کر لوگوں نے کانوں میں روئیاں دے ڈالیں اور بہت سنجیدگی سے سوچنے لگے کہ کان ہی نہ ہوتے تو بہتر تھا۔ بچوں کو آواز سے اتنا ڈرایا گیا کہ وہ ماؤں کی گود میں جا کر چھپ گئے۔ تب لوگوں کو یاد آیا کہ ایسے موقع پر کتوں کے رونے سے وضاحتیں ہوتی تھیں اور مرغیوں کے مرنے سے بات ٹلتی تھی لیکن اب کے جو بلا آئی تھی وہ حد درجہ عیار تھی کہ اس نے علامتوں اور وضاحتوں کے قصے پہلے ہی تمام کر دیئے تھے اور لوگوں کو صرف وقت کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا تھا۔

راتوں کو بے مقصد گھومنے والوں نے بھی بتایا کہ کوئی سایہ ساری رات میں پھرتا نظر آتا ہے، پھر تو کانوں کان سفر کرنے والی اس خبر کو شاہراہ پر اتنا دوڑایا گیا کہ دوڑتے دوڑتے یہ یقین کی سلطنت میں داخل ہو گئی اور سبھوں نے اس بات پر اس طرح یقین کیا جیسے ان کی آنکھوں نے

یہ سب کچھ دیکھا ہو ۔ سننے کے سامنے دیکھنے کی کوئی اہمیت نہ رہی کہ لوگ دیکھنے جیسی کسی چیز کو ماننے پر تیار ہی نہیں تھے۔

پھر خبریں یہ بھی آنے لگیں کہ فلاں نے دستک سن کر دروازہ کھولا اور اس کے بعد ہی اسے دست آنے شروع ہو گئے اور وہ چٹ پٹ ہو گیا، فلاں نے اپنا نام سن کر دروازہ کھولا، اس کا پیشاب پاخانہ بند ہو گیا اور پھر بند ہی رہا۔

گھونٹ گھونٹ گھوم کر دنیا دیکھنے والوں نے ایک بات یہ کہہ دی کہ دستوریوں ہے کہ ایسے مکانات پر قبل سے نشانات لگا دیئے جاتے ہیں جن پر دستک دینا ہے۔ اس طرح پہچان کا مسئلہ پہلے ہی حل کر لیا جاتا ہے۔ اس بات نے شک و شبہات کی ایک وبا پھیلا دی۔ مکانوں کے نمبروں تک سے ڈرا جانے لگا اور ہر آدمی شک کے سمندر میں ڈوب ڈوب گیا ـــــ یہ بات تو دیر سے سمجھ میں آئی کہ ایسا خاص خاص موقعوں پر ہوتا ہے، جب سارے آدمی انتظار کی ایک ہی لڑی میں پرو دیئے گئے ہوں تب ایسا نہیں ہوا کرتا۔

لیکن پھر گڈمڈ سی بات ہو جاتی تھی۔ وجہ یہ تھی کہ بھوت کے مزاج کا پتہ نہیں چل رہا تھا۔ مختلف انداز سے لقمہ بنانے کی ترکیب سے کبھی یہ سمجھ لینے کی مجبوری ہوتی تھی کہ بھوت ایک نہیں کئی ہیں۔ لیکن رفتار کی سستی اس بات کی تردید کر دیتی تھی ـــــ بعد میں ایک بات پر اتفاق ہوا تھا کہ بھوت کی کئی زبانیں ہیں اور وہ تمام زبانوں سے ذائقے لے رہا ہے۔

لوگوں نے راتوں کو سونا چھوڑ دیا تھا اور جاگ جاگ کر دستک کا انتظار کرتے تھے جس کے بارے میں طے تھا کہ جواب نہیں دینا ہے پھر بھی وہ اپنے کانوں کو راتوں کی آوازوں کی طرف لگاتے لیکن رات چپکے چپکے دبے پاؤں ان کے قریب سے گذر جاتی، کبھی کبھار کسی پرندے کے چیخنے کی آواز آتی تو ان کے چہروں سے خون کی بوند بوند نکل جاتی اور وہ اپنے سفید سفید چہرے اپنے کاندھوں پر ٹکائے سفید ہونٹوں پر سفید زبانیں پھیرا کرتے۔

تبھی کچھ لوگوں کو اس بات کو دہرانے کا خیال آیا جیسے مقدس کتابوں کی طرح زمانے کی بوسیدہ جزدانوں میں رکھ دیا گیا تھا۔ لوگ اس کی ضرورت شدت سے محسوس کرنے لگے۔ لیکن اس میں ایک دقت یہ بھی کہ اب کوئی دیوانہ ایسا باقی نہیں رہا تھا جسے خدا کی آمین سمجھ لیا جائے۔ تب پھر اس سے پہلے دہی ہوا جیسے دہراتے دہراتے اب گھن آنے لگی تھی لیکن اس کے باوجود وہ بات اپنی جگہ اٹل تھی یعنی ان میں سے ایسے لوگوں نے جن کا دور دراز سے کچھ تعلق تھا، اپنا سامان سفر باندھنا شروع کیا کہ اب وہ

انتظار کے کرب سے عاجز آچکے تھے اور اپنے جسموں کے جوڑ جوڑ کی اب بہت زیادہ حفاظت نہیں کر سکتے تھے۔ جن کا کوئی تعلق نہیں تھا وہ کسی نہ کسی طرح سلسلہ جنبانی ملا رہے تھے اور جن کا سلسلہ کسی طرح بھی نہیں مل رہا تھا وہ اب سب حصوں کی آفتوں کو سمیٹنے کے لئے اپنے آپ کو وسیع کر رہے تھے۔

میں نے بھی سلسلہ ملانے کی کوشش میں ناکامی کے بعد سوچا کہ دوست کا تعلق باہر سے بھی ہے اس سلسلے میں وہ کارآمد ہو سکتا ہے۔ چنانچہ میں اس کے پاس گیا تو اسکے گھر پر لگا تالہ مجھ سے رازدارانہ انداز میں کہنے لگا کہ وہ تو اپنے تعلق والوں کے یہاں جا چکا۔ تبھی میں نے جانا کہ میرا مقدر شہر کے ساتھ وابستہ ہے اور جن کے مقدر کو شہر نے خود سے وابستہ نہیں کیا تھا انھیں ہی اپنے یہاں سے چلتا کر دیا تھا۔

بھوت کو شاید اپنے لقمۂ تر کے چھن جانے سے غصہ آگیا اور وارداتوں میں تیزی آگئی۔ لیکن مشکل اپنی جگہ برقرار تھی کہ اس کے سر پیر کا پتہ نہیں چل رہا تھا۔ کبھی وہ سر سے کھاتا تھا کبھی پیر سے اور کبھی پورا کا پورا لقمہ ہڑپ لیتا تھا۔ اس سے نیا بندہ دریافت کرنے کی کوشش کرنے والوں کے کام میں بڑی رکاوٹ آرہی تھی اور ان کی ہر کوشش ادھوری رہ جاتی تھی۔

پھر ـــــ مختلف طریقوں سے انسانوں کا انجانے بھوت کا لقمہ بن جانا، بے سر پیر کے بھوت کا راتوں میں گھومنا، دروازوں پر دستک دینا، لوگوں کا راتوں میں جاگنا اور انتظار کے کرب میں مبتلا ہونا ـــــ ان سب باتوں کو کئی سورج نے دیکھ لیا اور بات راز نہ رہی بلکہ عام بن گئی یعنی موت کی خبر اب بھی ملتی تھی لیکن خبر نہیں لگتی تھی۔ بے سر پیر کا بھوت راتوں میں اب بھی گھومتا تھا اور اس کے چشم دید گواہ موجود تھے، دروازوں پر دستک ہوتی تھی، لوگ راتوں میں جاگتے تھے لیکن انتظار کا کرب اب نہیں رہا تھا بلکہ انتظار ہی رہ گیا تھا۔

اسی مرنے اور اسی جینے میں جب ہم زندگی گذارنے لگے تب اچانک خبر ملی کہ میرا دوست واپس آگیا۔ اس وقت میری پہچان میرے لئے مشکل بن گئی کہ اس خبر سے مجھے خوشی ہوئی یا غصہ آیا یا افسوس ہوا۔ بہرکیف جو کچھ بھی مجھ پر بیتی، اسی حال میں، میں اس کے یہاں جا پہنچا تب میں نے جانا کہ مجھے تعجب ہوا تھا کہ جن چیزوں کی وجہ کر وہ یہاں سے گیا تھا، وہ اپنی جگہ برقرار تھیں اور ایسی کوئی بات نہیں ہوئی تھی کہ گیا ہوا آدمی واپس آجائے۔

اس کے جسم کے خوبصورت حصوں پر بے سر پیر کے بھوت کی لالچی نگاہیں، چہرے پر انتظار کا کرب اور آنکھوں میں بے خوابی کے نشانات تھے۔ یہ تمام چیزیں وہ تھیں جو میرے پاس رہ گئی تھیں اور وہ ان تمام چیزوں کو یہیں چھوڑ کر گیا تھا۔

"میں نے اس سے پوچھا۔
"تمھیں یہ بیماریاں کیوں کر لگیں ـــــ ؟ اور پھر تم یہاں آئے ہی کیوں ـــــ ؟"
"بیماریاں ـــــ !" وہ ہنسا ـــــ "تمھیں یہ سب بیماریاں لگ رہی ہیں اور وہاں یہ سب صحت مندی کی علامتیں ہیں ـــــ"
"علامتیں ـــــ !؟"
اس نے مجھے پڑھ لیا۔ وہ جہاں دیدہ ہو کر واپس آیا تھا ـــــ
لیکن کچھ نہ کہتے ہوئے وہ مجھ سے لپٹ گیا اور ہم دونوں دیر تک گرم جوشی سے لپٹے رہے۔ ☐

نجمہ شہر یار
شعبۂ انگریزی، عبداللہ گرلز کالج
مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ

نرگس کے پھول

آنگن میں لگا ہوا بیلا مہک رہا ہے اور نیم کے درخت کے تنے سے سر لٹکا کر اس نے آنکھیں بند کر لی ہیں۔ کون ہوگا جو بیلے کی اس بھینی مہک کو بامعنی بنائے گا۔ اس کے اندر چھپے ہوئے اس حسن کا پارکھ ہوگا جو کسی کو عموماً نظر نہیں آتا ——— پھر ہوا تیز تیز چلتی ہے اور کلیاں چٹکتی ہیں۔ وہ ان بیلوں کی مہک سے چاہے کتنی ہی بے خود کیوں نہ ہو جائے ... ان فضاؤں سے کتنی ہی مسحور کیوں نہ ہو جائے پر پابہ زنجیر ہو کر اپنی انفرادیت کو کبھی ختم نہ ہونے دے گی !

اور پھر نیم کے درخت کے پرسکون سایوں کے پاس سے اٹھ کر وہ اپنے کمرے میں آگئی ——— کھڑکی کے جو پٹ ہوا سے بند ہو گئے تھے ان کو کھولا۔ ہوا کے نرم جھونکے کے ساتھ سورج کی کرنیں بھی اندر داخل ہوئیں اور جب اس نے آنکھیں بند کر کے سورج کی طرف دیکھا تو فضائیں سرخ تھیں اور جب آنکھیں کھولیں تو ہر طرف سبزہ تھا اور بارش میں نہائے ہوئے درخت تھے اور گھاس پر اوس کے قوس و قزح کے رنگ لئے ہوئے قطرے تھے۔ ایک بھورے رنگ کی چڑیا اندر داخل ہوئی تو گلدان میں لگے ہوئے پھولوں میں سے تنکا تلاش کرنے لگی ... گھونسلا بنانے کو یہ کس قدر بیتاب ہے ... آخر کیوں ... تو کیا گھونسلے کے بغیر زندہ رہنا مشکل ہے ...... ؟

اور یہ جو سامنے والی کھڑکی ہے اسے ہر وقت کھلا رہنا چاہئے جو اگر بند ہو جائے تو دم گھٹتا ہے۔ نہ جانے کیوں چپکے سے اس کے ذہن کے دریچے میں وہ شہزادی در آئی جسے کسی جادوگر نے جادوئی قلعے میں اسیر کر لیا تھا جس کی کھڑکیاں بھی طلسمی تھیں جو اپنے آپ کھلتی اور بند ہوتی تھیں اور ان ہی کھڑکیوں میں کھڑی ہو کر وہ شہزادی کسی ایسی ہستی کا انتظار کیا کرتی تھی جو ایک نہ ایک دن آکر اسے اس قید سے نجات دلائے گی ... وہ کھڑکیاں جو بھیانک طوفانی سمندروں کے سفید جھاگ کی طرف کھلا کرتی تھیں !

اور پھر وہ اپنے پڑھنے کی میز تک آئی۔ ایک کتاب لے کر پاس رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھ

گئی اور بڑی دیر تک ڈوبتی اور ابھرتی رہی۔ پڑھتے وقت اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے سارے احساسات اسی کے ہوں اور پھر اچانک بارش شروع ہو گئی ——— !

بوچھار جب اندر آنے لگی تو اسے مجبوراً کھڑکی بند کرنا پڑی تب ہی اسے ایسا لگا جیسے اس کی آنکھیں بھیگ رہی ہوں۔ الہام سا ہوا کہ کوئی ہستی یقیناً ایسی موجود ہے جو اسے پالے گی۔ اور اس کانٹوں بھری زندگی میں اس کا ساتھ دے سکے گی اور بیلے کی بھینی مہک کو بامعنی بنا دے گی۔ اور پھر بجلی بڑی زور سے چمکی اور بادل بہت زور سے گرجے اور تب ہی اس نے اپنی ننگی کلائیوں کی طرف دیکھا کہ اسے چوڑیوں سے بچپن سے ہی بہت نفرت تھی۔ اور جب وہ چھوٹی سی تھی تو چوڑی والی کو گھر سے بھگا دیا کرتی تھی ...... اسے محسوس ہوا کہ کمرے میں بہت گھٹن ہے لیکن باہر فضائیں بہت دلکش ہوں گی۔ اور تب ہی اسے محسوس ہوا کہ اس جادوئی قلعے والی کھڑکی کے پاس کوئی شہزادہ چپکے سے آیا ہے اور اسے بچا کرلے جانا چاہتا ہے لیکن اپنی کوشش میں ناکام ہو جاتا ہے اور خود بھی اسی طلسمی قلعے میں اسیر ہو جاتا ہے ———

اور اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ اسے محسوس ہوا جیسے وہ سرپٹ گھوڑا دوڑائے چلی جا رہی ہے گو ہر مقصود کو حاصل کرنے کی تمنا میں ... راستے میں ایک درخت کے نیچے بیٹھا ہوا ایک بوڑھا شخص اسے منزل کا نشان بتاتا ہے اور اسے ہدایت کرتا ہے کہ خواہ کیسی ہی خوفناک آوازیں کیوں نہ پیچھے سے سنائی دیں پیچھے مڑ کر ہرگز مت دیکھنا .... وہ آگے بڑھتی ہے ... پیچھے سے بیحد ڈراونی اور پر اسرار آوازیں آتی ہیں ... "ارے پکڑو جانے نہ پائے" ... وہ سہم کر پیچھے مڑنا چاہتی ہے تاکہ ان آوازوں کا سراغ جان سکے لیکن اسے اس بوڑھے کی تنبیہہ یاد آ جاتی ہے۔ اپنے مقصد کو حاصل کرنے کی لگن میں وہ آگے بڑھتی ہی رہتی ہے ... نہ ہی اس کا دھیان بھٹکتا ہے اور نہ ہی وہ پیچھے مڑ کر دیکھتی ہے۔ آخرکار وہ اپنی منزل تک جا پہنچتی ہے وہ گیت گاتی ہوئی بلبل، سونے جیسے پانی والے فوارے کا پانی اور اس درخت کی ایک شاخ لے کر آگے بڑھتی ہے جس کی ہر شاخ گیت گاتی تھی، نغمے بکھیرتی تھی۔ فضا کے حسن سے سرشار ہوتی ہوئی، وہ تینوں چیزیں لے کر آگے بڑھتی ہے تو اس کو وہ پتھر کے بت نظر آتے ہیں جو کبھی جیتے جاگتے انسان رہے ہوں گے۔ اس بوڑھے نے اسے یہ بتایا تھا کہ جو بھی پیچھے مڑ کر ان مہیب آوازوں کا سراغ جاننے کی کوشش کرے گا بے جان پتھر کے بت میں بدل جائے گا۔ یہ سب کے سب جب جاندار رہے ہوں گے تو یہاں یہ تینوں چیزیں حاصل کرنے آئے ہوں گے اور انھوں نے پیچھے مڑ کر دیکھ لیا ہوگا، ان کا دھیان بھٹک گیا

ہوگا، گلن سچی نہ رہی ہوگی ـــــ یہ سارے کے سارے پتھر کے بے جان بت ... اور پھر بلبل کی ہدایت پر وہ فوارے کا تھوڑا سا پانی ان بتوں پر چھڑک دیتی ہے اور سارے کے سارے بت جی اٹھتے ہیں ... انھیں میں وہ دو انسان بھی ہیں جو اس کے بھائی ہیں جو ان تینوں چیزوں کی تلاش میں آئے تھے اور پیچھے مڑ کر دیکھ لیا تھا اسی وجہ سے پتھر کے بتوں میں بدل گئے تھے ـــــ اور پھر وہ ساری چیزیں لے کر (جن کی تلاش اسے اس دشوار سفر پر لے گئی تھی) اپنے دیس واپس ہوتی ہے ـــــ وہ تینوں چیزیں جن کی اس کے باغ میں کمی تھی!..... مگر یہ سب کیا...؟ آخر میں اتنی دور... ماضی کے غاروں میں کیا تلاش کرنے جا پہنچی؟ مجھے آنگن میں لگے ان بیلوں کی مہک سونگھنی چاہئے کہ ان سے مجھے محبت بھی ہے اور ساتھ ہی نفرت بھی ہے کہ یہ مہک بے حد پسندیدہ بھی ہے اور ساتھ ہی سخت ناپسندیدہ بھی ہے... نہیں... وہ ساری عمر چاہے ان بیلوں سے یونہی محبت بھری نفرت کرتی رہے پر بندھن میں ہرگز نہ بندھے گی۔ کون جانے جیسے وہ اپنائے اسے ہر قسم کے پھولوں سے نفرت ہو، برستی ہوئی گھٹاؤں... اور بہتی، سرسراتی ہواؤں سے نفرت ہو.... اسے ہرگز یہ منظور نہ ہوگا کہ کوئی اسے ایک خاص سمت جانے کو منع کرے... یا اس سطح کا ہو کہ اسے محض بیوی بہ معنی خدمت گار سمجھے... وہ یہ کبھی منظور نہ کرے گی کہ اسے بیلے کے پھولوں سے سجا دیا جائے، کہ یہ پھول دیوانہ بھی بناتے ہیں ساتھ ہی روح میں زہر بھی گھولتے ہیں... اسے لگا جیسے دور کہیں زنجیریں کھنک رہی ہوں... اسے ایسا بھی لگا کہ جیسے وہ ساحل سمندر پر کھڑی ہے اور دور پر کوئی غوطہ خور سمندر کی تہوں سے سچے موتی نکال نکال کر ان کو ایک نظر دیکھتا ہے اور پھر حقارت کے ساتھ ان کو دور تلک بکھری ہوئی ریت پر پھینک دیتا ہے، بکھیر دیتا ہے......

اور جب اس نے کوئل کے کوکنے کی آواز سنی تو وہ بے ساختہ مسکرا دی لیکن پھر فوراً ہی اپنے کانوں میں انگلیاں ڈال لیں ـــــ اس آواز سے بھی نفرت کرنا ہوگی حالانکہ اس آواز میں زندگی اور کائنات کا سارا حسن پنہاں ہے اور پھر اسی وقت جب ہوا کے کسی نرم جھونکے کے ساتھ بیلے کی خوشبو چپکے سے کمرے میں در آئی تو وحشت سے اس نے اپنا چہرہ ہاتھوں سے چھپا لیا اسے لگا جیسے پورے کمرے میں دھواں ہی دھواں ہو جس سے اس کا دم گھٹا جا رہا ہو!

اور پھر اسے یاد آیا کہ ایک دن کچھ عورتیں اس کے گھر آئی تھیں اور اسے کچھ ان نگاہوں سے دیکھ رہی تھیں جیسے کوئی بھیڑیا بکری کو دیکھتا ہے۔ وہ غصے سے بے تاب ہو کر اوپر چھت پر جا بیٹھی تھی۔ اپنی ذلت کا اتنا شدید احساس اسے پہلے کبھی نہ ہوا تھا اور پھر ایک صاحبہ اسے دیکھنے اوپر آگئی تھیں تو وہ تلملا گئی تھی۔

"لڑکیاں تو پیغام آنے سے خوش ہوتی ہیں بیٹی تم غصہ ہو رہی ہو" ان صاحبہ نے کہا تھا۔
"اصل میں یہ شادی نہیں کرنا چاہتی" اس کی ماں نے ان کو بتایا تھا۔ اور انھوں نے دانتوں تلے انگلی دبالی تھی ایسی بھی لڑکیاں ہوتی ہیں۔! اور ان عورتوں کے جانے کے بعد اس نے صاف صاف اپنی ماں سے کہہ دیا تھا کہ وہ ہرگز کبھی بھی شادی نہ کرے گی اسے یہ کبھی بھی منظور نہ ہوگا کہ وہ بیچ دی جائے یا کسی کی بیوی بنے اور اس کا شوہر اوروں سے عشق کرتا پھرے کیونکہ بیوی سے عشق بد مذاقی کی دلیل سمجھا جاتا ہے......
اگر کبھی اس نے کسی سے شادی کی بھی تو خود اپنے آپ کرے گی، زبردستی اسے کسی کے پلّے نہیں باندھا جا سکتا۔!

اور ــــ اس نے کھڑکی کھول دی، ہوائیں سرسراتی ہوتی اندر داخل ہوئیں اس کی نگاہیں دور خلاء میں کسی ابھرتے ہوئے ہیولے پر مرکوز ہوگئیں... ہمارا سب سے بڑا غم یہ ہے کہ سمندر کی اوپری سطح پر تیرتے رہنا تو ہمیں آسان لگتا ہے لیکن اس کی گہرائیوں میں ڈوب کر ان دیکھی، انجانی دنیاؤں کا سراغ لگاتے ہوئے ہم ڈرتے ہیں ــــ دل و ذہن اور روح کے نہاں خانے کتنے حیرت خیز ہیں۔ جب تک کوئی بھرپور خلوص اور شدت کے ساتھ ان میں نہیں آتا، گہرائیوں تک پہنچنے کی صلاحیت نہیں رکھتا میں یونہی تنہا رہوں گی دروازے بند رہیں گے لیکن کھڑکیاں کھلی رہیں گی جو اس قابل ہوگا کہ سمندر کے اندر اتر سکے اسے ادھر آنے کی اجازت مل جائے گی اور ــــ اس کی پرکھ خود بہ خود ہی ہو جائے گی ــــ اور قدموں کے پاس کی زمین بھیگتی رہتی ہے اور دل میں یہ احساس شدید تر ہوتا جاتا ہے کہ دور دور تک کوئی آواز نہیں صرف سناٹے ہیں اور ان سناٹوں میں کبھی کبھی ابھرتی ہوئی چڑیوں کی چہکار ہے اور درختوں کے پتّوں کی سرسراہٹ ہے... درخت کہ جو منتظر ہیں کہ سورج نکلے صبح ہو جائے....

اور پھر اس نے کھڑکی سے دور سڑک کے اس پار دیکھا کہ کوئی جادوگر مختلف تماشے دکھا رہا ہے جن کو دیکھ کر بچے بہت خوش ہو رہے ہیں۔ اسے معلوم تھا کہ یہ سب مسمریزم ہوتا ہے جسے کہ نظر کا دھوکہ کہتے ہیں اور پھر اس نے یہ بھی دیکھا کہ سڑک پر ایک شخص چلا جا رہا ہے جس کے اصلی چہرے پر ایک خول چڑھا ہے جس کو ہی سب اس کا اصلی چہرہ سمجھ رہے ہیں اور جب اس نے غور سے دیکھا تو ــــ اسے ان دونوں چہروں کے پیچھے ایک تیسرا چہرہ بھی نظر آیا... یہ سب کیا ہے وہ گھبرا سی گئی اور کھڑکی کے پاس سے ہٹ آئی....

اور پھر اسے لگا جیسے وہ ایک نئی اور عجیب سی جگہ پر کھڑی ہے۔ قریب ہی ایک چشمہ بہہ رہا ہے اور اس چشمے کے صاف شفاف پانی میں ایک نوجوان اپنے چہرے کا عکس دیکھ رہا ہے اور سراپا محو

ہے اپنے حسن کو سراہنے میں اور پھر وہ اپنے ہی چہرے کو کسی دوسرے کا چہرہ سمجھ کر خود اپنے ہی عشق میں مبتلا ہو جاتا ہے ... اپنے عکس کو پانے کی تمنا میں کہیں یہ تباہ نہ ہو جائے ... اور پھر ذرا سی دیر میں اس نے دیکھا کہ چشمے کے پانی پر ایک نرگس کا پھول بہتا ہوا اچھلا جا رہا ہے اور وہ نوجوان وہاں سے غائب ہو چکا ہے!

تیز بہتے ہوئے پانی پر پڑے ہوئے اس پھول کو اٹھانے کے لئے وہ چشمے میں چھلانگ لگا دیتی ہے اور پھول اس کے ہاتھ میں آجاتا ہے جسے لے کر وہ کنارے پر واپس آجاتی ہے ——

اور پھر اسی رات اس نے خواب میں دیکھا کہ ایک دریا طغیانی پہ ہے اور وہ اس کے کنارے کھڑی ہے اور بھنور میں وہی نوجوان، جو پانی میں اپنا عکس دیکھ رہا تھا، ڈوبا جا رہا ہے —— ... اس نے خود کو ان طوفانی لہروں کے سپرد کر دیا اور اس نوجوان کو بھنور سے نکال لائی —— اور —— پھر جب اس کی آنکھ کھلی تو اس نے اس نوجوان کو اپنے سامنے کھڑا پایا اور جب اس نے آنکھیں مسل کر غور سے اسے دیکھنا چاہا تو وہاں کوئی بھی نظر نہ آیا۔ وہاں اس نے یہ ضرور دیکھا کہ سامنے کے گلدان میں لگا ہوا نرگس کا پھول خود اپنے آپ کو چوم رہا ہے اور پھر وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ نہ جانے کتنے بھونرے ادھر ادھر سے آکر نرگس کے اس پھول پہ منڈلانے لگے اس نے غصہ میں اٹھ کر سارے بھونرے کو باہر اڑا دیا۔ اسے لگا کہ جیسے وہ پھول کچھ اداس ہو گیا ہو شاید بھونروں کے منڈلانے سے اس کی انا کو تسکین ملتی ہے ... اس نے سوچا ......

اس نے اٹھ کر اپنی میز کی دراز کھولی تو اسے ایک کاغذ ملا۔ تحریر اس کی اپنی تھی لیکن اسے یہ یاد نہ آیا کہ وہ الفاظ اس نے کب لکھے تھے شاید نیم خوابی کی کیفیت میں ......

"بت کے گر کر ٹوٹنے کی آواز دل کے ٹوٹ جانے کی آواز پر بھاری ہے ... ہر طرف موجیں ہیں ناچتے، رقص کرتے جذبات ہیں مگر کس کے لئے؟ نرگس کے اس پھول کے لئے ... وہ تو خود کو ہی چوم رہا ہے اپنے ہی عشق میں مبتلا ہے ... اس نے آج تک کسی سے عشق کیا ہی نہیں —— روح کہ جو تشنہ ہے، آنکھیں جن میں صرف ٹوٹے ہوئے خواب ہیں، خشک ہوتے ہوئے آنسو ہیں ... اندر سے کوئی چیز امنڈ امنڈ کر آرہی ہے جیسے آسمان پہ بادل میرے اندر آتش فشاں ہے ...... یہ لاوے کیوں ابلتے رہتے ہیں؟ ....

اور پھر اس نے اپنی ڈائری میں لکھا —— "بدلتے ہوئے موسموں کے رنگ ... نیم کا یہ درخت، جو میرے گھر کے آنگن پر سایہ کئے ہوئے ہے میں اس کے بدلتے ہوئے رنگوں کو نہارتی ہوں ....

پت جھڑ آیا، پتیاں مرجھائیں، کمھلائیں، ان کے چہرے زرد پڑے، پھر خشک ہواؤں نے انھیں اور خشک کر دیا اور وہ زمین پر جھڑنے لگیں، سارا آنگن زرد، خشک پتوں سے ڈھک گیا۔۔۔
پت جھڑ کی سائیں سائیں نیم کے پیڑ کو پراسرار بناتی رہی۔۔۔ پتیوں کے ساتھ ساتھ زرد زرد مہین شاخیں زمین کو ڈھکتی رہیں۔۔۔ نیم کا پیڑ ہلکا ہلکا سا نظر آنے لگا۔۔۔ ننھے ننھے نازک بسنتی پھول شاخوں پر ابھرنے لگے بکھرنے لگے اور میرے صحن کو گلزار بنانے لگے ایک دن بہت بارش ہوئی تو بے تحاشا پھول گرے۔۔۔ پھولوں سے ڈھکی، بھیگی دھرتی مسکرا اٹھی ——

ہر رات نیم کے اس درخت کے پھول ہنستے ہیں اور چاند کا چہرہ زرد ہو جاتا ہے۔۔۔۔۔۔
اور کل رات جب چاند ڈوب رہا تھا تو۔۔۔ میں جاگ رہی تھی اور ننھا رو رہا تھا۔۔۔ اور نیم کے بور کا حسن جاگ رہا تھا اور ننھے ننھے نازک بسنتی پھول زمین اور بستر پر اوندھے منہ پڑے رو رہے تھے اور —— یہ سب دیکھ کر میں ہنس رہی تھی۔۔۔ اچانک صبح ہو گئی!

رات آندھی اتنے زوروں سے آئی کہ دل دہل گئے۔۔۔ ننھے ننھے بچے۔۔۔ وہ اور تنہا ویران گھر۔۔۔ سائیں سائیں کرتی ہوائیں۔ بھوک کی حالت میں، آندھی کے ڈر سے سویا ہوا بڑا بچہ آندھی کے ڈر اور گھٹنے کے درد سے پریشان بچی، سہمے سہمے، دہشت زدہ سے دونوں ننھے بچے، اڑتی ہوئی دھول، چمکتی ہوئی بجلی۔۔۔ دھڑ دھڑ بولتے کھڑکیوں کے پٹ۔۔۔ اس نے اٹھ کر کھڑکیاں بند کر دیں۔ کمرے میں حبس تھا بچے پسینے میں ڈوبے ہوئے تھے کیونکہ لائٹ بھی غائب ہو چکی تھی۔ روشندان کے باہر سے اندر آتی ہوئی بجلی کی رمق دل کو سہماتی رہی اور شمع دان میں جلتی ہوئی موم بتی کی لو لرزتی رہی اور حبس سے دم گھٹتا رہا گھٹن جس سے اسے بچپن سے نفرت تھی!
کھڑکیاں اور دروازے بند رہے اور کوئی مسافر ادھر نہ آیا۔ اسے محسوس ہوا جیسے دور، دور تک ایک سراب ہے اور کوئی اس سراب کے پیچھے بھاگا چلا جا رہا ہے لاکھ آوازیں دیتے رہو واپس نہیں آنے کا —— اور پھر طوفان گذر جانے کے بعد اسے محسوس ہوا جیسے اس میں طوفانوں سے ٹکرانے کی صلاحیت پیدا ہو گئی ہو اسے بے حد طمانیت ہوئی۔ اسی وقت بچی نے پاس آکر اس کی پیشانی کو چوم لیا ——
"رات آپ نے ہمیں آندھی سے ڈرنے نہیں دیا یہ پیار اس لئے" —— بچی پہلے تو ہنسی پھر بری طرح رو پڑی ——!

اس نے دیکھا کہ گلدان میں لگا ہوا ننھا نرگس کا پھول خود اپنے آپ کو چوم رہا ہے اور اس نے اٹھ کر ساری کھڑکیاں کھول دیں کہ دم گھٹتا جا رہا ہے اور اسی وقت آنگن میں لگے ہوئے بیلے کی مہک چپکے سے کمرے میں در آئی اور وہ آنگن سے بیلے کے چند پھول توڑ لائی اور نرگس کے اس پھول کے قریب ہی ان کو سجا دیا —— !!

پھر اس نے یہ بھی دیکھا کہ اس کے سامنے کی صاف شفاف زمین پر خون کی بے شمار بوندیں چمک رہی ہیں اور اس نے جب آنکھیں خشک کرنا چاہیں تو رومال بھی سرخ ہو گیا اور اسی وقت اس نے یہ بھی دیکھا کہ مشرق کی طرف سے نکلتے ہوئے سورج کا گولہ بھی انگارے جیسا سرخ ہے اور کھڑکی کے اس پار، نیچے کی طرف، دور تک پھیلی ہوئی گھاس پر پڑے اوس کے قطرے بھی سرخ ہیں —— شاید رات آسمان سے لہو ٹپکا ہے ! ....

اور اس کے بعد اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اس نے دیکھا کہ دور تک پھیلی ہوئی دھرتی پر سیکڑوں کی تعداد میں نرگس کے پھول ہی پھول بکھرے ہوئے ہیں اور پھر اسے محسوس ہوا جیسے وہ سرپٹ گھوڑا دوڑائے چلی جا رہی ہے ... پیچھے سے مہیب اور پر اسرار آوازیں مسلسل آتی رہتی ہیں لیکن ان کا سراغ جاننے کی غرض سے وہ ہرگز پیچھے مڑ کر نہیں دیکھتی ... اسے کوئی آواز سنائی نہیں دیتی ... دور دور تک اسے کوئی آواز سنائی نہیں دیتی .... ☐

ساجد رشید

۶/۴ باپوراؤ، جگ تاپ مارگ
بمبئی ۴۰۰۰۱۱

تماشہ

رات نے کسی ساؤتھ انڈین حسینہ جیسے اپنے تیل چپڑے گھرے سیاہ بال جب کھیتوں کھلیانوں اور چوپالوں پر پھیلا دیئے تب یوں ہوا کہ کالے پتھر والے مندر میں سیکڑوں سال سے سو رہے کانسے کے بھگوان پلکوں سے وقت کی خاک جھڑی اور انھوں نے دھیرے دھیرے آنکھیں کھول دیں۔ اور مندر میں مقید تاریکی سے ہم کلام ہوئے۔

"اوہ تو تونے نرک کے بعد یہاں بھی ڈیرا ڈال رکھا ہے"۔

"مگر جواب میں ایک ننھے سے جھینگر کی جھائیں جھائیں ہی گونجتی رہی۔

سیکڑوں سال لمبی نیند کے بعد بھگوان کو جس احساس نے مضطرب کیا وہ بھوک کا احساس تھا! بھگوان نے اپنے کانسے کے جسم کو ایک بھرپور انگڑائی کے ساتھ توڑا اور کڑکڑاہٹ کی آواز سے مندر گونج گیا۔ انھوں نے سنگھاسن پر سے اپنے سامنے رکھی چڑھاوے کی تھالی کو اس امید کے ساتھ دیکھا کہ اس میں چڑھاوے کی مٹھائیاں اور پھل ہوں گے مگر اتنی بڑی تھالی میں صرف ایک پلپلے کیلے کو دیکھ کر انھیں بڑا دھکا پہنچا۔

"یہ سارے پھل کہاں گئے؟ سیب، ناریل، کیلے، چیکو، موسمی، اور انگور یہ تو روز ہی چڑھائے جاتے رہے ہیں! کیا دکھیارے لوگوں میں بانٹ دیئے گئے؟" بھگوان بڑبڑائے۔ خاموشی مسکی اور ننھا جھینگر بس جھائیں جھائیں کرتا رہا۔ بھگوان نے ایک بار پھر اپنی پر امید نظروں کو مندر کے کونے کھدروں میں دوڑایا شاید کہیں ... شاید کہیں ... ! کہیں کچھ بھی نہیں بس اندھیرا اور گہرا سناٹا۔

یہ چراغ کیوں نہیں جلایا گیا؟ جواب پانے کے لئے چراغ کے گڑھے کو ٹٹولتے ہیں بالکل خشک ہے۔ کیا کڑوا تیل بھی ختم ہوگیا؟ مگر وہ اس پر زیادہ دیر نہ سوچ سکے بھوک کا احساس ان کے پیٹ ہی کو نہیں بلکہ روئیں روئیں کو ہیر رہا تھا۔ انھوں نے مایوس ہو کر کیلے کو بڑی بیچارگی

سے چھیل کر منہ میں رکھا ہی تھا کہ اس کی تیز مدائن بو سے انھیں ابکائی آئی اور انھوں نے کھنکار کر تھوک دیا۔ اب انھیں خیال آیا کہ مندر کے دروازے پر ایک غلہ رکھا ہے جس میں پوجا کے لئے آنے والے لوگ مندر کی تعمیر اور اخراجات کے لئے روپے پیسے ڈال جایا کرتے ہیں۔

غلے سے پیسے نکالنے میں کوئی حرج نہیں درشن ہی کے تو ہیں۔ اس وقت مجھے ضرورت جو آن پڑی ہے"۔ یہ سوچ کر بھگوان نے غلے کو ہاتھ میں لے کر ہلایا تو کوئی آواز نہیں ہوئی "سوچا مہنگائی کے اس کال میں جب بھک منگے بھی کوئی پیسے نہیں لیتے تو پھر ہم تو بھگوان ہیں ہمارے بھگت پیسے کیوں ڈالنے لگے اس میں ضرور روپے ہوں گے"۔ اس خیال کے ساتھ ہی بھگوان نے بڑے اتساہ سے غلہ کھولا اور جب اس میں ہاتھ ڈالا تو جیسے انھیں سانپ ڈس گیا۔ غلہ خالی تھا!

"اف میرے بھگت بھی مجھ سے چھل کرنے لگے"۔ یہ سوچ کر وہ بڑے دکھی ہوئے۔ انھیں پتہ تھا کہ غلے میں سینکڑوں روپے پڑتے ہیں۔ پھر روپے کیا ہوئے مندر کی چابی تو صرف بڑے پجاری کے پاس ہے.....!!

یہ تمام غیر متوقع باتیں بھگوان کے لئے بڑی تکلیف دہ تھیں وہ بوجھل قدموں اور دکھی من کے ساتھ مندر سے باہر آئے۔ من کے دکھ سے زیادہ تکلیف بھوک کی تھی۔ بھگوان کے ذہن میں ایک خیال جگنو کی دم کی طرح چمکا۔ اس خیال نے ان کے بھوک سے نڈھال جسم میں جیسے بجلی بھر دی۔ وہ تیز قدموں سے گاؤں کی ایک اندھیری گلی میں گھس گئے۔ ایک خارش زدہ مریل کتا اپنی لرزتی سوکھی ٹانگوں پر اپنے نچڑے جسم کا بوجھ لئے بھگوان پر بھونکنے لگا۔ بھگوان نے دھتکارا مگر وہ تو کتا تھا! اس کی ٹیاؤں ٹیاؤں سے جھلا کر بھگوان زور سے ڈپٹے "چپ رہ کیا تجھے پتہ نہیں ہم بھگوان ہیں"۔ لیکن کتے نے شاید تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تب غصے میں آکر بھگوان نے ایک پتھر اٹھا کر دے مارا وہ چیں چیں کرتا اندھیرے میں غائب ہو گیا۔

اندھیری تنگ گلیوں میں بھٹکتے ہوئے بھگوان ایک پکے مکان کے سامنے رکے جس کے ماتھے پر چونے سے "اوم" بنا ہوا تھا اور لکھا تھا "ہیرا جی سنار" جوہری کے مکان کو پاکر بھگوان جیسے کھل اٹھے انھوں نے بند دروازے کی کنڈی بجائی مگر جواب ندارد پھر بجائی اور دیر تک بجاتے رہے تب کہیں جاکر اندر سے کھانسی کی آواز کے بعد کسی نے بال برابر دروازہ کھولا۔ لالٹین کی مدھم روشنی میں اندر والا باہر والے کو پہچاننے کی کوشش کرنے لگا۔

"کون ہے؟" اندر سے ڈپٹتی کم اور لرزتی زیادہ، آواز آئی۔

"ہم ہیں"۔ بھگوان بھی ذرا تنے۔
"ہم کون ؟" اب کے لرزا اور ڈپٹ برابر تھی۔
"ہم ہیں بھگوان"۔ بھگوان اور بھی تن گئے۔
"کون بھگوان داس ؟" پہچاننے کی کوشش۔
"نہیں صرف بھگوان مندر سے آرہے ہیں"۔
"بھگوان ! اونہہ سسرے چور اُچکے اب بھگوان کا سوانگ بھرنے لگے۔
"بھگوان کو اس بدتمیزی پر غصہ تو بہت آیا مگر بھوک تلوے تک لگی ہوئی تھی اس لئے ذرا نرم ہوئے۔
"دیکھو میں کچھ بیچنے لایا ہوں"۔
"یہ بھی کوئی لین دین کا سمئے ہے"۔ جوہری جس کا چہرہ اب ذرا نظر آرہا تھا کسمسایا۔
"میں اپنا یہ سونے کا تاج بیچنا چاہتا ہوں"۔ بھگوان نے بڑے بھاری من سے یہ جملہ ادا کیا اور اپنا سونے کا تاج جسے سینکڑوں سال پہلے راجہ نے مندر میں بھگوان کی مورتی کی استھاپنا کے فوراً بعد اپنے ہاتھوں سے بھگوان کے سر پر رکھا تھا جوہری کے ہاتھ میں پکڑا دیا۔
جوہری نے لالٹین کی دھندلی روشنی میں اپنی تجربہ کار بوڑھی آنکھوں سے تاج کو اندر تک چیر کر دیکھا اور ایک دم سے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔
"کیوں اتنی بڑی دنیا میں مورکھ میں ہی نظر آتا ہوں کیا"۔ وہ لالٹین کی آخری لو کی طرح بھڑک اٹھا۔
"کیا بک رہے ہو تم" ؟ بھگوان بھی گرجے۔
"کیوں پیتل کو سونا کہ کر ٹھگنے آئے ہو۔ چالیس سال سے جھک نہیں مار رہا ہوں اس کاروبار میں"۔ بھگوان کے لئے یہ زبردست دھچکا تھا وہ اپنے پورے شریر سے لرز گئے۔
"یہ کیسے ہوا ؟ جوہری کا لوٹایا ہوا تاج ہاتھ میں لے کر وہ باہر آکر سوچنے لگے۔ راجہ نے تو اپنے درباری جوہری سے اپنی نگرانی میں بنوا کر اپنے ہاتھوں سے ہمارے شیش پر رکھا تھا ضرور کسی نے نیت خراب کی ہے۔ ہماری سیکڑوں سال لمبی نیند کے دوران کسی نے تاج بدل ڈالا ہے۔ اگر آج بھوک نہ لگتی اور آنکھ نہ کھلتی تو ہم یوں ہی پیتل کا یہ تاج سونا سمجھ کر پہنے بیٹھے رہتے کس نے کیا ہے یہ پاپ ؟ مندر کی چابی تو ۔۔۔۔۔۔"
مندر کو لوٹتے ہوئے بھگوان نے گہری ندی کے پل پر سے گذرتے سمئے تاج کو پانی میں پھینک

دیا جو ڈبک ڈبک کی آوازیں پیدا کرتا ڈوب گیا۔

پھر یوں ہوا کہ صبح بڑے پجاری نے مندر کا دروازہ کھولا اور بھگوان کو سنگھاسن پر ننگے سر بیٹھے پایا۔

"ہائے پاپ گھور پاپ !" کی چیخ مار کر بڑے پجاری نے واویلا مچا دیا اور بھگوان اپنی پتھرائی آنکھوں سے یہ تماشا دیکھ رہے تھے !

بڑا پجاری اب بھی واویلا مچائے ہوئے ہیں اور بھگوان یہ تماشا اپنی پتھرائی ہوئی آنکھوں سے اب بھی دیکھ رہے ہیں !! □

FORM IV *(See Rule 8)*

1 Place of publication — ایجوکیشنل بک ہاؤس، مسلم یونی ورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ

2 Periodicity of its publication — دو ماہی

3 Printer's Name — اسد یار خاں
(Whether citizen of India?) — ہندوستانی
Address — ایجوکیشنل بک ہاؤس، مسلم یونی ورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ

4 Publisher's Name — اسد یار خاں
(Whether citizen of India?) — ہندوستانی
Address — ایجوکیشنل بک ہاؤس، مسلم یونی ورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ

5 Editor's Name — ابوالکلام قاسمی
(Whether citizen of India?) — ہندوستانی
Address — ایجوکیشنل بک ہاؤس، مسلم یونی ورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ

6 Names and address of individuals who own the newspapers and partners or shareholders holding more than one percent of the total capital.

اسد یار خاں (مالک)، ایجوکیشنل بک ہاؤس، مسلم یونی ورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ

I, ASAD YAR KHAN, hereby declare that the particulars given above are true to the best of my knowledge and belief.

Dated 1-3-79

Signature of Publisher
Asad Yar Khan

خلیل تنویر
گورنمنٹ میوزیم
اودے پور

غزلیں

بجھتے ہوئے چراغ شرربار دیکھئے
جو ہو سکے تو وقت کے اس پار دیکھئے
کیا بستیاں تھیں جن کو ہوا نے مٹا دیا
ہر نقش بے نوا، در و دیوار دیکھئے
وہ آئینہ ہے اس کے مقابل نہ جا سکے
اپنے لہو کی آگ گنہ گار دیکھئے
وہ کون تھا جو سرحدِ شب سے گذر گیا
سویا پڑا ہے لشکرِ اغیار دیکھئے
وہ اپنی راہ پا کے بھی کیسا بھٹک گیا
حرفِ زنا پسند تھا، انکار دیکھئے

وہ ملا بھی تو اس سے کیا کہتے
بڑھ چلے تھے جو فاصلے دل کے
وہ بھی اک سایۂ گریزاں تھا
ہم جسے کائنات سمجھے تھے
پھر لہو میں دھواں سا اٹھتا ہے
یاد آتے ہیں قافلے گل کے
تیری آمد کی منتظر آنکھیں
بجھ گئیں، خاک ہو گئے رستے
پاس لگتی تھی دور کی آواز
یہ کرشمے بھی رات بھر کے تھے

شاہد کلیم

سنٹرل اکسائز آفس
گیا (بہار)

تبدیلی

قوس قزح
نیلے امبر پر اگی ہوئی تھی
سات طرح کے رنگوں کا
منظر آنکھوں میں
پھیل گیا تھا
کچھ لمحے کو
کائنات کا
رنگ و روغن
بدل گیا تھا

سکوت

نہ کھڑکی کو ہوا ہی پیٹتی ہے
نہ تصویریں چٹخ کر چیختی ہیں
نہ آتا ہے بلاوا کسی کا
نہ دستک کی صدا ہی گونجتی ہے
میں گہری نیند سے
کمرے میں اپنے سو رہا ہوں
سوادِ چشم میں
کچھ اور خوابوں کا اضافہ
ہو رہا ہے

وقت

قطرہ قطرہ وہ پانی
جو آکاش کی وسعتوں میں اڑا تھا
سمندر میں گر کر
کسی اجنبی سمت میں
بہہ رہا تھا
سمندر بڑے زور سے
ہنس رہا تھا

معصوم نظر
لال پورا ، دونگاپور
راجستھان ۳۱۴۰۰۱

بے خبر کشتیاں

دور کالے بھنور سے
نکلتی ہوئی بے خبر کشتیاں
اب کناروں کی جانب رواں ہو رہی ہیں
سمندر کی لہروں میں جنبش نہیں
مگر اب کسی بھی سمے
کوئی زلزلہ
سر اٹھانے کی کوشش کرے
کوئی طوفاں اٹھے
ساحلوں سے پرے
بے خبر کشتیاں
کیوں چلی آرہی ہیں

شجر سوچتا رہا

تیز ہوا میں
اپنے ہاتھ ہلاتا تھا
گونگا بہرا
ایک شجر اٹھلاتا تھا
پہلی بارش بن برسے ہی چلی گئی
تب سے اب تک
کیوں تنہا گھبراتا ہے
روز نئی رت کو آواز لگاتا ہے
پتہ پتہ پیڑ کا
جھڑتا جاتا ہے

نظم

سرمئی سمندر میں
بادلوں کی ساکت قطاریں
کہساروں کے سروں پہ کھڑی ہیں
درختوں کی شاخوں پہ بیٹھے ہوئے کبوتر
اجنبی موسم کو گزرتے ہوئے دیکھ رہے ہیں
بیچ میں تیز بہتا ہوا دریا
خاموشی کو توڑتا ہوا بہہ رہا ہے
کناروں پہ ڈھلتی ہوئی شام
لمحہ لمحہ رات کے اندھے کنویں میں
اترتی جارہی ہے

غزلیں

سید ارشاد حیدر
۶۰۵ ـ دریاآباد ، الہ آباد

دھوپ اس پار گئی اب مرا سایہ بھی نہیں
اور آنکھوں میں کوئی خواب شکستہ بھی نہیں
نقش مبہم تھا ، ابھرتا تھا نہ مٹتا ہی تھا
ذہن مفلوج میں کچھ اس کے سوا تھا بھی نہیں
ایک تنکا بھی مرے دست تمنا میں نہ تھا
ہاں مگر میں نے کبھی ڈوب کے دیکھا بھی نہیں
کھو گیا گردِ سفر میں مری منزل کا نشاں
اور تا حدِ نظر نقش کفِ پا بھی نہیں
عہدِ رفتہ کے مناظر کو میں دیکھوں کیوں کر
موجِ دریا پہ کوئی عکس ٹھہرتا بھی نہیں

احترام اسلام
۵۴۷ ـ اترسوئیا ، الہ آباد

نہ یوں صداؤں کے پیکر تراش چیخوں میں
کہ جسم ہوگئے نغموں کے لاش چیخوں میں
سنبھال لے نہ جو دل کو حصارِ کم رحمی
تو کون زندہ بچے دل خراش چیخوں میں
وجود میری ہی آواز نے نہیں کھویا
صدا صدا کا ہوا ہے وناش چیخوں میں
ضرور ضبط کے جوالامکھی سے پھوٹی ہے
بدل گئی. جو صدا دل خراش چیخوں میں
یہی دعا ، یہی حسرت ہے احترام مری
سنائی دے تری آواز کاش چیخوں میں

احمد کمال پروازی ، اُجین

چھتوں پہ شام کی ہیبت دروں میں سناٹا
یہ کون چھوڑ گیا منظروں میں سناٹا
یہ خاک خاک اڑیں ہیں روایتیں اپنی
کہ موج موج رواں ہے سروں میں سناٹا
اُدھر وہ لے کے چلا سحر کاریاں اپنی
اِدھر وہ ڈال گیا بستروں میں سناٹا
صدا کا آخری طائر بھی ہو چکا معدوم
ابھی تلک ہے مگر دائروں میں سناٹا
بس اتنا یاد کہ پونم کی رات آئی تھی
تبھی سے گھوم رہا ہے پروں میں سناٹا

پرویز یداللہ مہدی

قصہ اردو نگر کا ....

(اردو کے تمام بے ساختہ، خود ساختہ، حواس باختہ ادیبوں و شاعروں سے معذرت کے ساتھ)

"اُردو نگر" کے غیر شاعر و ادیب عوام کی دانست میں بالآخر وہ بُرا وقت آ گیا جس کا ڈر تھا کیونکہ طوطیانِ شعر و ادب' کی گونج مقاماتِ آہ و فغاں سے نکل کر اب بستیوں' بازاروں' دفتروں' کالجوں' غرض تمام پرائیویٹ اور پبلک مقامات پر سنائی دینے لگی تھی، یوں لگتا تھا جیسے اُردو نگر میں صرف شاعر و ادیب ہی رہتے ہیں، چنانچہ کبھی کبھار کوئی بھولا بھٹکا سیاح یہاں آتا بھی تو واپسی ٹپہ روانہ ہو جاتا کیونکہ اسے یہاں آدمی جیسی مخلوق تو نظر آتی لیکن دور دور تک آدمی نظر نہیں آتا۔ یوں بھی کسی کا بہ یک وقت شاعر یا ادیب ہونے کے ساتھ آدمی بھی ہونا ضروری نہیں۔ چنانچہ اکثر شاعروں اور ادیبوں کے اجتماع میں آدمی کم ہی نظر آتے ہیں یا بالکل نظر نہیں آتے۔ کہتے ہیں کسی بھی چیز کی بہتات اسے بے قدر کر دیتی ہے (اپنے یہاں بچے اور لیڈر اس کی زندہ مثال ہیں) اُردو نگر میں شاعروں اور ادیبوں کا یہی حال ہوا۔ ان کی بے قدری ملاحظہ فرمایئے ـــــــ نگر میں کسی کے ہاں بھی بیٹا بیٹی کا جنم ہوتا تو روایتی شاعروں اور ادیبوں کی فوج کی فوج اس مخصوص غریب خانہ کا محاصرہ کر لیتیں۔ اور پھر ملا جُلا مشاعرہ و ادبی اجلاس شروع ہو جاتا جو اکثر اس قدر طول پکڑ جاتا کہ آخری شاعر یا ادیب کے مائیک پکڑتے پکڑتے صاحب خانہ کے محل مبارک میں ایک اور ولادت کے نامبارک آثار نمودار ہو جاتے اور اسی بہانے یار لوگ دوسرے دور کا آغاز کر دیتے (پہلے یہ کارِ خیر درمیانہ مخلوق "عرف ہاں جی" انجام دیا کرتی تھی) یہی حال سورج کو چونچ میں پکڑتے ہوئے مرغوں عرف جدیدیوں کا تھا۔ اگر کسی نگر واسی کے ہاں موت واقع ہو جاتی تو غسالوں سے پہلے یہ حضرات پہنچ جاتے اور ایسی ایسی تجریدی ناقابل فہم اور ابہام آلودہ تخلیقات سناتے کہ پسماندگان میں سے کوئی نہ کوئی مرحوم کا ساتھ دینے کے لئے روانہ ہو جاتا۔ جب کسی نگر واسی کے بیٹا بیٹی ناطہ نواسی گھر سے فرار ہو جاتے تو اس کے رشتہ داروں اور دوستوں سے پہلے طنز و مزاح نگار اور نقاد حضرات دھڑے سے پہنچ جاتے اور اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھتے جب تک کہ گھر کی دوسری لڑکی یا لڑکا فرار نہیں ہو جاتا۔ بلکہ بعض اوقات تو مفرور لڑکی بدنصیب باپ خود فرار ہو جاتا۔ غرض خوشی کی کوئی تقریب، سوگ کی کوئی مجلس

ایسی نہ ہوتی جو ادیبوں اور شاعروں کی شرکت سے حادثے میں تبدیل نہ ہوتی ہو۔ زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں تھا جو اس ستم ہائے 'شعروادب' سے محفوظ رہا ہو۔ اگر دکاندار شاعر ہو تو صرف انہی گاہکوں کی مانگ پوری کرتا جو شعر کی زبان میں بات کرتے۔ ویسے بعض اوقات صرف مصرعوں سے کام چل جاتا۔ بشرطیکہ مصرع اپنی جگہ مکمل شعر کا لطف دیتے ہوں۔ مثال کے طور پر اگر کسی کو نمک کی ضرورت ہوتی تو وہ اس صورت میں نمک حاصل کر سکتا جب کوئی ایسا شعر یا مصرع سناتا جس میں نمک کا ذکر خیر ہو۔ نمونے کے لئے شعر ملاحظہ فرمائیں ؎

اد نمک پاش تجھے اپنی ملاحت کی قسم
بات تو جب ہے کہ ہر زخم نمکداں ہو جائے

برمحل شعر سنانا بجائے خود اس بات کی ضمانت ہوتا کہ آپ کی مُراد ضرور پوری ہوگی۔ یعنی ادھر آپ نے شعر یا مصرع عرض کیا ادھر داد کی شکل میں مطلوبہ شئے آپ کے جھولے میں —— قصّہ مختصر یہ کہ 'اردونگر' کے سارے کاروبار مطلع سے مقطع تک محدود ہو گئے۔ سارا نظام زندگی 'شعروادب' کے سانچے میں ڈھل کر آہستہ آہستہ صفحۂ قرطاس کی زینت بننے لگا —— !

اِدھر زمین کے یہ باسی شاعرانہ زمینوں میں زبانی ہل' چلانے اور افسانوی پلاٹوں پر خیالی عمارتیں تعمیر کرنے میں لگے تھے۔ ادھر تمام غیر شاعر و ادیب لوگ جو 'شعروادب' کے ہاتھوں تمام شعبہ ہائے زندگی کو یوں 'منظوم و منثور' ہوتا دیکھ کر گھبرائے ہوئے تھے' پیروں، فقیروں کے مزاروں اور جھاڑ پھونک کرنے والے گنڈہ بازوں کی طرف رجوع ہو گئے'، تاکہ ان چلتی پھرتی آفات و بلیات یعنی ادبا و شعرا و شاعرات کے 'شعروشر' دونوں سے خود کو بلکہ اپنی آیندہ نسلوں کو محفوظ رکھ سکیں۔ نگر کے لوگ اپنے گھروں کو بھوت پریت و دیگر شیطانی اثرات سے محفوظ رکھنے کے لئے عموماً مختلف قسم کے تعویذ پتے، اپنی چوکھٹوں سے لٹکایا کرتے۔ اب ان 'پلیتوں' میں 'دافع شعروادب قسم کے گنڈوں کا بھی اضافہ ہو گیا۔ اب گھر سے، ہر قدم نکالتے وقت دل ہی دل میں یہ آیت پڑھنے لگے —— اعوذ باللّٰہ من الشاعر والادیب الشیطان الرّجیم ——

ادیبوں اور شاعروں کی اس بہتات کا نتیجہ یہ ہوا ہے ادب کی حدود سے سامعین اور قارئین یوں غائب ہو گئے' جیسے مغرب میں عورت کے سر سے چوٹی اور مشرق میں غریب کی قسمت سے روٹی —— چنانچہ آئے دن نگر کے اخبارات میں اس قسم کے اشتہار شائع ہونے لگے ——

ضرورت ہے —— !

مارچ، اپریل ۱۹۹۰ء

ادارۂ بشیرہ عرق موقوعہ محلہ دودھ خانہ اللہ رکھی کے یومیہ طرحی مشاعرے کے لئے باذوق سامعین کی اشد ضرورت ہے، خواہش مند حضرات و خواتین فوراً ربط پیدا کریں۔

نوٹ: مستحق سامعین خصوصاً خواتین کی خدمت میں یک طرفہ سواری خرچ یعنی خرچہ آمد یا رفت گزرانا جائے گا ————

اس قسم کے اشتہارات کا ردعمل یہ ہوا کہ کچھ چلتا پرزہ تاجرانہ ذہنیت رکھنے والے ادبی تحصیلداروں نے سامعین سپلائینگ ایجنسیاں کھول لیں اور معقول معاوضہ کے عوض شاعروں اور ادبی اجلاسوں کے لئے مختلف معیار کے سامعین سپلائی کرنے لگے۔ ان ایجنسیوں کی دیکھا دیکھی جملہ سامان تقاریب سپلائی کرنے والی کمپنیوں نے اپنے کاروبار کو چمکانے کے لئے اس قسم کی اشتہار بازی شروع کر دی ————

جملہ سامان آرڈر بک کروانے پر کم از کم پانچ روز زیادہ سے زیادہ پچیس سامعین فری (سامعین کی تعداد کا انحصار آرڈر کی نوعیت پر ہوتا تھا) یہ کاروبار جلد ہی ٹھپ ہو گیا۔ کیونکہ ایک دو کے بعد ایجنسیاں اور کمپنیاں سامعین سپلائی کرتی تھیں۔ وہ شاعروں اور ادبی اجتماعات میں شرکت فرمانے کے بعد یا تو شاعر اور ادیب بن جاتے تھے یا پھر تارک الدنیا ہو جاتے تھے۔ البتہ جو اصحاب پوری کوشش کے باوجود نہ تو دنیا ہی ترک کرنے میں کامیاب ہوتے تھے اور نہ ہی شاعر یا ادیب بن سکتے تھے۔ وہ یا تو نقاد بن جاتے تھے یا پھر استاد شاعروں کی بے سرو پا شرحیں فرمانے لگتے تھے ———— ایسے ہی ایک بگڑے ہوئے شارح کے ہاتھوں مرزا غالب کے اسی شعر کی مٹی پلید ملاحظہ فرمایئے ؎

ہے کہاں تمنّا کا دوسرا قدم یارب
ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پا پایا

خود ساختہ شارح صاحب فرماتے ہیں ———— مرزا غالب جس ڈومنی پر سو جان سے فریفتہ تھے اس کا نام تمنّا تھا — مرزا جب کبھی اس سے ملنے اس کے ٹھکانے پہنچتے تو پتہ چلتا کہ وہ ابھی ابھی اپنے کسی اور چاہنے والے سے ملنے گئی ہے۔ چنانچہ مرزا دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر تمنّا کے نقش قدم کے سہارے اس کا تعاقب کرنے کی کوشش کرتے لیکن ہر بار ان کی یہ کوشش ناکام ثابت ہوتی کیونکہ انھیں تمنّا کے صرف ایک ہی پاؤں کا نشان نظر آتا۔ دوسرے پاؤں کا نشان دور دور تک نظر نہیں آتا۔ ایک دن بے بس ہو کر مرزا نے یہ مصرع موزوں فرما دیا کہ ؎ ہے کہاں تمنّا کا دوسرا قدم یارب

مرزا غالب دراصل اس امر سے لاعلم تھے کہ ان کی چہیتی ڈومنی تمنّا خانم کی صرف ایک ہی ٹانگ ہے۔ اور دوسری ٹانگ درحقیقت لکڑی کی مصنوعی ٹانگ ہے اور ظاہر ہے کہ لکڑی کی مصنوعی ٹانگ کا نشان

اصلی پاؤں کے نشان سے قطعی مختلف ہوتا ہے، چنانچہ مرزا تھک ہار کر مصرعہ ثانی فرماتے ہیں۔

ہم نے دشت امکاں کو ایک نقش پا پایا

اس سے پہلے کہ "اردو نگر" کی تاریخ اپنے آپ کو دہراتی۔ یعنی شاعر و ادیب عوام کی بڑھتی ہوئی بے چینی کسی بیرونی طاقت کو یہ دعوت دیتی کہ تشریف لاکر برسوں پہلے دہرائے ہوئے سبق کو پھر سے دہرایئے۔ نگر کے ارباب حل و عقد نے اس "عقد ثانی" کے خطرے کی بو سونگھتے ہی اپنی اپنی "گدیوں" اور "گدّیوں" کی سلامتی کے لیے "درخت گراؤ" "گھاس بڑھاؤ" "مچھر پالو مکھی پالو" جیسی اہم اور قومی مہمات کو بالائے طاق رکھ کر "انسداد شعر و ادب" کا "بیڑا" اٹھا کر منھ میں رکھ لیا

اس سلسلے میں سب سے پہلے عوام کے نمایندوں سے راست ربط قائم کیا گیا تاکہ ارباب حکومت کو صحیح صورت حال کا علم ہو سکے۔ کیونکہ اس دوران بیشتر ارباب حکومت اپنے اپنے قلم دانوں بالفاظ دیگر پچھوں ا؛ رخاندان سمیت غیر ملکی دوروں میں مصروف تھے تاکہ بیرونی دنیا سے "اردو نگر" کے تعلقات بہتر سے بہتر بنا سکیں۔ عوام کے نمایندوں نے جتنا زہر اُگلا تھا، اگلا یہ کہ یہاں تک کہہ دیا کہ اگر "شعر و ادب" کے اس فتنے کو فوری طور پر نہیں کچلا گیا تو پھر مستقبل قریب میں ارباب حکومت کا قافیہ تنگ ہو سکتا ہے، ارکان حکومت کے "بحر" اور "وزن" میں فرق آسکتا ہے۔ چنانچہ ارباب حکومت نے فوراً اپنی 'بحروں' کو مضبوط اور مستحکم کر کے پُورے 'وزن' کے ساتھ اپنی اپنی گدیوں اور کرسیوں کو سنبھالا پھر "کابینہ" کا ایک ہنگامی "ہنگامہ" کھڑا کیا یعنی ہنگامی اجلاس بلایا جس میں کافی اونچ نیچ اور ڈھیل کھینچے کے بعد "بل" پاس کیا گیا جس کی رو سے اردو نگر کی حدود میں 'تخلیق شعر و ادب' پر ٹیکس لاگو کر دیا گیا۔

اس سلسلے میں حد بہ مقرر کی گئی کہ سالانہ پچیس سے زائد افسانے و مضامین لکھنے والے ادیبوں اور پچاس نظموں و غزلوں سے زیادہ عرض کرنے والے شاعروں پر "بسیار نویسی" ٹیکس لازمی قرار دیا گیا۔ البتہ اس حد کے اندر رہ کر 'مشق سخن' کرنے والے اُدبا و شعراء اس ٹیکس سے مستثنیٰ تھے ——————

اس نئے ٹیکس کے خلاف شعر و ادب کے چند نمایندوں نے اپنے غم و غصہ کا اظہار یوں کیا کہ ادیبوں نے نگر کی دیواروں پر مختصر طویل افسانے مضامین رقم کیے اور شاعروں نے اپنے کلام بے لگام زیور طبع سے آراستہ کر کے ان دیواروں کو تباہ کر دیا۔ اس انوکھے احتجاج پر جب ارباب حکومت نے کوئی نوٹس نہیں لیا تو ترسیل کے اس المیئے نے ادبا و شعراء برادری میں مایوسی کی لہر دوڑا دی۔ اس پر بقول کسے مرے کو مارے شیخ مدار' جن نمایندوں نے حکومت کے اس اقدام کے خلاف منھ کھولا تھا ان میں سے چند ایک کا منھ پھر کے خاموش کر دیا گیا۔ کچھ کا منہ بھر دیا گیا۔ اور جو ذرا زیادہ اصولی نظر آئے، ان کا منہ بند

کرنے کے لیے انھیں خود بند کر دیا۔ نتیجۃً اس سال شعر و ادب کی پیداوار کی رفتار خاصی سست رہی لیکن جتنی بھی تخلیقات منظر عام پر آئیں ان میں سربراہان حکومت کو انقلابی رنگ نمایاں نظر آیا بلکہ سونگھنے پر بغاوت کی "بُو" بھی محسوس ہوئی۔ چنانچہ تمام شاعروں اور ادیبوں پر ہر تخلیق کے نزول کے بعد قریبی تھانوں میں حاضری لازمی قرار دی گئی، جہاں اسپیشل آفیسرز کی حیثیت سے 'شعر و ادب' کے ایسے ریٹائرڈ نقادوں کا تقرر کیا گیا جو قلم کو قصائی کا چھرا اور تنقید کو عمل جراحی' سمجھتے تھے۔ وہ اپنے بکے ہوئے اذہان کے ساتھ ہر تخلیق میں 'قابل تعزیر' 'نکات' تلاش کرتے نہ ملنے کی صورت میں اپنی طرف سے پیدا کرتے تاکہ گرفت میں آئے ہوئے ادیب یا شاعر کا کچھ روز سرکاری مہمان خانے میں قیام واجب ہو جائے۔ سرکاری اعزازات کے عوض بکے ہوئے ایسے ہی کچھ اور ذہنوں کو یکجا کر کے حکومت نے ایک ایسے بورڈ کی تشکیل دی جس کا کام صرف ادیبوں اور شاعروں میں پھوٹ ڈلوانا تھا۔ اس بورڈ کی چند فتنہ پردازیاں ملاحظہ فرمایئے۔ نگر کے کسی نامور ادیب یا شاعر کا نام کسی ادیبہ یا شاعرہ کے ساتھ منسلک کر دیا تو کسی کا نام کسی عطار کے لونڈے کے ساتھ جوڑ دیا۔ شاعروں میں کسی استاد شاعر کے مصرع میں الف گروا دیا۔ کسی کے پورے کے پورے شعر کو خارج از بحث ثابت کر دیا۔ فتنہ پردازوں کے اس 'بلینک بورڈ' کے مشورے پر ارباب حکومت نے ایک اور بل پاس کیا جس کی رو سے یہ پابندی عاید کر دی کہ 'اردو نگر' کی حدود میں کوئی بھی شاعر یا ادیب اپنے خیال کو اس وقت تک تحریر یا تقریر میں منتقل نہیں کر سکتا جب تک فتنہ پردازوں کے بورڈ سے اجازت نہیں حاصل کر لیتا۔ اس سلسلے میں چھپے ہوئے فارم بلدیہ کے دفتر اور اس کی تمام شاخوں پر رکھوا دیے گئے۔ لیکن ابتدا میں ارباب حکومت کو بڑی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ کیونکہ اردو شاعر و ادیب چاہے ہم خیال ہوں نہ ہوں لیکن ان کی اکثریت ہم نام اور ہم تخلص ضرور ہوتی ہے، چنانچہ پہلے تو ایسے تمام ہم نام و ہم تخلص شاعروں اور ادیبوں کو آپس میں خود ہی نمٹ لینے کی مہلت دی گئی، لیکن جب اس سلسلے میں سینیئر اور جونیئر شعرا و ادبا میں سر پھٹول ہونے لگا اور داخلی امن کو خطرہ لاحق ہونے کا اندیشہ کھڑا ہو گیا تو حکومت کی طرف سے جونیئر شاعروں و ادیبوں کے نام نوٹس جاری کیے گئے کہ اندرون ایک ہفتہ اگر انھوں نے اپنے نام اور تخلص تبدیل نہیں کیے تو ان کے خلاف قانونی چارہ جوئی کی جائے گی۔ نتیجۃً بیشتر جونیئر حضرات نے نہ صرف نام اور تخلص ہی ترک کر دیے بلکہ شعر و ادب سے بھی ناطہ توڑ لیا۔ اس کامیابی پر "اینٹی شعر و ادب" اقدامات میں اور بھی شدت آ گئی۔ اب بڑے پیمانے پر "فیملی پلاننگ سنٹر" کے تحت "اینٹی شعر و ادب سنٹر" کھولے گئے۔ ان شعبوں میں خاص طور سے ان اصحاب کا تقرر کیا گیا جو پشتوں سے شعر و ادب کے ستائے ہوئے تھے۔ پھر کیا تھا دیکھتے ہی

دیکھتے دیکھتے جنبش قلم شاعری و ادب کا بیدردی سے قتل عام ہونے لگا۔ ان سینیئروں کی مہربانی سے بس اسٹانڈوں، پارکوں و دیگر پبلک مقامات پر جہاں کل تک یہ تحریریں آویزاں نظر آتی تھیں

جیب کتروں اور اٹھائی گیروں سے ہشیار ——— !

یہاں تھوکنا اور گندگی پھیلانا منع ہے ——— !

وہاں ان نئی تحریروں کا اضافہ ہوگیا ———

شاعروں اور ادیبوں سے ہشیار ——— !

یہاں شعر و ادب کی بات کرنا سخت منع ہے ——— !

اسی طرح ہوٹلوں وغیرہ میں جہاں کل تک صرف یہ نوٹس نظر آتے تھے ———

ہوٹلوں میں پی کر آنے کی سخت ممانعت ہے ——— !

براہ کرم سیاسی گفتگو مت کیجئے ——— !

وہاں یہ نئی تحریریں جلی حروف میں نظر آنے لگیں ———

شاعروں اور ادیبوں کا داخلہ ممنوع ہے ——— !

براہ کرم ادبی گفتگو مت کیجئے ——— !

ارباب حکومت کے اس رویئے نے مقامی طور پر شاعروں اور ادیبوں کا مقام اس قدر گرا دیا کہ عام لوگ اب اپنے بچوں کی کسی بے ہودہ حرکت پر یوں سرزنش کرتے ——— لونڈا ہاتھ سے نکل گیا' بالکل شاعر و ادیب ہوگیا ہے ——— گویا کسی کو شاعر و ادیب کہہ دینا بہت بڑی گالی کے مترادف ہوگیا۔ لوگ اپنے بال بچوں کو شاعروں اور ادیبوں کے سائے سے بھی بچانے لگے۔ نوجوان لڑکیاں آپس میں بھی لڑتیں یہی کوسنے دیتیں——— خدا کرے تیری شادی کسی شاعر یا ادیب سے ہوجائے پھر معلوم ہوگا تجھے آٹے دال کا بھاؤ ———

ارباب حکومت کے ان سخت اقدامات نے اگرچہ شاعروں اور ادیبوں کی کمر توڑ دی تھی لیکن یہ چونکہ وہ مخلوق ہے جو گرتی بھی ہے تو اس کی ٹانگ اوپر کو ہوتی ہے اس لئے جنادری قسم کے ادیب و شاعر انڈر گراونڈ ہو کر ایسے ایسے انقلابی قسم کے شعری اشری شوشے چھوڑنے لگے جو داخلی امن میں خلل کا باعث بن گئے۔ چنانچہ عوام الناس کے سلوک کو برقرار اور داخلی امن کو بحال رکھتے ہوئے ارباب حکومت نے مجبوراً ہنگامی حالات کا اعلان کردیا۔ اس سلسلے میں پہلا قدم یہ اٹھایا گیا کہ دو یا دو سے زائد شاعروں و ادیبوں کے اجتماع پر امتناع عائد کردیا گیا جس کے نتیجہ میں کھلے عام منعقد کئے جانے والے شاعرے و ادبی

اجلاس ٹھپ ہو گئے۔ اس طریق سے مطمئن ہونے کے بعد تمام انڈر گراؤنڈ ادیبوں و شاعروں کو زمین کھود کر نکالا گیا۔ پھر انھیں ایک غیر معینہ مدت کے لئے نظر بند کر دیا گیا۔ اب بڑے پرانے پرانے جغادری حضرات کے شاگردوں یعنی چھوٹے موٹے ادیبوں اور شاعروں کی گرفتاریاں عمل میں آئیں۔ اس سلسلے میں شاعروں اور ادیبوں کی مخصوص ہیئت کذائی کی وجہ سے پولیس کو انھیں گرفتار کرنے میں بڑی مدد ملی یعنی جو بھی لمبے لمبے بالوں والا نحیف و ناتواں میلا کچیلا شخص نظر آتا اسے فوراً شبہ میں دھر لیا جاتا اس اندھا دھند پکڑ دھکڑ کو دیکھ کر کئی نو مشق شاعروں اور ادیبوں نے شعر و ادب سے توبہ کر لی اور دوبارہ آدمیت کے جانے میں آگئے!

ان گرفتاریوں اور پکڑ دھکڑ کے بعد کچھ دنوں تک نگر میں امن و امان بحال رہا لیکن جیسے ہی ایمرجنسی اٹھائی گئی نگر کے مختلف گوشوں سے پھر اس فتنے کے سر اٹھانے کی اطلاعات موصول ہوئیں۔ اس مرتبہ یہ فتنہ دراصل ان سابقہ شاعروں اور ادیبوں نے کھڑا کیا جنھیں ارباب حکومت نے اس لئے معاف کر دیا تھا کہ وہ تائب ہو چکے تھے۔ اس طرح ان شاعروں اور ادیبوں نے یہ ثابت کر دیا کہ چور چوری سے جاتا ہے ہیرا پھیری سے نہیں۔ اس مرتبہ ارباب حکومت کے قدم اٹھانے سے پہلے عوام کے ایک طبقے نے اس فتنے کا سر کچلنے کے لئے ستیہ گرہ کا آغاز کر دیا۔ 'غریبی ہٹاؤ' کے وزن پر شاعری ہٹاؤ' 'ادب کو جلاؤ'، قسم کے نعرے گڑھے گئے، بلکہ ان پر عمل بھی کیا گیا۔ یعنی جگہ جگہ اساتذہ کے دواوین اور نگر کے چند عظیم ادیبوں اور شاعروں کے پتلے بھی نذر آتش کئے گئے ——— بلکہ دو ایک جگہ تو کچھ شاعروں کو بھی بہ نفس نفیس نذر آتش کرنے کی کوشش کی گئی لیکن پولیس کی بر وقت مداخلت نے ان شاعروں کو 'ستی' ہونے سے بچا لیا ———

عوام کی اس بے چینی کو دیکھتے ہوئے ارباب حکومت نے بالآخر ایک ایسا بل پاس کیا جس کی رو سے "اردو نگر" میں شعر و ادب کی تخلیق تعزیری جرم قرار دی گئی۔ فنکار شعر و ادب کے خلاف حکومت کی زنبیل میں یہ آخری حربہ تھا۔ چنانچہ تمام نمائشی شاعر و ادیب ہمیشہ ہمیشہ کے لئے تائب ہو گئے، اور ایسے شعرا و ادبا، جو کمبل تو چھوڑنا چاہتے تھے لیکن کمبل جنھیں نہیں چھوڑتا تھا وہ مجبوراً ہجرت کر گئے اور ان کے ساتھ ہی 'اردو نگر' سے شعر و ادب بھی ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گیا ———

انا للہ و انا الیہ راجعون ——— خدا غریق رحمت کرے بہت سی خوبیاں اور خامیاں تھیں مرنے والے میں ——— !

سُنا ہے 'اردو نگر' میں اب مکمل امن و امان ہے۔ البتہ راوی کا بیان ہے کہ وہاں اب زندگی جس قدر بے رنگ ہے بے کیف ہے اتنی پہلے کبھی نہیں تھی ——— □

مجموعی طور پر تنقیدی تناظر مختلف النوع موضوعات پر زنگا رنگ مضامین کا مجموعہ ہے۔ اس کا مطالعہ مصنف کے تنقیدی نقطۂ نظر کو سمجھنے کے لئے ناگزیر ہے۔

——— ابوالکلام قاسمی

تصورات عشق و خرد اقبال کی نظر میں ● ڈاکٹر وزیر آغا ● اقبال اکادمی پاکستان، لاہور ● ۳۵ روپے

ڈاکٹر وزیر آغا ایک بار پھر ایک ناقابل فراموش تصنیف اپنے قارئین کے لئے منظر عام پر آئے ہیں۔ اقبال پر وہ اس سے پہلے بھی مضامین کی شکل میں لکھتے رہے ہیں لیکن "اوراق" کا جدید نظم نمبر شایع کر کے انھوں نے اقبال سے اپنی اور جدید پاکستانی شعری سماج کی غیر معمولی وابستگی کا ثبوت دیا تھا، اور اب اس کتاب کی اشاعت کے ذریعہ انھوں نے اپنے عمیق فکری رجحانات کا ثبوت دیا ہے۔ اس تصنیف کے ذریعہ اس امر کے بارے میں شرح صدر ہوتی ہے کہ ان کی شعری روایات کا ماخذ ان کی اپنی اقدار اور اپنا نظام حیات ہے۔ اعتماد و ایقان کا اعلان اس بار زیادہ واضح انداز میں ہوا ہے۔ ہم اس مستحسن اقدام کا خیر مقدم کرتے ہیں۔

"تصوراتِ عشق و خرد اقبال کی نظر میں" مربوط اور جامع تصنیف ہے۔ اس میں ڈاکٹر وزیر آغا کی پچھلی اہم تصنیفات "اردو شاعری کا مزاج" اور "تخلیقی عمل" کا پرتو جھلکتا ہوا نظر آتا ہے۔ اس طرح وہ اب تک شعر و ادب اور اس کی تخلیق کے بارے میں جس نادیدہ نظر سے سوچتے رہے ہیں، پیش نظر کتاب اس کی توسیع بن جاتی ہے۔ فکر و اظہار کا تسلسل سنجیدہ و باوزن نقاد کا نمایاں وصف ہوتا ہے۔ لحظہ لحظہ کروٹیں بدلنے والا نقاد خس و خاشاک کی طرح کنارے کنارے سطح آب پر بہتا رہتا ہے اور فکر کی پہنائیوں کی غواصی نہیں کر پاتا۔ اس کتاب کا مطالعہ کرتے ہوئے ہمیں وزیر آغا کے وسعت مطالعہ کا اعتراف کرنا پڑتا ہے پھر ان کے استنباطات ہمیں اسی طرح متاثر کرتے ہیں جیسے وہ چاہتے ہیں۔

بنیادی طور پر یہ کتاب دو حصوں میں منقسم ہے۔ پہلا حصہ اقبال کے تصورات کے پس منظر سے متعلق ہے۔ یہ حصہ پھر دو ذیلی حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلا ذیلی حصہ یورپی پس منظر اور دوسرا ذیلی حصہ اسلامی پس منظر پر محیط ہے۔ ان میں غالب بحث فلسفیانہ افکار سے متعلق ہے، البتہ پہلے ذیلی حصہ میں وہ فرائڈ اور ینگ (جسے ڈاکٹر وزیر آغا ژنگ لکھتے ہیں) کو نظر انداز نہیں کر سکے ہیں۔ اس ذیلی حصہ کا سب سے بڑا وصف یہ ہے کہ اس میں مصنف نے دلائل و براہین سے یہ ثابت کیا ہے کہ اقبال نے مغرب سے استفادہ ضرور کیا ہے لیکن ان کے افکار وہاں سے مستعار بہرحال نہیں تھے۔ دوسرے ذیلی حصہ میں انھوں نے مسلمانوں کے فکر و فلسفہ کے سرمایہ کو بہت اختصار کے ساتھ لیکن بے حد جامع انداز میں متعارف کرایا ہے۔ یہاں انھوں نے اقبال کے نظریاتی و فکری ماخذ انتہائی عالمانہ انداز میں تلاش کئے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ضمنی طور پر انھوں نے مسلم فلاسفہ کے یونانی فلاسفہ (مغربی فلاسفہ کا دور مسلم فلاسفہ کے بعد آتا ہے) سے اختلافات و انحرافات کو بھی واضح کیا ہے۔ اس باب کے پس منظر میں ہی اقبال کے تصورات عشق و خرد کو سمجھا جا سکتا ہے۔ چنانچہ دوسرا باب خرد کی اہمیت اور عشق کا مقام کے دو ذیلی ابواب میں منقسم ہے۔ نہ معلوم جدلیاتی مادیت کے علمبرداروں کو اس کی ضرورت کیوں لاحق ہوگئی کہ وہ اقبال کو خرد دشمن

ثابت کریں۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے بڑی سلیقہ مندی کے ساتھ یہ واضح کیا ہے کہ اقبال خرد کی اہمیت کے معترف تھے لیکن اس کی کچھ حدود ہیں جن کے تعین کی ہر دور میں کوشش کی گئی ہے۔ اقبال نے یہ تعین اپنے ایمانی و فکری نظام کے تناظر میں کیا ہے، جو خود اپنی حیثیت میں مستدل ہے۔ دوسرے ذیلی باب میں عشق کے فکری نظام کو پیش کیا ہے لیکن میرے نزدیک اس باب کی ندرت یہ ہے کہ وزیر آغا نے اس میں عشق پر تخلیقی عمل کے منبع کی حیثیت سے بحث کی ہے۔ اختتامیہ حسب معمول تمام مباحث کا خاتمۂ کلام ہے۔ جدید مغربی معیار کتب کے مطابق اس کتاب کے آخر میں کتابیات اور اشاریہ اور روایتی اردو کتب کے حسب حال اغلاط نامہ شامل ہے۔

کتاب ٹائپ میں چھاپی گئی۔ کاغذ اور جلد عمدہ و خوبصورت ہے۔

دیکھئے ایسی بھرپور کتاب آیندہ پھر کب لکھی جائے گی۔

—— ابنِ فرید

ادب اور لاشعور ● ڈاکٹر سلیم اختر ● مکتبہ عالیہ، لاہور ● قیمت ۱۳/۵۰ روپے

ڈاکٹر سلیم اختر کے بارے میں ڈاکٹر وزیر آغا نے اس کتاب کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ "پروفیسر سلیم اختر نفسیات کے طالب علم ہیں" لیکن حقیقت یہ ہے کہ موصوف اردو کے استاد ہیں اور انھوں نے اپنے علم و ادب کا وسیع تر قرطاس پر مطالعہ کرنے کے لئے نفسیات کا بالاستیعاب مطالعہ کیا اور بین العلومی مطالعہ کی ایک جہت کو اپنے لئے مختص کر لیا۔ 'لاشعور' جو کتاب کے نام کا ایک جزو ہے نفسیات کے ایک مخصوص مکتبۂ فکر کی نمائندگی کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔ اس نفسیاتی مکتبۂ فکر سے فرائڈ اور ینگ انھیں سب سے زیادہ دعوت شوق دیتے ہیں۔ اس لئے ہمیں ان کی نفسیاتی تنقید کا اسی زاویہ سے مطالعہ کرنا ہوگا۔

ڈاکٹر سلیم اختر نے ادب و لاشعور میں زیادہ تر بنیادی مسائل سے بحث کی ہے، مثلاً ادب کیا نہیں؟ تخلیقی محرکات و تخلیقی عمل، ادب اور فحاشی، تخلیق کار کی ابنارملٹی، ادب اور ابلاغ، ادب اور اخلاقی اقدار، تنقید اور لاشعور، غزل: تخلیقی عمل کا نفسیاتی مطالعہ، مرثیہ اور کتھارسس، انشائیہ اور انسانی سائیکی، مصوری اور اعصابی خلل وغیرہ۔ مجموعی طور پر اس کتاب میں اٹھارہ موضوعات پر چھوٹے بڑے مقالات ہیں اور ہر مقالہ میں اپنے موضوع سے پوری طرح انصاف کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ بعض مقامات پر اختلاف کی گنجائش پیدا ہو جاتی ہے مثلاً ادب کو مرض تصور نہ کرنا لیکن نفسی پیچیدگیوں کی آماجگاہ تصور کرنا، اخلاقی اقدار کو انفرادی نفسی تشکیل سے غیر متعلق تصور کرنا یعنی اضافی قرار دینا وغیرہ۔ مگر یہ اختلافات وہ ہیں جو اس صورت میں پیدا ہوتے ہیں کہ ہم یہ فراموش کر دیں کہ ڈاکٹر سلیم اختر نے شعوری طور پر تحلیل نفسی اور تجزیاتی نفسیات میں مطالعاتی اختصاص کو اپنایا ہے۔

ڈاکٹر سلیم اختر چونکہ بنیادی طور پر اردو کے منتہی ہیں اس لئے وہ تحلیل نفسی اور تجزیاتی نفسیات کے ساتھ ساتھ ان رموز سے بھی واقف ہیں جو اہل ادب کے لئے مخصوص ہیں یعنی ادب سے کس حد تک اور کس نوعیت سے استفادہ کرنا چاہیئے۔ ادب کو زیادہ اسطوری اور لاشعوری تہہ داری عطا کرنے کے لئے وہ نفسیات میں بھی ینگ کی تجزیاتی نفسیات کو عموماً ترجیح دیتے ہیں۔ ادب کا اس نوعیت کا مطالعہ نہ صرف اپنے اندر غیر معمولی کشش رکھتا ہے بلکہ مختلف علوم کے درمیان نقطۂ اتحاد بھی فراہم کرتا ہے اور غور و فکر کے نئے زاویے روشن

کرتا ہے

نفسیاتی دبستان تنقید میں ڈاکٹر سلیم اختر اپنا ایک خاص مقام رکھتے ہیں۔ ان کی سی بالیدگی نظر ان کے ہم عصر نقادوں میں کم ہی لوگوں کو نصیب ہے۔ پیش نظر مجموعہ ان کی بہت اچھی نمایندگی کرتا ہے۔

ـــــ ابن فرید

تاریخ ادبیات تاجکستان

• مصنف : یرژی بیچکاں، مترجم : کبیر احمد جائسی • انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی • ۱۳ روپے

ایک زمانہ وہ تھا جب اردو کے تذکرے بھی فارسی میں لکھے جاتے تھے اور اب یہ وقت آیا ہے کہ اہلِ اردو فارسی ہی سے تقریباً نابلد ہو گئے ہیں۔ اس کے باوجود فارسی کے چند بالغ نظر اور سنجیدہ فکر عالم اردو اور فارسی کے رشتہ و تعلق قایم رکھنے کی سعی کر رہے ہیں۔ ان صاحب علم اہل قلم میں ڈاکٹر کبیر احمد جائسی نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ تاجیک ادب ہمارے لئے غیر متعارف سرمایہ ہے۔ ہم نے اس کے بارے میں کبھی اس طرح نہ سوچا کہ یہ لائق اعتنا بھی ہے۔ ادھر چند برسوں میں پروفیسر نذیر احمد، پروفیسر امیر حسن عابدی اور ڈاکٹر سمیع الدین احمد وغیرہ نے اپنے وقیع مقالات کے ذریعہ ہماری توجہ کے انعطاف کا سامان فراہم کیا لیکن یہ تشنگی پھر بھی رہی کہ ہم تاجیک ادب سے کسی مربوط تاریخ کی کتاب کے ذریعہ متعارف ہوں۔ اس کمی کو ڈاکٹر جائسی نے اپنی زیر تبصرہ کتاب کے ذریعہ پورا کر دیا۔

تاجیک دراصل فارسی دری ہے جو بیدل جیسے شاعر کی زبان ہے جسے (بیدل کو) غالب نے اپنا آئیڈیل بنایا تھا۔ یان ریپکا نے جب اپنی کتاب 'فارسی ادب کی تاریخ' (انگریزی) مرتب کی تو اس میں تاجیک ادب پر ایک باب یرژی بیچکاں سے لکھوایا۔ ڈاکٹر جائسی نے اسی باب کا ترجمہ اردو میں کیا اور کتابی شکل میں شایع کرایا ہے۔ "تاریخ ادبیات تاجکستان" اوسط حجم کی مفصل اور جامع تاریخ ہے۔ اس کی سب سے اہم انفرادیت یہ ہے کہ اس میں تاجکستان کی سیاسی و معاشرتی تاریخ کے پس منظر میں ادبی تاریخ کا مطالعہ کیا گیا ہے۔ اکتوبر انقلاب سے قبل کی مفصل تاریخ اشتراکی فلسفۂ تاریخ کے زاویۂ نظر سے اور اس کے بعد تاجیک ادب کی تیز رفتار ترقی اور اس کے وسائل ابلاغ میں وسعت کا تذکرہ انتہائی رجائی انداز میں کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر جائسی نے ترجمہ اس قدر حسن و خوبصورتی کے ساتھ کیا ہے کہ عبارت کی روانی ترجمہ کا شبہ نہیں ہونے دیتی۔

اس کتاب کا مطالعہ کرتے ہوئے مجھے اپنا ایک تجربہ یاد آ گیا۔ اب سے قیاساً پندرہ سال پہلے جدید ایرانی شاعر اسمٰعیل شہرودی سے دوران گفتگو میری زبان پر کہیں 'سبک ہندی' کا نام آ گیا۔ شہرودی فوراً چونک اٹھے اور بڑی شدومد کے ساتھ استرداد کیا کہ اس طرح کا کوئی سبک نہیں ہے اور لیجئے بیچکا نے اپنے اس مقالہ میں سبک ہندی کے نام سے کئی صفحے رنگ ڈالے ہیں۔

"تاریخ ادبیات تاجکستان" اردو میں بین الاقوامی ادب کے سرمایہ میں لائق اعتراف اضافہ ہے۔ انجمن ترقی اردو (ہند) نے اسے شایع کر کے ایک بہت بڑی کمی پوری کر دی۔

ـــــ ابن فرید

اقبال: روشنی کی جمالیات • ڈاکٹر شکیل الرحمن • پنجابی پُستک بھنڈار، دہلی • ۱۰ روپے

ڈاکٹر شکیل الرحمن ہمارے جانے پہچانے نقادوں میں سے ہیں ؛ ان کا نام آتے ہی دو تاثرات میرے ذہن میں ابھرتے ہیں : تیز رفتار رواں عبارت اور اساطیر کی تہوں میں اترتی ہوئی ہمارے ماضی کی جڑیں، جن سے ہمارے نقوش اوّلیں (ARCHETYPES) تیار ہوتے ہیں۔ یہ سارا قرطاس ینگ کی تجزیاتی نفسیات سے مرصع ہوتا ہے چنانچہ رنگ و نور کے امتزاج سے جو پیکر تیار ہوتے ہیں ان کو حیاتی و جذباتی سطحوں پر ڈاکٹر شکیل الرحمن نے آشکارا کیا ہے۔ نفسیات جمال کی یہ ایک ایسی رسائی (APPROACH) ہے جس کی طرف ہمارے اہل نظر حضرات نے کم ہی توجہ دی ہے۔ پھر اقبال کا ایک نوعیت کا مطالعہ تو شاید پہلی بار کیا گیا ہے۔ اس کتاب کا انداز غالب تر توضیحی و تشریحی ہے۔ اقبال فہمی میں اس سے خاطر خواہ فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔

اسٹار پبلی کیشنز لمیٹڈ نے اچھے کاغذ پر خوبصورت جلد کے ساتھ مایوس کن حد تک بھونڈی چھپائی اور زیادہ قیمت کے ساتھ اس کتاب کو پیش کر کے اردو کی بے بسی کا خاصا احساس دلایا ہے۔

——— (ابنِ فرید)

چشمِ خوں بستہ • انجم جمالی • ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ • ۱۰ روپے

اس کتاب کا مطالعہ کرتے ہوئے میری نظریں اچانک ان سطروں پر ٹھہر گئیں "اگر حالات نے پلٹا کھایا تو شاید کینسر ہی کسی مصیبت سے بچا سکے، جی ہاں کینسر جو عرصہ ۹ ماہ سے میرے گلے کا ہار ہے اور فی الحال صورتِ حال یہ ہے کہ کھانے کے لئے ناک میں نلی اور سانس کے لئے گلے میں، اب تو ہر بات کاغذی ہے" اور اس کے بعد یہ شعر ؎

نہ کتابیں، نہ رسائل نہ تقاریر کے ٹیپ کون دے گا مری برسوں کی ریاضت کا ثبوت

عجب دل گرفتگی کی کیفیت پیدا ہو گئی۔ انجم جمالی اس عالم میں بھی اپنا "ٹوٹا ہوا آئینہ" اردو نواز قاری کے سامنے رکھ رہے ہیں۔

انجم جمالی مزاجاً کلاسیکی رنگ کے شاعر ہیں۔ ان کی لفظیات اور تراکیب، ان کی علامات و رموز میں وہ تمام لوازم نمایاں ہیں جنھیں اب تک غزل کی آبرو تصور کیا جاتا رہا ہے۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ گذشتہ پچیس سال کی مشق سے ان کا ایک مزاج بن گیا ہے جو اس نوعیت کے استعارے سے جھلکتا ہے :

ہر ایک سمت تیرگی تھی جادۂ حیات میں کہاں کہاں جلاؤں ایک چراغ سوچتا رہا
رکھ گیا کوئی سرِراہ امیدوں کا چراغ اب کوئی حادثہ گذرے تو ادب سے گذرے
خود ہی ہو جائے گا ہر خوابِ زلیخا نیلام اور کچھ دن جو نہ یوسف کے خریدار ملے
رات کچھ یادوں نے دستک دی تو تھی پچھلے پہر کیا بتائیں کب کھلا کب بند دروازہ ہوا

یہ ٹھہرا ٹھہرا اور دھیما انداز جو اپنے اندر انجم جمالی کی شخصیتی گداز گی بھی رکھتا ہے ان کے کلام میں خاصا پر اثر

سوز پیدا کر دیتا ہے ۔ یہی ان کے اشعار کی خوبی ہے ۔ انھوں نے آزاد نظمیں بھی کہی ہیں جن میں "خواب پریشاں" "ایل پر تاب" اور "مطرب خوش نوا" اچھی نظمیں ہیں لیکن پھر بھی غزلوں کے مقابلے میں دبتی ہیں ۔

"چشم خوں بستہ" انجم جمالی کے گذشتہ دو تین سال کے کلام کا انتخاب ہے جو ہر نوع مطالعہ کا مستحق ہے

ــــــ ابن فرید

اعراض ● رئیس مالیگانوی ● جمال پبلی کیشنز، مالیگاؤں ● ۱۰ روپے

'اعراض' کے مطالعہ میں سب سے بڑی دشواری جو پیش آئی وہ شروع و آخر میں عبدالمجید سرور کی رہبری کرنے والی تحریروں کی وجہ سے ہوئی ۔ ہر بار نہ معلوم کیوں یہ احساس ہوتا تھا کہ جیسے یہ مجموعۂ کلام نہیں جدیدیت کے خلاف جنگ کا اعلامیہ ہے ۔ منفی اور جہری (VOCAL) تحریروں سے ویسے ہی طبیعت اوبتی ہے، پھر پورے کا پورا مجموعہ کلام کیسے برداشت کیا جائے ۔ فنا پذیر (EPHIMERAL) مسائل کو چسپاں کر لینے کا حشر یہی ہوتا ہے ۔

رئیس مالیگانوی کہنہ مشق شاعر ہیں ۔ ان کا بنیادی رنگ کلاسیکی ہے لیکن انھوں نے شعوری طور پر جدید بندش زبان کو اختیار کرنے کی کوشش کی ہے ۔ بیشتر وہ کامیاب رہے ہیں لیکن کہیں کہیں وہ لڑکھڑا بھی گئے ہیں ۔ وہ اگر اس رنگ کو اعتماد کے ساتھ اہمیت دیں جو ان کا مزاج بن چکا ہے تو بہت اچھے شعر کہہ سکتے ہیں ۔ ویسے اعراض میں اچھے شعروں کی کمی نہیں ہے ۔

ہم سے دیوانے کہاں اور ملیں گے یارو
اپنے پیکر سے صلیبوں کو سجا رکھا ہے

اکثر بجھے ہیں وقت کی ہلکی سی پھونک سے
طوفان زندگی میں سنبھلتے ہوئے چراغ

ایک چہرے سے ریاکاری نمایاں ہو گئی
اور کچھ چہرے لگا لو بندگی کے واسطے

ہم اسیران چمن کے حوصلوں کو دیکھ کر
اور بھی اونچی ذرا دیوار زنداں کیجئے

دامن صبر میں اشکوں کو چھپانا ہے کمال
بوند گرتی ہے صدف میں تو گہر ہوتی ہے

'اعراض' رئیس مالیگانوی کے صرف دو سال کے کلام کا مجموعہ ہے جس کا سرورق سلطان سبحانی نے بہت خوبصورت بنایا ہے ۔ طباعت اور گٹ اپ بھی معیاری ہے ۔

ــــــ ابن فرید

شمع فروزاں ● عروج زیدی ● مکتبہ حجاب، رام پور (یو۔پی) ● ۵ روپے

عروج زیدی کہنہ مشق شاعر ہیں ۔ ان کا کلام ان تمام شعری محاسن سے مملو ہوتا ہے جو گذشتہ نصف صدی میں معیاری تصور کیا جاتا رہا ہے ۔ نصف صدی کا شعری تجربہ رکھنے کے باوجود وہ بہت زیادہ معروف نہ ہو سکے ۔ اس کی وجہ ان کے مزاج کی سادگی و خودداری ہے ۔ عام طور سے وہ غزل کہتے ہیں لیکن اس بار انھوں نے اپنے قطعات کا مجموعہ پیش کیا ہے جن کے بارے میں تیسرے صفحہ پر جلی قلم میں مرقوم ہے : "زندگی آمیز و زندگی آموز قطعات کا تابناک و دلبصیرت افروز مرقع ۔" اس مجموعہ کے شروع میں مولانا امتیاز علی خاں عرشی، مولانا ماہر القادری اور حضرت گوپال متل نے دیباچے لکھے ہیں ۔ ان میں گوپال متل کا دیباچہ دلچسپ ہے جس میں لیکن کے ذریعہ صفت کا کثرت سے استعمال کیا گیا ہے ۔ مولانا عرشی اور ماہر القادری کے دیباچے عروج زیدی کے قطعات سے بڑی مناسبت

رکھتے ہیں اس لئے کہ ان میں شاعر کے محاسن کلام کا ذکر موثر انداز میں کیا گیا ہے۔
ان قطعات میں ایمانی و اخلاقی موضوعات کو سلیقہ مندی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ بعض قطعات میں قرآنی آیات اور مضامین احادیث کو بھی استادانہ انداز میں کھپایا گیا ہے۔ جن سینوں میں یہ چراغ روشن ہے وہ ان قطعات سے بالخصوص مستفیض ہوں گے۔
ضخامت کے لحاظ سے کتاب کی قیمت بہت مناسب ہے۔ کاش عروج زیدی کا کلام کتابت و طباعت کے حسن سے بھی آراستہ ہوتا۔

——— ابن فرید

کشمکش ● ڈاکٹر چودھری رفیع الدین عثمانی ● اسلامک پبلشرز، رام پور (یو۔پی) ● ۶/۵۰

ڈاکٹر عثمانی معالج ہیں۔ ان کی عمر اب ماشاءاللہ پون صدی سے زیادہ ہو چکی ہے۔ اس عمر میں انھیں قلم سے بھی کچھ کام لینے کا خیال آیا ہے، چنانچہ وہ ڈرامے لکھنے کی طرف متوجہ ہوئے ہیں۔ اس سے قبل ان کا ایک مختصر ڈرامہ "اعتراف گناہ" شایع ہو چکا ہے۔ یہ دوسرا ڈرامہ ہے جو خاصا طویل ہے اور ابھی حال ہی میں کتابی شکل میں شایع ہوا ہے۔ ڈاکٹر عثمانی نے اسے دینی و اخلاقی ڈرامہ قرار دیا ہے لیکن درحقیقت یہ ان کی خود نوشت سوانح حیات ہے جسے انھوں نے ڈرامہ کی شکل میں پیش کیا ہے۔ یہ ڈرامہ چودہ سین پر مشتمل ہے۔ اس کے کرداروں کے نام برنارڈ شا کے انداز میں رمزیاتی ہیں اور الزبتھن ڈراموں کی طرح حسب ضرورت پابند منظوم کلام سے بھی فائدہ اٹھایا گیا ہے۔ پورے ڈرامہ کو اگر پانچ یا اس کے لگ بھگ ایکٹ میں تقسیم کر دیا گیا ہوتا تو زیادہ نظم پیدا ہو جاتا۔ ڈرامہ میں جہاں کہیں بھی منظوم کلام نظر آتا ہے وہ بھی خود ڈاکٹر عثمانی کا ہے جو ہمدم تخلص استعمال کرتے ہیں۔ ڈرامہ کی زبان حالانکہ مکالماتی نہیں ہے لیکن معیاری اور بے عیب ہے۔ فنی لحاظ سے اس کا حسن، اس کی ایڈونچرس تنظیم و ارتقاء ہے۔
'کشمکش' کے شروع میں مولانا صدرالدین اصلاحی، مولانا امتیاز علی خاں عرشی اور مولانا سید احمد عروج قادری نے دیباچے لکھے ہیں جن میں اس ڈرامہ کے فنی محاسن پر کوئی روشنی نہیں ڈالی گئی ہے۔ مصنف نے خود البتہ اپنے زاویۂ نظر اور مقصد تصنیف کو واضح کیا ہے۔
ضخامت کے لحاظ سے اس کتاب کی قیمت بہت کم ہے۔

——— ابن فرید

اردو شاعری میں جدیدیت کی روایت ● ڈاکٹر عنوان چشتی ● اردو سماج، جامعہ نگر، نئی دہلی۔ ۲۵ ● ۲۰ روپے

ڈاکٹر عنوان چشتی کی کتاب "اردو شاعری میں جدیدیت کی روایت" پڑھتے ہوئے صرف تکرار و تضادات سے ہی واسطہ نہیں پڑتا بلکہ جدیدیت کے سمجھنے میں مزید الجھنیں پیدا ہوتی ہیں۔ ان کے خیال میں جدیدیت اور جدت ہم معنی ہیں۔ ص ۲۷ کا اقتباس ملاحظہ کیجئے "عام طور پر جدت کے دو مفہوم ہیں: ایک یہ کہ شاعری میں جدید مسائل موضوعات، رجحانات و عصری آگہی کو سمونا، دوسرے روایت کی ڈگر سے ہٹ کر نئے اسالیب و انداز کا سہارا لینا مگر جدت میں یہ دونوں مفہوم شامل ہیں۔ پہلا مفہوم جدت کا داخلی اور دوسرا خارجی پہلو ہے۔ اس لئے ہر ایسی شاعری کو

جدید شاعری کہا جاسکتا ہے جس میں تجربے اور تازگی کی جھلک ملتی ہے اور جس میں روایت سے گریز کا احساس ہوتا ہے۔" غرض کہ جدت اور جدیدیت ایک ہی شے ہیں۔ یوں تو ہر شخص کو آزادی حاصل ہے کہ وہ اپنے اپنے طور پر اصطلاحات کی تعبیر و تشریح کرتا رہے لیکن اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ ادب کا تاریخی شعور بھی رکھتا ہو۔ اگر ہر جدت جدیدیت ہی ہے تو پھر سودا بھی ترقی پسند کہلائیں گے کہ انھوں نے اپنے "شہر آشوب" میں سماجی اور معاشرتی برائیوں کی نشاندہی کی ہے۔ لیکن غالباً مصنف کو بھی سودا کو ترقی پسند کہنا گوارا نہیں ہوگا۔ اس لئے کہ ترقی پسندیت مخصوص رجحان کا نام ہے جس کی اپنی آئیڈیولوجی ہے۔ اس خانے میں سودا فٹ نہیں بیٹھتے۔ اسی طرح جدیدیت بھی ادب کا ایک مخصوص فکری رویہ ہے جو اپنی ابتدا میں محض ایک رجحان تھی لیکن بعد میں چل کر ایک تحریک بن گئی اس لئے "جدیدیت" کو لغوی معنی سے نکال کر مخصوص ادبی رجحان کے تناظر میں دیکھنا چاہئے۔ خلیل الرحمن اعظمی نے جدیدیت کے سلسلے میں لکھا ہے کہ "صالح قسم کی جدیدیت وہ ہے جو وقت اور ماحول کے فطری تقاضوں اور ادیب کے اپنے احساس اور تجربے سے پیدا ہوتی ہے۔" (مضامین نو) ۔ جدیدیت کی یہ تعریف وسیع اور ہمہ گیر ہے۔ یہ ادب کو بحیثیت کل کے دیکھنے کی کوشش ہے۔ ترقی پسند تحریک کے نزدیک "ادیب کے اپنے احساس اور تجربے" کی کوئی اہمیت نہیں ہے اور یہی نکتہ جدیدیت اور ترقی پسندی کے درمیان ما بہ الامتیاز ہے۔ رومانیت میں ادیب کی انفرادیت کو اہمیت ضرور حاصل ہے لیکن "وقت اور ماحول کے فطری تقاضوں" سے اسے علاقہ نہیں ہوتا۔ ان معنوں میں جدیدیت، ترقی پسندیت اور رومانیت دونوں کی ضد ہے۔

اگر یہ نکتہ سمجھ لیا جاتا تو پھر جدیدیت کو روایت کی ضد سمجھنے کا جواز ختم ہو جاتا اور اس نئی تعبیر کی ضرورت پیش نہیں آتی جو مصنف نے کتاب کے پہلے باب "جدیدیت، روایت کا تخلیقی اظہار" میں کرنے کی کوشش کی ہے۔ چونکہ جدت اور جدیدیت مصنف کے خیال میں ہم معنی ہیں اس لئے قدیم شاعری میں کئے گئے عروضی تجربے بھی جدیدیت کے زمرے میں آتے ہیں۔ وہ تجربے بھی روایت کے بطن سے ہی جنم لیتے ہیں۔ کتاب کا دوسرا باب قدیم شاعری میں کئے گئے صرف عروضی تجربوں کو ہی بحث میں لاتا ہے۔

جدید اردو نظم پر بحث چوتھے باب میں کی گئی ہے۔ مصنف کی نظر میں جدید نظم کی روایت وضاحتی اسلوب کی روایت ہے۔ ترقی پسند شعرا نے بھی (اختر الایمان اور فیض کو چھوڑ کر) وضاحتی اسلوب کو فنی ذریعۂ اظہار کا وسیلہ بنایا۔ "حلقۂ ارباب ذوق" نے اور ان کے اثر سے جدید شعرا نے جو اسلوب اختیار کیا وہ "رمزیت" کا تھا۔ ان کے فنی اظہار کے وسائل میں استعارہ سازی، علامت نگاری اور پیکر تراشی کو اہمیت حاصل ہے۔ پھر مصنف نے استعارہ، پیکر اور علامت کی تعریف و تشریح کی ہے۔ یہ تشریح یہیں ختم نہیں ہوتی بلکہ "جدید اردو غزل" (چھٹا باب) میں بھی دہرائی گئی ہے جس کی یقیناً کوئی ضرورت نہیں تھی اور اگر ایسا کرنا ضروری ہی تھا تو غزل اور نظم میں ان وسائل کے استعمال میں اگر رویے کا فرق ہے تو ان کا جائزہ بھی لیا جانا چاہئے تھا۔

غزل اور نظم دونوں کی بحث میں مصنف نے فن کار کے ذہنی رویے کو سرے سے نظر انداز کیا ہے۔ اس کی وجہ بھی دلچسپ ہے: "شاعری کو دو طریقوں سے پرکھا جاسکتا ہے ایک خارجی یا معروضی معیاروں سے دوسرے داخلی یا موضوعی پیمانوں سے ..... میری رائے میں خارجی یا معروضی طور پر نثر و نظم میں جو چیز مدِ فاصل ہے وہ "آہنگ" ہے اور یہی عنصر شاعری کو پرکھنے کا معروضی معیار ہے۔" ص ۲۸۷ (نثری نظم)۔ تنقیدی معروضیت کی اس انوکھی تعبیر کو پڑھ

کر مصنف کی ذہنی اور فکری سادہ لوحی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ جدید اردو گیت سے بحث دلچسپ اور معلوماتی ہے۔ عروضی مسائل پر مصنف کی گرفت مضبوط معلوم ہوتی ہے۔

بحیثیت مجموعی یہ کتاب مکتبی تنقید کی روایت قایم رکھنے میں کامیاب ہے۔ کتابت وطباعت غنیمت ہے۔

ـــــ عقیل احمد

لفظوں کی دھوپ ● شکیل مظہری ● حیدرن پبلشرز "آشیانہ" ڈرانڈلی (ین۔کے) ● ۱۰ روپے

" اپنے کھوتے ہوئے وجود کی تلاش میں سرگرداں ہوں اور شاعری کو عرفان ذات کا ذریعہ مانتا ہوں "۔ یہ عبارت شکیل مظہری کے پیش منظر کی ہے جو مجموعہ کے شروع میں ہے۔ یعنی شکیل مظہری کا مسئلہ اپنی ذات کی تلاش ہے۔ لیکن کیا شاعر اس تلاش میں کامیاب ہے۔ بقول ان کے " مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میرا " میں " دور کہیں ذات کی پاتال میں گم ہو چکا ہے اور اب تلاش وتجسس ہی اپنا مقدر ہے "۔ غرض شاعر نے اپنی شاعری وجود کی شناخت سے شروع کی اور اب بھی وہ تلاش کی منزل میں ہے۔

دراصل موجودہ تہذیب نے نئی نسل کو جو تحفہ دیا ہے وہ بے چہرگی اور بد اعتمادی کا ہے۔ تہذیب کا یہ رخ اس قدر بھیانک ہے کہ اس آئینہ میں اپنی شکل دیکھنا بھی خود پر سے اعتماد اٹھا دینا ہے۔ ایسی صورت میں اس کے سوا چارہ ہی کیا ہے کہ فرد اپنے آپ کو مختلف کھلونوں سے بہلائے یا موت سے اپنا رشتہ جوڑے ورنہ اپنے آپ کو حالات کے سپرد کردے۔ شکیل نے اپنا رشتہ یاد اور خواب سے جوڑا ہے۔ یہ دو کھلونے ہیں جن سے وہ اپنے آپ کو بہلا رہا ہے۔

دن کسی یاد کی دہلیز پر دم توڑ گیا — رات آئی ہے کوئی خواب سنہرا لے کر

مجموعہ کا بیشتر حصہ غزلوں پر مشتمل ہے۔ ان میں ماحول سے بیزاری کے نتیجے میں پیدا ہونے والی ناامیدی کے احساسات اور تاثرات ہیں جو پوری شاعری میں بکھرے پڑے ہیں مثلاً

یہ رات اتنی تہی مایہ ہے کہ اب اس میں — نہ چاند ہے، نہ اجالا، نہ آرزو، نہ سکوں
رات کے دشت میں آتے ہو تو کیا پاؤ گے — دن کے صحرا سے گذرنے کی سزا پاؤ گے
ہم کو بھی حسرت تزئین خودی تھی لیکن — اپنی بے چہرگی نے ہم کو سنورنے نہ دیا
یہ شہر میری طرح بن گیا ہے پتھر کا — لگی ہیں اس میں بھی خاموشیوں کی تصویریں
اک چمکتی دھوپ تھے ہم بھی مگر — ہم کو سائے کا تجسس کھا گیا

شکیل مظہری کی غزلوں کا بنیادی وصف ان کا صاف ستھرا اور دھیما لہجہ ہے۔ بھاری بھرکم الفاظ سے عاری محض احساسات وتاثرات ہیں جو جاری وساری الفاظ میں ہی اپنا اظہار کرتے ہیں۔ ان کی غزلیں قوافی کے جبر سے پاک ہیں اور اوزان وبحور کا انتخاب برملا ہے۔ ان کے ڈکشن میں شہر، شب، سناٹا، دن، دھوپ، سورج اور سایہ جیسے استعاراتی تلازمے بار بار استعمال ہوتے ہیں جو شاعر کے مخصوص ذہنی رویّے کی نشاندہی کرتے ہیں۔ یہ استعارے جدید شاعری میں عام ہیں۔ ان کے استعمال میں شاعر کا کوئی منفرد رویہ سامنے نہیں آتا۔ اس کے لئے تجربات میں تنوع اور فکر کی اشد ضرورت پڑتی ہے۔

مجموعہ کے شروع میں چند نظمیں بھی شامل ہیں جن میں رسول بے امت، ایک نظم مشورہ اچھی نظمیں ہیں۔ باقی نظموں میں فنی پختگی کی کمی کا احساس ہوتا ہے۔ بنیادی طور پر شکیل غزل کے شاعر ہیں۔ غزلوں میں تاثرات کی یکسانیت کھٹکتی ہے لیکن اپنے محدود دائرے میں جو شاعری پیش کی گئی ہے وہ اپنے اندر تازگی رکھتی ہے۔ شروع میں ڈاکٹر مغنی تبسم کا مقدمہ بھی شامل ہے جو شاعر کی شاعری کے مختلف فکری رویوں کا احاطہ کرتا ہے۔ کتابت، طباعت اور گٹ اپ عمدہ ہے۔

عقیل احمد ______

کبڑی بلندیاں

● احسن شفیق ● ادارہ ارباب فکر و فن، ۴۷۲/۱ جی۔ ٹی۔ روڈ شب پور ہوڑہ ۲ ● ۱۰ روپے

احسن شفیق کا تعلق بنگال سے ہے۔ یہیں ٹیگور اور نذرالاسلام دونوں نے بنگلہ زبان میں بڑی شاعری پیش کی ہے۔ ذاتی طور پر نذرالاسلام کی شاعری کو جستہ جستہ ترجموں کے ذریعہ پڑھنے کا موقعہ ملا ہے۔ اس روشنی میں احسن شفیق کی شاعری پر نذرالاسلام کا اثر معلوم ہوتا ہے۔ وہی جذبات کی ہلچل اور ہیجان انگیزی احسن شفیق کی شاعری میں بھی پائی جاتی ہے۔ البتہ نذرالاسلام کی ہیجان انگیزی اپنے اندر فکری ارتعاشات بھی رکھتی ہے جو ان کی شاعری کو عظیم بناتی ہے۔ احسن شفیق کی ہیجان انگیزی محض ایک ردعمل ہے جس کے لیے ان کے پاس جواز بھی ہے۔ وہ خود لکھتے ہیں "... وہ ہی ادب ہوتا ہے جو اپنے گردوپیش سے الجھتا ہے۔ ہر اسٹیبلشمنٹ کے ہاتھ سے چکنی مچھلی کی طرح پھسل جائے، کتے کی طرح بھونک کر اپنی ناراضی کا اظہار کرے۔ عقاب کی طرح جھپٹے اور چیونٹی کی طرح رینگ کر اس کی ناپختگی کی نشاندہی کرے۔" ہر اسٹیبلشمنٹ کے ہاتھ سے چکنی مچھلی کی طرح پھسل جانے والی بات صحیح ہے۔ لیکن کتے کی طرح بھونک کر اپنی ناراضی کا اظہار کرنے سے جو شاعری پیدا ہوگی وہ لمحاتی اثر تو رکھ سکتی ہے لیکن دیرپا نہیں ہو سکتی۔ احسن شفیق کی شاعری پر جوش کی انقلابی نظموں کی گہری چھاپ ملتی ہے۔ فرق جدید اور قدیم لفظیات کا ہے اور زندگی کی طرف رویے کا ہے۔ ورنہ جوش کا آہنگ نظموں میں نمایاں ہے۔ وہی ہیجان انگیز بغاوت کا رجحان۔ ایسی شاعری اگر فکری بنیادوں پر کی جاتی ہے تبھی پائدار ہوتی ہے۔

مجموعے میں شامل بعض نظمیں گھنٹی بجتی ہے رہٹ چلتی ہے، سانپنی، سولہ نمبر بس اسٹاپ، شکل اگ رہی ہوگی، اچھی نظمیں ہیں۔ ان میں پختگی بھی ہے اور "حمد" کی طرح زبان کے استعمال پر قدرت کا ثبوت بھی۔

نظم کے احساسات احسن شفیق کی غزلوں میں بھی نمایاں ہیں البتہ غزلوں میں نظم کے مقابلے میں لہجہ دھیما ہے۔

اب سکوت دریا بھی ساحلوں کو ڈستا ہے — کشتیوں سے وحشت کا دیوتا نہیں جاتا
جانے کس بیماری کی خاطر روز شفق لاتی ہے خون — جانے کون توانا ہو کر نکلے کا اک نشتر سا
اڑتے پنچھی پیاسی نظروں کے ہیجان سے عاری ہیں — تیز ہوئی جاتی ہیں کرنیں تھاپ، سہیلی گوبر تھاپ

مجموعی طور پر احسن شفیق کی شاعری میں امکانات کافی ہیں۔ البتہ جذبات کے ابال کو فکری ٹھہراؤ دینے کی ضرورت ہے مگر تازگی سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ کتاب کا گٹ اپ عمدہ ہے۔

عقیل احمد ______

بازدید

● آج تمھارے الفاظ ملے پڑھ کر بہت خوشی ہوئی۔ شہریار کا یہ شعر علی گڑھ بری طرح یاد آگیا۔ اس
شہر سے نپٹنے کا کوئی راستہ ہے تمھارے پاس!

آگ کے شعلوں سے سارا شہر روشن ہوگیا ہو مبارک آرزوئے خار وخس پوری ہوئی

لیکن ایک بات اور ہوئی جس کا ڈر تھا۔ تمھارے کاتب نے میری نظموں میں کچھ غلطیاں فرمادیں۔ براہ کرم اگلے شمارے میں انھیں ضرور ٹھیک کرادو۔ (اگر چاہو تو میرا یہ خط ہی چھاپ دو۔

نظم "ایک عورت"

لائن ۲۰ اور ۲۱ اس طرح ہونی چاہئیں

"زہر کا بستر تھا تحتِ منتہیٰ منظر عجب
در بدر اک گھر پریشاں اور اوپر سر عجب"

نظم "ابتدا"

لائن ۹ اور ۱۰ اس طرح ہونی چاہئیں

"سپیدۂ شب لازوال ساقی
سیہ دن بے مثال باقی"

نظم "ایک دن کا قصہ"

لائن ۲ کے بعد ایک اور لائن تھی جو کاتب صاحب بالکل بھول گئے ہیں۔ وہ لائن تھی :

"چھٹیاں مناتی تھی"

اور لائن ۴ کا آخری لفظ تھی ہے "تھیں" نہیں

اب آپ نظم پڑھیں تو مزہ آجائے گا۔

"دھوپ کی آواز آتی تھی
دھوپ ٹن ٹن بجتی تھی
شام اپنے بچوں میں
چھٹیاں مناتی تھی
صبح کے درختوں میں

تتلیاں	اگاتی تھی	
ایک دن	ذرا ہم نے	آنکھ دیر سے کھولی
شام	اپنے بچوں کے	درمیان غائب تھی
صبح	کے درختوں میں	
رات	کالی بجتی تھی	
دھوپ	کی آواز آتی تھی	
دھوپ	ٹن ٹن بجتی تھی	

صلاح الدین پرویز، سعودی عرب

● الفاظ کے شمارے ۱۲ اور ۱۳ موصول ہوئے شکریہ

شمارہ ۱۳ میں آپ کا اداریہ بہت جاندار ہے۔ چند جملوں میں نہ صرف آج کے ادب کی صنعتی تنقیدی اور تخلیقی صورت حال کی نباضی کی گئی ہے بلکہ صاف اور ستھرے الفاظ میں اس بات کی نشان دہی بھی کی گئی ہے کہ آج کی تنقید میں 'اپنی پسند' زیادہ دخیل ہوگئی ہے جس کی وجہ سے "تنقید تنقید باقی رہنے کے بجائے اپنی یا اپنے جیسوں کی افسانہ نگاری کا جواز بنتی جارہی ہے"۔ اس رجحان کے زہریلے اثرات کی نمایندگی بھی بڑی خوبی سے ہوئی ہے یعنی آج کا افسانہ نگار اپنے لئے غیر معمولی طور پر CONCIOUS ہونے کے مرض میں مبتلا ہوتا جارہا ہے — جس سے افسانہ کا عام معیار پست ہوتا جارہا ہے"۔ اس زہر کی کاٹ وہ 'وسیع القلبی' ہے جو "مختلف انداز کے فن پاروں کو ایک ساتھ قبول کرتی ہے" —— یہاں آکر ہم یہ سوچنے لگ جاتے ہیں کہ یہ 'وسیع القلبی' ہم کس طرح پیدا کرسکتے ہیں جب کہ وسیع اور مختلف النوع ادب کا مطالعہ (اس میں وہ گہرا مطالعہ بھی شامل ہے جس سے ہم قطعی متفق بھی نہ ہوں) ہمیں چھو نہیں جاتا اور شعور و آگہی کے دروازے ہم پر بند ہونے لگتے ہیں۔ نتیجہ کے طور پر ہم خود اپنے لئے ایک مضبوط زمین پیدا کرنے کے بجائے دوسروں کے قدم ان کی زمینوں سے اکھاڑنے کے جتن کرنے لگتے ہیں۔ ظاہر ہے ہم پتھروں کے ڈھیر کے پاس کھڑے نظر آتے ہیں اور ہمارے ہاتھوں میں پتھر

نئی کہانی کی زمین میں آپ نے جس 'بحث' کا بیج بویا تھا اس کی کونپل پھوٹ نکلی ہے۔ اس شمارے میں علیم اختر حالی، اور ڈاکٹر سید حامد حسین اور عبدالحمید اپنے اپنے طور پر منفرد ہیں۔ حالی صاحب کے یہاں گہرائی اور بصیرت صاف دیکھی جاسکتی ہے۔ ان کا یہ جملہ فکر انگیز ہے —— "ہمیں یہ دیکھنا چاہئے کہ تجریدیت کا جو لطف ہم شعر و ادب میں پیدا کرنا چاہتے ہیں اس کی نوعیت کیا ہوسکتی ہے۔ شعر میں اس کا تظاہر کس طرح ہوگا اور کہانی میں کس طرح ممکن ہے۔ دورِ جدید کے کہانی کاروں نے ان مراتب اور نزاکتوں کا خیال کئے بغیر کہانی کو ایسی تجریدیت بخشنی شروع کردی جس کی یہ متحمل نہیں ہوسکتی۔ اس بے جوڑ سی بات نے نئی کہانی کو چوں چوں کا مربہ بنا ڈالا ہے"۔—— کہانی میں اس طرح کی 'تجریدیت' پر جو اسے چوں چوں کا مربہ بنا ڈالتی ہے سخت تنقید کی ضرورت ہے تاکہ کہانی کے ان اجزا اور وقوعوں کی نشان دہی ہوسکے جن سے ابہام پیدا ہوجاتا ہے۔ تجریدی افسانہ نگاروں کی کچھ کہانیاں چن لی جائیں تاکہ ان پر بحث ہو۔ اس سے قاری اور فن کار دونوں کو اپنا معیار بلند کرنے اور اپنے اپنے رویوں کو سمجھنے اور درست

کرنے کا موقع ملے گا۔ کم سے کم یہ تو ہوگا کہ افسانہ نگاروں کی تازہ نسل اس سے فائدہ اٹھائے گی ــــ حالی صاحب کی بحث میں ایک بھرپور افسانہ کی تعریف بس بنتے بنتے رہ گئی۔ میرا مطلب ہے تھوڑی کوشش اور ہو جاتی تو اچھا تھا۔ یہ ضرور ہے کہ افسانہ کی تعریف کسی مسئلہ کو حل نہیں کرتی البتہ نئے امکانات روشن ہوا اٹھتے ہیں۔ اس لئے کہ اس پر مباحث کے دروازے کھلتے ہیں۔

افسانہ اور شعر کی شناخت میں ڈاکٹر سید حامد حسین نے فکری غواصی کی ہے اور دونوں کا خوبصورت تقابل کیا ہے۔ انھوں نے اقبال مجید کے بھیجے ہوئے ان ٹکڑوں کو احاطہ بحث میں لیا ہے جو مختلف افسانوں سے ماخوذ تھے اور نثری نظم کے طور پر شایع ہوئے تھے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہم انھیں نظم کہہ سکتے ہیں (نثری ہی سہی)۔ پہلے دوسرے اور پانچویں ٹکڑے تشبیہہ کی حد سے آگے نہیں بڑھے ہیں۔ نظم کو تو چھوڑیے مگر افسانہ جیسی بیانیہ صنف میں بھی تشبیہہ ایک ادنیٰ صفت ہے۔ آج کا افسانہ استعارے کی حدوں سے بھی تجاوز کر چکا ہے۔ جہاں تک نظم کا تعلق ہے اس میں استعارے تو درکنار علامت جیسی پیچیدہ صفت کا پایا جانا ایک عام سی بات ہے۔ افسانہ حقیقت کو من وعن بیان نہیں کرتا (ورنہ افسانہ کیوں) بلکہ اپنے اظہار کے لئے ایک ایسے پیٹرن کی تلاش کرتا ہے جس پر حقیقت کے نقوش کچھ نئے عکس ابھار سکیں اور نکھار آ سکے۔ لیکن یہ اظہار بیان کا تابع رہتا ہے۔ چنانچہ تیسرے، چوتھے اور چھٹے ٹکڑوں میں بھی بیان جملے ہیں۔ نظم ہوتی تو جملوں میں مروڑ (TWIST) ہوتا۔ سیدھے سیدھے جملے لکھے نہ ہوتے۔ افسانوں سے ایسے نثری ٹکڑے نکل آنا جن پر نظموں کا گمان ہو کوئی انوکھی بات نہیں۔ اس لئے کہ راہ چلنے والا کبھی کبھی دوڑنے بھی لگتا ہے اور جب ایک دو چھلانگ میں سانس پھول جاتی ہے تو پھر چلنے لگتا ہے۔ ایسے شخص کو مسافر ہی کہیں گے، دوڑ لگانے والا نہیں۔ ٹہلنے اور دوڑنے میں بہرحال فرق ہے لیکن جو جس میں ماہر ہو جائے۔

عبدالحمید نے نئی کہانی کی بحث کو آگے بڑھایا ہے۔ اس بحث میں نئے قاری کی شناخت آسان ہوتی نظر آتی ہے۔ قاری میں عبدالحمید نے بجا طور پر "ادب کے نئے تجربوں کا کھلے ذہن سے مطالعہ اور ان تجربات کے محرکات" پر نگاہ کے علاوہ اس میں "ادبی تربیت اور تنقیدی بصیرت" جیسے عوامل تلاش کئے ہیں۔ یہ قاری کوئی عام قاری نہیں ہے کہ اس نے آج ہی افسانے کو اٹھایا اور پڑھا اور شروع سے آخر تک سمجھ گیا۔ یعنی وہ قاری جو عام طور پر لاکھوں کی تعداد میں شایع ہونے والے اردو کے پرچوں کے معیار پر ادب کا ارفع اور اعلیٰ ادراک قایم کرے۔ ظاہر ہے افسانوی ادب کی ترسیل کی باگ ڈور ایسے شخص کے ہاتھ میں نہیں دی جا سکتی۔ جو اسے بدلتی ہوئی اور ارتقائی شکل میں برداشت نہیں کر سکتا۔ فن کار کے لئے ایسے بند ذہن قاری کو خوش کرنے کے لئے کہاں تک اترنا پڑے گا اور ادب کے معیار کو کس درجہ پست کرنا ہوگا اسے ناپا نہیں جا سکتا۔ عبدالحمید نے تخلیق کے مقصد پر سیر حاصل بحث کی ہے اور نظریہ اور مقصد میں جو فرق ہے اسے بڑی خوبی سے واضح کیا ہے۔ ایبسرڈٹی اور ابہام کے سلسلے میں عبدالحمید کا یہ کہنا درست ہے کہ ــــ "تفہیم میں سب سے پہلا مرحلہ زبان کے شعور کا ہے۔ نئی فنی زبان لفظ کے لغوی اور منطقی معنی سے ارتفاع کی کوشش کرتی ہے۔"

عبدالحمید کی مڈبھیڑ جو ڈاکٹر سید محمد عقیل کے نظریوں اور خیالات سے ہوئی ہے بڑی دلچسپ ہے۔

ڈاکٹر صاحب یقیناً ان لوگوں میں سے ہیں جو قاری کی عمومیت پر فن کار کی انفرادیت کو قربان کر دینا چاہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ پہلے ابہام اور اہمال کا ورد کرتے تھے اور اب اقبال مجید کے مضمون (الفاظ جلد ۳ شمارہ ۳ صفحہ ۱۵) سے انھیں 'مکڑ جال' کا لفظ حاصل ہوا ہے اور متواتر اس کی گردان کر رہے ہیں۔ یہ لفظ لاشعوری طور پر ان کے یہاں کتنا اہم ہو گیا ہے اس کا اندازہ افسانوں پر ان کی تحریروں کے علاوہ 'اندازے' کے توسط سے ہو سکتا ہے۔ ستمبر اکتوبر ۸۳ء کے 'اندازے' کے صرف ایک چھوٹے سے پیراگراف میں یہ لفظ آٹھ بار استعمال ہوا ہے۔ عقیل صاحب نے 'مکڑ جال' جیسے لفظ کو اسی طرح معنی خیز بنا دیا ہے جس طرح لفظ 'کنواں' کا انھوں نے افسانہ بنا دیا ہے (الفاظ جلد ۳ شمارہ ۴ صفحہ ۲۲) وہ اپنے آپ کو نئی کہانی کا قاری نہیں مانتے مگر اس کے باوجود انھیں سریندر پرکاش کا 'بجوکا' انور سجاد کا 'کونپل' خالدہ اصغر کا 'سواری'، جوگندر پال کا 'باہر کے بعیتر' وغیرہ افسانے تجریدی ہوتے ہوئے بھی اچھے لگتے ہیں۔ کیا افسانے انھیں کے مطابق 'مکڑ جال' کے افسانے نہیں ہیں؟ "ابہام اور اہمال" ان میں نہیں ہے۔ اور کیا "ایجاد بندہ والی سیکالوجی" جیسے لفظ پتھروں کا ڈھیر ہیں اور سامنے شیشے کی عمارتیں۔ ہم کیسے سمجھیں کہ واقعی انور سجاد کے افسانے اس قاری کی فہم و ادراک میں آتے ہیں جس کا ذکر عقیل صاحب کرتے ہیں۔ انھوں نے 'اندازے' کا شمارہ نکالا تو امید بندھی تھی کہ چلو ایک قدیم زاویۂ نظر سے سہی ادب کی گہری نباضی، تجزیاتی غواصی اور تنقیدی گیرائی دیکھنے کو ملے گی مگر اب تک جو کچھ سامنے آیا ہے سراسر ادب پر ہی اوپر نکل جانے کا نتیجہ ہے۔

سلیم شہزاد نے 'اپنی مٹی کا ادب' میں عصری حسیت کا بہت اچھا محاسبہ کیا ہے۔ یہ مضمون خارج کی سطح سے لکھا گیا ہے اور منفرد اسلوب کا حامل ہے۔ جدیدیت کا منفی اظہار قدیم نقادوں کا نشانہ بنتا رہا ہے۔ سلیم شہزاد نے بڑی خوبی سے اس منزل کو سر کیا ہے ــــ "منفی فکر جب حقائق کو پیش کرتی ہے اور افراد کے درمیان جنم لینے والی گھناؤنی حرکات سے پردہ اٹھاتی ہے تو وہ منفی نہیں رہ جاتی۔ وہ عصری شعور کی رہنمائی میں اطراف میں پھیلی تمام ناانصافیوں پر روشنی ڈالتی ہے۔ وہ مجہولیت، بے حسی، خوفزدگی، فرار اور مریضانہ ذہنیت کا پرچار نہیں کرتی بلکہ سماج میں پھیلے ان تمام زہروں کی نشاندہی کرتی ہے۔ یعنی اس نفی میں اس بات کا پہلو پوشیدہ ہوتا ہے"

ظاہر ہے ایسی صورت میں فن کار کی شمولیت (INVOLVEMENT) کو کہاں لے جائیں گے۔ اظہار اور ترسیل کی دشواری تعمیمات اور مشترک کیفیتوں سے حل نہیں ہوتی۔ یہیں فن کار اپنی ذات میں غواصی کی دعوت دیتا ہے۔ ظاہر ہے تعمیمات کا عادی قاری فرار حاصل کرتا ہے نہ کہ فن کار۔

افسانہ 'گڈریا' کا جائزہ شائع کر کے آپ نے پرانے افسانوں کے حق میں ایک نیا قدم اٹھایا ہے۔ عظیم الشان صدیقی نے البتہ قدیم زاویۂ نظر سے پورے طور پر گلو خلاصی حاصل نہیں کی ہے۔ انھیں چاہیے تھا کہ اس افسانے کو عصر حاضر کی سطح پر رکھ کر اس میں زندگی کے آثار تلاش کرتے۔ میرا خیال ہے کہ افسانے کے تخلیقی عمل کا سرا وہاں سے مل جاتا جہاں افسانہ 'صدمہ' پہنچاتا ہے۔ اس لئے کہ داؤجی کا انفرادی کرب سماج میں شریک ہونے اور اس سے مفاہمت کی کوشش میں ہے۔ آخر کار وہی سماج داؤجی کے ساتھ غیرت کا برتاؤ کرتا ہے۔ نتیجہ کے طور پر داؤجی اپنی ازلی صورت (ORIGINALITY) یعنی گڈریے میں علٰحدہ (ISOLATE) ہو جاتے ہیں۔

شمارہ ۶ کی نظموں اور غزلوں کا حصہ قدرے کمزور ہے۔ افسانوں میں 'مکڑا' اور 'اندھیرے کی بیل' اچھے ہیں۔ باقی غنیمت ہیں۔ ترجموں کا سلسلہ بہت خوب ہے۔ اسے جاری رہنا چاہئے۔ اشتہاروں میں یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی کہ ای۔ ایم۔ فارسٹر کی کتاب کا ترجمہ 'ناول کا فن' سامنے آرہا ہے۔ یہ اردو تنقید کے لئے ایک اہم اضافہ ہوگا۔

حالیہ شمارے میں سوالنامے پر میری تحریر شامل کرنے کا شکریہ۔ یہاں میں کیا کہوں اس لئے کہ یہ دوسرے حضرات کی توجہ کا حصہ ہے۔ حسین الحق نے زیادہ تر بحث برائے بحث والا رویہ اپنایا ہے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ انھوں نے حسن عسکری کا اسلوب اپنانے میں اپنے انفرادی اظہار کو پس پشت ڈال دیا ہے یعنی وہ کھل کر سامنے نہیں آسکا۔ اس لئے کہ ایک طرف وہ یہ بات طے کر دیتے ہیں وجدان کا جنازہ نکل گیا اور لکیر پیٹتے رہنے کا مشورہ دیتے ہیں تو دوسری طرف ۱۹۶۲ء سے ۱۹۸۵ء تک سوچتے رہنے کے نتیجے میں جس عرفان کی بات کرتے ہیں (اور یہاں میں اپنے ذہنی سفر کے اس موڑ کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں جو حسن عسکری مرحوم کو ضعیفی میں اس مقام تک لایا اور مجھے جوانی میں ہی یہاں پہنچا گیا) اس کے متعلق یہ بھی کہتے ہیں کہ اس نے ان کی "اس فکر کو پائدار کیا کہ ادب کا تعلق فلسفہ، تصوف اور وجدان سے اتنا گہرا ہے کہ میرے خیال میں کسی مقام پر اس سے الگ ہٹ کر سوچا ہی نہیں جاسکتا"۔ جہاں تک حسن عسکری مرحوم اور حسین الحق کی سرعت معرفت کے فرق کی بات ہے اس کے بارے میں قارئین کو روشناس کرانے کے لئے حسین الحق کی تحریروں کے سیلاب کی ضرورت ہے لیکن اتنی بات تو ضرور ہے کہ وجدان کے ایک ہی لفظ کی ایک بار مکمل نفی اور دوسری بار مکمل اثبات قاری کو اس شش و پنج میں ڈال سکتا ہے کہ وہ کیا سمجھے۔ اگر اسے پیراڈاکس سمجھا جائے تو اس کے سمجھنے کا کوئی جواز ہونا چاہئے۔ میرا خیال ہے کہ حسین الحق وجدان اور جمالیات کو الگ الگ برت نہیں پائے ہیں اور دونوں کو وجدان کہہ بیٹھے ہیں۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں وجدان کا تعلق تخلیقی عمل سے ہے جسے فن کار تخلیق کے لمحوں میں محسوس کرتا ہے اور استعمال کرتا ہے جب کہ جمالیات اس کی تخلیق میں حسن و لطافت کے طور پر شامل ہوتی ہے اور اس کا رشتہ تخلیق اور قاری کے درمیان ہوتا ہے۔

حسین الحق نے عصری حسیت کی نفی کر کے دائمی حسیت تلاش کی ہے۔ دائمی حسیت ازل سے ابد تک رہنے والی ہوسکتی ہے۔ چنانچہ دائمی حسیت سے وہ اگر فن کار کی تخلیقی رو (CREATIVE CHANNEL) مراد لیتے تو بات سمجھ میں آتی تھی مگر تعجب اس بات پر ہوتا ہے کہ جس بنا پر وہ عصری حسیت کا قتل عام کرتے ہیں اسی بنا پر دائمی حسیت کا محل تعمیر کرتے ہیں یعنی بھوک، خوف، لالچ اور بے سکونی۔ حالانکہ یہ عوامل بھی عصری حسیت کے ان عوامل کی طرح ہیں جو بقول حسین الحق "ترقی پسندوں کے اسٹنٹ ہیں"۔ جب صورت حال ایسی ہو تو عصری حسیت میں ہی کیا برائی ہے۔ عصری حسیت اگر علم ہے تو علم سے ادراک، ادراک سے عرفان اور عرفان سے وجدان کی کڑیاں ملائی جاسکتی ہیں۔ مگر حسین الحق تو وجدان کے مرگ کا ماتم کرتے نظر آتے ہیں۔ اس مضمون سے البتہ ہمیں یہ امید بندھتی ہے کہ حسین الحق نئی نسل کی تلاش و جستجو کی راہوں پر گامزن ہوسکیں گے۔

ناصر بغدادی کے مضمون 'کافکا کے خطوط ملینا کے نام' کے ذریعے کافکا کی شخصیت پر بھرپور روشنی پڑتی ہے۔ اس کے علاوہ تاریخ اور عصری حسیت کے باہمی رشتے سامنے آتے ہیں۔ انھوں نے معنی خیز اور خوبصورت مضمون لکھا ہے۔

جناب شمیم حنفی کا ریڈیائی ڈرامہ مٹی کا بلاوا' پانی کی طرح شفاف اور رواں ہے۔ زبان کی خوبصورتی نکھار اور جاذبیت بہت متاثر کرتی ہے۔ ایسی زبان کے ساتھ عصری حسیت کو برتنا انھیں کا حق ہے۔ انھوں نے دو نسلوں کے درمیان پیدا ہونے والی ذہنی خلیج اور محسوسات کے فرق کو پرانے کلچر اور نئی تہذیب کے طور پر برانگیختہ کیا ہے۔ ظاہر ہے یہاں پر عربی کا وہ مقولہ جس میں کہا گیا ہے کہ ہر چیز اپنی اصل کی طرف لوٹتی ہے پوری آب و تاب سے جھلک اٹھتا ہے۔ آج کی نسل اپنے اردگرد کی چیزوں سے بے تعلق ہے اور مادیت کے طلسمی رشتے افراد کے درمیان زر و سیم کی طرح چمکتے ہیں۔ یہی کاروباری لین دین کے ناطے ہیں۔ لہٰذا جب میر صاحب خود کلامی کے انداز میں کہتے ہیں:

"سب ؟ سب ساتھ رہیں گے ؟ تمھاری اماں اور تم اور جاوید اور میں ـــــ کیا یہی "سب"
یہیں ؟ یہ در و دیوار ـــــ یہ بستی ـــــ امام باڑہ ـــــ باغ ـــــ کھیت ـــــ باپ دادا کی
قبریں ـــــ یہ مٹی، یہ ہوا، یہ ـــــ یہ کچھ بھی نہیں ـــــ کچھ بھی نہیں ؟ سب کچھ چھوڑ کر
جانا ہوگا ! یہ سب کچھ ! ـــــ یا مولا ـــــ کیسی مشکل آن پڑی ہے۔"

تو دل میں ایک مانوس سی چبھن اپنا سر ابھارتی ہے۔ اس چبھن کی وہی کیفیت ہے جو انتظار حسین کے افسانوں سے پیدا ہوتی ہے۔ البتہ میرے خیال میں نئی نسل کی زبان سے جو مکالے کہلائے گئے ہیں ان میں جدید انداز کم جھلکتا ہے۔

کلام حیدری کا افسانہ الف۔لام۔میم بہت عمدہ ہے۔ اس میں ان کی تخلیقی رو اور زیادہ واضح ہوگئی ہے جسے میں نے کسی مضمون میں 'جبلی رومانیت' سے تعبیر کیا ہے۔ ان کے یہاں رشتوں کے ٹوٹاؤ کا المیہ شدت رکھتا ہے اور لکیروں کی بنت بھی ملتی ہے۔ اس افسانے نے ان کے سابقہ افسانوں کا نچوڑ پیش کرتے ہوئے آگے کی طرف قدم بڑھایا ہے ـــــ مومن مشتاق صدیق کا افسانہ اچھا لگا۔ ان سے اور افسانے لکھوائیے۔ چودھری محمد نعیم کی انگریزی کہانی کا ترجمہ بہت خوبصورتی اور اعتماد سے کیا گیا ہے۔ کہانی جتنی چھوٹی ہے اتنی ہی عمیق۔ اس میں نئے میڈیم کا استعمال بھرپور طور پر کیا گیا ہے۔ نئے میڈیم کے طور پر سڑی گلی لاشوں کی فضا قاری کو پوری گرفت میں لے لیتی ہے۔

اس شمارے میں نظموں اور غزلوں کا ذخیرہ مجموعی طور پر بہت عمدہ اور پرتاثیر ہے۔

مہدی جعفر، بھوپال

● جنوری، فروری ۱۹۷۹ء کا شمارہ دیکھا۔ مجھے معلوم تھا کہ فاطمی صاحب پر میرے مضمون کا ردعمل ہوگا اور وہ ہوا۔ دراصل استاد اور شاگرد کا رشتہ ہی ایسا ظالم ہوتا ہے۔

فاطمی صاحب کو دراصل غصہ یہی ہے، جو میں نے عقیل صاحب کے خلاف لکھا۔ ان کے مضمون میں نقائص تلاش کیے لیکن کوئی انصاف سے کام لے اور بتائے کہ جب مضمون میں سوا نقائص کے کچھ تھا ہی نہیں تو میں خوبیاں کہاں سے تلاش کرتا۔ عظیم آباد اکسپریس میں جو باتیں عقیل صاحب کے لئے مناظر عاشق نے کہی ہیں وہ آپ نے بھی پڑھی ہوں گی۔ وہاں بھی فاطمی صاحب اور ان کے ساتھیوں کی طبیعت مکدر ہوگئی تھی۔ لیکن خالی طبیعت مکدر ہونے سے تو کام نہیں چل سکتا۔ وہ باتیں صحیح ہیں یا غلط اور غلط ہیں تو کیوں ؟ یہ لوگ اپنی طبیعت کو کب تک مکدر کرتے رہیں

گے، میں نیا جدید یا ہوں یا پرانا جدید یا اور میں قاری ہوں یا فن کار؟ اس بات کو الگ رکھ کر اس پر غور کرنا چاہئے کہ میں نے کیا کہا، لیکن بقول مجنوں گورکھپوری ایسے لوگ یہ دیکھتے ہیں کہ "کس نے کہا؟" یہ نہیں دیکھتے کہ "کیا کہا؟" ایسے لوگ بت پرست تو ہو سکتے ہیں لیکن بت شکن نہیں۔ علی احمد فاطمی شاید خود کو ترقی پسند سمجھتے ہیں۔ اب یہ بالکل الگ بات ہے کہ انھیں ترقی پسندی کا ابتدائی شعور بھی نہ ہو۔ اور فاطمی کی کیا بات ہے یہ شعور تو ان کے اساتذہ میں بھی مفقود ہے۔ کم از کم ترقی پسندی کا وہ شعور جو مجنوں گورکھپوری یا اختر انصاری وغیرہ کے یہاں ہمیں نظر آتا ہے۔ اب ایسے لوگوں سے نئے فن کاروں، اور جدیدیت کو سمجھنے پر اصرار کرنا تو قطعاً غیر ضروری ہے، جو ادب کو شرح کے ذریعے پڑھنے کے عادی ہیں۔ یا شرح کی جگہ استاد کے نوٹس کو رہنما بناتے ہیں۔ یہ لوگ نہیں جانتے کہ ذہن کی ادبی تربیت اور سلیم الطبعی صرف یہ دونوں چیزیں فن پارے کو سمجھنے میں مدد دیتی ہیں۔ شرح یا استاد کے لکھائے ہوئے نوٹس نہیں۔ دوسری صورت میں حال وہ ہوتا ہے جیسا کہ فاطمی صاحب کا ہوا ہے کہ انھیں جدید افسانہ اگر سمجھ میں نہیں آتا تو کہتے ہیں کہ کچھ دنوں میں مین را "صاف" ہو جائیں گے۔ (ملاحظہ فرمائیے "بیس نئی کہانیاں") اور نہ جانے کیا کیا کچھ کہتے ہیں۔ فاطمی صاحب اظہار خیال فرماتے ہیں جدید ادب اور جدید افسانے پر لیکن صحیح اردو نثر نہیں لکھ پاتے۔ اس کے لئے کچھ نہیں صرف "بیس نئی کہانیاں" کا انتساب ہی دیکھ لیا جائے تو بہتر ہوگا۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ اس خط میں زبان کی کوئی غلطی نظر نہیں آتی۔ (ممکن ہے یہ بھی آپ کی اصلاح کا نتیجہ ہو۔)

عبدالحمید، الہ آباد

● تازہ شمارہ ہر لحاظ سے وقیع ہے۔ یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ الفاظ نے آہستہ آہستہ (مگر ستے ہتھکنڈوں سے بچتے ہوئے) رسائل و جرائد کی دنیا میں اپنی جگہ مستحکم کر لی ہے۔ اب تو خواہ مخواہ اس میں لکھنے کو جی چاہتا ہے منظومات کے باب میں شہریار کی دونوں غزلیں نہایت خاصے کی چیزیں ہیں۔ دونوں غزلیں جس پس منظر کو پیش کرتی ہیں وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ آپ نے بجا طور پر ان کے شعر ؎

آگ کے شعلوں سے سارا شہر روشن ہو گیا ہو مبارک آرزوئے خاروخس پوری ہوئی

کو اس مرتبہ اداریہ کی جگہ دی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ سانحۂ علی گڑھ کی ترجمانی کے لئے یہ ایک شعر ہی کافی ہے معنی کا ایک جہان اس میں پوشیدہ ہے۔ اس خاص سیاق و سباق سے ہٹ کر بھی دیکھئے تو دونوں غزلیں (بحیثیت غزل کے) خاصی کامیاب ہیں مشمولات کی دوسری چیزیں بھی اہم ہیں اور کوئی وجہ نہیں کہ ان کو پسند نہ کیا جائے۔ آپ کے تبصرے حسب معمول پسند آئے "تحریک" کے "سلور جبلی نمبر" میں افسانے پر آپ کا شاندار مضمون دلچسپی کے ساتھ پڑھا، پسند آیا۔ مبارکباد دینا چاہتا تھا لیکن موقع نہ مل سکا۔ بہرحال تاخیر کے ساتھ ہی سہی لیکن اتنے جاندار مضمون پر مبارکباد قبول فرمائیے۔

فاروق شفق، کلکتہ

● 'نوائے ٹوکیو' کی بزم میں آپ کی شرکت قابل ستائش ہے۔ آپ نے الفاظ ارسال فرما کر ہماری سوکھی کھیتی جیسے ہری کر دی ہو آپ جانیں، جاپان ایسے ملک میں جہاں اردو بولنے والے خال خال ہی ملتے ہیں، الفاظ کا شمارہ نہایت ہی اہمیت کا حامل ہے جس میں ایک عام اردو داں کے ذوق کی ہر چیز شامل ہے۔

یوں گو کہ الفاظ کا ایک ہی شمارہ موصول ہوا جس میں جانکی اماں کا خاکہ نہایت دلکش تھا۔ ایسے کردار ہمارے معاشرے میں عام ہوتے ہیں لیکن ان کا اتنی گہری نظر سے کوئی جائزہ نہیں لیتا جیسا کہ 'جانکی اماں' میں لیا گیا ہے۔ الیاس احمد کا افسانہ کرا بھی قابلِ تعریف ہے۔ اور الفاظ میں نظموں اور غزلوں کا اجتماع دلفریب ہے۔

محمد اقبال حنیف، اردو سیکشن ریڈیو جاپان
ٹوکیو، جاپان

جلد ۴ شمارہ ۳، ۴

دو ماہی

الفاظ

مئی، جون، جولائی، اگست ۱۹۷۹ء

چیف ایڈیٹر

ابوالکلام قاسمی

مینیجنگ ایڈیٹر

اسد یار خاں

مجلس مشاورت

پروفیسر خورشید الاسلام
قاضی عبد الستار
نسیم قریشی

زر سالانہ ——— دس روپے
فی کاپی ——— دو روپے

پرنٹر پبلشر ——— اسد یار خاں
مطبوعہ ——— اسرار کریمی پریس الٰہ آباد
کتابت ——— ریاض احمد الٰہ آباد
سرورق ——— انوار انجم

مقام اشاعت:
ایجوکیشنل بک ہاؤس
مسلم یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱

پتہ : دو ماہی الفاظ ایجوکیشنل بک ہاؤس مسلم یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱ فون نمبر ۳۷۶۸

آئینہ

الفاظ

اداریہ

مضامین

منظومات

افسانے

ڈرامہ

تقویم

اداریہ

ادیب کا سماجی منصب کیا ہے ؟ کیا ادیب سماجی فلاح وبہبود کے لئے ادب کے وسیلے سے کوئی خدمت انجام دے سکتا ہے ؟ ادب کا تعلق ادیب کی ذات سے ہوتا ہے یا ذات کی حدوں سے پرے شروع ہونے والے سماج سے ؟ کیا ادیب نے ادب کے مبادیات تک سے ناواقف عوام سے مفاہمت کا ٹھیکہ لے رکھا ہے ؟ یہ اور اس نوع کے سوالات گزشتہ چالیس سال سے اردو ادب میں زیر بحث ہیں ۔ اس طرح کے سوالات یوں تو دنیا کے ہر ادب میں زیر بحث آتے رہے ہیں مگر ہمارے ادب میں ایسے سوالات کی نوعیت یوں مختلف ہوجاتی ہے ہمارے یہاں ایک آدھ کے استثناء کے ساتھ سماجی ذمہ داریوں کی باتیں کرنے والے دو چار ادیب بھی ان ذمہ داریوں سے عہدہ برا ہونے کا کوئی عملی ثبوت نہ فراہم کرسکے ۔ ایسے عالم میں جب ادیب کا سماجی منصب اس حد تک مبہم اور صرف نظریہ سازی پر مبنی ہو کوئی ادب یا ادیب کی غیر ادبی افادیت کی بات بھی کیسے کرے ــــــ کہ اس افادیت کا ثبوت افادیت پسندوں کی شخصیت یا ان کے ادب تک میں بھی کہیں ڈھونڈے سے نہیں ملتا ۔

جہاں تک عام قاری سے ادیب کی مفاہمت کا سوال ہے ، تو جناب ! پوری مفاہمت تو کوئی اوسط درجے کا اخبار بھی نہیں کر پاتا ــــــ مفاہمت کی باتیں کرنے والے مختلف افراد کی ذہنی سطح ، نفسیاتی کیفیات اور غیر مسطح علمی اور تفہیمی قد و قامت سے ناواقف ہیں ــــ اگر صرف اتنا سمجھ لیا جائے کہ ادب کی تخلیق عوام کی ضرورت نہیں بلکہ خود ادیب اور شاعر کی ضرورت ہوتی ہے ، تب بھی ہم کسی نتیجہ تک بہ آسانی پہنچ سکتے ہیں ۔ دنیا کے تمام علوم و فنون میں کوئی

آئینہ

الفاظ — ادارے

اداریہ

ادیب کا سماجی منصب کیا ہے؟ کیا ادیب سماجی فلاح وبہبود کے لئے ادب کے وسیلے سے کوئی خدمت انجام دے سکتا ہے؟ ادب کا تعلق ادیب کی ذات سے ہوتا ہے یا ذات کی حدوں سے پرے شروع ہونے والے سماج سے؟ کیا ادیب نے ادب کے مبادیات تک سے ناواقف عوام سے مفاہمت کا ٹھیکہ لے رکھا ہے؟ یہ اور اس نوع کے سوالات گزشتہ چالیس سال سے اردو ادب میں زیر بحث ہیں۔ اس طرح کے سوالات یوں تو دنیا کے ہر ادب میں زیر بحث آتے رہے ہیں مگر ہمارے ادب میں ایسے سوالات کی نوعیت یوں مختلف ہو جاتی ہے ہمارے یہاں ایک آدھ کے استثنار کے ساتھ سماجی ذمہ داریوں کی باتیں کرنے والے دو چار ادیب بھی ان ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کا کوئی عملی ثبوت نہ فراہم کر سکے۔ ایسے عالم میں جب ادیب کا سماجی منصب اس حد تک مبہم اور صرف نظریہ سازی پر مبنی ہو کوئی ادب یا ادیب کی غیر ادبی افادیت کی بات بھی کیسے کرے ——— کہ اس افادیت کا ثبوت افادیت پسندوں کی شخصیت یا ان کے ادب تک میں بھی کہیں ڈھونڈے سے نہیں ملتا۔

جہاں تک عام قاری سے ادیب کی مفاہمت کا سوال ہے، تو جناب! پوری مفاہمت تو کوئی اوسط درجے کا اخبار بھی نہیں کر پاتا ——— مفاہمت کی باتیں کرنے والے مختلف افراد کی ذہنی سطح، نفسیاتی کیفیات اور غیر مسطح علمی اور تفہیمی قدوقامت سے ناواقف ہیں ——— اگر صرف اتنا سمجھ لیا جائے کہ ادب کی تخلیق عوام کی ضرورت نہیں بلکہ خود ادیب اور شاعر کی ضرورت ہوتی ہے، تب بھی ہم کسی نتیجہ تک بہ آسانی پہنچ سکتے ہیں۔ دنیا کے تمام علوم وفنون میں کوئی

بھی علم یا فن ایسا نہیں جو اپنی بنیادی اصلاحات یا مبادیات سے واقفیت کا مطالبہ نہ رکھتا ہو۔ پھر یہ ستم ادب کے ساتھ کیوں روا رکھا جائے اور یہ توقع کیوں کی جائے کہ ادب عوام کی چیز ہے، عوام کے ذریعہ وجود میں آتا ہے اور عوام کے مصرف کے لئے ہے۔ اگر کوئی ادیب ان میں سے کسی ایک شرط کو بھی پورا نہیں کرتا تو اسے گردن زدنی قرار دے دیا جائے۔

عوام پسند ادیبوں کی گزشتہ تیس چالیس سال کی ادبی قلابازیوں کا جائزہ لیجئے تو بعض عجیب وغریب حقائق سامنے آئیں گے ـــــ اقبال کو ابتدا میں فاسسٹ اور رجعت پسند کہا جاتا ہے اور کچھ ہی دنوں بعد اپنا عقیدہ یوں تبدیل کیا جاتا ہے کہ اچانک اقبال کے کلام میں سارے اشتراکی تصورات کی گونج سنائی دینے لگتی ہے ـــــ سعادت حسن منٹو کو ذہنی مریض اور مضرِ انسانیت گردانا جاتا ہے اور رفتہ رفتہ اسی منٹو کو اس طرح اپنانے کی کوشش شروع ہوتی ہے گویا وہ افادیت پسند گروہ کے سرخیل رہے ہوں ـــــ قرۃ العین حیدر کو فراریت پسند، میراجی کو نفسیاتی مسئلہ اور راشد کو ہیئت پسند کے ناموں سے موسوم کیا جاتا ہے مگر ایک منزل ایسی آتی ہے جب قرۃ العین حیدر کے یہاں سماجی شعور کی جستجو اور راشد کی سیاسی اور سماجی بیدار مغزی کو تسلیم کرنے کے علاوہ کوئی اور چارۂ کار دکھائی نہیں دیتا۔

ان حقائق کو سامنے رکھ کر صرف ایک بات سامنے آتی ہے، وہ کہ آپ کا ادبی موقف کچھ بھی نہیں ہے ـــــ آپ اس خوف سے اپنے ادبی عقیدے تبدیل کرنے پر مجبور ہیں کہ اگلی نسلیں آپ پر ادب ناشناسی کا الزام نہ صادر کریں ــ آپ کا مسئلہ ادب نہیں سماجی منصب ہے ـــــ ادب سے خلوص باقی نہ رہے، سماجی مناصب زندگی کا مقصد بن جائیں، ادب کو دنیا داری کے وسیلے کے طور پر استعمال کیا جانے لگے۔ گروہ بندی معصوم اور نابالغ ذہنوں کا غلط استعمال شب و روز کا مشغلہ تو جان لینا چاہئے کہ ایسے ادب کی کشتی ڈوب چکی ہے، اقدار فنا ہو چکے ہیں اور اس ادب کے علم برداروں کی ادبی اخلاقیات تباہ و برباد ہو چکی ہے۔

ـــــ ابوالکلام قاسمی

ترجمہ: ایس۔ این۔ شاہ

جیکب سلونے

آئزک سنگر

(۱۹۷۸ء کا نوبل لاریٹ)

یہودی مذہبی پیشوا کا بیٹا جو یہودیوں کی قدیم
زبان "یدش" میں لکھتا ہے اور جس کا موضوع پولینڈ
کا چھوٹا سا یہودی طبقہ ہے۔ مگر اس کی تخلیق یقیناً
عالمگیر انسانی زندگی پر روشنی ڈالتی ہے۔

آئزک سنگر ایک غیر معمولی شخصیت کا مالک ہے۔ ۷۴ سال ہوئے وارسا میں پیدا ہوا تھا لیکن ۱۹۳۵ء میں امریکہ ہجرت کر گیا اور وہاں کی شہریت قبول کر لی۔ اور بہت دنوں تک امریکہ میں نکلنے والے یہودیوں کے ایک روزنامہ میں افسانے اور قسط وار ناول شائع کراتا رہا۔ اس کی تخلیقات سے لوگ متاثر ہونے لگے۔ گو وہ اب انگریزی سے بخوبی واقف ہو گیا ہے لیکن لکھتا برابر اپنی زبان یدش میں ہی ہے۔ انگریزی میں ترجمہ کے توسل سے وہ اس دور کے اعلیٰ ترین ادیبوں کی صف میں شامل ہوا اور عالمگیر شہرت حاصل کی۔

سنگر ایک یہودی مذہبی عالم اور پیشوا کا بیٹا ہے۔ جو ایک کٹر یہودی فرقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ کچھ عرصہ تک سنگر نے خود بھی مذہبی تعلیم حاصل کی لیکن اور بہت سے یہودیوں کی طرح اس نے بھی مذہبی تعلیم کو خیرباد کہہ کر غیر مذہبی مقاصد و معروفیات کو اپنا لیا۔ لیکن اس کی تخلیقات میں مذہبی فلسفیانہ تصورات بھرے پڑے ہیں۔ اس کا بڑا بھائی آئی۔ آئی سنگر ایک اعلےٰ درجہ کا ناولسٹ تھا۔ اپنے بھائی کی شہرت کے سائے سے بچنے کے لئے اس نے اپنی ماں کا نام اپنے نام میں شامل کر لیا۔ وارسا کے فن کاروں اور دانشوروں کے جو گروپ دوسری جنگ سے پہلے قومی اور انقلابی جذباتی ہیجان سے گذر رہے تھے کچھ عرصے وہ بھی ان کا سرگرم رکن رہا۔ مگر جلد ہی ان سے علیحدہ ہو گیا۔ اس لئے کہ اس کے مزاج کی انفرادیت اسے کسی بھی سماجی یا سیاسی اجتماعی تحریک وعقیدہ کی دنیا سے دور رکھنا چاہتی تھی اور اس میں ضم ہو جانا

اس کے لئے ممکن نہ تھا۔

یدش زبان جو وسطی اور مشرقی یورپ کے یہودیوں کی قدیم زبان ہے۔ قرون وسطیٰ سے لے کر دوسری جنگ عظیم سے پچاس سال پہلے تک (جبکہ یہودی مغربی یورپ اور امریکہ کو ہجرت کرنے لگے تھے) ایک مرتی ہوئی زبان تصور کی جاتی تھی۔ جرمنوں کے ہاتھ ۶۰ لاکھ یہودیوں کے قتل عام کے بعد یدش زبان کے لئے ختم ہو جانے کے سوا کیا باقی رہ گیا تھا لیکن وہ پھر بھی چند چھوٹے چھوٹے تمدنی اور تہذیبی مرکزوں میں سانس لیتی رہی۔ یہ چھوٹے چھوٹے مرکز نیویارک اور اسرائیل میں تھے۔ ظاہر ہے سنگر کے پڑھنے والے بہت تھوڑے سے لوگ تھے لیکن آہستہ آہستہ بدلتے وقت کے ساتھ یہودی نوجوانوں نے اپنی جڑوں کا کھوج لگانے اور اس سے رابطہ قائم کرنے کی سعی میں اس سسکتی ہوئی قدیم زبان کو دوبارہ زندہ کیا۔[۱]

ایک نظر میں دیکھئے یدش جس میں محاوروں کی بھرمار ہے، ترجمہ کے اعتبار سے بہت مشکل زبان ہے لیکن پھر بھی سنگر کی تخلیقات کا اتنی کامیابی کے ساتھ ترجمہ کر لیا گیا کہ دنیا کے طول و عرض میں اس کے پڑھنے والے بیشمار ہیں۔

ایک اور عجیب پہلو یہ بھی ہے کہ حالانکہ سنگر بنیادی طور پر ایک چھوٹے سے مخصوص مذہبی طبقہ کے بارے میں لکھتا ہے۔ کہ جسکی ایک خاص تاریخ ہے لیکن جیسا کہ سویڈش اکاڈمی نے نوبل پرائز دیتے ہوئے اس کے بارے میں لکھا ہے "احساس کی گہرائیوں سے پیدا ہونے والا اس کا فن ـــــ جس کی جڑیں پولینڈ کے یہودیوں کی روایات میں پیوست ہیں عالمگیر انسانی زندگی کے پہلو روشن کرتا ہے" وہ اخلاقی قدروں کی کارکردگی میں یقین نہیں رکھتا اور اس کی تحریریں ہماری زندگی میں یقینی طور پر شیطانی ارواح بد کے پھیلے جال اور کامرانی کا اعلان نظر آتا ہے۔ پھر بھی سنگر دنیا کے عظیم فن کاروں میں لیوٹالسٹائے جیسے معلم اخلاق کا پسند کرنے والا ہے۔ اور سویڈش اکاڈمی نے بجا طور پر اس کے تعریفی اعلان میں اس کے وسیع اور پرکار تخیل کو ٹالسٹائے کے بظاہر لامحدود نفسیاتی خزانے کے ہم پلہ قرار دیا ہے۔

اس کے پلاٹ عام طور پر پرانی چال کے کھیل تماشوں کے ڈھنگ کے ہوتے ہیں۔

---

[۱] اُردو کے مستقبل سے مایوس اصحاب غور فرمائیں ـــــ ایڈیٹر

ستی - اگست ۶۹ء

لیکن ان میں ایک گہری جنسی نرگسیت پائی جاتی ہے۔ اس کے ہیرو اور ہیروئنیں اپنے آپ کو خود جنسی جھگڑوں اور کارناموں میں پھنساتے ہیں۔ بالکل ہنیری ملر کے سے کردار کی طرح۔ مگر جنسی افعال کا بالتفصیل اور وضاحت کے ساتھ بیان اس کے یہاں کہیں کہیں نہیں ہے۔ اور اس جگہ یہ بھی ایک قابل ذکر بات ہے کہ جب سنگر کو بتایا گیا کہ اسے نوبل پرائز مل گیا ہے تو اس نے کہا کہ اس کا خیال ہے کہ یہ پرائز ملر کو ملنا چاہیے تھا۔ اس لئے کہ ملر ادب کی مکمل آزادی کے لئے ہمیشہ لڑتا رہا ہے۔

دوسرے مشہور مصنفوں کی طرح سنگر بھی طرح طرح کے تضادات کا مجموعہ ہے۔ ڈکنس کی طرح وہ بھی عوام و خواص دونوں کے لئے لکھتا ہے۔ اس کی تحریر میں عام اور کبھی کبھی بہت غیر معمولی دونوں ہی انداز پائے جاتے ہیں۔ ڈکنس کی طرح وہ بھی بہت پابند اور باشعور فن کار ہے۔ وہ روز لکھتا ہے (جن دنوں میں اس کے ناول "گورے میں شیطان" کا ترجمہ کر رہا تھا تو اس نے مجھے تاکید کی تھی کہ سہ پہر سے پہلے میں اسے فون نہ کروں اس لئے کہ وہ روزانہ اخبار کے لئے پابندی سے کام کرتا ہے۔) اس کا ترشے ہوئے کردار تخلیق کرنے کا فن بھی ڈکنس جیسا ہے۔ وہ چند الفاظ میں چند اشاروں میں بڑی ذہانت کے ساتھ قاری کے سامنے مکمل کردار پیش کر دیتا ہے۔ ایک ضدی مگر پریشان ذہن عالم کا پورا کردار صرف دو بڑی اچھی مگر چھوٹی چھوٹی سی کیفیتوں کی تصویر سے اس طرح چھلکتا ہے: "پادری بنیش نے اپنی بھاری ابرو جو سیدھی آنکھ کے اوپر لٹک آئی تھی انگشت شہادت اور انگوٹھے کی مدد سے اوپر اٹھائی تاکہ وہ اپنی آنکھ استعمال کر سکے۔" "تھوڑی تھوڑی دیر بعد پادری بنیش اپنی کرسی پر جا کر بیٹھا تھا اپنی چابی کو اپنی پیشانی میں زور سے گڑا دیتا تھا تاکہ وہ جاگتا رہے ورنہ چند ہی لمحوں میں خراٹے بھرنے لگے گا۔"

ایک بکھرے دماغ تیز مزاج آدمی کا خاکہ سنگر مشہور ناولسٹ بالزاک کے سے انداز میں چند لائنوں میں کیسی خوبی سے کھینچتا ہے: "اور لمبے قد کا قدرے جھکا ہوا آدمی تھا۔ وہ تیزی سے چلتا پھرتا تھا اور ذرا بات پر ناراض ہو کر چیخنے چلانے لگتا تھا۔ اس کا مسلا کچیلا ہیٹ ہمیشہ ٹیڑھا رہتا تھا۔ قمیض کا گریبان کھلا اور بنیان پر دھبے پڑے ہوئے۔ ناک خمدار چونچ کی طرح دو بڑی بڑی پرندوں کی سی آنکھیں۔ داڑھی بھوسے کے رنگ کی

میل ایمی ہوئی؟" سنگر خاص خاص ٹائپ کی سوشل شخصیتوں کو خوب سمجھتا ہے اور بڑی خوبصورتی سے انھیں افراد میں ڈھال کر ہمارے سامنے پیش کرتا ہے۔ ایک بڑے خاندان کی خاتون کا خاکہ ہلکے سے کینہ پرورانہ جذبے کے ساتھ ان الفاظ میں کھینچتا ہے "خاتون چندہ جمع کرنے کا دورہ کر رہی ہیں کسی کارِ خیر کے سلسلہ میں" گھر گھر اس عورت نے چٹخیلے اچار مربے چکھے جنھیں محنتی گھر گرہستنوں نے گرمیوں کے دنوں میں تیار کر کے رکھا تھا چکھنے کے بعد اپنے پادریوں کی سی چونچ نما ناک صاف کی۔ اور اپنی آستینوں کی سلک سے آنسو پونچھے جو بڑھاپے مرجھائے رخساروں پر ڈھلک آئے تھے۔ اور بھاری بھرکم ساٹن کے کوٹ پر لگے جھلملاتے نگینوں کا ساتھ نبھا رہے تھے۔ اس عورت کے پاس سے شہد کے کیک کی ـــــ آرام اور فرصت کی زندگی کی ـــــ دور دراز یہودی شہروں اور خوشی اور کامرانی کی خبروں کی مہک آ رہی تھی ـــــ مالداروں نے اسے سونے کی چیزیں بھی دیں جو اس نے سنبھال کر مذہبی عقیدت کے ساتھ رومال میں باندھ لیں ـــــ اس کی بیڑھے کے سینگ کی طرح مڑی ہوئی ناک سردی اور خدا کے خوف سے سرخ ہو رہی تھی۔"

یہ کلاسیکی اندازِ بیان ایک استادِ فن کار کا سا ہے۔ جو کلاسیکی موضوعات پر استعمال ہوا اور اس کا رنگ کلاسیکی انداز میں زندگی سے بھرپور ہے۔ اسے پڑھ کر ہمیں سروینٹیز اور ڈیفو کی یاد آتی ہے۔ یہ ادب عام انسان اور انسانی زندگی سے قریب ہونے کے تجربے اور مشاہدے سے جنم لیتا ہے۔ سنگر کے کردار صاف شناخت کئے جا سکتے ہیں اور یقیناً وہ ساری دنیا میں شناخت کئے گئے ہیں۔ ایک امریکی ماہر لسانیات نے مجھے بتایا ہے کہ سنگر کا اردو زبان میں بخوبی ترجمہ کیا جا سکتا ہے اس لئے کہ اردو ادب اس قسم کے اندازِ بیان اور موضوعات سے مالا مال ہے۔

سنگر جانتا ہے کہ وہ کوئی عوامی معانی تانے نہیں لکھتا بلکہ اس کی قوت اُسے اپنے کلچر سے ملتی ہے۔ سنگر سے نیویارک ٹائمز کے ایک انٹرویو میں پوچھا گیا کہ اس کی کہانیاں جو ایک چھوٹے سے یہودی طبقہ کے بارے میں ہیں کیوں دوسروں کو پسند آتی ہیں۔ اس نے بڑی صفائی سے کہ جیسا کہ اس کا انداز ہے جواب دیا "میں بتاتا ہوں ـــــ جب میں لکھنے بیٹھتا ہوں تو میں اپنے آپ سے یہ نہیں کہتا کہ میں یہودیوں کی

کہانی لکھ رہا ہوں۔ بالکل اسی طرح کہ جب کوئی فرانسیسی فرانس میں مکان بناتا ہے تو یہ نہیں کہتا کہ میں فرانسیسی انداز کا مکان بنا رہا ہوں۔ وہ تو بس مکان بنانا شروع کر دیتا ہے۔ اسے تو بس اپنے بیوی بچوں کے لئے ایک مکان بناتا ہے۔ چونکہ وہ فرانس میں بن رہا ہے اس لئے وہ فرانسیسی انداز کا ہی بن جاتا ہے۔ تو میں بھی جب کہانی لکھتا ہوں تو ایسی ہی کہانی لکھتا ہوں کہ جیسی لکھ سکتا ہوں اور جیسی لکھتا ہوں۔ میں یہودیوں کو خوب جانتا ہوں اور یدش زبان بھی۔ اسی لئے قدرتی طور پر میرے ہیرو اور میرے کردار یہودی ہوتے ہیں اور یہودیوں کی زبان یدش ہی بولتے ہیں۔ مجھے بھی آپ ہی کی طرح یا کسی کی بھی طرح انسان کی محبت یا دغابازی، تمنا یا امید یا نا امیدی کی کھوج رہتی ہے۔"

سنگر واضح طور پر یقین رکھتا ہے کہ قاری کے لئے انبساط ذہنی کا مواد فراہم کرنا ادیب کا بنیادی فریضہ ہے۔ اس سے کچھ سوالات کے جوابات یہ ہیں۔

(۱) کیا آپ نے محسوس کیا ہے کہ آپ ایک فوٹوگرافر کی طرح اپنی تصانیف میں ایک معدوم ہوتے ہوئے کلچر کو آئندہ کے لئے محفوظ کر رہے ہیں۔؟

"لوگ مجھ سے یہی کہتے ہیں اور جب وہ کہتے ہیں تو مجھے بھی محسوس ہوتا ہے کہ شاید ایسا ہی ہے لیکن میں جان بوجھ کر اس نظر سے لکھنے نہیں بیٹھتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ میں تخلیقی فن کار نہیں ہوں۔ اگر یہ سوچ کر لکھنے بیٹھتا کہ مجھے یدش زبان کو یا پولینڈ کی اس زندگی کو بچانا ہے یا امن لانا ہے یا دنیا کو بہتر بنانا ہے اس ڈھنگ کی باتیں میں نہیں سوچتا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ میری کہانی قاری کو ایک آدھ گھنٹے کی مسرت فراہم کرے گی اور بس ـــ اور یہی میرے لئے کافی ہے۔ میں قاری سے تعلق رکھنا ضروری سمجھتا ہوں اور پڑھنے والے ظاہر ہے کہ مصنف کو اسی پیمانہ پر ناپتے ہیں کہ وہ دلچسپ ہے یا غیر دلچسپ اور گو کہ کچھ اُن میں سے سیدھے سادے کم علم لوگ یا بالکل قدیم تصورات کے لوگ ہوتے ہیں۔ لیکن اتنی بات وہ بھی سمجھتے ہیں کہ ادیب اس دنیا کا سدھار نہیں کر پائے گا ـــــ جیسا کہ کچھ نوجوان ادیب آج کل سوچتے ہیں۔"

سنگر نقادوں سے اور اپنی تصانیف کی دور اندکار توجیہات کرنے والوں سے سب فن کاروں کی طرح گھبراتا ہے۔ لیکن اس ناگزیر مصیبت کے سلسلہ میں وہ دوسرے فن کاروں سے زیادہ فلسفیانہ رویہ رکھتا ہے۔ اس سلسلہ میں وہ یہ لطیفہ سنایا کرتا ہے

"ایک بار میں نے ایک ناول لکھا تھا۔ لبلن کا جادوگر اس کا ہیرو آخر میں جاکر اپنی حرکات پر
اظہار تاسف کرتا ہے اور عورتوں کے پیچھے بھاگنے سے توبہ کرتا ہے۔ کچھ دن بعد ایک ماہر
نفسیات نے مجھ سے بات کی اور کہا کہ میں نے آپ کا ناول پڑھا اور یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ
آپ نے ہیرو کو واپس اس کی ماں کے رحم میں بھیج دیا ہے۔ اب میں نے سوچا کہ یہ تو
میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ بہرحال میں نے اپنے آپ سے کہا کہ یہ شخص ایک اچھا خاصا
قاری ہے اور دوسروں کی طرح اگر یہ اس طرح سوچتا ہے تو ٹھیک ہے اس میں بھی
کیا نقصان ہے۔"

سنگر کی اس مزاجی کیفیت کا تجربہ میں بھی رکھتا ہوں کہ وہ اپنی تخلیقات کی تفہیم
کے بارے میں جھگڑوں سے کتنا بچتا ہے۔ جن دنوں میں نے اس کے ناول "گورے میں
شیطان" کا ترجمہ کیا جو سترھویں صدی کے ایک پولش یہودی گاؤں میں شیطنت اور
مسیحائی کے بارے میں ہے تو میں نے ان الفاظ میں اس کی تعریف کی تھی: "یہ شفاف اور
بھرپور بیان ہے اس تشنج کا جو انسان کے وجود کو چھلنی کر ڈالتا ہے جب بھی کوئی مربوط
اور مستحکم انقلابی تحریک سے سماج ٹوٹتا اور بکھرتا ہے۔ ٹکڑوں میں کرچوں میں ناممکن کو
حاصل کرنے کے لئے۔"

ایرونگ ہونے جو امریکہ کا ایک نامور نقاد ہے اس ناول پر بڑا اغیظ و غضب سے بھرا
تبصرہ کیا وہ تو بکھر پڑا اور اس کتاب سے سنگر کی امریکی اور پھر عالمی شہرت شروع ہوئی۔
اروِنگ ہونے جو ایک سیاسی مفکر ہے اور اس وقت امریکہ میں پرانے بائیں بازو مارکسزم
کا سب سے بڑا نمائندہ ہے، میرے الفاظ سے مجروح محسوس کیا اور میری رائے کو ضرورت
سے زیادہ سیدھا سادہ اور سطحی رویہ کہا اور کہا کہ یہ "نوجعت پسندوں" کے نقد و نظر کا
سماج کی انقلابی مسیحائی کے نظریہ کے خلاف رویہ ہے۔ سنگر نے جیسا کہ اس کی عادت ہے
ہم دونوں کے جھگڑے اور رائے دینے سے اعتراض کیا۔ ظاہر ہے کہ ہم دونوں ہی
اس کے معترف تھے۔

سنگر کا نمایاں انداز ہے بے تعلق ہو کر سوچنا اور اپنی بات کہے جانا۔ ایک گھٹیا
قسم کے بے وقوف عالم کو جس کی اس کے ساتھی خوب گت بنا رہے ہیں۔ اس لئے کہ وہ
مسیحا کی سچائی سے انکار کر رہا ہے۔ وہ اس طرح پیش کرتا ہے: "بہت سے نوجوان طالبعلم

شبنینا پر جھپٹ پڑے۔ اس کا گریبان پکڑ کر اسے گھسیٹنے لگے۔ شبنینا چیخا اور اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کرنے لگا۔ اس نے اپنی لمبی گردن آگے پیچھے گھمائی اور ڈوبتے آدمی کی طرح ہوا میں ہاتھ ہلائے۔ اس کا کوٹ پھٹ گیا اور اس کی چندیا پہ دھری گول چھوٹی سی یہودی ملاؤں کی ٹوپی نیچے گر پڑی۔ دو لمبی لمبی اُلجھے ہوئے بالوں کی موٹی موٹی قلمیں اس کے منڈے ہوئے سر سے شروع ہو کر نیچے لٹک رہی تھیں۔ اس نے اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کی مگر طالب علموں نے اس کا سر پکڑ لیا اور اس کی ٹکوں سے دُھنائی کرتے ہوئے کہ جیسے آٹا گوندھ رہے ہوں اُٹھا کر لے چلے۔

دیکھئے ایک خوفزدہ اپاہج لڑکی جس پر بھوت پریت کا اثر ہے اور جس کی جھاڑ پھونک کی گئی ہے اس کے بارے میں اس کے گاؤں کے لوگ کیسی کیسی باتیں کرتے ہیں: "ایک پڑوسی کہہ رہا تھا جو ایلزا کے قریب ہی ایک ڈھئے ہوئے مکان میں رہتا ہے کہ ریشیل ضروریات سے فارغ ہونے باڑے تک نہیں جاتی ــــ"

سنگر کبھی کبھی بے انتہا نرم دلی اور محبت سے لکھتا ہے۔ ایک جگہ بڑی دل سوزی سے وہ ریشیل کی مایوسی کا ذکر کرتا ہے جس وقت اس بدنصیب لڑکی کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسے ایک کٹر مذہبی بڈھے سے شادی کرنی ہے "تب ریشیل جو بالکل بادلی مشہور تھی اپنے نرم و نازک ہاتھوں سے اپنا منھ ڈھانپ کر رونے لگی۔ سسکیاں بھرنے لگی اور اپنے نصیبے بین کرنے لگی ــــ ایک سمجھدار اور عقل والی لڑکی کی طرح ــــ اس کے لانبے بال فرش کو چھو رہے تھے اور اس کے بچوں جیسے کندھے کانپ رہے تھے۔

ہندوستانی فلموں میں اکثر ہم اس درد ناک منظر کو دیکھتے ہیں۔ بالزاک، ڈکنس اور انیسویں صدی کے یوروپین ادب سے اور گوگول سے سنگر کا تعلق صاف نظر آتا ہے۔

ذہانت، طباعی، حسِ مزاح اور عوامی مزاج جو یدش ادب کی ممتاز خصوصیتیں ہیں سنگر کی تخلیقات میں بھی دلچسپی اور دلکشی کا باعث ہیں۔ سنگر کی بہترین کہانی "بیوقوف گمپل" یدش زبان کے مشہور مصنفین کے بھولے بدھوؤں کے مشہور کردار کی روایت کا سلسلہ ہے۔ مثلاً ایلشن کا کردار تی وی جو فڈلر کا ہیرو ہے یا پیریز کا کردار مونتشے جو جنت میں ملنے والا سب سے بڑا اجر ایک نرم گرم روٹی کو تصور کرتا ہے یا مینڈل کا کردار بنجمن جو اللہ کا نام لے کر بیت المقدس کے لئے نکل پڑا۔ جبکہ نہ اسے سمتوں کا پتہ نہ جغرافیہ کا علم نہ دنیا کی

سیاست سے واقفیت۔

سنگر کے فن کی انیسویں صدی کے استاد فن کاروں کے فن سے مشابہت اس بات کا ثبوت قطعی نہیں ہے کہ وہ ان لوگوں کا کوئی کمتر مقلد ہے۔ اور یہ بھی نہیں ہے کہ وہ ایک ایسا شخص ہو جو گئے وقتوں کا علم بلند کرتا رہتا ہے۔ بلکہ کئی باتوں میں تو وہ بے انتہا جدید ہے شیطنت کے کارفرمائی میں اس کی دلچسپی ہو سکتی ہے کہ اس کے یہودیوں کے پرانے بھوت پریت کے قصے کہانیوں اور ارواح خبیثہ کے بارے میں پراسرار کہاوتوں اور عقیدوں کے مطالعہ سے تعلق رکھتی ہو۔ مگر یہ تو آج کے داخلی روحانی کرب کا ایک حصہ مانا جاتا ہے۔ جیسا کہ اٹلی کے نقاد ماریو پرازنے لکھا ہے۔ اس کیفیت کی خاص چیزیں ایذا رسانی سے دلچسپی، غیر معقول رویے، خواب وخیال میں لاشیں، تشدد اور موت کا غالب احساس مانے جاتے ہیں۔ جس کا اظہار ہمارے عوامی کلچر میں ہو رہا ہے ——— (ایکزورسسٹ اور جاز کے قبیل کی کتابیں اس کی شاہد ہیں)

"بیوقوف گمپل" کا بہت اچھا ترجمہ پچھلے دنوں کے نوبل پرائز پانے والے سال بیلو جیسی اہم شخصیت نے کیا تھا۔ شاید کچھ لوگ اسی لئے ان دونوں یہودی مصنفوں کا رشتہ جوڑنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ لیکن سال بیلو یہودی روایات سے گہری واقفیت اور اپنے یورپین پس منظر سے تعلق کے احساس کے باوجود قطعی طور پر امریکی ہے۔ "میں تو امریکی ہوں۔ شکاگو میں پیدا ہوا ہوں۔ جیسا کہ ان الفاظ میں مارش اپنا تعارف کراتا ہے جو سنگر کی کہانیوں کے نیویارک کے باسیوں میں سے ایک ہے۔ لیکن ان کا نیویارک مہاجرین کا نیویارک ہے۔ وہ نیویارک جس میں یورپ میں تباہ کاری سے جان بچا کر بھاگے ہوئے انسان بستے ہیں۔ جو اپنے ساٹھ لاکھ بھائیوں کے قتل عام کے زخم سینے میں چھپائے جیتے ہیں۔

بڑی حد تک سنگر کی مماثلت پچھلی نسل کے یہودی مصنف شولم ایش سے ہے۔ وہ بھی مشرقی یورپ کا مہاجر تھا۔ وہ بھی یدش میں لکھتا تھا اور اس نے بھی انگریزی میں ترجمہ سے کافی شہرت حاصل کی۔

ایش نے سنگر اور اس کے بڑے بھائی کے بارے میں پیشین گوئی کی تھی: "تین شہر نام کی معرکۃ الآرا تصانیف میں جو اس نے یہودی خاندانوں کی کئی پیڑھیوں کی زندگی کے بارے میں لکھیں

یہ خاندان یورپ کے بڑے یہودی مرکزوں میں بسے ہوئے تھے۔ لیکن اس بیان میں اپنے ماتذاتی شہر کی کتاب میں وہ ایک معمولی فرد نظر آتا ہے۔ اس کی اصل عظمت اس کی کہانی کاری میں ہے خاندانوں کی داستان میں نہیں۔

نیویارک ٹائمز کے انٹرویو میں آخر میں سنگر نے اپنے مخصوص بے لاگ سنجیدہ اور لطیف حسِ مزاح سے معمور انداز میں بتایا کہ وہ "اپنی دنیا کا مرکز خیال" کسے سمجھتا ہے (درسی تحقیق کے موضوعات کے حساب سے) اُس نے کہا "اسپینوزا نے اپنی کتاب 'اخلاقیات' میں لکھا ہے کہ ہر چیز ایک شدید جذبہ بن سکتی ہے اور میرا بھی یہی خیال ہے۔ کوئی ایسی چیز نہیں ہے کہ جو ایک شدید جذبہ کی شکل اختیار نہ کر سکے۔ خاص طور پر اگر وہ چیز سیکس یا مابعد الطبیعات سے تعلق رکھتی ہے اور میرا اپنا خیال ہے کہ سیکس اور مابعد الطبیعات کا ایک دوسرے کا ساتھ ہے۔ جیسے کہ میں محسوس کرتا ہوں کہ اگر ایک شخص کی دوسرے شخص کے لئے چاہت صرف جسمانی نہیں ہوتی بلکہ اس میں روح کو بھی دخل ہوتا ہے دو افراد چاہے وہ مرد عورت ہوں یا عورت اور عورت یا مرد اور مرد ہوں جب ایک دوسرے کو سینے سے لگاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ ایک دوسرے کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے اور ایک دوسرے پر پاگلوں کی طرح فدا ہوتے ہیں تو یہ صرف جسمانی بھوک کی کارفرمائی یا کیفیت نہیں ہے۔ یہ اس کے سوا بھی کچھ ہے۔" انٹرویو کرنے والے نے کہا: "اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کے کام پر تحقیق کا موضوع ہوگا۔ 'جذبہ اور بے اعتدالی'، سنگر کی تخلیقات ہیں۔"

"جی ہاں! بالکل صحیح ـــــ اگر میں ڈین ہوتا تو میں آپ کو ابھی اسی لمحے پی۔ ایچ۔ ڈی دے ڈالتا۔" □

شہزاد منظر

آئزک باشے وِس سِنگر

سویڈش اکیڈمی نے ۱۹۷۸ء کا ادب کا نوبل انعام یہودی نژاد امریکی مصنف آئزک سِنگر کو عطا کیا ہے۔ آئزک سِنگر نواں امریکی مصنف ہے جسے یہ اعزاز حاصل ہوا ہے۔ اس سے قبل ۱۹۷۶ء سال کے لئے بھی ادب کا نوبل انعام ایک امریکی سال بیلو کو حاصل ہوا تھا۔ ابھی تک جن امریکی ادیبوں کو ادب کا نوبل انعام حاصل ہونے کا اعزاز حاصل ہوا ہے اُن میں پرل ایس بک، یوجین اُونیل، ولیم فوکنر، جان اسٹین بیک، اور آرنسٹ ہیمنگوے وغیرہ شامل ہیں۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ جن امریکی مصنّفوں کو ادب کا نوبل انعام حاصل ہوا ہے ان میں بعض ایسے ادیب بھی ہیں جنھیں ادبیات عالم میں زیادہ نمایاں مقام حاصل نہیں ہے اور ان کی شہرت اور مقبولیت بہت حد تک مقامی ہے، اس کے باوجود انھیں ادب کا نوبل انعام حاصل ہوا، اور دوسرے کئی اہم مقبول اور بین الاقوامی شہرت یافتہ ادیبوں کو نظر انداز کر دیا گیا جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ نوبل انعام کسی مصنف کی عظمت کو جانچنے کا معیار نہیں ہو سکتا۔ دنیا میں ایسے بہت سے مصنف موجود ہیں جو ادبیات عالم میں انعام حاصل کرنے والے مصنفوں سے کہیں زیادہ بلند مقام رکھتے ہیں۔ اس کے باوجود سویڈش اکیڈمی نے انھیں قابل اعتنا نہیں سمجھا۔ یہی وجہ ہے کہ اب دنیا میں نوبل انعام کی وہ وقعت اور اہمیت نہیں رہی جو آج سے ربع صدی پہلے تھی۔ آج سے پچیس سال قبل تک ادب کے اس بین الاقوامی انعام کو قدر کی نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا کہ اس وقت تک آج کی طرح انعام کے بارے میں شکوک و شبہات پیدا نہیں ہوتے تھے۔ اس دور میں بھی طالسطائی، چیخوف، جیمز جوئس، گورکی اور گالزوردی وغیرہ مصنفوں کو نوبل انعام نہیں ملا۔ اس کے باوجود کسی کو سویڈش اکیڈمی کی غیر جانبداری کے بارے میں شکایت پیدا نہیں ہوئی تھی لیکن

دوسری عالمگیر جنگ کے بعد سے سویڈش اکیڈمی نے یکے بعد دیگرے بعض ایسے لوگوں کو ادب اور امن کے انعامات دیئے کہ اس کی غیر جانبداری کے بارے میں شکوک پیدا ہوگئے۔

سویڈش اکیڈمی کی افریشیائی ادیبوں سے بے اعتنائی اور تعصب کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ جب سے نوبل انعامات کی تقسیم کا سلسلہ شروع ہوا ہے، آج تک صرف دو ایشیائی مصنفوں کو نوبل انعام کے لئے یا انعام کے قابل تصور کیا گیا ہے ان میں ایک رابندرناتھ ٹیگور اور دوسرے جاپانی ناول نویس کاواباتا ہیں۔ حالانکہ اس ایشیا میں خلیل جبران، ڈاکٹر طہٰ حسین، لوہسون بھی تھے اور علامہ اقبال اور لن یوتانگ بھی تھے۔ لیکن سویڈش اکیڈمی نے یورپ کے چھوٹے سے چھوٹے ملک کی چھوٹی سے چھوٹی زبان کا قطعی وغیر معروف مصنف تو نوبل انعام دیئے جانے کا مستحق سمجھا لیکن ایشیا و افریقہ میں کوئی پائے کا مصنف نظر نہیں آیا۔ تاہم جب بھی ادب کا نوبل انعام دیئے جانے کا اعلان ہوتا ہے تو لوگوں کی توجہ اُس مصنف کی جانب مبذول ہو جاتی ہے اور لوگ یہ جاننا چاہتے ہیں کہ اس سال ادب کا نوبل انعام جس مصنف کو ملا وہ کون ہے اور اُس کا ادبیات عالم میں کیا مقام ہے۔ چنانچہ اس سال جب امریکی مصنف آئزک سنگر کو انعام دیئے جانے کا اعلان ہوا تو لوگوں نے پہلا سوال یہ کیا کہ آئزک سنگر کون ہے اور امریکی ادب میں اُس کی کیا حیثیت ہے؟

آئزک باشیے وس سنگر ان امریکی مصنفوں میں سے نہیں جن کی شہرت امریکہ سے باہر بہت زیادہ ہو جیسا کہ اونیل، ہمینگوے، اسٹین بیک، کیوتے اور ایڈ ایک وغیرہ۔ وہ امریکہ کے باہر سال بیلو سے بھی کم معروف ہے۔ اس کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ دنیا کے مشہور مصنفین کے بارے میں حوالے کی کتاب "ٹوئنٹی ایتھ سنچری اوتھرز" میں اس کے بارے میں کوئی تفصیل نہیں ملتی ہے۔ ان کی نیم گمنامی کی وجہ یہ ہے کہ وہ انگریزی اور بجل مصنف نہیں بلکہ YIDDISH زبان کا مصنف ہے جو مشرقی یورپ کے یہودیوں کے درمیان بولی جانے والی ایک محدود زبان ہے۔

اس سے قبل کہ میں قارئین سے آئزک سنگر کو متعارف کراؤں اس زبان کے بارے میں مختصراً عرض کرتا ہوں، جس کا وہ اوریجنل مصنف ہے اور جس کے بارے میں قارئین زیادہ معلومات نہیں رکھتے۔ یدش (YIDDISH) جرمن زبان کا لفظ ہے جس کا مطلب "یہودی" ہے

یہ اُس زبان کا نام بھی ہے جو مشرقی یورپ کے یہودی بولتے بھی ہیں خصوصاً وہ یہودی جو مشرقی یورپ کے مختلف ملکوں سے ترک وطن کر کے امریکہ آ گئے ہیں یہ اُن یہودیوں کی اولاد ہیں جو قرون وسطیٰ کے جرمنی میں آباد تھے۔ اس زبان میں بہت سے عبرانی (HEBREW) اور آرامائیک (ARAMAIC) کے الفاظ شامل ہیں یہ زبان جدید جرمن زبان سے قطعی مختلف ہے۔ یدش زبان میں ان تمام زبانوں کے الفاظ شامل ہیں جہاں یہودی صدیوں سے آباد رہتے۔ یدش زبان میں اس وقت سب سے زیادہ الفاظ امریکی عوام الناس کے درمیان بولی جانے والی زبان کے شامل ہیں اس زبان کے لئے عبرانی رسم الخط استعمال کیا جاتا ہے۔

عبرانی زبان یہودیوں میں صرف عالم و فاضل طبقہ کی زبان ہے جبکہ یدش عام یہودیوں کی زبان۔ چنانچہ یہودی ادیبوں نے اسی زبان کو ادبی اظہار کے لئے منتخب کیا ہے۔ یدش زبان میں پندرھویں سے انیسویں صدی کے درمیان لوک ادب نے بڑی ترقی کی ہے۔ لیکن انیسویں صدی سے قبل اِس زبان میں تحریری ادب کا کوئی سُراغ نہیں ملتا ہے۔ جدید یدش زبان و ادب کا بابا "SHOLEM JAKOB ADRAMOYICH" ہے۔ جس کے بعد اس زبان میں کئی بڑے تخلیقی ادیب پیدا ہوئے۔ اس وقت صورتحال یہ ہے کہ دنیا کے مختلف حصوں سے ترک وطن کر کے امریکہ آنے والے یہودیوں نے یدش زبان و ادب کو بے حد ترقی دی ہے اور اس زبان میں ادب و صحافت نے بڑی ترقی کر لی ہے۔ ۱۸۵۷ء میں ابراہام کاہن نے "ڈیلی فارورڈ" کے نام سے پہلے یدش روزنامہ کی بنیاد رکھی۔ اُس کے بعد یدش اخبارات و جرائد شائع ہوئے۔ پہلی جنگ عظیم سے قبل یدش زبان و ثقافت کا سب سے بڑا مرکز مشرقی یورپ تھا لیکن پہلی اور دوسری جنگ عظیم کے دوران یدش کلچر کا سب سے اہم مرکز امریکہ بن گیا۔ انقلاب روس کے بعد یدش کلچر کا اشتراکی روس میں کافی فروغ ہوا اور وہاں اس زبان کے بڑے بڑے ادیب پیدا ہوئے۔ آج یدش وہاں عبرانی کی طرح ایک ترقی یافتہ زبان بن چکی ہے اور اِس وقت دنیا میں اِس زبان کے بولنے والوں کی تعداد ایک کروڑ بیس لاکھ ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران مشرقی یورپ میں آباد یہودیوں کی بزدلی اور روس میں یدش زبان کے چلن کے باعث اس کے بولنے والوں کی تعداد روز بروز کم ہو رہی ہے۔ اِسی لئے بعض ماہرین لسانیات کا خیال ہے کہ یدش، ایک انحطاط پذیر زبان ہے۔ ایک وقت آئے گا جب یہ زبان ختم ہو جائے گی لیکن یہودی اس زبان کو زندہ

رکھنے اور اسے ترقی دینے کی حتی المقدور کوشش کر رہے ہیں اور امریکہ، اسرائیل، جنوبی امریکہ، (خصوصاً ارجنٹائن) جنوبی افریقہ، آسٹریلیا اور انگلینڈ میں اس زبان کے احیا کی زور شور سے کوشش جاری ہے۔ یدش زبان کے تحفظ اور ترقی کے لئے ایک اکیڈمی اور انسٹی ٹیوٹ آف جولش ریسرچ بھی قائم کی گئی ہے۔

آئزک سنگر ۱۴ر جولائی ۱۹۰۴ء کو پولینڈ کے قصبہ (RAVHZYMIN) میں پیدا ہوا۔ اس کے والد یہودی راہب یعنی (RABBI) تھے۔ پولینڈ کا یہ حصہ اس وقت روس کے زیر تسلط تھا۔ وہ جب چار سال کا تھا کہ اس کے والدین اپنا آبائی گاؤں ترک کر کے "وارسا" چلے گئے۔ جہاں اس نے ابتدائی تعلیم حاصل کی اور یہیں سے اس نے عبرانی زبان میں ڈپلیٹ کیا۔ وہ اپنے بڑے بھائی اسرائیل جوزیف سنگر کی شخصیت اور علمیت سے بہت متاثر تھا۔ جو خود یدش زبان کا بہت مشہور ادیب تھا۔ آئزک سنگر نے پولینڈ کے قیام کے دوران ہی افسانہ نگاری اور ناول نویسی شروع کی۔ ابتدا میں اس نے عبرانی میں اور پھر یدش زبان میں کئی کتابیں لکھیں جو پولینڈ میں بھی شائع ہوئیں۔ ۱۹۳۵ء میں وہ اپنے بھائی اسرائیل سنگر کے پاس امریکہ آگیا اور نیویارک میں قیام پذیر ہوا۔ اسرائیل سنگر پہلے ہی یدش روزنامہ "جوئش ڈیلی فارورڈ" سے وابستہ تھا۔ آئزک بھی اسی اخبار سے وابستہ ہو گیا۔ اور اس میں آزادانہ طور پر افسانے، مقالات اور ادبی کتابوں پر تبصرے لکھتا رہا۔ آج چالیس سال گذر جانے کے بعد بھی آئزک اس اخبار کے لئے مضامین لکھ رہا ہے۔ اس کا پہلا ناول (THE IANICLY MOSKAY) اسی روزنامہ میں بالاقساط شائع ہوا۔ یہ ناول ہفتہ میں دو دن شائع ہوتا تھا۔ چنانچہ یہ ناول اس اخبار میں تین سال تک مسلسل شائع ہوتا رہا۔ وہ اُس دور کے بارے میں لکھتا ہے " اس زمانے میں اگر کوئی شخص مجھے فی ہفتہ پندرہ ڈالر معاوضہ بھی دیتا تو میں کام کرنے کے لئے آمادہ ہو جاتا تھا۔ کیونکہ ابتدا میں میں مالی طور پر بے حد پریشان تھا۔ وہ تقریباً بیس سال تک اپنی دوسری بیوی "آلمہ" پر انحصار کرتا رہا جو منین ہٹن کے ایک ڈیپارٹمنٹل اسٹور میں سیلز کلرک تھی۔ ۱۹۴۴ء میں جب اس کے بھائی اسرائیل سنگر کا انتقال ہوا تو اس وقت تک آئزک سینگر ادیب کی حیثیت سے تسلیم کیا جا چکا تھا لیکن اس کی شہرت اور مقبولیت صرف یدش زبان تک محدود تھی۔

یہ بات بے حد دلچسپ ہے کہ آئزک سنگر کے پیش نظر شہرت کا حصول کبھی بھی نہیں رہا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ کبھی ثابت قدمی کے ساتھ افسانے یا ناول نہیں لکھتا ہے۔ اُس کے بہترین ناول اور افسانے بھی اتفاقیہ تخلیق ہیں۔ اور پھر وہ ایسی زبان کا مصنف ہے جس سے بہت کم لوگ واقف ہیں۔ وہ چھیالیس سال تک اپنی کتاب کی اشاعت کا انتظار کرتا رہا اس کے بعد اس کے ناول کا پہلا انگریزی ترجمہ شائع ہوا جس نے اسے دنیا کے ممتاز مصنفوں کی صف میں کھڑا کر دیا۔ آئزک سنگر بنیادی طور پر یدش زبان کا مصنف ہے۔ اور وہ یدش زبان ہی میں لکھتا رہا ہے۔ البتہ اس کے دوست احباب اور عقیدت مند اس کے ناول اور افسانوں کے ترجمے کرتے رہے ہیں۔ اس دور میں جس نوجوان ناول نویس نے اُس کے "گیمپل دی فول" (GIMPEL THE FOOL) کا انگریزی ترجمہ کیا۔ وہ آج کا نوبل انعام یافتہ مصنف سال بیلو تھا۔ آئزک سنگر نے ایک انٹرویو میں بتایا کہ "میں کبھی کبھی اپنی کتاب کے ترجمے کے لئے آمادہ نہ تھا کیونکہ میں نہیں چاہتا تھا کہ میں یدش زبان کے بجائے انگریزی زبان کے ادیب کی حیثیت سے پہچانا جاؤں"

آئزک کو نوبل انعام ملنے سے قبل کئی دوسرے انعامات حاصل ہو چکے ہیں مثلاً اُسے ۱۹۵۵ء میں (LARAMED - PRIZE) حاصل ہوا۔ ۱۹۶۳ء میں اسے (DAROFF PRIZE) ملا۔ ۱۹۷۰ء میں اسے "نیشنل بک ایوارڈز" حاصل ہوا۔ ۱۹۵۹ء میں ہی اسے جوتش اکیڈمی آف آرٹس اینڈ سائینس کا فیلو مقرر کیا گیا۔ اسے جن دوسرے اداروں کا رکن منتخب کیا گیا "ان نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف آرٹس اینڈ لیٹرز" "پولش انسٹی ٹیوٹ آف آرٹس اینڈ سائینس ان امریکہ" اور "نیویارک سٹی۔ پی۔ ای۔ این" "امریکن اکیڈمی آف آرٹس اینڈ سائینس شامل ہیں۔

آئزک سنگر نے ۱۹۶۱ء میں مرتی ہوئی زبان کے دفاع میں کہا کہ "میں بھوت کے بارے میں افسانے لکھنا پسند کرتا ہوں اور بھوت کے بارے میں کہانیاں ایک مرتی ہوئی زبان میں ہی زیادہ بہتر طور پر لکھی جا سکتی ہیں۔ بھوت کو یدش زبان پسند ہے اور جہاں تک میرے خیال کا تعلق ہے بھوت اسی زبان میں بات کرتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ حشر کے روز جب لاکھوں کی تعداد میں یدش بولنے والے اپنی قبروں سے اٹھیں گے تو وہ سب سے پہلے سوال یہ کریں گے کہ کیا یدش زبان میں کوئی ایسی نئی کتاب شائع ہوئی ہے جو پڑھی

جا سکے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ آئزک سنگر کے ناولوں اور افسانوں کا زیادہ تر موضوع بھوت ہوتا ہے۔ سنگر کا تو یہاں تک دعویٰ ہے کہ وہ بھوت کے وجود کو ثابت کر سکتا ہے۔ سنگر ایک راسخ العقیدہ شخص ہے اور خدا کے وجود پر یقین رکھتا ہے لیکن قدیم روایات اور دقیانوسی خیالات اور کٹرپن کا سخت مخالف ہے۔ اس نے بھی اپنے بڑے بھائی اسرائیل سنگر کی طرح ریڈیکل راہ اختیار کی ہے۔ آئزک سنگر کے افسانے پلاٹ کے لحاظ سے بے حد پیچیدہ اور پر لطف ہوتے ہیں اور ان میں جنسی معاملات کا بہت کھل کر تذکرہ ہوتا ہے۔ آئزک سنگر کا کہنا ہے کہ مجھے اپنے افسانے اور ناولوں میں جنسی معاملات کا تذکرہ کرتے ہوئے کبھی شرم محسوس نہیں ہوئی۔

آئزک سنگر اگرچہ انگریزی بڑی روانی سے بولتا ہے لیکن وہ صرف اپنی مادری زبان یدش میں ہی لکھتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ "لکھتے وقت اسے یدش زبان میں جو توانائی محسوس ہوتی ہے وہ کسی دوسری زبان میں محسوس نہیں ہوتی۔ اس کی عمر جب پچاس سال تھی، اس وقت تک وہ آٹھ ناولوں، بچوں کے لئے دس کتابوں، چار یادداشتوں اور لاتعداد افسانوں کا مصنف بن چکا تھا۔ اس کے افسانوں اور ناولوں کے موضوعات زیادہ تر انجیل مقدس اور جوئش کبالا (JEWISH CABALA) کی پراسرار تحریروں سے ماخوذ ہیں اور اس نے طالسطائی اور چیخوف سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ وہ بنیادی طور پر افسانہ نگار ہے۔ ان تمام باتوں نے مل کر آئزک سنگر کو "انیسویں صدی کا عظیم مصنف" بنا دیا ہے۔ وہ نوبل انعام پانے والا واحد ناول نویس ہے جس نے اپنے بارے میں کبھی کوئی دعویٰ نہیں کیا۔ اسے جب ٹیلیفون پر پہلی بار نوبل انعام ملنے کی اطلاع ملی تو اسے یقین نہیں آیا اس نے سمجھا کہ اس کے نام کے بارے میں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے یا کسی نے مذاق کیا ہے لیکن اُسے جب بتایا گیا کہ یہ حقیقت ہے کہ اسے بھی نوبل انعام ملا ہے تو اس نے خدا کا شکر ادا کیا۔ آج جبکہ وہ نوبل انعام پانے کے بعد عالمگیر شہرت کا مالک بن چکا ہے وہ نہ اپنی زندگی کے طرز کو بدلنے کے لئے آمادہ ہے اور نہ اپنی طرز نگارش کو، اس کا کہنا ہے کہ ہر چیز حسب سابق رہیگی۔ وہی ٹائپ رائٹر، وہی بیوی، وہی گھر، وہی ٹیلیفون، وہی ٹیلیفون کا نمبر اور وہی زبان (یدش زبان)۔ میں خدا کا شکر گذار ہوں کہ اس نے مجھے یہ اعزاز، یہ شہرت اور یہ عزت بخشی۔ میں سویڈش اکیڈمی کا بھی شکر گذار ہوں کہ اس نے مجھے اس قابل سمجھا۔ اس کے ساتھ ہی، ہر افسانہ، ہر خیال، "ہر لفظ" ہر دن کے لئے خدا کا شکر گذار ہوں۔ □

آئزک سنگر ترجمہ: ایس۔ این شاہ

ایلکا اور میئر

جس رات میئر بونز اپنے آپ کو سونے کی اجازت دے دیتا تو اس کا سر ایک پتھر کی طرح تکیہ پر جا گرتا۔ اور اگر کوئی اس کی نیند میں مخل نہ ہو تو وہ سیدھا دس بارہ گھنٹے کے لئے بے خبر ہو جاتا تھا۔ لیکن اس رات ایسا نہیں ہوا۔ وہ بہت سویرے ہی جاگ گیا اسکی آنکھ پٹ سے کھل گئی اور وہ پھر نہ سو سکا۔ اس کا بھاری بھرکم جسم گہری سانسیں لے رہا تھا اور پہلو بدل رہا تھا وہ شدید جذبے اور پریشانی سے بے چینی محسوس کر رہا تھا۔

میئر بونز کوئی کمزور مزاج آدمی نہیں تھا۔ اپنی جوانی میں اس نے سیف توڑے تھے، چوریاں کی تھیں اور چوروں کے اڈے پر جہاں غنڈوں کا جماؤ رہتا تھا اپنی طاقت کے مظاہرے کئے تھے۔ کوئی بھی اس کا ہاتھ نہیں موڑ سکا تھا۔ اس نے اکثر ڈٹ کر کھانے اور شراب پینے پر بھی شرط لگائی تھی۔ وہ آسانی سے آدھی بطخ چٹ کر جاتا اور اوپر سے ایک درجن مگے بیئر کے پی لیتا تھا۔ اگر کبھی اتفاق سے وہ گرفتار ہو جاتا تو ہتھکڑیاں چٹخا دیتا اور پولیس کی گاڑی کا دروازہ چکنا چور کر دیتا۔

جب اس کی شادی ہو گئی اور اسے وارسا کی کفن دفن کی سوسائٹی کی طرف سے جو غریبوں اور لاوارثوں کے لئے کفن دفن کا انتظام کرتی تھی نوکری دے دی گئی تو وہ سیدھے راستے پر آ گیا۔ جب تک روسی پولینڈ پر حکومت کرتے رہے اسے بیس روبل تنخواہ کے ملتے تھے۔ اور پھر جب جرمن پولینڈ کے حاکم بنے تو اسے اتنی ہی رقم مارکس میں ملنے لگی۔ اس نے چور اچکوں اور دلالوں سے ملنا جلنا بند کر دیا۔ وہ ایک بڑی خوبصورت لڑکی سے محبت کرنے لگا تھا۔ وہ لڑکی جس کا نام بیلکا لٹواک تھا ایک امیر گھرانے میں کھانا پکاتی تھی لیکن جیسے جیسے وقت گذرتا گیا اسے احساس ہوا کہ اس نے شادی کے معاملے میں غلط انتخاب کیا ہے۔ پہلی بات تو یہ کہ بیلکا بانجھ تھی۔ دوسری یہ کہ بیمار تھی خون تھوکتی تھی۔

اور تیسری یہ کہ وہ اس کے تلفظ کو سخت ناپسند کرتا تھا۔ وہ اسے سوروں کی سی بولی کہتا تھا۔ آہستہ آہستہ اس کی خوبصورتی بھی ختم ہو گئی۔ جب وہ غصہ ہوتی تھی تو وہ ایسے کوسنے اور گالیاں دیتی تھی کہ جیسی اس نے کبھی سنی بھی نہ تھی۔ وہ پڑھی لکھی تھی اور روزانہ یدش زبان کے اخبار میں قسط وار چھپنے والے ناول پڑھا کرتی تھی کہ جن میں عورتوں کو دھوکہ دینے کے واقعات، رئیسوں کی جال سازیاں اور یتیموں کے برباد کرنے کے قصے ہوتے تھے۔ کھانے کے وقت میئر گراموفون پر تھیٹر کے گیت، دوگانے اور دوسرے ساز وغیرہ کے ریکارڈ سننا پسند کرتا تھا۔ مگر وہ بڑبڑاتی تھی کہ گراموفون کی آواز سے اس کے سر میں درد ہو جاتا ہے۔ اکثر جمعہ کی شام کو ان کا جھگڑا اس بات پر ہوتا تھا کہ میئر یونز مچھلی کو شکر ڈال کر پکوانا چاہتا تھا جیسا کہ اس کی آنجہانی ماں پکایا کرتی تھی مگر بیلکا بجائے شکر کے کالی مرچ ڈال کر پکاتی تھی۔ اور اگر کبھی جھلا کر میئر یونز اس کے دو چار ہاتھ اڑا دیتا تو وہ بیہوش ہو جاتی اور ڈاکٹر کو بلانا پڑتا۔

وہ وارسا چھوڑ کر بھاگ جاتا اگر خدا نے کہیں سے ریڈ ایلکا کو نہ بھیج دیا ہوتا۔ ریڈ ایلکا عورتوں کی میتوں کے لئے کفن تیار کرنے اور انھیں نہلانے کی ذمہ داری ادا کرتی تھی۔ ریڈ ایلکا کا نصیب بھی کچھ اچھا نہ تھا۔ اس نے جس شخص سے شادی کی تھی وہ بیمار رہتا تھا اور کچھ باؤلا سا تھا۔ اس کے علاوہ وہ پکا عیدی بھی تھا۔ اس کا نام تھا یونٹ شے۔ اور وہ جلد ساز تھا۔

۱۹۰۵ء کی اس خونی صبح جبکہ ٹاؤن ہال پر جمع ہونے والے انقلابیوں نے اعلیٰ حضرت زار سے آئین کی مانگ کی تھی اور کوسک سپاہیوں نے درجنوں انقلابیوں کو بھون ڈالا تھا۔ یونٹ شے کی ریڑھ کی ہڈی میں گولی لگی تھی۔ علاج کے سلسلہ میں اس کا ایک گردہ نکال دیا گیا اس کے بعد وہ پھر کبھی صحت مند نہیں رہا۔ ایلکا کے یہاں اس سے دو بچے ہوئے لیکن وہ زندہ نہیں رہے۔ دونوں سرخ بخار کی نذر ہو گئے۔ ایلکا جواب چالیس سال سے اوپر تھی اور میئر یونز سے تین سال بڑی تھی۔ اب بھی لڑکی سی لگتی تھی۔ اس کے سرخ بالوں میں جو ڈچ بوب اسٹائل کے کٹے ہوئے تھے۔ ایک تار بھی سفید نہیں تھا۔ وہ چھوٹی سی دبلی پتلی سی تھی اور آنکھیں بلی کی طرح سبز رنگ کی۔ ناک چونچ دار اور گال سیب کی طرح سرخ۔ ایلکا کی ساری طاقت اسکے دہانے میں تھی جب وہ ہنستی تھی تو

آپ آدھے محلے میں آواز سن سکتے تھے جب وہ کسی کو گالیاں دیتی تو لفظ اور فقرے اس کی تیز زبان سے گولی کی طرح نکلتے یہاں تک کہ سننے والا سوچتا رہ جاتا کہ ہنسے یا رُو دے۔ اس کے دانت بڑے مضبوط تھے اور لڑائی جھگڑے میں وہ کتیا کی طرح کاٹ کھاتی تھی۔

جب ایلکا پہلی دفعہ سوسائٹی میں آئی اور میٹر بوتز نے اس کی حرکتیں نوٹ کیں تو وہ اس سے بہت ڈرا۔ وہ مُردوں سے ایسے ہنسی اور مذاق کرتی تھی جیسے وہ زندہ ہوں۔ "چپ — لیٹی رہ چپ چاپ" وہ کسی لاش سے کہتی "شرارت نہ کر تجھے لکڑی کی پیٹی کے اندر بند کر کے ابھی روانہ کرتے ہیں — بس ناچ لی جتنے دن زندگی کے ملے تھے — سوچا اب آرام سے۔"

ایک بار میٹر نے دیکھا کہ ایلکا نے اپنے منہ سے سگریٹ نکال کر میّت کے منہ میں لگا دی۔ میٹر نے اس سے کہا کہ میت کے ساتھ یہ سب نہیں کرنا چاہیئے۔

"تم فکر مت کرو" اس نے کہا "میرے تو کوڑے پڑنے ہیں ہی جہنم میں دو ایک اور سہی" اور پھر خود ہی اپنے چوتڑوں پر ایک دھپ مارا۔

زیادہ دن نہیں گذرے تھے کہ میٹر بوتز ایلکا کی طرف کھنچنے لگا۔ اتنی وارفتگی کے ساتھ کہ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ وہ اس کے ساتھ بھی ہوتی تب بھی وہ اس کے لئے تڑپنے لگتا۔ اس کی تیکھی باتوں سے اُس کا جی نہ بھرتا۔

بچپن میں اور بڑے ہو کر بھی اکثر میٹر بوتز نے شیخی بگھاری تھی کہ وہ کبھی ایک عورت کے دامن سے نہیں بندھا رہ سکتا۔ جب بھی کوئی اس پر پھندہ ڈالتی وہ صاف کہہ دیتا تھا کہ چل اپنا راستہ لے۔ اندھیرے میں ساری بلّیاں ایک ہی رنگ کی ہوتی ہیں۔ مگر ایلکا کی چاہت کو وہ روک نہ پایا۔ وہ اس کا مذاق بناتی تھی۔ اس کے بھاری بھرکم جسم کا۔ اس کے بڑے بڑے ہاتھ پیروں کا۔ اس کی زبردست خوراک اور گھڑگھڑاتی آواز کا۔ وہ اسے مذاق میں میرا ریچھ میرا بھینسا کہہ کر پکارتی اور پھر اس کے سیدھے کھڑے ہوئے بالوں سے کھیلنے لگتی اور ان کی چوٹی گوندھتی تھی۔

ایلکا اور میٹر بوتز کو اتنا وقت ایک دوسرے کے ساتھ نہیں مل پاتا تھا کہ جتنا وہ چاہتے تھے۔ وہ اس کے گھر نہیں جا سکتی تھی اور نہ وہ اس کے گھر آسکتا تھا۔ وہ ایسے کمروں کی تلاش میں رہتے تھے جہاں رات گذار سکیں۔ اور نام دپتہ نہ لکھانا پڑے لیکن اکثر

وہ یہ بھی نہیں کر پاتے تھے۔ کیونکہ اس سے پہلے کہ وہ اپنے گھروں سے روانہ ہوتے انھیں کسی سانحے کے مقام پر بلایا جاتا کہ جہاں یا تو کوئی گاڑی کے نیچے آگیا ہوتا یا گلے میں پھندا لگا کر مرگیا ہوتا، جل مرا ہوتا یا کھڑکی سے نیچے چھلانگ لگا چکا ہوتا ایسے واقعات میں پولیس پوسٹ مارٹم چاہتی تھی اور چونکہ یہودی قانون کے مطابق پوسٹ مارٹم منع ہے تو پولیس کو یا تو رشوت دے کر یا دھوکہ دے کر میت کو چھڑانا ہوتا تھا۔ ایسے موقعوں پر ایلسکا بڑے کام کی ثابت ہوتی تھی۔ وہ روسی اور پولش دونوں زبانیں بول سکتی تھی اور جب ۱۹۱۵ء میں جرمنوں نے وارسا پر قبضہ کر لیا تو اس نے جرمن پولیس والوں سے کچھ جرمنی زبان کے لفظ اور کچھ یدش زبان کے لفظ ملا ملا کر باتیں بنانے کی پریکٹس کر لی۔ اور ایسے موقعوں پر جرمن پولیس والوں سے ہنس بول کر اور آنکھیں لڑا کر بڑی استادی سے بنیک کے کرارے نوٹوں کی گڈی ان کی جیب میں اتار دیتی تھی۔

ایلکا نے اپنی ترکیبوں سے میئر بونز کو پہلے اپنا اسسٹنٹ اور پھر گاڑی بان اور آخرکار جب سوسائٹی نے کار خریدلی تو کار کا ڈرائیور بنوایا۔ کار میتوں کو دور سے لانے میں کام دیتی تھی کبھی کبھی ان دونوں کو میت لانے کے لئے رات کے وقت دور جانا پڑتا۔ کار کھیتوں اور جنگلوں سے گذرتی ہوتی۔ اور محبت کرنے کا بہترین موقع انھیں ہاتھ لگتا۔ ایلکا میئر کے ساتھ بیٹھ جاتی تھی اور شکرے سی نظر سے بھانپتی جاتی تھی کہ کون سی جگہ تھوڑی دیر آرام کرنے اور لطف اٹھانے کے لئے اچھی رہے گی کہ جہاں کوئی مخل نہ ہو۔ وہ میئر سے کہتی "میت تھوڑا انتظار کرے ـــــ کیا جلدی ہے۔ ارے قبر تھوڑے ہی کھٹی ہو جائے گی" جب وہ میئر کو پیار کرتی یا اپنے آپ کو اس کے سپرد کرتی تو برابر سگریٹ پیتی رہتی تھی۔ گو اس کے بچہ پیدا کرنے کے دن گذر چکے تھے مگر خواہش اور بڑھتی جا رہی تھی۔ میئر جب اس کے ساتھ ہوتا تھا تو وہ بھول جانا چاہتا تھا کہ وہ کفن دفن کرنے والی سوسائٹی میں ملازم ہے۔ مگر وہ اسے بھولنے نہیں دیتی تھی۔ کبھی وہ کہنے لگتی " او میئر جب تو مرے گا تو کتنی بھاری لاش بنے گا ـــــ بارہ آدمیوں کی ضرورت پڑے گی تجھے کندھا دینے کے لئے۔"

"چپ رہ!"

"کیوں ڈرنے لگا ـــــ ارے کوئی نہیں بچ سکتا موت سے۔"

ایلسکا میئر پہ اتنی چھا گئی تھی کہ جو چیزیں میئر کو بُری لگتی تھیں اب وہ اچھی لگنے

لگی تھیں۔ اس نے ایلکا کے انداز اختیار کرنے شروع کر دیئے تھے۔ اُس کی پسند کی سگریٹ پیتا۔ اس کے پسند کے کھانے شوق سے کھاتا۔

ایلکا نشے میں بدمست کبھی نہیں ہوتی تھی۔ لیکن پینے کے بعد ذرا بدتمیز ہو جاتی تھی۔ وہ کفر کی باتیں کرنے لگتی۔ موت کے فرشتہ کا مذاق اڑاتی۔ جہنم کے حاکموں اور جنت کے معصوموں کو ہنسی کا نشانہ بناتی۔ ایک بار میٹر نے اسے ایک لاش سے یہ کہتے سنا۔

"آرام سے سو جا فکر مت کر۔ تو نے جو پیسا اپنی بیوہ کے پاس چھوڑا ہے اس کا دوسرا خصم خوب عیش کرے گا۔" پھر اس نے مُردہ آدمی کی بغل میں گُل گُلی کر دی۔

میٹر زیادہ سوچنے سمجھنے والا آدمی نہیں تھا۔ جب بھی وہ سوچنا شروع کرتا تو اُس کا دماغ دھندلا جاتا اور اسے نیند آنے لگتی۔ مگر وہ محسوس کرتا تھا کہ ایلکا کا مُردوں کے ساتھ یہ رویہ کسی بیہودہ خواہش کی بنا پر ہے۔ جو اُس کے دماغ میں ایک دراڑ کی طرح کھنچی ہوئی ہے۔ پھر وہ سوچتا کہ ہر عورت جس سے اس کے تعلقات رہے تھے کچھ نہ کچھ ٹیڑھی تھی۔ میٹر کو ایک ایسی بھی ملی تھی جس نے اسے حکم دیا تھا کہ اُسے رستے سے مارے اور اس کے اُوپر تھوک دے۔ کبھی کبھی جب وہ قید ہوا تھا تو جیل میں ساتھی قیدیوں سے اُس نے ایسے واقعات سُنے تھے کہ اسکے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے۔

اب چونکہ اس نے ایلکا سے اپنا عشق چلا دیا تھا تو طرح طرح کے خیالات اس کے ذہن پر ٹڈیوں کی طرح ٹوٹ پڑے تھے۔ آج رات وہ اپنے گھر سو رہا تھا۔ علیحدہ ایک پلنگ پر۔ اور دوسرے پر تھی اس کی بیوی بیلکا۔ وہ کئی گھنٹے سوتا رہا تھا۔ لیکن یکایک اُس کی آنکھ کھل گئی، ایک ایسے آدمی کی طرح جو بڑی اُلجھن میں پڑ گیا۔ برابر پڑی بیلکا خراٹے لے رہی تھی۔ ناک کے نتھنوں سے سیٹیاں بج رہی تھیں اور وہ کبھی کبھی نیند میں آہیں بھرتی تھی۔ میٹر نے اس سے طلاق کی بات کہہ دی تھی اور یہ پیش کش بھی کر دی تھی کہ وہ اسے اخراجات دیتا رہے گا لیکن بیلکا نے صاف منع کر دیا تھا۔ رات کے اندھیرے میں میٹر کی نظر کے آگے صرف ایلکا کا چہرہ گھوم رہا تھا وہ پیار سے ہنس بول رہی تھی۔ اس کا مذاق اڑا رہی تھی۔ اس کے عجیب عجیب نام رکھ رہی تھی۔ ایلسکا با عصمت تو کیا بلکہ ایک نمبر حرامکار تھی۔ وہ برسوں محبہ خانے میں رہی تھی اور یقیناً انگنت مردوں سے مل چکی تھی۔ اتنی کہ شاید میٹر بوزنر کے سر پر بال بھی نہ تھے۔ ایک بار

وہ بری طرح عشق میں گرفتار ہوئی تھی۔ وہ ایک وَتّے پہ مرمٹی تھی جس کا بعد میں قتل ہو گیا۔ ایلکا اس کے لئے آج تک روتی تھی لیکن یہ سب معلوم ہونے کے باوجود میٹر یونز قطعی راضی تھا کہ وہ اس سے شادی کرلے۔ اگر یونٹ تسے سے اس کی علیحدگی ہو جائے۔

کسی نے اُسے بتایا تھا امریکہ میں کفن دفن کرنے کی پرائیویٹ دوکانیں ہیں اور اس جیسا آدمی وہاں خوب پیسہ کما سکتا ہے۔ میٹر جاگتے میں خواب دیکھا کرتا تھا کہ وہ اور ایلکا امریکہ چلے گئے ہیں۔ وہاں انھوں نے کفن دفن کمپنی کھولی ہے۔ ایلکا کا مدتوں شوہر مرچکا ہے اور خود اس نے بیلکا سے پیچھا چھڑا لیا ہے۔ نئے ملک میں کوئی نہیں جانتا ہے کہ وہ چور رہ چکا ہے یا ایلکا فاحشہ تھی۔ تمام دن وہ لاشوں میں مصروف رہتے ہیں اور شام کو دونوں تھیٹر دیکھنے جاتے ہیں۔ بیٹے بیٹیاں ہیں اور ان کا اپنا ذاتی مکان ہے اور میٹر نے ذرا اونچے قسم کے مالدار لوگوں والے مذہبی ادارہ کی ممبری لے لی ہے۔ ان کی دوکان پر بس بڑے بڑے رئیسوں کی میتیں آتی ہیں ــــ یکایک میٹر کے دماغ میں بجلی کے کوندے کی طرح ایک خیال چمکا۔ اسے اس سب کے لئے زیادہ انتظار کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ اپنی بیوی بیلکا کا ایک منٹ میں کام تمام کرسکتا ہے بس اس کا گلا دبا دینا ہے اور ایلکا کو یونٹ تسے کو ایک گولی کھلا دینا ہے کیونکہ وہ دونوں بیمار رہتے ہیں اس لئے کیا فرق پڑتا ہے کہ وہ سال بھر بعد مرے یا ابھی۔

میٹر کو اپنے خیالات سے خود ہی ڈر لگنے لگا۔ اور وہ بڑبڑا کر غرانے اور کھانسنے لگا پھر وہ اتنی زور سے اُٹھا کہ پلنگ کے اسپرنگ چرچرا گئے۔ اس کی بیوی بیلکا کی آنکھ کھل گئی اس نے کہا "کیوں اُلٹ پلٹ رہا ہے سانپ کی طرح سونے دے مجھے۔"

"سو جا لٹوک سو رہا۔"

"وہی کھجلی اٹھ رہی ہے تیرے ــــ میں جانتی ہوں ــــ مگر جب تک میں زندہ ہوں وہ تیری بیوی نہیں بن سکتی۔ آوارہ بدکار، کرو ما لینا بازار کی رنڈی ہی رہیگی ــــ آگ لگے کمبخت کو اے آسمانی باپ۔"

وہ غصے سے چیخا: "چپ ہو جا عورت ــــ ورنہ ابھی جان سے مار ڈالوں گا۔"

"مارے گا مجھے ــــ چاقو لا اور مار ــــ اس زندگی سے تو موت اچھی ہے بہت اچھی ہے۔" وہ کھانسنے لگی۔ رونے لگی۔ خون تھوکنے لگی۔

میٹر اٹھ بیٹھا۔ اسے معلوم تھا کہ ایلکا ایک قحبہ خانے میں رہی ہے لیکن کروملنا بازار کی بات اسے آج ہی معلوم ہوئی تھی۔ ظاہر ہے کہ اس کی بیوی کو ایلکا کے بارے میں اس سے زیادہ معلوم تھا۔ وہ غصہ میں جھلا رہا تھا۔ وہ چیخنا چاہتا تھا۔ اپنی بیوی کو بال پکڑ کر زمین پر گھسیٹنا چاہتا تھا۔ اس نے کرومالینا بازار دیکھا تھا۔ گندہ گھٹیا بے کھڑکی کا حوالات کم ایک قبر — نہیں یہ نہیں ہو سکتا یہ جھوٹ بول رہی ہے۔ اُسے سوچ کر ہی اُبکائی آنے لگی۔

سال گذرتے جا رہے تھے اور میٹر یونز کو کچھ ہوش نہیں تھا۔ اس کی بیوی نے کئی بار خون تھوکا اور آخر کار اسے ایک سینی ٹوریم میں داخل کرنا پڑا۔ ڈاکٹروں نے بتا دیا تھا کہ وہ زیادہ زندہ نہیں رہے گی۔ مگر وہاں کی تازہ ہوا نے وہ اس کی روح کی کمزوریوں کو کسی طرح قائم رکھے ہوئے تھے۔ میٹر تمام اخراجات برداشت کر رہا تھا۔ ادھر گھر خالی پڑا تھا اور وہ اکیلا تھا۔ ایلکا آرام سے ملنے آ سکتی تھی۔ ایلکا کا شوہر تو اپنے گھر بیمار پڑا ہی تھا۔ لیکن دونوں چاہنے والوں کو زیادہ وقت ملاقات کے لئے نہیں مل پاتا تھا اس لئے کہ ۱۹۱۴ء کی جنگ چھڑ چکی تھی اور مار دھاڑ، چاقو زنی اور خودکشی کے واقعات بڑھتے جا رہے تھے۔ اور مہاجرین آدھے پولینڈ سے اس شہر کی طرف بھاگے چلے آ رہے تھے۔ سوسائٹی کی سیاہ موٹر ہر وقت لاشیں جمع کرتی بھاگی پھرتی تھی اور میٹر اور ایلکا کو گھنٹہ دو گھنٹہ کی فرصت بھی محبت کے لئے نہ مل پاتی۔ اس وقت اس کا معاشقہ باتیں کرنے ایک آدھ پیار کرنے اور مستقبل کے پلان بنانے پر تھا پھر جب جرمنوں نے وارسا فتح کر لیا تو بھکمری اور ٹائفس بخار نے پوری پوری بلڈنگیں خالی کر ڈالیں۔ ایلکا کے اوپر پھر بھی کوئی اثر نہ ہوا۔ موت اس کے لئے اب بھی ایک مذاق ہی تھی۔ ہر بار اُسے ایک موقع ہاتھ آ جاتا تھا کہ وہ خدا اور انسان کو بُرا بھلا کہے اور گالیاں دے اور بتائے کہ زندگی بس ایک بال سے باریک دھاگے سے لٹک رہی ہے۔ اُمیدیں مکڑی کا جالا ہیں جن میں آدمی پھنسا رہتا ہے۔ آنے والی زندگی، مہدی موعود، نجات، جنت اور جہنم سب جھوٹ ہے بکواس ہے — زندگی میں جو چھین جھپٹ کر مزہ اُڑا لیا وہی اپنا ہے — مگر زندگی سے لطف اُٹھانے کے لئے فرصت چاہیئے اور وہ اکثر شکوہ کرتی "دیکھو میٹر ہمیں تو مرنے کی بھی فرصت نہیں ملیگی"

ایلکا نے کھانا قریب قریب بالکل چھوڑ دیا تھا۔ وہ کبھی کبھی ایک آدھ لقمہ پکوڑی کا یا چاکلیٹ کا ایک ٹکڑا چکھ لیتی تھی۔ بس شراب پیتی رہتی تھی اور سگریٹ پہ سگریٹ پھونکتی

رہتی تھی۔ میئر بھی کچا پکا، جو ملتا کھا لیتا تھا۔ اکثر آدھی رات کو ٹیلیفون کی گھنٹی بجتی کہ انھیں پولیس اسٹیشن پر یا یہودیوں کے ہسپتال پر یا متعدی امراض کے ہسپتال پر یا مُردہ خانہ پر پہونچنا ہے۔ وہ تہوار اور چھٹی بھی بھول گئے تھے۔ سوسائٹی کے دوسرے ملازم گرمیوں کی چھٹیوں پر جاتے تھے لیکن ایلکا اور میئر نہیں جا سکتے تھے۔ بھلا ان کی جگہ کام کون کرتا تھا وہی دونوں تھے جنھوں نے پولیس، سول افسران، فوجی حکام سے لے کر قبرستان والوں تک سے تعلقات قائم کر رکھے تھے۔

میئر کا گھر گندہ اور بے توجہی کا شکار پڑا تھا۔ دیواروں پر سے پلاسٹر گر رہا تھا۔ چونکہ اس ہنگامی دور میں کرایہ داروں نے کرایہ دینا بند کر دیا تھا مالکوں نے بھی مرمت کرانی بند کر دی تھی۔ پانی کے نل برف جمنے سے پھٹ جاتے تھے اُن کی مرمت نہ ہوتی۔ پاخانوں کے پائپ اَٹے پڑے تھے کبھی کبھی اگر ایلکا موقع نکال کر میئر کے گھر رات کو رُک جاتی تھی تو گھر کی کچھ جھاڑ پونچھ کر دیتی تھی لیکن ٹیلیفون کام میں مخل ہو جاتا تھا۔ دونوں کا بُلاوا آجاتا تھا کہ کوئی گولی سے ہلاک ہو گیا ہے یا آگ سے جل مرا ہے یا بازار میں ہارٹ فیل ہو گیا ہے جیسے ہی ٹیلیفون کی گھنٹی بجتی۔ ایلکا کہتی "مُبارک ہو ـــــ موت کا فرشتہ ہے" اور اس سے پہلے کہ میئر پوچھے کیا بات ہے، وہ کپڑے پہننا شروع کر دیتی۔

روس میں زار نے تخت چھوڑ دیا تھا۔ جرمنوں کو محاذوں پر نقصانات اُٹھانے پڑ رہے تھے کسی طرح ایک ہاں اور نہیں کے درمیان پولینڈ آزاد ہو گیا مگر اس سے بیماری اور موت ختم نہیں ہوئی۔ کچھ دنوں کے لئے امن ہوا لیکن جلد ہی بالشویکوں نے حملہ کر دیا اور ایک بار پھر مہاجرین چاروں طرف سے موج در موج وارسا میں آنے لگے۔ جن قصبوں کو بالشویک فتح کر لیتے تھے وہاں وہ یہودی ملّاؤں اور مالدار لوگوں کو گولی سے اُڑا دیتے تھے اُدھر پولینڈ والوں نے کمیونسٹوں کو پھانسی پر لٹکانا شروع کر دیا تھا۔ اُن دنوں ایلکا کا شوہر یونٹ تنشے بھی انتقال کر گیا مگر ایلکا نے ہفت روزہ سوگ نہیں منایا۔ چونکہ میئر لکھ پڑھ نہیں سکتا تھا تو ایلکا کا ہونا ضروری تھا تاکہ کاغذوں پر دستخط کرے اور رجسٹر میں لوگوں کے نام پتے درج کر لے۔ وہ اتنا زیادہ کام کر رہے تھے تو انھوں نے پیسہ بھی کافی کمایا لیکن بڑھتی ہوئی مہنگائی سے مر

سب بے کار کر کے رکھ دیا۔ سیکڑوں ڈالر جو میٹر نے بُرے پچھلے وقت کے لئے بچا رکھے تھے
اب الماری کی کھلی دراز میں بیکار پڑے تھے کوئی چور بھی انھیں نہ اُٹھاتا۔ ایلکا نے
کچھ زیور خریدے لیکن اُسے پہننے کا موقع نہیں ملتا تھا۔ جب میٹر نے اس سے کہا کہ وہ زیور
کیوں نہیں پہنتی تو اس نے جواب دیا: "ارے پہنوں کس وقت ــــ انھیں تو میرے
کفن کی جیبوں میں رکھ دیجیے۔" وہ اس محاورے کی طرف اشارہ کر رہی تھی کہ کفن میں
جیب نہیں ہوتی۔

میٹر اچھی طرح سمجھ گیا تھا کہ ایلکا دوسرے کی میتوں کا مذاق ہی نہیں اُڑاتی بلکہ اُس کو اپنی موت بھی ایک کھیل ایک مذاق ــــ یا خدا جانے کیا لگتی تھی۔ میٹر موت کے بارے میں بات کرنا پسند نہیں کرتا تھا لیکن ایلکا ہر موقع پر یہی بات نکال لیتی تھی کہ جو کچھ وہ کر رہی ہے یہی ایک دن اس کے ساتھ بھی کیا جائے گا۔ اس نے پہلے ہی سے ایک قبر کی جگہ قبرستان میں خرید لی تھی۔ سوسائٹی نے اس کے لئے کچھ قیمت میں بھی رعایت کر دی تھی۔ اب میٹر سے اس نے قسم لی کہ جب وہ مرے گا تو اپنی بیوی بیلکا کے برابر نہیں بلکہ اس کے برابر دفن کیا جائے گا۔ میٹر کبھی کبھی اس پر بہت ناراض ہوتا کہ یہ سب کیسی باتیں ہیں وہ تو اب صحیح معنوں میں زندگی شروع کرنے والے ہیں۔ ایلکا جواب دیتی: "ارے! ڈرتا ہے تو میٹر ــــ کوئی نہیں جانتا آنے والا کل اس کے لئے کیا لائے گا۔ موت کیلنڈر دیکھ کر تھوڑے ہی آتی ہے۔"

ایلسکا کہتی کہ اس کے گھر کے لوگوں میں سب ہی کم عمر میں مرے تھے۔ اس کا باپ اس کی ماں اس کے بہن بھائی، تو بھلا اس میں کیا خاص بات تھی۔

میٹر کے لئے ایک دن اوٹووک سے فون آیا کہ بیلکا چل بسی۔ جس دن وہ مری تھی اس نے حسب معمول صبح کا ناشتہ کیا اور پھر اپنے یدش کے اخبار میں ناول بھی پڑھنے کی کوشش کی مگر لنچ کے ٹائم جب نرس اس کا ٹمپریچر لینے آئی تو دیکھا کہ وہ مر چکی ہے۔ میٹر اس موقع پر اوٹووک اکیلا جانا چاہتا تھا مگر ایلکا نہیں مانی وہ بھی اس کے ساتھ گئی اور چونکہ میٹر نے اپنی قبر کے لئے ایلکا کے برابر والا پلاٹ لے لیا تھا اس لئے اس کی بیوی کو وہیں اوٹووک کے نزدیک ایک گاؤں میں دفن کیا گیا۔ حالانکہ اس گاؤں کی تجہیز و تکفین سوسائٹی کی مستورات نے اسے ناجائز قرار دیا۔ ایلکا نے میٹر کی بیوی کی میت پر ضرورت سے زیادہ دھیان دیا۔

اسے انڈے کی زردی سے غسل دیا اور خود اس کا کفن سیا۔ بیلکا کو جب قبر میں رکھا گیا تو ایلکا نے زور سے کہا "اب تم نہیں آؤ گی بلکہ ہم تمھارے پاس آئیں گے۔ تم آسمان پر ہماری بخشش کی سعی کرنا۔

اب یہ لگتا تھا کہ ایلکا اور میئر جلد ہی شادی کر لیں گے۔ علیحدہ علیحدہ دو گھر رکھنے سے کیا فائدہ۔ لیکن ایلکا ٹالتی رہی۔ اس نے ایک سال سے پہلے شادی کرنے سے انکار کر دیا۔ اس نے کہیں پڑھا تھا کہ پہلی برسی تک مرنے والے کی روح اپنے عزیزوں کے پاس منڈلاتی رہتی ہے۔ جب ایک سال بھی گذر گیا تو ایلکا نے کچھ دوسری وجوہات بتانی شروع کر دیں۔ اس نے کہا کہ وہ چاہتی ہے کہ مکان تبدیل کرے۔ نیا فرنیچر خریدے، نئے کپڑے بنائے اور لمبی چھٹی لیکر گھومے پھرے۔ پیرس جائے۔ وہ اسی طرح کی بہت سی باتیں کرتی رہتی تھی۔ کچھ سنجیدگی سے کبھی مذاق میں۔ میئر اپنے امریکہ جانے کے بارے میں خواب بھولا نہیں تھا مگر ایلکا کہتی تھی کہ ہمیں امریکہ سے کیا لینا ہے ہم وہاں ہمیشہ ہی تھوڑے رہ سکتے ہیں۔

ایک رات جب میئر ایلکا کے یہاں رکا ہوا تھا ایلکا نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنی بائیں چھاتی پر رکھ دیا اور کہا۔

"چھو کر دیکھو"

میئر نے کوئی چیز سخت محسوس کی۔

"یہ کیا ہے ——؟"

"کینسر کی شروعات —— میری ماں بھی اسی سے مری تھی اور میری خالہ بھی۔"

"تم کل ہی ڈاکٹر کے پاس جاؤ —— فوراً چیک کراؤ۔"

"ہونہہ —— ڈاکٹر —— ارے اگر میری ماں ڈاکٹر کے پاس دوڑی ہوئی نہ گئی ہوتی تو کم سے کم آرام سے تو مرتی۔ ان قصائیوں نے تو اس کی بوٹیاں کاٹ ڈالیں —— میں ایسی بیوقوف نہیں ہوں۔"

"مگر یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ ڈاکٹر بتائے کہ یہ کچھ نہیں ہے۔"

"ارے نہیں میئر اوپر والے نے میرا پروانہ بھیج دیا ہے۔"

یہ الفاظ ادا کرتے ہی وہ جذبے کی رو میں بہہ گئی۔ پھر پیار کا نشہ چڑھنے لگا اور وہ اس کی باہوں میں الجھ گئی۔ ایسے وقت وہ برابر باتیں کرتی رہتی تھی۔ میئر سے اس کی گذری

ہوئی محبوباؤں کے بارے میں پوچھتی تھی اور ان شادی شدہ عورتوں کے بارے میں بھی جن سے اس کے تعلقات رہے تھے۔ وہ چاہتی تھی کہ وہ ان سے اس کا موازنہ کرکے بتائے کہ وہ کس بات میں ان سے بہتر ہے۔ شروع شروع میں میئر کو محبت کے وقت یہ سب پسند نہ آیا لیکن جیسا کہ ایلکا کے معاملے میں ہوتا آیا تھا کہ وہ اس کی بات مان ہی جاتا تھا اور آہستہ آہستہ اسے وہی عادت پڑ جاتی تھی۔ ایسا ہی ہوا۔

اس بار اس نے میئر سے کہا کہ اس کا خیال ہے کہ اُس کے بعد سوسائٹی اور میئر دونوں کو بہت پریشانی ہو جائے گی اس لئے اس نے سوچا ہے کہ کسی عورت کو اپنا کام سمجھا کر اس ملازمت کے لئے تیار کردے۔ میئر نے اس بات پر اس کے منہ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

"اپنا پنجہ ہٹالو" اس نے ناراض ہوکر کہا۔ اُس روز کے بعد دن ہو یا رات جب بھی وہ ساتھ سفر کررہے ہوتے۔ وہ مستقل اپنی موت کے بارے میں باتیں کررہی ہوتی اور جب میئر کہتا کہ وہ یہ سب نہیں سننا چاہتا۔ تو وہ کہتی ـــــ

"ارے اس میں کیا رکھا ہے ـــــ میں ڈرتی نہیں ہوں ـــــ میں کوئی چھوٹا سا بچھڑا تھوڑی ہی ہوں جو قصائی کی چھری سے کانپے!"

ایلکا کی باتیں ہی باتیں نہیں تھیں بلکہ سچ مچ کچھ دن بعد اس کی ایک چچیری بہن نمودار ہوئی کسی قصبہ سے آئی تھی۔ کوّے جیسی کالی اور تاتاریوں کی سی ٹیڑھی آنکھیں۔ اس نے اپنی عمر ۲۷ سال بتائی مگر میئر کا خیال تھا کہ وہ تیس سے بھی اوپر ہے۔ ایلکا کی طرح وہ بھی شراب اور سگریٹ کی عادی تھی۔ اس کا نام ڈینشکا۔ کوئی مشکل سے ہی کہہ سکتا تھا کہ یہ دونوں بہنیں ہیں۔ ایلکا باتونی اور پُرمذاق، مگر ڈینشکا ناپ تول کر بات کرنے والی اور مسکراہٹ ـــــ نہ اس کے لبوں پر نہ اس کی ناراض آنکھوں میں۔ میئر کو دیکھتے ہی اس سے نفرت ہوگئی۔ ایلکا کفن دفن کے کام میں اسے ساتھ رکھنے لگی۔ کیونکہ ڈنشکا سلائی کا کام کرچکی تھی۔ وہ ایلکا سے بھی زیادہ اچھی طرح کفن کے ٹکڑے پھاڑ لیتی تھی اس لئے کہ اس کام میں قینچی کی اجازت نہیں ہوتی۔ لمبے لمبے شلنگے بھر کر جوڑنے میں بھی وہ ایلکا سے ہوشیار تھی۔ ایک بار ایلکا کو شہر میں کچھ کام کی وجہ سے رکنا پڑا تو ایک دیہات سے ایک متمول یہودی کی لاش لینے کے لئے میئر کو ڈنشکا کو لے کر

ساتھ لے جانا پڑا۔ ڈنشکا نے پورے راستے ایک بات بھی نہ کی۔ پھر یکایک اُس نے اپنا ہاتھ میئر کے گھٹنے پر رکھ دیا اور اسے سہلانے لگی۔ میئر نے اس کا ہاتھ ہٹا کر اُس کی گود میں واپس رکھ دیا۔ اس رات میئر کو صبح تک نیند نہیں آئی۔ اس کی کھوپڑی سوچتے سوچتے قریب قریب پھٹ جانے والی تھی۔ کبھی اسے پسینہ آتا کبھی ٹھنڈ سے کپکپی چڑھتی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کیا اُس کو ایلکا پر زور ڈالنا چاہئیے کہ وہ ڈنشکا کو نکال باہر کرے یا اُسے یہ سب چھوڑ چھاڑ کر امریکہ بھاگ جانا چاہئیے یا اس وقت کا انتظار کرنا چاہئیے جب ایلکا مرے اور وہ اس کی قبر پر اپنا گلا کاٹ ڈالے۔ کیا اُسے اس سوسائٹی کی نوکری چھوڑ کر مزدوری یا دوسرا کوئی کام کر لینا چاہئیے۔ ایلکا کے بغیر ہر چیز اور ہر بات کا تصور اس کے لئے خالی خالی اور فضول سا تھا۔ میئر تنہا شراب نہیں پیتا تھا۔ مگر آج اس نے ایک بوتل کھولی اور غٹ غٹ کر کے اپنے گلا میں آتار لی۔ پہلی بار خوف نے اسے گھیرا تھا۔ اسے محسوس ہوا کہ ڈنشکا اس کے اُوپر ضرور بد نصیبی لائے گی۔ ایلکا کی جگہ کوئی نہیں پُر کر سکتا۔ میئر کھڑکی کے پاس جا بیٹھا اور باہر پھیلی رات کو تکنے لگا۔ اس نے اپنے آپ سے کہا: "اُف ــــ سب ختم ہو گیا ــــ سب بیکار ہے"۔

ایلکا بستر علالت پر تھی کینسر بڑھ رہا تھا اور دوسری چھاتی پر بھی نمودار ہو گیا تھا۔ وہ شدید درد اور تکلیف میں گرفتار رہتی۔ ڈاکٹر اسے مارفیہ دے کر بے خبر کر دیتے۔ پروفیسر مینٹن نے ایلکا کو سمجھایا کہ یہودی اسپتال میں داخل ہو جائے جہاں ریڈیم سے اس کا علاج ہوگا اور ہو سکتا ہے کہ آپریشن ہو اور موت کو کچھ دن اور روکا جا سکے۔ لیکن ایلکا کہنے لگی: "مجھے تیزی سے مرجانا پسند ہے ــــ آہستہ آہستہ ایڑیاں رگڑ کر مرنے کے مقابلہ میں ــــ میں سفر کے لئے تیار ہوں"۔

حالانکہ وہ بیمار تھی مگر وہ سوسائٹی کی ملازمت پر رہی۔ میئر کو آکر اُسے ہر میت اور دفن کے بارے میں بتانا پڑتا تھا۔ حالانکہ میئر ڈنشکا سے ــــ اُس کنواری سے نفرت کرتا تھا لیکن اس میں چند باتیں اچھی ضرور تھیں۔ جب ایلکا پلنگ پر پڑ گئی تو میئر اُس کے گھر آکر رہنے لگا اور ڈنشکا میئر کے گھر چلی گئی۔ اس نے کمروں میں جھاڑو دی۔ صفائی کی۔ ٹوٹے پھوٹے برتن اُٹھا کر باہر پھینکے۔ مالک مکان کے پیچھے پڑ کر دیواروں پر قلعی کرائی۔ چھت کی مرمّت کرائی اور نئے فرش بنواۓ اور صبح کو جب میئر سے اس کی ملاقات سوسائٹی کے دفتر میں یا کام پر ہوتی تو

وہ اس کے لئے ہمیشہ کچھ کھانا پکا کرلے جاتی، کبھی کوفتے کبھی بھنا گوشت کبھی چوزہ ـــــ ایلکا کی طرح جیسی جو ایک آدھ پکوڑے یا چاکلیٹ کے ٹکڑوں پر جیتی تھی۔ ایلکا کے لئے تو ایک ایک پیگ کافی ہوتا تھا بڑبڑ شروع کردینے کے لئے، مگر ڈنشکا خوب پی لیتی پھر بھی سنجیدہ رہتی۔ میٹر اس کو کبھی سمجھ نہ پایا ایسی عجیب شئے، ایک دیہات سے کیسے آسکتی ہے۔ کہاں سے اس میں برداشت کی طاقت آگئی۔ اس کے اپنے تجربے نے تو اسے بتایا تھا کہ چھوٹی جگہ کے رہنے والے بیوقوف اور بزدل ہوتے ہیں۔ ہمیشہ رُدتے رہتے ہیں شکوہ شکایت کرتے رہتے ہیں۔

ایک دن ایلکا کی دیکھ بھال رکھنے والی عورت خود بیمار پڑ گئی اور جو اس کی جگہ آنے والی تھی وہ اپنی لڑکی کے پاس اس کے گھر چلی گئی۔ ایلکا کے معالج نے اس کے انجکشن لگایا اور میٹر اس وقت تک اس کے پاس بیٹھا رہا جب تک کہ دوا کا اثر شروع ہو۔ جب ایلکا کو نیند آنے لگی تو اس نے میٹر سے کہا کہ وہ قسم اٹھائے کہ اس کے مرنے کے بعد وہ ڈنشکا سے شادی کرے گا۔ لیکن میٹر نے اس بات پر انکار کردیا۔

دوسرے دن صبح میٹر کے پاس ٹیلیفون آیا کہ ایک ایکٹر جو یدش زبان کے ڈراموں میں ہیرو کا پارٹ کرتا تھا۔ پہلے تھیٹر میں اور پھر سڑکوں پر وہ اوٹو وک کے سینی ٹوریم میں مرگیا ہے۔ ایک جگہ شہر میں اسپرٹ کے اسٹوو میں آگ لگنے سے پانچ بچے جل مرے۔ ایک نوجوان نے خودکشی کرلی اور پولیس اس کی لاش پوسٹ مارٹم کے لئے مانگ رہی ہے۔ میٹر نہادھو کر تیار ہوا تو ایلکا نے ان خبروں کے بارے میں تفصیلات کے بارے میں معلومات کیں۔ وہ اس ایکٹر کو جانتی تھی اور اسے اس کی اداکاری، اُس کے گانے اور اس کا ہنسی مذاق بہت پسند تھا۔ ایک ہی دن میں ان تمام موتوں کی خبر نے اسے جیسے دوبارہ ہمت دے دی اور پھر وہ ایک صحت مند آدمی کی طرح باتیں کرتی رہی۔ وہ عورت جو اس کی دیکھ بھال کرنے آنے والی تھی اسے دس بجے تک پہونچنا تھا۔ میٹر اسے تنہا چھوڑ کر نہیں جانا چاہتا تھا مگر ایلکا نے کہا: "ارے مجھے اب اور کیا ہو جائے گا ـــــ تم جاؤ" یہ کہہ کر وہ مسکرائی اور آنکھ ماری۔

پورے دن میٹر اور ڈنشکا اتنے مصروف رہے کہ کھانا بھی نہیں کھاسکے۔ میٹر بچوں کے سانحے کے بارے میں ڈنشکا سے بات کرنا چاہتا تھا۔ لیکن ڈنشکا خاموش رہی۔ میٹر کو خیال آیا کہ ایسے موقعوں پر ایلکا ہمیشہ کوئی مناسب بات کہتی تھی۔ وہ ڈنشکا جیسی ناشکری کے ساتھ وقت

ہفتے بھی نہیں رہ سکتا۔

سینی ٹوریم میں یہ طریقہ تھا کہ لاش کو سارے دن برف خانہ میں رکھتے اور رات کو چپ چاپ سپرد کرتے تھے تاکہ دوسرے مریضوں پر اثر نہ ہو۔ میٹر اور ڈشکا دن بھر شہر کے کام کام میں مصروف رہے اور شام کو اوٹو ووک سینی ٹوریم کی طرف روانہ ہوئے۔ بارش ہو رہی تھی رات اندھیری تھی، نہ ستارے نہ چاند۔ میٹر نے کئی بار ڈشکا سے بات کرنی چاہی لیکن اس نے ایسا کڑوا جواب دیا کہ وہ بالآخر چپ ہو رہا۔ وہ سوچنے لگا معلوم نہیں کیا سوچتی رہتی ہے ہر وقت یہ عورت ـــــ عجیب بیوقوف ہے اور کچھ نہیں ـــــ بڑا احسان کر رہی ہے میرے برابر بیٹھ کر ـــــ

اب وہ پراگا قبرستان کے برابر سے گذر رہے تھے۔ شہر کے سُرخ آسمان کے پس منظر میں اُٹھے ہوئے مقبروں کے مینار دھندلکے میں خود رو دَنگس کی چھتریوں کا جنگل معلوم ہو رہے تھے۔ میٹر نے ایلکا کے انداز میں بات کرنی شروع کی۔

" مُردوں کا شہر ہے ـــــ ہے نا ـــــ زندگی سے تھک کر گہری نیند سو رہے ہیں ـــــ خدا کو مانتی ہو تم ـــــ "

" معلوم نہیں "

" اچھا تو پھر یہ دنیا کس نے بنائی ـــــ ؟ "

ڈشکا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اور میٹر کو غصہ آنے لگا اس نے کہا " پھر کیا فائدہ ہے پیدا ہونے سے ـــــ زندگی سے ـــــ اگر اس کا آخر یہی ہے ـــــ ایک دن میں ایک مزدوروں کے جلسہ میں کھڑا ہو گیا ـــــ گذر رہا تھا ادھر سے ـــــ ایک بڑا لیڈر تقریر کر رہا تھا وہ کہہ رہا تھا کہ خدا کہیں نہیں ہے۔ ہر چیز نے اپنے آپ کو خود بنایا ہے ـــــ بھلا ہر چیز خود کیسے بن سکتی ہے ـــــ احمق پن ـــــ " ڈشکا نے پھر بھی کوئی جواب نہیں دیا۔ اور میٹر نے طے کر لیا کہ اب اس رات وہ اس سے بالکل بات نہیں کرے گا۔ اسے ایلکا بہت یاد آئی۔ وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑانے لگا " وہ نہیں مرے گی ـــــ اگر ہم دونوں میں سے کسی کو مرنا ہے تو پہلے میں مرنا چاہتا ہوں "

اُن کی کار ایک گاؤں سے گذر رہی تھی جو غیر یہودی لوگوں کا گاؤں تھا۔ پھر ایک کالونی آئی جو ابھی بن رہی تھی۔ پھر ایلکا آیا جہاں پاکباز یہودی اور ان کے مُلّا گرمی گذارنے آیا کرتے تھے

اور پھر وہ علاقہ جہاں دانشور جمع ہوتے تھے، مختلف عقائد کے رکھنے والے۔ زرتشتی، بدھ مت والے اور کمیونسٹ خیال کے لوگ جو یدش زبان بولنا کسرِ شان سمجھتے اور پولش بولنا پسند کرتے تھے۔

ایلکا کی بیماری سے میئر کے دماغ میں کھلبلی سی مچ گئی تھی اور وہ کچھ نہ کچھ سوچتا رہتا تھا۔ مثال کے طور پر یہ کہ یہ عورت ڈنسکا اس سے پہلے اپنے گاؤں میں کیا کرتی تھی۔ جنگ کے دنوں میں یہ ضرور اسمگلر یا فاحشہ رہی ہوگی۔ یکایک اسے اس کی بیوی بیلکا کا خیال آیا۔ پہلے پہل وہ اس سے راضی نہیں تھی لیکن میئر اس کے سامنے جھک گیا اور اس نے ہمیشہ ہمیشہ محبت کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ اسے اس کا لیٹوین لہجہ بڑا پیارا لگا تھا مگر برسوں بعد جب وہ بیمار ہو گئی تھی اُسے اس کا ہر لفظ بُرا لگنے لگا تھا وہ اکثر درخواست کرتا تھا کہ وہ چپ رہے مگر ایلسکا کی تو بات ہی کچھ اور ہے۔ وہ جتنا بات کرتی ہے اتنی ہی پیاری لگتی ہے۔

او ٹو ووک پہونچ کر میئر نے سینی ٹوریم کے کولڈ اسٹوریج پر گاڑی روک دی۔ پھر ساری کارروائی تیزی کے ساتھ ہونے لگی۔ بڑی خاموشی سے جیسے کوئی سازش ہو۔ ایک دروازہ کھلا اور دو آدمیوں نے ایک بکس اس کی گاڑی میں رکھ دیا۔ اُس نے اُن کی صورت بھی نہیں دیکھی اور ایک لفظ بھی نہیں بولا گیا۔ ذرا سی دیر کے لئے جب کولڈ اسٹوریج کا دروازہ کھلا ہوا تھا میئر نے دو اور بکس ویسے ہی رکھے ہوئے دیکھے۔ ایک لمبی میز کے سامنے جس پر جلتی شمعیں پٹر پٹر کر کے بوند بوند اپنا موم بہا رہی تھیں اور ایک بوڑھا آدمی بیٹھا کچھ آیتیں پڑھ رہا تھا۔ ٹھنڈ کا ایک جھونکا سرد کمرے سے آیا۔ میئر نے "ووتھکا" کی بوتل جو اس کے ساتھ تھی کھولی اور ایک لمبے گھونٹ میں خالی کر دی۔

جب وہ وارسا کی طرف واپس ہو رہا تھا تو اس کی گذری زندگی کے سین اس کی نظر کے سامنے گھومنے لگے۔ غریبی —— چوریاں —— جھگڑے قحبہ خانے —— فاحشائیں —— گرفتاریاں —— "آخر کیسے میں یہ جہنم سہہ گیا"! اپنے آپ سے پوچھا۔ اُسے اپنی ماں کی ایک کہاوت یاد آئی "خدا ہمیں بچاتا ہے ان تمام چیزوں سے جن کی عادت پڑ جائے۔"

کار ایک جنگل سے گذر رہی تھی۔ اُس نے رفتار تیز کر دی اور کبھی اِدھر اور کبھی

اُدھر کاٹنے لگا۔ وہ چاہتا تھا کہ ڈنشکا اس سے درخواست کرے کہ آہستہ چلاؤ۔ مگر وہ تو بڑے ضدی انداز میں خاموش بیٹھی تھی اور باہر تاریک رات کی طرف تک رہی تھی۔ میٹر نے کہا: "گھبراؤ مت ―― میں میت کو مار نہیں ڈالوں گا۔" پھر اس کے دل میں کچھ بدی آئی اور ایک خواہش ہوئی کہ اپنی تقدیر کو آزمائے، بالکل ایک ایسے جواری کی طرح جو کھیلتے ہوئے تھک کر ایک بار سب کچھ داؤ پر لگا دیتا ہے۔ اس کی کار کی روشنی درختوں پر، گھروں پر، باغیچوں پر، کنوؤں پر پڑتی جا رہی تھی۔ وہ بار بار ڈنشکا کی طرف ایک نظر ڈال لیتا تھا۔ وہ سوچنے لگا کہ معلوم ہوتا ہے زندگی یقیناً ڈنشکا کے لئے ایک چٹکی بھر ہلاس کے برابر بھی قیمت نہیں رکھتی۔

ان کی گاڑی ایک ایسی سڑک پر آنکلی جو ایک کھلے قطع میں سے گذرتی تھی۔ پھر وہ پھسلنے سی لگی جیسے کہ پہاڑ سے نیچے جا رہی ہو۔ ایکدم میٹر خوش ہو گیا۔ اس کا جی ہلکا ہو گیا۔ کوئی فکر کی بات نہیں ہے ہو جائے گا جو ہوگا۔ وہ اپنے برابر اپنی بیوقوف سواری کو بالکل بھولا ہوا تھا۔ زندگی مزیدار چیز ہے ―― وہ سوچنے لگا۔ ہوسکتا ہے اُسے ایک دن امریکہ جانے کا موقع بھی مل جائے۔ عورتوں کی اور لاشوں کی وہاں کیا کمی ہے۔ وہ گاڑی چلا رہا تھا اور خواب سا دیکھ رہا تھا کہ ایلکا اس کے ساتھ ہے کسی دوسری عورت کے روپ میں ہنستی بولتی مذاق کرتی۔ اس کی بہادری اور ہمت کو جھٹلاتی کہ یکایک ایک درخت اس کی آنکھوں کے سامنے اُبھرا، درخت اور سڑک کے بیچوں بیچ وہ شاید شاہراہ سے بھٹک گیا ہے۔ وہ بریک دینا چاہتا تھا مگر ایکسیلیٹر دب گیا اور اسے ایک زبردست ٹکر کی آواز آئی۔ اور پھر خاموشی چھا گئی۔

دوسرے دن ایک دہقان نے جو اپنے کام پر جانے کے لئے اُدھر سے گذر رہا تھا ایک ٹوٹی ہوئی کار اور تین لاشیں دیکھیں۔ پیچھے کا دروازہ ٹوٹ گیا تھا اور ایکٹر کی لاش والا بکس نیچے گر گیا تھا۔ وہاں مجمع جمع ہو گیا۔ پولیس آگئی۔ وارسا کی کفن دفن سوسائٹی نے ڈو اور گاڑیاں بھیجیں کہ لاشوں کو لے آئیں۔ سوسائٹی کے پریسیڈنٹ اور وارڈن نے طے کیا کہ ایلکا کو یہ بات نہ بتائی جائے۔ لیکن ایک عورت جو اس کی دیکھ بھال کر رہی تھی اس نے یہ خبر ریڈیو پر سنی اور ایلکا کو بتا دی۔ ایلکا ہنسنے لگی۔ اور ہنستی ہی رہی۔ پھر اس کی ہنسی ہچکیوں میں تبدیل ہو گئی اور جب وہ بند ہو گئیں تو وہ بستر سے اٹھی اور اس نے کہا۔

"لاؤ میرے کپڑے مجھے دو۔"

تجہیز و تکفین کے سلسلہ ڈو دن ایلکا کو لگے۔ ایلکا میں پھر سے طاقت آ گئی۔ سوسائٹی کا ہر شخص اس میں توانائی اور زندگی کی لہر دیکھ کر حیرت میں تھا۔ اُس نے خود ڈشکا کو نہلایا اور میٹر اور اُس کے کفن سیئے۔ ایک کمرہ سے دوسرے کمرہ میں جا آ رہی تھی حکم احکام چلا رہی تھی اور میتوں سے اپنے مخصوص انداز میں باتیں کر رہی تھی "سفر کے لئے تیار پیٹی میں بند باہر بھیجے جانے کے لئے۔"

اُس دن ہمارساجن ڈو بڑے جلوس جنازوں کے نکلے۔ ایک کے ساتھ تھیٹر کے شیدائی اور مصنف تھے اور دوسرے کے ساتھ چونڈ اچکے، دلّے اور فاحشائیں۔

وارسا میں جہاں ٹائفس بخار اور بھکمری نے بدمعاشی کے دھندوں کو قریب قریب ٹھنڈا کر دیا تھا اور کمیونسٹوں نے ان کے اڈوں کو ضبط کر لیا تھا مگر پھر بھی کافی پرانے پاپی جنازے میں موجود تھے، میٹر کی میت کو آخری سلام دینے۔ ایلکا جنازے کے ساتھ تھی۔ وہ اپنے سیاہ لباس اور سیاہ ہیٹ میں بہت خوبصورت اور نوعمر معلوم ہو رہی تھی۔ لوگ ایلکا اور میٹر کے بارے میں باتیں کر رہے تھے۔ میٹر ایک بچوں کے اسکول کی امداد کرتا تھا۔ اس اسکول کے بچے ایک ٹیچر کے ساتھ جنازے کے آگے آگے چل رہے تھے۔ یہ پکارتے ہوئے "یقیناً انصاف اس کے پیش پیش ہوگا۔"

قبرستان پہونچ کر دو کوچوانوں نے ایلکا کو سہارا دے کر ایک قبر کے پتھر پر چڑھا دیا۔ اور اس نے وہاں، ایک چھوٹی سی تقریر کی ——

"میرے پیارے میٹر اطمینان رکھ میں تیرے پاس آ جاؤں گی —— مجھے نہ بھولنا —— میٹر میری قبر کے لئے زمین بالکل تیرے برابر ہے۔ ہم دونوں ایک تھے، ایک ہیں کوئی جُدا نہیں کر سکتا —— خُدا بھی نہیں۔"

پھر وہ ڈشکا کے جنازے سے مخاطب ہوئی۔

"آرام سے سو میری بہن۔ میں تجھے سب کچھ دینا چاہتی تھی مگر قدرت کو منظور نہیں تھا۔" اِن الفاظ کے ساتھ ہی وہ تھک کر گر گئی۔

آخر کار اسے ہسپتال میں بھرتی کیا گیا۔ مگر کینسر اتنا پھیل چکا تھا کہ بچنے کی کوئی امید نہیں تھی۔ وہ ڈو تکیوں کے سہارے بیٹھی رہتی تھی اور کفن دفن سوسائٹی کی عورتیں آتی جاتی

رہتی تھیں۔ اس کی خیریت پوچھنے، سوسائٹی کی باتیں بتانے نئے لوگ ملازم رکھ لئے گئے تھے۔ ملک الموت کی وہی رفتار تھی۔ کفن کا کپڑا مہنگا ہوتا جا رہا تھا۔ قبر کی جگہ کے زیادہ پیسے مانگے جانے لگے تھے۔ کتبہ کھودنے والوں نے اُجرت بڑھا رکھی تھی۔ یہودی سنگ تراشوں نے طرح طرح کے ڈیزائن امیروں کے کتبوں پر بنانے شروع کر دئیے تھے۔ شیر، ہرن، چڑیوں کی شبیہ تک کہ جیسے غیر یہودی لوگوں کی قبروں پر ہوتے تھے۔ ایلکا سنتی رہتی تھی، پوچھتی رہتی تھی۔ اس کا چہرہ پیلا پڑ گیا تھا۔ مگر آنکھیں ابھی تک سبز تھیں۔ اب جبکہ میئر جا چکا تھا اُسے کسی بات کا غم نہیں تھا۔ ہر چیز اس کے لئے تیار تھی۔ قبر کی جگہ، کفن کا کپڑا اور مہندی کی ایک شاخ کہ جسے لے کر وہ میئر کے ساتھ اندھیرے غاروں میں سے گزرتی اسرائیل کی سرزمین پر پہونچے گی کہ جب مہدیٔ موعود درخشاں ہوگا۔ □

صلاح الدین پرویز
سائیسو ریکس، شارع ستین
ص ب ۲۵۵۱، ریاض سعودی عرب

سلام

سلام اے کبریا والے
ترے ہونٹوں کی جنبش پر

گھروں میں شور کرتے تھے
وہ راتوں کے گھنے سائے
کہ اک آہٹ سی ہوتی ہے
تھپکتی ہے صدا کوئی

تھپکتی ہے صدا کوئی
کہ دستک ٹوٹ جاتی ہے
سلام اے کبریا والے

ترے ہونٹوں کی جنبش پر
کہ جس کی چھاؤں میں کھلتے ہیں
لوری سے گندے بستر

سلام اے کبریا والے
پیاری فاطمہ والے
سلام اے فاطمہ والے

ترے قدموں کی آہٹ پر
چمکتا ہے دھندلکوں میں کسی کے پاؤں کا چہرا
کہ مٹی دف بجاتی ہے جہاں تھمتا ہے بے سایا
کہ ان پاؤں کے نیچے گاؤں بستا ہے بڑا پیارا

ہم اپنی دھوپ کی بستی میں تھوڑی شام بھر لیں گے
ہمارا گاؤں ہے نیندوں بھرا آرام کر لیں گے

سلام اے فاطمہ والے

ترے قدموں کی آہٹ پر
کہ جس سے دن نکلتا ہے
کہ جس سے مینہ برستا ہے

سلام اے آمنہ والے

کہ جس سے موسموں کی رات دن برسات ہوتی ہے
کبھی اک رات چھوٹی سی ہزاروں جگنوؤں والی
کبھی اک شام لمبی سی بڑی سی دوپہر والی
کبھی دن میں نظر آتے ہیں اک مہتاب کے کاکل
خموں میں جن کے ہوتے ہیں سحابوں سے بھرے چھاگل

سلام اے آمنہ والے

کہ پی جاتے ہیں سب سنگ آشنا اور نہر بنتے ہیں
کہ ان نہروں میں ریتوں کے ہزاروں شہر رہتے ہیں

سلام اے کبریا والے

ترا دروازہ شاہی ہے
ارے تو کتنا سادائی
تری یکتائی سادی ہے

سلام اے کبریا والے

کہ تیرا گھر انوکھا ہے

سلام اے کبریا والے

ترا حجرہ چٹائی ہے
بدن تا لا بدن
کون و مکاں تا لامکاں
جس کی سواری ہے

ملائک اپنی بے آسانی سے اس کو بچھاتے ہیں
محمد مصطفےٰ صلِ علیٰ جس پہ کبھی آرام کرتے ہیں
نمازیں پڑھتی رہتی ہیں نمازیں ایسی مسجد ہے

سلام اے کبریا والے

یہ ستی کیسی ستی ہے
کہ پارا ابر کا جس پر گراتا ہے کوئی کاجل
کہ آنکھیں جاگ جاتی ہیں
مسرت گوندھ لیتی ہیں
وضو کرتی ہیں
بادل کے دریچوں میں
وہ واپس لوٹ جاتی ہیں

سلام اے کبریا والے

میں اس کاجل کے صدقے جو ترے گاؤں میں روشن ہے
سلام اے کبریا والے
میں اس بادل کے صدقے جو تری چھت پہ چمکتا ہے
سلام اے کبریا والے
میں اس بستر کے صدقے جو تری آنکھوں میں جلتا ہے
سلام اے کبریا والے
میں اس مٹی کے صدقے جو ترے پاؤں سے جھڑتی ہے
سلام اے کبریا والے
میں ان ہالوں کے صدقے جو ترے پاؤں میں بستے ہیں
سلام اے کبریا والے
سلام اے کبریا والے

کہ تو ہے بادلی
تو آشنائی

فاطمائی ہے
توئی صدیق ہے توئی
توئی فاروق ہے توئی
توئی عثمان ہے توئی
علی توئی، حسن توئی، حسین ابنِ علی توئی

سلام اے کبریا والے
کہ تو خود کبریائی ہے
سلام اے کبریا والے
سلام اے کبریا والے
سلام اے کبریا والے

توئی تو ہے، توئی تو ہے
توئی تو ہے، توئی تو ہے
توئی توئی، توئی توئی
توئی توئی، توئی توئی
توئی تو ہے، توئی تو ہے
توئی تو ہے، توئی تو ہے

اعجاز احمد
پاکستان

سورج کا ساتھ

رات تمام ہوئی اور صبح کی
فیروزی کانچ سے زیادہ نازک اور گہری جھیل کے کناروں پہ دہکتے
نارنجی اور سبز پھولوں!
ہاں، میرے محبوب
طویل رات کے رستوں پہ ہم دور تلک گئے تھے؛ گیہوں کی بالیوں جیسا
سنہرا تمہارا بدن دھوپ بھری ہواؤں کی طرح خوشنما تھا۔ اور
خامشی۔
اجنبی غلام گردشوں میں سسکی کی طرح ابھرنے والے لفظ نہیں، بلکہ۔
آتش بھری نظر کی مثال شعلہ بن کے لپکتی ہوئی۔
چاندنی کا ہاتھ تمہارے چہرے پہ نرم تھا، اور میں نے تمام رات ...
خط لکھے ہیں جن کے لفظ ہمیشہ میرے پیار کی گواہی دیں گے۔ زندگی
کی چاہت قربتوں کے رنگ تھے، جھلملاتی سفید روشنیوں کے نامانوس
علاقوں کی طرح طویل اور مکمل۔
لفظ یوں ہیں جیسے بڑے دریا کی تہہ میں شفاف سنگریزے۔ باقی ہوا ہے۔
پانی اور سکرت!
اور میں اپنی نظموں کے ذریعے پیغام بس ان غیر معروف شاعروں کو
بھیجتا ہوں جن سے میں نے لفظوں کی زرخیزی سیکھی، یا ان عورتوں کے
نام جن کے بدن میرے بدن میں شریک رہے۔

لہذا، زباں پہ اگر حرف کا ذائقہ ہے تو بھی کوئی بات نہیں ۔
لفظوں میں ہم وہ دکھ اور راحتیں بیان کرتے ہیں جن سے وصل لفظوں
کے بغیر ہوگا ۔ نظمیں تبدیل کچھ نہیں کرتیں، نہ کچھ سکھلاتی ہیں ۔ یہ تو بس پرانے
ذائقوں
یا جھکی آنکھ اور منہ پھیر کے کہی ہوئی باتوں کے لبوں پہ لرزتی لاش کو
برقرار رکھنے کی تدبیریں ہیں ۔
چنانچہ، میں گزرے برسوں کا بوجھ پھونس کے ایک کشکول میں لئے
پھرتا ہوں اور خبر لاتا بھی تو چاند کی، آسمانوں کی، زمیں کے
موسموں کی ۔
اکیلے کے سفر میں سورج میرا ساتھی ہے ۔

برت پال سنگھ بیتاب

نظم

سنیچر میرے سر کی سیدھ میں چلتا رہا
میں جب دریا کی جانب تشنگی لے کر لپکتا
سوکھ جاتا وہ
کتابیں دیکھتے ہی مجھ کو
اپنے لفظ پی جاتیں
صحیفوں کے حروف اپنی سکونت
میرے پاس آتے ہی کھو دیتے ہیں
مرے بے سر ترنم سے
کوئی ساز
اپنے سُر کو جب ملاتا
بے سُرا ہو جاتا وہ بھی
کہیں جب شرط ہوتی
ہارنا میرا مقدر ہی ٹھہرتا

بار بار اپنی نظر کے زاویے پر
غور کرتا میں
کمی کوئی دکھائی بھی نہ دیتی
ایک دن مجھ کو سنیچر کے
سمندر پار ہو جانے کی خوشخبری ملی
اس دن سے میرے بازو میرے پر ہوتے
میں چونچ میں ساتوں سمندر بھر کے
صحرا پہ برستا جا رہا تھا جب اچانک ....
وہ سمندر بھی
مری ہی چونچ سے وارد ہوا
جس کے کنارے پر وہی بوڑھا سنیچر
ترچھی آنکھوں سے مجھے بس گھورتا تھا

پرت پال سنگھ بیتاب

نظم

پانیوں سے بھرے کھیت میں
راستہ ہی کہاں تھا ؟
مجھے پاگلوں کی طرح بھاگتے دیکھ کر
لوگ چلا رہے تھے
" ارے یہ تمھیں کیا ہوا ہے ؟"
" ذرا اپنے جوتوں پہ تو رحم کھاؤ "
" ارے اپنے کپڑوں پہ ہی ....."
مگر میں تو بس ....

کیا کروں خواب میں جیتے رہنا
مقدر جو ٹھہرا
یہی سوچتا ہوں
لباس اپنے تن سے اتاروں
کہیں دور پھینکوں اسے
لوگ تو ....
لوگ تو مجھ کو
پہلے ہی پاگل سمجھنے لگے ہیں

اسلم آزاد

انہدام

مری آنکھوں میں منظر
قید ہے
نیلے سمندر
شاداب جنگل
اور
پر اسرار برفیلے
جزیرے کا
کسی
انجان وادی کی صدائیں
خنک
ٹھنڈی ہوائیں
لبوں پہ
ذائقہ
اس زرد مٹی کا
رگوں میں
آگ بہتی جا رہی ہے
اور
میں خود
اندر اندر
ڈھہ رہا ہوں

شعبۂ اردو، پٹنہ یونیورسٹی، پٹنہ

مراجعت

جی میں آتا ہے کہ
مٹی کا گھروندہ پھر بناؤں
اور
اس کو توڑ ڈالوں
خوبصورت
انگنت
رنگیں
کھلونوں کے لیے میں روٹھ جاؤں
نیلگوں آکاش کے
اجلے
دمکتے چاند ماما کو بلاؤں
اور
اپنے گھر کے آنگن میں
لٹکتے پالنا میں لیٹ جاؤں
دادی اماں سے
کوئی قصہ سنوں
اور
نیند کی گہرائیوں میں ڈوب جاؤں

سیتا کانت مہاپاتر

ترجمہ: کرامت علی کرامت
گورنمنٹ کالج، سندر گڑھ، اڑیسہ ۷۷۰۰۰۱

تتلی کی موت

(اڑیا نظم)

کڑی دوپہر میں اندھیرا ہے کیوں ؟
یا کسی دوسرے جےؔ درتھ[1] کو مٹانے کی خاطر
ہے اک سازشِ نو
"ان" کے رونے، بلکنے، سسکنے کی آواز کے درمیاں
آج سورج ہوا ہے غروب
کتنے روتے ہوئے جانور اور بشر تیرگی میں گھرے ہیں
"یہ" عماراتِ صد منزلہ پھاند کر آج آئے ہیں نیچے کی جانب
چھلانگیں لگاتے ہوئے بندروں کی طرح
چھوڑ کر حقے، کوکن، ایل ایس ڈی کی عادت
گہرے تالاب کی تہہ سے اوپر کو لے کر کئی سادھنا
کی پرانی کتابیں
"یہ" آئے ہیں کیچڑ میں برچھی، چھری، نایم بم کو پھینکے
ہوئے
"یہ" رونے میں اس طرح مصروف ہیں
کہ جیسے ہوں یہ کوئی طفلِ یتیم
ہیں ان میں گورنر بھی، شہ بھی، سپہ بھی
مقرر بھی، فن کار بھی، سائنس داں بھی
ان میں ہیں کچھ غریب اور کچھ ہیں اچھوت

رات خاموش ہے اور طویل
دیپ کی طرح بازو کی لرزش سے محروم تارے
ہو کے گم کردہ راہ جھڑتے رہے ہیں اندھیرے
میں پیہم
باغ کے ایک گم نام گوشے میں رکھا ہے تابوت
جس میں آراستہ اور محفوظ ہے ایک معصوم تتلی کا لاشہ
سبز گوں پیڑ پر جیٹ ایسے پڑے ہیں
کیکڑوں کے ہوں جیسے یہ خول
اور "یہ لوگ" بالوں کو بکھراتے
سینہ کوبی میں ہیں ایسے مصروف
نوچ کر اپنے ناخن سے گالوں کو کرتے ہیں یہ خون سے
تر بتر
اور روتے بلکتے ہوئے کہہ رہے ہیں
"جسم کا سارا خون ہے سفید
زندگی کا ہر اک جلوہ بے رنگ ہے
اور معصوم خوشیوں میں اڑنے کی ہر حرکت ہو گئی گم
ختم ہو ہی گیا ساری رعنائیوں کا کرشمہ
اری تتلی، باغوں کی زینت !

[1] مہابھارت کی جنگ کا ایک ایسا کردار جسے زیر کرنے کے لیے شری کرشن نے روز روشن میں مصنوعی تیرگی پیدا کر دی تھی۔

لے گیا کون تجھ کو ؟
کھا گیا کون تجھ کو ؟
آہ !
کھا گیا کون تجھ کو ؟

یک بیک دن کا رتھ آسماں میں رکا ہے
دیکھ کر یہ سماں آہ وزاری کا آکاش سے
پاروتی اور شو جی کی آنکھوں سے آنسو ہے جاری
دیوتاؤں میں ماتم کی صف بچھی ہے

نہیں، کچھ نہیں
آسماں میں نہیں نیلگوں وسعتیں
طائروں کے ہیں بازو شکستہ
درختوں میں پتے نہیں ہیں
سمندر ہے پانی سے محروم
نہیں، کچھ نہیں
درختوں میں گل ہیں، نہ بلبل کے نغمے
نہ دریا میں موجیں، نہ آکاش میں نغمہ و نے

ابھرتی ہے ہر سو یہ ماتم کی آواز
تو نہ جا کر کے ہم کو یتیم
چاند کا ہو سفر، جنگ ہو یا سیاسی الکشن
پیٹ بھرنے کے سارے طریقے
یہ بڑھتی ہوئی توند
یہ گھٹتی ہوئی آنکھ کی روشنی

یہ گھٹتی ہوئی زندگی
موت کا ڈر، یہ جیوتش کے اندیشے
ہو سردی کا موسم کہ گرمی کا عالم
ہو بارش کا موسم کہ موجِ بہاراں
وقت یوں ہی گزرتا چلا جا رہا ہے
کون یہ جانتا تھا، اے تتلی
موت منڈلا رہی تھی ترے سر پہ ہر دم
تری موت ہی کے سبب
سارے پیڑ اور لتا مضمحل اور پژمردہ ہیں آج
کون یہ جانتا تھا کہ آئے گی اک روز ایسی قیامت ؟

پیاری تتلی
تو کہ ہے سارے اندھوں کی لاٹھی
چھوڑ کر ساری دھرتی کی مایا
تو ہمارے ہی خوں کے تموج میں ہے محوِ پرواز
اور ہمارے ہی خواب کے اعصاب میں تیرتی ہے
کس طرح ہم جئیں گے تجھے چھوڑ کر ؟
چاروں جانب اندھیرا ہے پھیلا ہوا
تو ہے یم لوک میں آج موجود
لوگو !
آؤ مثالِ صبا ہم چلیں
جا کے ہم بھیک تتلی کے جیون کی مانگیں خدا سے
اور کسی طرح لوٹا کے لے آئیں پھر اسے "

رات ہے اب طویل اور خاموش
وقت ہے یہ کچھ ایسا پر آسیب
تیرگی سے گھرا ہے یہ کالا سمندر
کالے غم سے ہیں لبریز آہوں کی موجیں ۔

انتظار حسین

۳۸۔بیل روڈ، لاہور
پاکستان

خواب اور تقدیر

ناقوں پہ سوار، چپ سادھے، سانس روکے ہم دیر تک اس راہ چلتے رہے حتیٰ کہ آگے آگے رہبر کے طور چلتے ہوئے ابوطاہر نے اپنے ناقے کی نکیل کھینچی اور اطمینان بھرے لہجہ میں اعلان کیا کہ "ہم نکل آئے ہیں۔"

"نکل آئے ہیں؟" ہم تینوں نے استعجاب اور بے یقینی سے ابوطاہر کو دیکھا۔ "رفیق! کیا ہم تیرے کہنے پر اعتبار کریں؟"

ابوطاہر نے اعتماد سے جواب دیا۔ "قسم ہے اس کی جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے کہ ہم شہر بے وفا سے نکل آئے ہیں۔"

پھر بھی ہم نے تامل کیا۔ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ارد گرد دیکھا۔ گرد و پیش کا پورا جائزہ لیا۔ کوئی کے جانے پہچانے در و دیوار واقعی نظروں سے اوجھل تھے۔ یہ گرد و پیش ہی اور تھا۔ تب ہمیں باور آیا کہ ہم نکل آئے ہیں۔ بس ترت اپنے ناقوں سے اترے اور بے اختیار سجدے میں گر پڑے۔ اپنے پیدا کرنے والے کا شکر ادا کیا۔ پھر راہ کے کنارے کھجوروں کے سائے میں بیٹھ کر اپنے توشے کو کھولا۔ ایک ایک مٹھی ستو پھانکے اور ٹھنڈا پانی پیا۔ اس ساعت میں ٹھنڈا پانی ہمیں کتنا ٹھنڈا اور میٹھا لگا، لگا کہ ہم پیاسوں نے آج زمانے کے بعد پانی پیا ہے۔ خدا کی قسم اس آفت زدہ شہر میں تو غذائیں اپنا ذائقہ کھو بیٹھی تھیں اور ٹھنڈے میٹھے کنوئیں یک قلم کھاری ہو گئے تھے یا شاید ہم اتنے بے مزہ ہو گئے تھے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ کی پیدا کی ہوئی نعمتیں ہمارے لیے بے لذت ہو گئی تھیں۔

یہ سب کچھ اس شخص کے وارد ہونے کے بعد ہوا۔ وہ شخص بالا قد گھوڑے پہ سوار سیاہ عمامہ پہنے منہ میں ڈھاٹا باندھے تلوار زیب کمر کیے ہوئے شہر میں داخل ہوا۔ ہم سمجھے کہ امام زماں کا ورود ہوا۔ نجات دہندہ کا ظہور ہوا۔ گلی گلی کوچہ کوچہ یہ خبر پھیلی، لوگ مسرور ہوئے، نجات کے تصور سے مخمور ہوئے مرحبا کہتے گھروں سے نکلے اور گرد اس کے اکٹھے ہوئے۔ کس شان سے سواری قصر الامارہ کی سمت چلی

لگتا تھا کہ پورا شہر امنڈا ہوا ہے۔

قصرالامارہ کے اونچے دروازے پر پہنچ کر اس نے گھوڑے کی باگ کھینچی اور مجمع کی طرف رخ کیا۔ رخ کرتے کرتے دفعتاً ڈھاٹا کھولا۔ خونخوار صورت، کف در دہان، نیام سے شمشیر نکالی۔ کڑک کر کہا کہ اے لوگو تم میں سے جو جانتا ہے، وہ جانتا ہے۔ جو نہیں جانتا وہ جان لے کہ میں آگیا ہوں۔ سب سناٹے میں آگئے۔ وہ بھی جنھوں نے دیکھا اور جانا کہ کون ہے جو آگیا ہے اور وہ بھی جنھوں نے دیکھا مگر نہ جانا کہ کون ہے جو آگیا ہے۔

اس نے اپنا اعلان کیا اور قصرالامارہ کے اندر چلا گیا۔ لوگ دیر تک ساکت کھڑے رہے۔ آخر کو ابوالمنذر نے مہر سکوت توڑی۔ افسوس بھرے لہجہ میں بولا "کوفے پر خدا کی رحمت ہو۔ انتظار اس نے کس کے لیے کھینچا اور وارد کون ہوا؟"

"کیا واقعی یہ وہ نہیں ہے جس کے لیے ہم انتظار کھینچ رہے تھے؟"

ابوالمنذر نے اس سوال پر ٹھنڈا سانس کھینچا "اے لوگو تف ہے تم پر کہ ابھی تک تم نے نہیں پہچانا کہ یہ کس باپ کا بیٹا ہے" رکا۔ پھر کہا "اس باپ کا جس کا باپ نہیں تھا اور جسے لونڈی نے جنا تھا"

"زیاد کا بیٹا" بے اختیار کئی زبانوں سے نکلا۔

ایک دفعہ پھر سب سناٹے میں آگئے اور اس مرتبہ سناٹا زیادہ دیر تک طاری رہا۔

اس کے آنے کی خبر شہر میں آگ کی طرح پھیلی۔ میں منصور بن نعمان الحدید بھرے کوچوں سے گذر کر قصرالامارہ تک پہنچا تھا اور خالی خیابانوں اور ہوحق کرتے کوچوں سے گزر کر واپس گھر پہنچا اور جب اس بے آرام رات کے بعد صبح ہونے پر میں گھر سے نکلا تو دیکھا کہ شہر بدل چکا ہے۔ خدا کی قسم کل میں نے اس شہر کو بھٹی پہ چڑھے کڑھاؤ کی مثال ابلتے دیکھا تھا۔ آج میں اسے سینۂ اہلِ ہوس کی صورت ٹھنڈا دیکھ رہا تھا۔ اور میں رویا کہ شہر کس شور سے سر اٹھاتے ہیں اور کتنی سرعت سے ڈھے جاتے ہیں۔

میں گرفتہ دل اپنے رفیق دیرینہ مصعب ابن بشیر کے پاس پہنچا۔ گلوگیر ہو کر کہا کہ اے مصعب تو نے دیکھا کہ کوفہ کا رنگ رات رات میں کیا سے کیا ہو گیا۔

مصعب نے مجھے ناآشنایانہ نظروں سے دیکھا اور بولا "تعجب مت کر اور آہستہ بول"

میں نے اسے تعجب سے دیکھا "رفیق کیا تو وہ نہیں ہے جو کل اونچی آواز سے بول رہا تھا"

"کل سب سے اونچی آواز میں ابوالمنذر بولا تھا اور آج وہ قصرالامارہ کی دیوار تلے ٹھنڈا پڑا

ہے۔"

یہ کہہ کے وہ عزیز شتابی سے مجمع سے جدا ہوا اور قصر الامارہ کی طرف چلا گیا۔

تب میں نے جانا کہ کوفہ واقعی بدل چکا ہے اور واقعی مجھے آہستہ بولنا چاہیے۔ بلکہ نہیں بولنا چاہیے۔ قیس بن مسہر کو میں نے دیکھا کہ وہ اونچی آواز میں بولا اور ہمیشہ کے لیے چپ ہو گیا۔ اس بے باپ کے بیٹے کے آدمی اسے پکڑ کر قصر الامارہ کی چھت پہ لے گئے۔ پھر کہا کہ بول۔ قیس اس قصر بلند کی چھت پہ کھڑے ہو کر اونچی آواز میں بولا کہ اس خاموش شہر کے ہر گھر میں اس کی آواز سنی گئی۔ دوسرے ہی لمحے اسے اس اونچی چھت سے نیچے ڈھکیل دیا گیا۔ قصر الامارہ کی دیوار تلے کتنی دیر وہ سسکتا رہا۔ کچھ دیر بعد اس کا رفیق دیرینہ عبدالمومن بن عمیر اس راہ سے گذرا۔ اسے سسکتا دیکھ کر خنجر کمر سے کھولا اور اس کے گلے پر پھیر دیا۔ ایک بوڑھے نے یہ منظر دیکھا اور قریب آ کر سرگوشی میں کہا کہ تو نے خوب حق رفاقت ادا کیا اور عبدالمومن نے جواب دیا کہ میں اپنے رفیق کو سسکتا ہوا نہیں دیکھ سکتا تھا۔

میں یہ نقشہ دیکھ وہاں سے پلٹا اور خیاباں خیاباں پریشان پھرتا رہا۔ اور میں نے جانا کہ میں کوفہ میں نہیں ہوں، خوف کے صحرا میں بھٹک رہا ہوں۔

خوف کے صحرا میں بھٹکتے بھٹکتے میری مڈبھیڑ ابو طاہر سے ہوئی اور ابو طاہر نے مجھے جعفر ربیعی اور ہارون ابن سہیل سے ملایا۔ کتنے دنوں تک ہم گونگے بہرے بنے اس خوف کے صحرا میں پھرتے پھرے۔ آخر کے تئیں صبر کا دامن ہاتھ سے چھوٹا۔ سر جوڑ کر بیٹھے اور مشورہ کیا کہ کیا کیا جائے۔ سوچا کہ کسی صورت اس شہر خراب سے نکل چلیے۔

اس تجویز پہ جعفر ربیعی رو پڑا "میں کوفے کی مٹی ہوں۔ اس مٹی کو کیسے چھوڑ دوں؟"

ہارون ابن سہیل جعفر ربیعی کی بات سن کر آبدیدہ ہوا۔ کہنے لگا "ہر چند کہ میں مدینے کی مٹی ہوں مگر پالنے والے کی قسم اس قریے سے مفارقت مجھے بھی رلائے گی کہ میں نے اپنی جوانی کے ایام اسی کے کوچوں میں گذارے ہیں۔"

تب ابو طاہر نے کہ ہم میں بڑا تھا میری طرف دیکھا "اے منصور تو اس باب میں کیا کہتا ہے؟" میں نے عرض کیا "رفیقو حضور کی حدیث یاد کرو کہ جب تمھارا شہر تم پہ تنگ ہو جائے تو وہاں سے ہجرت کر جاؤ۔"

یہ کلام سن کر سب رفیق قائل ہوئے اور نکل چلنے کی تیاریاں کرنے لگے۔

ہم نے شہر سے نکلنا کتنا آسان جانا تھا مگر کتنا مشکل نکلا۔ شہر کے دروازے پر پہرہ تھا۔ آنے جانے والوں پہ روک ٹوک تھی۔ کتنی مرتبہ ہم شہر کی حد تک گئے اور پہرے داروں کو چوکنا دیکھ کر پلٹ آئے۔

کوفہ ہم پر تنگ ہوتا جا رہا تھا۔ تنگ ہوتے ہوتے وہ چوہے دان کی مثال بن گیا۔ اس کے اندر ہم ایسے تھے جیسے چوہے دان میں چوہے کہ چکر کاٹیں اور نکلنے کی راہ نہ پائیں۔

نکلنے کی صورت نہ دیکھ کر ہم جی جان سے بیزار ہوئے۔ ہارون ابن سہیل نے لمبی آہ کھینچی "کاش ہماری مائیں بانجھ ہو جاتیں اور ہمارے باپوں کے نطفے ضایع ہو جاتے کہ نہ ہم پیدا ہوتے نہ یہ سیاہ دن ہمیں دیکھنے پڑتے۔"

جعفر ربیعی رویا اور بولا "وائے ہو مجھ پر کہ میں اپنے ہی قریے میں رنج اسیری کھینچتا ہوں۔ وائے ہو اس قریے پر کہ وہ اپنے بیٹوں کے لیے سوتیلی ماں بن گیا۔"

یاس کی اس انتہا پر پہنچ کر ہم جری بن گئے۔ مرتا کیا نہ کرتا، بس ہم کمر ہمت باندھ چل کھڑے ہوئے کہ جو ہو سو ہو یہاں سے نکلو۔

ہم نے تو اپنے آپ کو داؤں پر لگا دیا تھا۔ مگر وہ جو کسی نے کہا ہے کہ ہمتِ مرداں مددِ خدا تو بس سمجھ لو کہ وہ تائید ایزدی تھی کہ پہریداروں کی نظروں میں ہم نہیں آسکے۔ بس ان کی آنکھوں پر پردے پڑ گئے اور اب ہم شہر سے باہر تھے اور آزاد فضا میں سانس لے رہے تھے۔

شام کے سائے بڑھتے جا رہے تھے اور ہوا گرم سے ٹھنڈی ہونے لگی تھی۔

"ہم سفر رات کالی ہے اور سفر لمبا ہے۔ قدم آگے اٹھانے سے پہلے سوچ لو۔"

"اے اخی! کیا یہ رات کوفے کے دنوں سے زیادہ سیاہ ہے؟"

یہ دلیل سب کو قائل کر گئی۔ ہم اس دم بدم کالی ہوتی رات میں سفر کرنے کے لیے کمریں کس کر تیار ہو گئے۔

"مگر جانا کہاں ہے؟"

اس سوال نے ہمیں چونکا دیا۔ ہم تو بس نکل کھڑے ہوئے تھے۔ یہ تو سوچا ہی نہیں تھا کہ جانا کہاں ہے؟

ابو طاہر نے تامل کیا۔ پھر کہا "مدینے اور کہاں۔"

میں اور جعفر ربیعی اس تجویز کے موئید ہوئے۔ مگر ہارون بن سہیل سوچ میں پڑ گیا۔ دبے لہجہ میں بولا "اگر مدینہ بھی کوفہ بن چکا ہو تو؟"

ہم سب نے اسے برہمی سے دیکھا۔

"اے رفیق" جعفر ربیعی بولا "تو اس منور شہر کے بارے میں جب کہ تو خود وہاں کی مٹی ہے ایسا سوچتا ہے۔"

ہارون بن سہیل رکا۔ پھر بولا "ہمنفس بے شک اس شہر مبارک کی زمین آسمان ہے۔ وہاں کی مٹی معتبر اور پانی مصفا ہے مگر میں اس شہر کی سمت سے آنے والوں سے ملا ہوں۔ میں نے انھیں پریشان پایا"
اس پر ہم چپ ہو گئے۔ کسی سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔ مگر ہارون بن سہیل ابھی چپ نہیں ہوا تھا۔ سوچتے سوچتے بولا "ہمنفسو میں سوچتا ہوں اور حیران ہوتا ہوں کہ نورِ حق سے منور ہونے والے شہر کتنی جلدی منقلب ہو گئے۔ کتنی جلدی ان کے دن پراگندہ اور راتیں پریشان ہو گئیں"
ابوطاہر نے اسے برہمی سے دیکھا "اے سہیل کے ناخلف بیٹے، تیری ماں تیرے سوگ میں بیٹھے۔ کیا تو اسلام کی حقانیت سے انکار کرے گا"
ہارون بن سہیل بولا "بزرگ میں پناہ مانگتا ہوں اس دن سے کہ میں خدائے بزرگ و برتر کی وحدانیت میں شک کروں اور اسلام کی حقانیت سے انکار کروں۔ مگر یہ کہ کوفہ ....."
ابوطاہر نے غصے سے اس کی بات کاٹی "کوفہ کیا؟ کیا کہنا چاہتا ہے تو؟"
"ہاں یہی سوچتا ہوں کہ کوفہ کیا اور کیوں؟ بار بار اس خیال کو دفع کرتا ہوں اور بار بار یہ خیال میرا دامن گیر ہوتا ہے کہ مبارک قریوں کے بیچ کوفہ کیسے نمودار ہو گیا اور کتنی جلدی نمودار ہوا۔ ہجرت کو ابھی کون سا زمانہ گذر گیا ہے"
میں نے دیکھا کہ ابوطاہر کے مزاج کی درہمی بڑھتی جا رہی ہے۔ میں نے بات بیچ میں کاٹی اور کہا کہ "رفیقو میری تجویز یہ ہے کہ اس شہر چلیں جسے حق تعالیٰ نے شہرِ امن قرار دیا ہے۔ بیشک دنیا ظالموں سے بھر جائے اور زمین فساد سے تہ و بالا ہو جائے مگر مکہ کے مبارک شہر کے امن میں خلل نہیں آئے گا"
سب رفیقوں نے میری اس تجویز پر صاد کیا اور ہم فوراً ہی ناقوں پر سوار ہو گئے۔
تاریکی بہت تھی کہ یہ چاند کے شروع کی راتوں میں سے ایک تھی مگر ہمارا جذبہ ہمیں کھینچے لئے جاتا تھا۔ اب رات بھیگ چکی تھی اور آسمان سے اترتی خنکی نے ہمارے دلوں میں ایک ترنگ پیدا کر دی تھی شہر امن کے تصور میں مگن، رہائی کے نشہ سے سرشار ہم بڑھے چلے جا رہے تھے۔ ناقے پر بیٹھے بیٹھے مجھے اونگھ آگئی۔ میں نے کیا حسین خواب دیکھا کہ میں شہرِ امن میں ہوں، نیک پاک بزرگوں کے بیچ بیٹھا شہرِ ظلم کا احوال سناتا ہوں۔ اچانک کان میں ایک آواز آئی "یہ تو ہم پھر وہیں آگئے" اور میں نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھولیں۔ اب تڑکا ہو چکا تھا۔ پھیلتے اجالے میں سامنے کوفے کے در و دیوار نظر آ رہے تھے۔
"یہ تو ہم پھر وہیں آگئے" جعفر ربیعی کہہ رہا تھا۔
ابوطاہر نے، ہارون بن سہیل نے، میں نے حیرت و دہشت سے ان در و دیوار کو دیکھا۔

"مگر کیسے ؟" میرے منہ سے نکلا۔

ابوطاہر نے تامل کیا۔ پھر کہا: "رفیق، رات بہت کالی تھی۔ ہم نے راستہ پہچاننا نہیں۔ ویا جس رستے آئے تھے۔ اسلئے اسی رستے چل پڑے۔"

"اب کیا کریں ؟" جعفر ربیعی نے سوال کیا۔

ہم سوچ میں پڑ گئے۔ پھر ابوطاہر نے بعد تامل کے کہا: "رفیقو، واپسی اب محال ہے کہ پہرے والوں نے ہمیں دیکھ لیا ہے۔" رکا۔ پھر یاس سے کہا: "شاید قدرت کو ہمارا اس شہر خراب سے نکلنا منظور نہیں۔"

ہارون بن سہیل نے اس پر ٹھنڈی آہ کھینچی۔ "بزرگ تو نے بجا کہا۔ کوفہ ہماری تقدیر ہے۔"

"اور میں منصور بن نعمان الحدیدی بصد حسرت و یاس یوں بولا۔ "ہاں کہ ہمارا خواب ہے۔ تقدیر ہماری کوفہ ہے۔"

اور ہم خراب و خستہ ہو کر پھر کوفے میں آ گئے اور پھر چرہے دان کے اندر چکر کاٹنے لگے۔

□

فضا ابن فیضی
مئو ناتھ بھنجن، اعظم گڑھ

رباعیات

زہراب میں تریاق و شکر ڈال گیا
سامانِ نحوست تھا جو، وہ سال گیا
تعریف پہ اس کی جو رہا میں خاموش
سمجھا وہ کہ میں سر سے بلا ٹال گیا

تھوڑا سا جہاں بوجھ پڑا ٹوٹ گیا
ہاتھوں سے گریبانِ سفر چھوٹ گیا
وہ راہ کی سختی کو سہے گا کیسے
جو آبلۂ پا کی طرح پھوٹ گیا

سانسوں کو سم آلود مرکب پایا
ہر سطح پہ اپنے کو مذبذب پایا
جی لیتا سلیقے سے جو ہوتا بے ذوق
کیوں میں نے یہ فن کار کا منصب پایا

فارغ ہے تو، اور بوجھ ہے سارا مجھ پر
ہنستا ہے عقیدوں کا دھندلکا مجھ پر
صدیوں سے ہوں آزردۂ ریب و تشکیک
اے زندگی! اب فاش تو ہو جا مجھ پر

خوں گشتہ ہوا، امن کا محضر کیسا
مانگے ہے بریدہ سری پیکر کیسا
مقتل کے تماشائی ہیں، جمہور یہاں
قانون کے ہاتھوں میں ہے خنجر کیسا

کڑوی ہے، مگر بات ہے سچی در اصل
کٹتی ہے یہاں روز نئی لاشوں کی فصل
اک فاختۂ امن نے کل مجھ سے کہا
زندہ ہے ابھی خونی عقابوں کی وہ نسل

کب تک کوئی ذہنوں میں الجھن پالے
سائے کے تعاقب میں ہیں پڑھنے والے
کس سوچ میں ڈوبا ہے ہمارا فن کار
ہر لفظ پہ ابہام کا پردہ ڈالے

منیر نیازی
پاکستان

لطف المنان
لوساکا، زمبیا

غزلیں

دشت باراں کی ہوا سے پھر ہرا سا ہوگیا
میں فقط خوشبو سے اس کی تازہ دم سا ہوگیا
اس کے ہونے سے ہوا پیدا خیالِ جاں فزا
جیسے اک مردہ زمیں میں باغ پیدا ہوگیا
پھر ہوائے عشق سے آشفتگی خوباں میں ہے
ان دنوں میں حسن بھی آزار جیسا ہوگیا
ہے کہیں محصور شاید وہ حقیقت عہد کی
جس کا رستہ دیکھتے اتنا زمانہ ہوگیا
غم رہا ہے حال کہنا دل کا اس بت سے منیرؔ
جس کے غم میں اپنے دل کا حال ایسا ہوگیا

تیشے کو غرور کشوری ہے
پتھر میں گلاب کی کلی ہے
دریا تہِ سنگ سو گئے تو
شہروں کی پیاس جی اٹھی ہے
دل پر ہے اداسیوں کی چھایا
آنکھوں میں رات کی نمی ہے
موسم کی تلاش میں بھٹکتا
شاید یہی اپنی زندگی ہے
اے دوست اتیری دلبری بھی
سرما کی اداس چاندنی ہے
سجدے کا نشان ہے جبیں پہ
دل میں تو وہی صنم گری ہے
اے بخت و تاج والے سلطاں!
تجھ سے بھلا میری کب بنی ہے

توصیف تبسم

۳۹۱ - سیکٹر آئی ۹
اسلام آباد، پاکستان

غزلیں

دریا بھی ہے یاد کا منظر یاد رکھو
ڈوب کے پھر ابھرے گا شناور یاد رکھو
آنکھوں میں اک خواب کو لے کر سو جاؤ
آنکھ کھلے تو خواب کا منظر یاد رکھو
شامیں، رات کے آنگن میں رہ سکتی ہیں
صبحو! دن سے گزرو تو گھر یاد رکھو
بارش سنگ میں اپنے لہو سے تم لکھو
کس نے مارا پہلا پتھر یاد رکھو
زخموں کے پھولوں کو مہکائے رکھنا
یوں نہ تھمے گا دست ستم گر یاد رکھو
وہ جو دن میں رنگ ہے رات میں خوشبو ہے
اس چہرے کو منظر منظر یاد رکھو
لوگو! باہر کچھ بھی نہیں ہے مت بھولو
سب منظر ہیں آنکھ کے اندر یاد رکھو

دل آبلہ ہے مگر، پیچ و تاب کے اندر
حباب جیسے کوئی موجِ آب کے اندر
یہاں تو بس تری آواز ہی کے سائے ہیں
پکارتا ہے کسے دشتِ خواب کے اندر
وہ لفظ جو سرِ عنواں لکھا ہے دیکھ لے
ملے نہ لفظ کے معنی کتاب کے اندر
بس ایک وہم ہیں، ہم آسمان کے نیچے
بجز ہوا نہیں کچھ بھی حباب کے اندر
حدودِ بے خبری سے ادھر بھی دیکھ سکیں
پڑے شگاف جو دیوارِ خواب کے اندر
وہ دردمند ہیں، ہم دل بنا لیا اس کو
کلی جو کھل نہ سکی آفتاب کے اندر
گرہ میں گرد کے کیا ہے کسی نے کب دیکھا
بگولا تھا تو یہی پیچ و تاب کے اندر
کہاں سے لاؤں خنک آبجو زمیں کے لئے
بھٹک رہا ہوں ابھی خود سراب کے اندر

سید امین اشرف

غزل

قرارِ خاطرِ آشفتگاں ملے نہ ملے
چلے چلو قدمِ کہکشاں ملے نہ ملے

ہیں مشتِ خاک برابر مجھے مہ و اختر
زمیں سے پیکرِ ہفت آسماں ملے نہ ملے

چلے تو لے کے چلے شانِ بے نیازی بھی
وہ قحط ہے کہ یہ جنسِ گراں ملے نہ ملے

یہ سوچ کر تری محفل سے لوٹ آئے ہیں
دماغِ عشق سے خوئے بتاں ملے نہ ملے

غرض کچھ اُس سے نہیں ذوقِ جستجو سے ہے
وہ سروِ ناز وہ آرامِ جاں ملے نہ ملے

جو آگئے ہیں تو یہ گردِ رہ گزر ہی سہی
مزاجِ گیسوئے عنبر فشاں ملے نہ ملے

اسی لئے ہیں سرِ برقِ بے اماں کچھ لوگ
چمن میں اور کہیں آشیاں ملے نہ ملے

مری طرف بھی اے محشر خرام و خوش اندام
ہرا بھرا شجرِ سوزِ جاں ملے نہ ملے

وہ رند ہوں کہ نہ پی کر بھی مست رہتا ہوں
مجھے سرورِ مئے ارغواں ملے نہ ملے

پرکاش فکری

غزلیں

جب اندھیرے میں چین پاؤں میں
کیوں چراغوں سے لو لگاؤں میں
وہ تو خوش ہے سراب کو پاکر
جان اپنی عبث جلاؤں میں
اس سے مانگے جو بھیک مرہم کی
اپنے زخموں کا جی دکھاؤں میں
رات کہتی ہے درد کا قصہ
خواب آنکھوں میں جب سجاؤں میں
یوں بھی دیکھوں تباہیاں اپنی
رخ پہ طوفاں کے گھر بناؤں میں
کتنا پیارا ہے ساحلی منظر
کیسے پانی میں ڈوب جاؤں میں
گرد پرتیں جما گئی فکریؔ
رنگ کتنے تھے کیا بتاؤں میں

کٹے درخت کے سر جہاں سے تھے
پرند چپ چاپ بے زباں سے تھے
گھرے تھے بادل اداسیوں کے
خموش بستی کے سب مکاں سے تھے
انھیں بھی موجیں ڈبو گئی ہیں
جو گہرے پانی کے رازداں سے تھے
کہاں مچلتے شرار ان میں
بدن ہمارے تو خاکداں سے تھے
رہے نگاہوں میں داغ بن کے
ہمارے زخموں کے جو نشاں سے تھے
یہ ریگ ان کے سفر کا حاصل
یہاں جو دریا کبھی رواں سے تھے
ہمیں تو فکریؔ نہ راس آئے
جو رنگ و خوشبو سے خوش بیاں سے تھے

حامدی کاشمیری

۳۹۹- جواہر نگر
سری نگر، کشمیر

غزلیں

منجمد وادیوں میں آگ لگادی کس نے
جان کو رکھ کے ہتھیلی پہ صدا دی کس نے

خونچکاں انگلیوں سے لکھی تھی دیواروں پر
صبح سے پہلے وہ تحریر مٹادی کس نے

دونوں کو قتل کیا بے سر و سامانی میں
خاک میں عزتِ اجداد ملادی کس نے

پہلے جو چپ تھے وہ سائے بھی ہیں خنداں مجھ پر
اس سیہ خانے میں اک شمع جلادی کس نے

گھٹ گیا زور ہواؤں کا تھمی موجِ بلا
منتظر کون ہے ساحل پہ دعا دی کس نے

خون روتے ہوئے سائے ہیں جہاں تک دیکھو
سب کے خوابوں کی یہ بستی تھی جلادی کس نے

کیسا ہے قہر درختوں کا، یہ اب دیکھو گے
صبح دم رات کی روداد سنادی کس نے

وہ توجہ، وہ تلطف، وہ پذیرائی نہیں
بزم سے اٹھ جاؤں، تہذیبِ شناسائی نہیں

ایک مدت سے پہاڑی راستے سنسان ہیں
کیا کسی کو شہر میں راہب کی یاد آئی نہیں

اب بھی موقع ہے چلو جنگل سے بستی کی طرف
ہے ابھی شورِ ہوا کالی گھٹا چھائی نہیں

ہو گئے ایک ایک کر کے سب تماشے میں شریک
اب تماشا ہی تماشا ہے تماشائی نہیں

وقت نے ثابت کیا پرچھائیاں گونگی نہیں
اب مرے دل میں بھی وہ احساسِ تنہائی نہیں

زلف و عارض، بام و در کی طرح ہدف گرد ہیں
کیا کسی کو شہر میں شوقِ خود آرائی نہیں

ماہنامہ "تحریریں"
چوک، اردو بازار، لاہور

حفیظ صدیقی

غزلیں

میں ازل سے ہی حصارِ ذات میں محصور تھا
کیا قفس سے جھانک کر باہر کا منظر دیکھتا

اس کے جاتے ہی فضا کے رنگ سارے کھو گئے
کیا گیا وہ شخص آنکھیں ہی چرا کر لے گیا

کل تلک اپنے خواب پر بھی تھا حقیقت کا گماں
آج جیتی جاگتی دنیا بھی منظر خواب کا

میں وہی کچھ تو نہیں جو تو نے سمجھا ہے مجھے
تو کبھی مجھ سے بھی مل اوروں کی باتوں پر نہ جا

لاکھ یہ خواہش کہ تجھ سے ہر تعلق توڑ لوں
لے ہی آتی ہے تری خوشبو مگر پاگل ہوا

وا ہے گر چشمِ بصیرت تو نہ دریا میں اتر
سطح سے پانی کی گہرائی کا اندازہ لگا

مدتیں گذریں کہ وہ اک بار آیا تھا حفیظ
آج تک دیوار و در سے اس کی آتی ہے صدا

چبھن کا بخش دے پہلا سا وہ مزا پھر سے
جو زخم بھول چکا ہوں وہی لگا پھر سے

مرے مزاجِ مروّت کو جو سمجھ نہ سکا
وہ ناشناس بنا، میرا آشنا پھر سے

ہوا کی جس نے صعوبت اٹھائی ہے برسوں
اسی چراغ کو میں نے جلا دیا پھر سے

رفاقتوں کا نتیجہ تو مل چکا ہے مجھے
تو اجنبی کی طرح میرے پاس آ پھر سے

سزائیں جتنی وفا کی مجھے ملیں کم ہیں
برنگِ طنز مرے غم پہ مسکرا پھر سے

شدید بانجھ ہوا میرا واقعی ماحول
میں اپنی ذات کے اندر نہ اگ سکا پھر سے

کسی نے پھر اسے بھڑکا دیا ہے میرے خلاف
بغیر ہاتھ ملائے وہ چل دیا پھر سے

تڑپ رہی ہے زمینوں پہ لاش سورج کی
طلب کرے گا کوئی اپنا خوں بہا پھر سے

جو دیکھتا ہوں وہی بات میں کروں گا رقم
جو ہو سکے مری آنکھوں کو تو بجھا پھر سے

بھلا کے اس کو بہت مطمئن تھا لیکن آج
جلے چراغ تو چلنے لگی ہوا پھر سے

آشفتہ چنگیزی

سائنوٹیکس، شارع ستین، ص ب ۴۵۵۱
ریاض، سعودی عرب

غزل

صدائیں قید کروں آہٹیں چرالے جاؤں
مہکتے جسم کی سب خوشبوئیں اڑا لے جاؤں
تری امانتیں محفوظ رکھ نہ پاؤں گا!
دوبارہ لوٹ کے آنے کی بس دعا لے جاؤں
کہا ہے دریا نے وہ شرط ہار جائے گا
جو ایک دن میں اسے ساتھ میں بہا لے جاؤں
بلا کا شور ہے، طوفان آگیا شاید
کہاں کا رخت سفر خود کو ہی بچا لے جاؤں
ابھی تو اور نہ جانے کہاں کہاں بھٹکوں
میں زندہ رہنے کا کوئی تو حوصلہ لے جاؤں

چار شعر

سبھی کو اپنا سمجھتا ہوں کیا ہوا ہے مجھے
بچھڑ کے تجھ سے عجب روگ لگ گیا ہے مجھے
یہاں کے لوگ سبھی پتھر کے جسم رکھتے ہیں
کہانیوں میں سنا تھا سو سچ لگا ہے مجھے
میں سرد جنگ کی عادت نہ ڈال پاؤں گا
کوئی محاذ پہ واپس بلا رہا ہے مجھے
میں تجھ کو بھول نہ پایا یہی غنیمت ہے
یہاں تو اس کا بھی امکان لگ رہا ہے مجھے

ظفر صہبائی

غزلیں

(بانی کے نام)

نہ تھی کچھ صرف لذت کی طرح تھی
بہار اک اچھی ساعت کی طرح تھی
کھلی کس لطف سے ہنستے لہو میں
اداسی عین فطرت کی طرح تھی
کس کا لمس آہٹ بن گیا تھا
مری ہستی سماعت کی طرح تھی
تعلق کا اشارا ہم نے سمجھا
ہنسی اس کی وضاحت کی طرح تھی
دھنک مانگی فلک نے جب قبا میں
نگر اک تشنہ حسرت کی طرح تھی
خدا کا شکر غم سا کام بخشا
حیات اک لمبی فرصت کی طرح تھی
شکستہ ہو چکے لمحو! سے پوچھو
کوئی شے مجھ میں وحدت کی طرح تھی
ہوا زخموں پہ بارش تھی نمک کی
مگر ایسی کہ لذت کی طرح تھی

دست احساس میں تھی گلوں کی چھڑی
چوٹ کھا کر مگر زندگی رو پڑی
یاد آیا عصائے کلیمی بہت
راستے میں ہمارے ندی جب پڑی
دیر تک آنکھ سے پھول برسا کیے
کس قدر شوخ تھی یاد کی پھلجھڑی
بس اچانک ہی سارے دیے بجھ گئے
تیرگی شہر پہ ایک دم گر پڑی
ان کی محرومیوں کا سبب یہ رہا
ہاتھ چھوٹے تھے لیکن امیدیں بڑی
بازوؤں سے ذرا کام لیتے جو ہم
کھولتی منہ سلاسل کی اک اک کڑی
ختم ہوتی ہے چابی کبھی تو ظفر
ٹک ٹک آخر کہاں تک کرے گی گھڑی

طاہر تونسوی

شعبۂ اردو
گورنمنٹ کالج، لاہور
پاکستان

غزلیں

مجھے یہ خوف کہ اس کو کہیں ہوا نہ لگے
وہ شخص جس کو خود اپنا بھی کچھ پتہ نہ لگے

شکستِ شب سے اگرچہ اداسیاں سمٹیں
مگر ابھرتا اجالوں کا قافلہ نہ لگے

چھپا ہوا تھا جو زنبیل ذہن میں برسوں
میں کاغذوں پہ بکھیروں تو آشنا نہ لگے

وہ دھوپ ہے کہ مجھے سایہ بھی گراں گذرے
غموں کی لہر میں اب کوئی آسرا نہ لگے

بدن کی جھیل میں اتروں مگر یہ خواہش ہو
میں لوٹ جاؤں اسی سمت گر بہانہ لگے

وہ حرفِ خیر میں کہ تھا فکر کی تجوری میں
خیال موجۂ احساس سے سوا نہ لگے

وہ جس کی گرد کو صدیوں نہ پا سکے طاہر
جو بند کر لوں میں آنکھیں تو ماورا نہ لگے

جنگل اجاڑ ہے تو ہر اک بے درخت ہے
اس رت میں اب کے جاڑے کا حملہ بھی سخت ہے

وہ پیاس ہے لبوں پہ سفیدی ہے منجمد
دریا کے صحن پہ بھی تو کائی کا تخت ہے

سطحِ زمیں پہ چاندنی پھیلی ہے اس طرح
پیراہنِ کفن ہے مگر سخت سخت ہے

یوں ہم چلے کہ بے سروسامانی رو پڑی
اندھے سفر میں حوصلہ ہی زادِ رخت ہے

جھانکو تو دل میں رحم کی پرچھائیاں ملیں
گفتار میں مگر وہ بلا کا کرخت ہے

دیکھوں تو خواہشات کے در ہیں کھلے ہوئے
سوچوں تو مجھ سے کون بڑا نیک بخت ہے

آتش فشاں پہاڑ ہے طاہر ترا یہ روپ
لمحوں کی آگ میں مرے دل کا درخت ہے

نیر مسعود

سدِ سکندری

افراد

بڑے آغا ــــــ عمر تخمیناً ایک سو چھ برس

آغا امیر حسن ــــــ بڑے آغا کے پوتے عمر تخمیناً چھیاسٹھ برس

ضمیر حسن ــــــ آغا امیر حسن کا بیٹا عمر تخمیناً چھتیس برس

ریحانہ ــــــ ضمیر حسن کی بیوی عمر تخمیناً اٹھائیس برس

دوست ــــــ ضمیر حسن کا ہم عمر

ڈاکٹر

○

پہلا منظر

[پردہ اٹھنے پر اسٹیج تاریک نظر آتا ہے۔ گھڑی کی ٹک ٹک کی آواز آتی جو بڑھتے بڑھتے گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ تیز سے تیز تر رفتار کا تاثر۔ اچانک ٹاپوں کی آواز بے ترتیب۔ گرنے کا دھماکا۔ وقفہ۔ کتاب کے ورق پلٹنے کی آواز۔ اسٹیج پر جزوی روشنی ہو جاتی ہے جس کے حلقے میں ایک میز اور دو کرسیاں رکھی ہیں۔ میز پہ ایک گھڑی، چند کتابیں اور کچھ معمولی سامان ہے۔ کرسیوں پر ضمیر حسن اور اس کا دوست بیٹھے ہیں۔ دوست میز پر ہاتھ رکھے ضمیر حسن کی طرف جھکا ہوا ہے۔]

دوست : یار ضمیر! لیکن بات کچھ سمجھ میں نہیں آئی۔ بظاہر تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کتاب میں جن بڑے آغا کی شہسواری کا حال لکھا ہے وہ تمھارے دادا ہی ہیں۔

ضمیر حسن : پردادا۔

دوست : پردادا؟ اوہ، اچھا، وہی تو میں کہوں۔ میں تمھارے دادا حضور کو ان سے کنفیوز کر رہا تھا۔ جبھی تو حیران تھا کہ اس کتاب میں تو تیس سال پہلے بڑے آغا کو مرحوم لکھا گیا ہے۔

ضمیر حسن : غلط لکھا گیا ہے۔

دوست : ایں؟ یار ٹھہرو، پھر گڑبڑ ہو رہی ہے۔ دیکھو نا، اس کتاب میں تو لکھا ہے کہ ... میں عبارت پڑھے دیتا ہوں۔ (میز پر ایک اوندھی رکھی ہوئی کتاب اٹھا کر اس میں سے پڑھتا ہے۔)... الغرض بڑے آغا مرحوم کے کمالاتِ شہسواری کہاں تک گنائے جائیں۔ ادنیٰ بات یہ ہے کہ گھوڑے پر فقط بیٹھنے کا ان کا ٹھاٹھ ایسا تھا کہ جن کو دیکھ کر اچھے اچھے شہسواروں کی گھگھی بندھ جاتی تھی۔ (ضمیر حسن کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھتا ہے۔)

ضمیر حسن : صحیح لکھا ہے۔ وہ ایسے ہی شہسوار تھے۔

دوست : اور سنو۔ اس کے آگے لکھا ہے (کھنکھار کر) "افسوس افسوس، موت کے ظالم ہاتھوں نے کیسے کیسے باکمالوں کو ہم سے چھین لیا۔ بڑے آغا مرحوم کی یاد آتی ہے بے ساختہ منہ سے آہ نکل جاتی ہے ..." اس کے بعد یہ کوئی فارسی کا شعر ہے جس میں کچھ خاک اور خزانے کا ذکر ہے۔ (کتاب بند کر کے رکھ دیتا ہے) خیر تو تمھارا مطلب یہ ہے کہ تیس سال پہلے تک بڑے آغا مرحوم زندہ تھے۔

ضمیر حسن : نہیں میرا مطلب یہ ہے کہ بڑے آغا مرحوم آج تک زندہ ہیں۔

دوست : (ہنستا ہے) اچھا، اب یہ بتاؤ کہ تمھارے دادا کا نام کبھی بڑے آغا کیوں پڑ گیا؟

ضمیر حسن : میرے دادا کا نام چھوٹے آغا تھا۔

دوست : وہی میں پوچھ رہا ہوں کہ پھر وہ بڑے آغا کیوں کہلاتے ہیں؟

ضمیر حسن : کہلاتے "ہیں"۔ یہ کیا ماضی اور حال کا چکر ڈالے ہوئے ہو۔ میرے دادا کا نام چھوٹے آغا تھا اور ان کی وفات کو عرصہ گزر گیا۔

دوست : وفات؟ تو وہ بزرگ جو تمھارے یہاں دیوان خانے میں رہتے ہیں، جنھیں تم دادا حضور کہتے ہو ...

ضمیر حسن : وہ میرے پردادا ہیں۔

دوست : پردادا ؟ یار تم پھر کنفیوژن ... مطلب، وہ تمہارے فادر کے ...

ضمیر حسن : ... جی ہاں۔ وہ ابا میاں کے دادا ہیں۔

دوست : ضمیر، پلیز...

ضمیر حسن : (بہت تیز لہجہ) ہاں وہی بڑے آغا ہیں جن کی شہ سواری کا حال اس کتاب میں تیس سال پہلے لکھا گیا تھا۔ انھیں کو تیس سال پہلے اس کتاب میں غلطی سے مرحوم لکھ دیا گیا۔ اور غلطی سے کیوں، صحیح لکھا گیا۔ اس لئے کہ اس وقت بھی، اب سے تیس سال پہلے بھی وہ اپنے دیوان خانے میں بند تھے اور تیس چالیس سال سے باہر نہیں نکلے تھے۔ اور اب اس تیس چالیس سال میں تیس سال اور جوڑ لو۔

دوست : ضمیر! پلیز...

ضمیر حسن : اور اگر تم یقین کرنا نہیں چاہتے تو دیوان خانے میں جاکر ان کا گلا گھونٹ دو۔

دوست : ضمیر، ضمیر! یہ تمھیں کیا ہو رہا ہے ؟

ضمیر حسن : (نرم لہجہ) معاف کرنا یار۔ یہ موضوع میرے لئے کچھ تکلیف دہ سا ہے۔ خواہ مخواہ تمھیں بھی پریشان کر رہا ہوں۔

دوست : نہیں، کوئی بات نہیں۔ مجھے معلوم نہیں تھا، ورنہ میں پوچھتا ہی نہیں۔

ضمیر حسن : ان کی عمر سو سال سے زیادہ ہے۔

دوست : چھوڑو یار۔ کچھ اور باتیں کریں۔

ضمیر حسن : نہیں، میں تمھارے مزاج سے واقف ہوں۔ تم رات بھر جاگتے اور الجھتے رہوگے، پھر وہی بلڈ پریشر... میں تمھیں ان کی ہسٹری بتائے دیتا ہوں۔

دوست : اچھا، پھر کبھی سہی، اور میری فکر نہ کرو (ہنستا ہے) میں کچھ کھا کے سو رہوں گا۔

ضمیر حسن : سنو۔ وہ بیس سال کے تھے جب میرے دادا چھوٹے آغا پیدا ہوئے۔ چالیس سال کے تھے جب ان کے پوتے یعنی میرے ابا میاں کی ولادت ہوئی۔ اس کے دو ایک سال بعد بڑے آغا انھیں گود میں لے کر گھوڑے پر بیٹھے۔ دوڑتے دوڑتے اچانک گھوڑے نے ٹھوکر کھائی اور پوتے کو بچانے کی فکر میں وہ گھوڑے پر سے اس طرح گرے کہ ان کی ٹانگ ٹوٹ گئی۔ علاج سے ہڈی جڑ تو گئی لیکن وہ بری طرح لنگڑانے لگے اور گھوڑے پر بیٹھنے کے قابل

نہیں رہے۔ اس کے بعد سے انھوں نے گھر سے نکلنا چھوڑ دیا۔

دوست : یعنی اب سے کوئی ...

ضمیر حسن : کوئی ساٹھ پینسٹھ سال پہلے کی بات ہے یہ۔ اس وقت ان کی عمر چالیس بیالیس سال رہی ہوگی۔ اس کے بعد سے آج تک وہ اپنے دیوان خانے سے باہر نہیں نکلے ہیں۔ میرے دادا چھوٹے آغا نے ان کی بے حد خدمت کی۔ کوئی پچیس سال ہوئے دادا میاں کا تعلیمی دورے میں انتقال ہوگیا۔ اس کے بعد سے ابا میاں اسی طرح ان کی خدمت کر رہے ہیں۔

دوست : اچھا ان کے ہوش حواس ؟

ضمیر حسن : بالکل درست ہیں۔ آواز بھی ویسی ہی مضبوط ہے۔ آنکھوں کی روشنی البتہ قریب قریب ختم ہو گئی ہے۔

دوست : یار ان سے تو ملاقات کرواؤ۔

ضمیر حسن : کوئی سوال نہیں۔ جب سے انھوں نے خود کو دیوان خانے میں قید کیا ہے اس وقت سے آج تک وہ کسی باہری آدمی سے نہیں ملے۔

دوست : کیوں ؟

ضمیر حسن : وضع داری۔ بازدید کی مجبوری۔

دوست : کیا مطلب ؟

ضمیر حسن : مطلب یہ کہ اگر کوئی ان سے ملاقات کو آئے تو ان کا بھی فرض ہو جائے گا کہ اس سے ملنے جائیں اور چونکہ انھوں نے باہر نکلنا چھوڑ دیا ہے اس لئے وہ جواب میں کسی سے ملنے نہیں جا سکتے۔ اس لئے کوئی ان سے نہیں مل سکتا۔

دوست : اچھا یہ بھی نہیں ہو سکتا کہ میں ان کو چھپ کر دیکھ لوں ؟

ضمیر حسن : نہ۔ ان کو خبر ہو جائے گی۔

دوست : ان کی دیکھ بھال کون کرتا ہے ؟

ضمیر حسن : ہم سبھی کرتے ہیں۔ ابا میاں سب سے زیادہ۔

دوست : اور تم اور ریحانہ ؟

ضمیر حسن : ہم بھی۔ لیکن یار سچ پوچھو تو یہ ہمارے بس کا روگ ہے نہیں۔ اتنا ٹنشن میں زیادہ دن تک برداشت نہیں کر سکتا۔ میں تو شاید پھر بھی جھیل لوں لیکن ریحانہ ...

دوست : اس میں ٹنشن کی کیا بات ہے ؟

ضمیر حسن : اصل میں پرابلم یہ ہوئی کہ میرے دادا صاحب نے ان کی بے حد خدمت کی اور ان کے ذہن کو جو گھوٹلے والے حادثے کے بعد بہت اپ سیٹ ہو گیا تھا پرسکون رکھنے کے لئے پوری کوشش کی کہ ان کو دیوان کے باہر کی دنیا سے بے خبر رکھا جائے ۔ چنانچہ وہ آج بھی بے خبر ہیں۔ اور ہمارا فرض ہے کہ ان کو بے خبر رہنے دیں ۔

دوست : کیا مطلب ؟

ضمیر حسن : چھوڑ و یار ۔ میرا دماغ الجھ گیا ۔ کچھ اور باتیں کریں ۔

[اسٹیج تاریک ہو جاتا ہے ۔ پردہ گرتا ہے ۔]

دوسرا منظر

[ایک سادہ سا کمرہ جس کی دیواروں تک اسٹیج کی روشنی نہیں پہنچ رہی ہے ۔ کوئی فرنیچر نظر نہیں آتا ۔ ضمیر حسن اور ریحانہ کھڑے باتیں کر رہے ہیں ۔]

ریحانہ : نہیں ، مجھے ڈر لگتا ہے ۔

ضمیر حسن : صرف جا کر سلام کر لینا ہے ۔ اس میں ڈرنے کی کون سی بات ہے ؟

ریحانہ : اور مزاج جو پوچھنا ہے ؟

ضمیر حسن : افوہ ! صرف اتنا پوچھنا ہے کہ دادا حضور مزاج کیسا ہے ، پھر تو وہ خود ہی شروع ہو جائیں گے ۔ تم تو ان کی باتیں بڑے شوق سے سنا کرتی تھیں ۔ یہ ان سے ڈرنا کیوں شروع کر دیا ؟

ریحانہ : نہیں ان سے تھوڑی ڈر لگتا ہے ۔

ضمیر حسن : پھر ؟

ریحانہ : مجھے دیوان خانے سے ڈر لگتا ہے ۔

ضمیر حسن : دیوان خانے سے ؟ (ہنستا ہے)

ریحانہ : نہیں دیوان خانے سے نہیں ... شاید انھیں سے ... نہیں شاید دیوان خانے میں ان کے ہونے سے ۔

ضمیر حسن : اچھا اچھا ، پھر کبھی اطمینان سے طے کر لینا کہ اصل میں تمھیں کا ہے سے ڈر لگتا ہے ۔

اس وقت تو صرف ... اے لو شاید ابا میاں آ گئے۔ اچھا ٹھیک ہے۔ تم چائے کا انتظام کرو۔

[ریحانہ جاتی ہے۔ آغا امیر حسن داخل ہوتے ہیں۔]

آغا امیر حسن: ضمیر میاں! اچھا تم ابھی ہو؟

ضمیر حسن: جی ابا میاں! آپ ہی کا انتظار کر رہا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نہیں آئے؟

آغا امیر حسن: آتے ہوں گے۔ میرے سامنے ہی روانہ ہو گئے تھے، میں گلی کی طرف سے آرہا ہوں۔

ضمیر حسن: لیکن ابا میاں! وہ ڈاکٹر کو دکھانے پر تیار بھی ہوں گے؟

آغا امیر حسن: نہیں بھائی، وہ کیا تیار ہوں گے۔ اسی لئے ڈاکٹر متین کو خوشامد کر کے راضی کیا ہے۔ وہی حکیموں کے خاندان سے ہیں۔ اچھی طرح سکھا پڑھا بھی دیا ہے۔

ضمیر حسن: لیکن ابا میاں! ان کو سمجھانا تو چاہئے کہ ڈاکٹری علاج ...

آغا امیر حسن: (غصے میں) یہ تم سمجھانا سمجھانا کیا کرتے ہو؟ وہ اس کے عادی نہیں ہیں کہ ان کے چھوٹے ان کو سبق پڑھائیں۔

ضمیر حسن: ابا میاں! سبق پڑھانے کی بات نہیں ہے، میرا مطلب تھا اگر ان سے کہہ کر دیکھا جائے کہ ڈاکٹری علاج ...

آغا امیر حسن: تب بھی وہ یہی سمجھیں گے کہ ان کو سبق پڑھایا جا رہا ہے۔ (بہت نرم لہجے میں) بیٹے! ہمارے اور ان کے زمانے میں بڑا فرق ہے۔ سمجھا تو کرو (دستک کی آواز) ڈاکٹر صاحب آ گئے۔ (بلند آواز) تشریف لائیے ڈاکٹر صاحب۔

[ڈاکٹر داخل ہوتا ہے۔]

ضمیر حسن: آداب عرض ڈاکٹر صاحب۔

ڈاکٹر: آداب ... (بیگ ایک سے دوسرے ہاتھ میں لیتا ہے) ہاں جناب کہاں ہیں بڑے آغا صاحب؟

آغا امیر حسن: آئیے، دیوان خانے میں تشریف لے چلئے۔ (سرگوشی میں) ضمیر میاں چائے۔

ڈاکٹر: نہیں چائے کی تکلیف نہ کیجئے گا۔ مجھے فوراً واپس جانا ہے۔ کیا بتاؤں دم لینے کی فرصت نہیں۔ امیر صاحب آپ بہت مزے میں ہیں۔ ریٹائرمنٹ کی لائف گزار رہے ہیں۔ یہاں تو مرنے کے بعد ہی ریٹائرمنٹ ہے۔ (ہنستا ہے) کدھر چلیں؟

آغا امیر حسن: ادھر تشریف لائیے۔

[دونوں روشنی سے دور جھپٹے جاتے ہیں۔ پردہ گرتا ہے۔]

تیسرا منظر

[پردہ اٹھنے پر اسٹیج تاریک۔ دھیرے دھیرے ہنکارے بھرنے کی آواز آتی ہے۔ اسٹیج روشن ہوتا ہے۔ دیوان خانہ۔ لکڑی کی کشادہ دار محرابیں نظر آرہی ہیں۔ پرانے وضع کی مسہری پر بڑے آغا کئی گاؤ تکیوں کے سہارے نیم دراز ہیں۔ ایک ٹانگ سیدھی ہے، دوسری موڑے ہوئے ہیں۔ صاف انگرکھا اور دوپلی ٹوپی پہنے ہیں۔ سر جھکائے ہوئے ہنکارے بھر رہے ہیں۔ آغا امیر حسن اور ڈاکٹر داخل ہوتے ہیں۔]

آغا امیر حسن: ابا حضور، حکیم صاحب تشریف لے آئے ہیں۔

بڑے آغا: (سر اٹھا کر) کون، امیر حسن میاں؟ کہاں نکل گئے تھے بیٹا؟

آغا امیر حسن: حکیم صاحب کو لانے گیا تھا ابا حضور۔ اسی میں دیر ہو گئی۔ بے چارے مطلب کا بڑا حرج کر کے آئے ہیں۔

ڈاکٹر: آداب بجا لاتا ہوں حضور۔ کیسا مزاج ہے؟

بڑے آغا: اچھا، حکیم صاحب آ گئے؟ تسلیمات۔ یہ لڑکا بھی ذرا میں پریشان ہو جاتا ہے۔ امیر حسن میاں میں نے تم سے کہا تھا کہ میں ٹھیک ہوں۔ مگر تم کہاں مانتے ہو؟ خواہ مخواہ حکیم صاحب کو زحمت دی۔

ڈاکٹر: جی نہیں، اس میں زحمت کی کیا بات ہے؟

آغا امیر حسن: ابا حضور آپ حکیم صاحب کو تفصیل سے اپنی طبیعت کا حال بتا دیجئے۔

بڑے آغا: اے بیٹا! طبیعت خراب ہو تو حال بتاؤں۔ حکیم صاحب، تداخل فصلین سے ہلکی سی حرارت ہو گئی ہے۔ دو چار روز میں آپ ہی آپ جاتی رہے گی۔ باقی جو شکایتیں ہیں وہ عمر کے تقاضے سے ہیں۔ بائیں ٹانگ کی بھی طاقت جواب دے چکی ہے۔ پلنگ سے لگنا نہیں چاہتا اس لئے اسی دیوان خانے میں رینگ۔ رینگ کر چہل قدمی بدستور کر لیتا ہوں۔ آنکھیں ... منہ کا مزہ مدت سے خراب ہے۔ کسی چیز میں وہ اگلا سا ذائقہ نہیں ملتا۔ آنکھیں ... آنکھوں نے بھی زمانہ ہوا کام کرنا چھوڑ دیا۔ آپ کی جگہ ایک پرچھائیں سی نظر آرہی ہے۔ (آنکھیں سکیڑ کر ڈاکٹر کو دیکھتے ہیں) ماشاءاللہ

جوان معلوم ہوتے ہیں۔ کس خانوادے سے تعلق ہے جناب کا؟

آغا امیرحسین : ابا حضور آپ حکیم سلطان حسین کے پوتے ...

بڑے آغا : اخاہ، تو یوں کہئے شفاء الدولہ بہادر کی اولاد ہیں۔ ماشاء اللہ، ماشاء اللہ، آپ کے خاندان کا دستِ شفا تو ضرب المثل ہے۔ شفاء الدولہ بہادر کا یہ عالم تھا کہ مریض نے حال بتانا شروع کیا اور انھوں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر چپ کیا۔ خود نبض پر ہاتھ رکھا اور اول سے آخر تک سارا حال ... لیجئے، میں نے ابھی تک آپ کو نبض تو دکھائی ہی نہیں۔ آپ بھی کیا سوچتے ہوں گے۔

(ہاتھ آگے بڑھاتے ہیں۔)

ڈاکٹر : جی نہیں، مجھے خود خیال نہیں رہا۔ لائیے دیکھوں۔ (نبض پر ہاتھ رکھتا ہے۔ وقفہ) ٹھیک ہے۔ آغا صاحب کوئی پریشانی کی بات نہیں۔ میں دوا بھجوا تا ہوں۔ دو تین دن میں ...

بڑے آغا : ... اور سنایئے، ہمارے بھائی حکیم سلطان حسین صاحب کا مزاج کیسا رہتا ہے؟

ڈاکٹر : جی، وہ تو ... ان کا تو انتقال ہو گیا۔

بڑے آغا : (بے تاثر لہجہ) ان کا بھی انتقال ہو گیا، یہ کب؟

ڈاکٹر : کوئی تیس سال ہو رہے ہیں۔

بڑے آغا : ہوں، اکثر ہمارے ساتھ کے بیمار مر گئے۔ (ضمیر حسن داخل ہوتا ہے) کون ضمیر حسن میاں؟

ضمیر حسن : جی، دادا حضور۔

ڈاکٹر : اچھا حضور، اب اجازت دیجئے۔ مریض انتظار کر رہے ہوں گے۔

بڑے آغا : جایئے گا؟ اچھا، بڑی زحمت فرمائی آپ نے۔

ڈاکٹر : خدا حافظ!

بڑے آغا : فی امان اللہ

آغا امیرحسین : تشریف لایئے حکیم صاحب۔

[دونوں جاتے ہیں۔ بڑے آغا کچھ دیر تک سر جھکائے ہنکارے بھرتے رہتے ہیں۔ پھر اچانک سر اٹھاتے ہیں۔]

بڑے آغا : ضمیر حسن میاں؟ اچھا تم کھڑے ہو؟

ضمیر حسن : جی دادا حضور!

بڑے آغا : ضمیر دلہن کیسی ہیں؟ آج آئیں نہیں۔

ضمیرحسن : سویرے آئی تھیں دادا حضور۔ آپ شاید آرام فرما رہے تھے۔ دروازے پر سے دیکھ کر لوٹ گئیں۔ ابھی پھر آرہی تھیں لیکن اتنے میں ڈاک ـــــ ... حکیم صاحب آگئے۔

بڑے آغا: حکیم صاحب۔ ضمیرحسن میاں، تو یہ حکیم صاحب شفارالدولہ بہادر کے خاندان سے ہیں؟

ضمیرحسن : کون شفارالدولہ؟

بڑے آغا: کون شفارالدولہ؟ بیٹے تم کس دنیا میں رہتے ہو؟ اللہ اللہ! بڑے آغا کا پوتا اور پوچھے کون شفارالدولہ! اس وقت مرحوم کی روح بے چین ہو گئی ہو گی۔ (ریحانہ داخل ہوتی ہے) کون ضمیر دلہن؟

ریحانہ : تسلیم دادا حضور۔

بڑے آغا: اچھا، تم بھی گھبرا کے چلی آئیں؟ جیو، خوش رہو۔

ریحانہ : کیسا مزاج ہے دادا حضور؟

بڑے آغا: شکر ہے بیٹی، ٹھیک ہوں۔ ہمارے امیرحسن میاں ذرا میں پریشان ہو جاتے ہیں۔ یوں ہی برائے نام حرارت ہو گئی تھی۔ وہ دوڑے دوڑے گئے حکیم صاحب کو بلا لائے۔

ریحانہ : آنکھوں کی تکلیف ...

بڑے آغا: وہ اب کیا جائے گی بیٹی۔ امیرحسن میاں کی خاطر سے سرمہ لگا لیتا ہوں، مگر فائدہ معلوم۔ خیر شکر ہے۔ خدا تم لوگوں کو جیتا رکھے۔ تم ہو تو میری آنکھیں روشن ہیں۔ ضمیرحسن میاں، بیٹا یہ بتاؤ...

ضمیرحسن : (بلند آواز) جی، آیا ابا میاں!

بڑے آغا: کیا امیرحسن میاں پکار رہے ہیں؟

ضمیرحسن : جی!

بڑے آغا: اچھا میاں، جاؤ، سلامت رہو۔ میرا جاتا ہے ضمیر دلھن! تم کھڑی ہو؟ بیٹھ جاؤ بیٹی!

ریحانہ : دادا حضور، میں بھی چلوں۔ گھر کا کام کاج ...

بڑے آغا: ہاں ہاں، سچ کہتی ہو۔ جاؤ بیٹی، خوش رہو۔

[ریحانہ جاتی ہے۔ بڑے آغا سر جھکا کر ہنکارے بھرنے لگتے ہیں۔ پردہ گرتا ہے۔]

چوتھا منظر

[اسٹیج کے ایک سمت دو مسہریوں پر روشنی پڑ رہی ہے۔ ایک مسہری پر ریحانہ بیٹھی سسکیاں بھر رہی ہے۔ پاس ہی ضمیر حسن کھڑا ہے۔]

ریحانہ : مجھے ڈر لگتا ہے۔
ضمیر حسن : پھر وہی چکر شروع ہوا۔ آخر دن میں ایک بار ان کو سلام کر لینے میں کیا حرج ہے ؟
ریحانہ : وہ باتیں جو کرتے ہیں۔
ضمیر حسن : تو کون سی ڈراؤنی باتیں کرتے ہیں ؟
ریحانہ : میرے دادا پر دادا کا اس طرح ذکر کرتے ہیں جیسے وہ سب زندہ ہوں۔
ضمیر حسن : تو ؟
ریحانہ : اور انھیں تمھارے دادا میاں کے مرنے کی بھی خبر نہیں ؟
ضمیر حسن : لیکن وہ دادا میاں کا ذکر کہاں کرتے ہیں ؟
ریحانہ : ذکر تو نہیں کرتے، لیکن ...
ضمیر حسن : لیکن ؟
ریحانہ : انھیں زندہ تو سمجھتے ہیں۔
ضمیر حسن : تو سمجھنے دو۔ اس میں پریشانی کی کیا بات ہے ؟
ریحانہ : پریشانی کی بات ...
ضمیر حسن : ارے بھئی، اگر وہ ان کے بارے میں سوال کیا کرتے، ان کی خیر خبر پوچھا کرتے تو البتہ پریشانی ہو سکتی تھی، لیکن جب وہ ...
ریحانہ : نہیں، یہ بات نہیں ہے۔
ضمیر حسن : پھر کیا بات ہے ؟
ریحانہ : مجھے وہاں جا کر معلوم نہیں کیا ہونے لگتا ہے۔ ضمیر، تم بھی میرے ساتھ چلا کرو نا۔
ضمیر حسن : پھر وہی۔ میں تمھیں بتا چکا ہوں کہ ابا میاں نے ہم دونوں کو ایک ساتھ دیوان خانے میں جانے سے منع کیا ہے۔
ریحانہ : لیکن کیوں ؟

ضمیرحسن : (سمجھانے کے انداز میں) اس لئے کہ اگلے زمانے میں میاں بیوی کا بزرگوں کی موجودگی میں ایک دوسرے کے سامنے آنا تہذیب کے خلاف سمجھا جاتا تھا۔ اس لئے اگر ہم دونوں ایک ساتھ دادا حضور کے سامنے جانے لگے تو ان کو ...

ریحانہ : تو ان کو معلوم ہی کیوں ہو کہ تم بھی آس پاس موجود ہو۔

ضمیرحسن : انھیں معلوم ہو جاتا ہے کسی کی موجودگی ان سے چھپ نہیں سکتی۔ لیکن تم نے یہ نہیں بتایا کہ تمھیں وہاں جاکر کیا ہونے لگتا ہے ؟

ریحانہ : ضمیر، میں کیا بتاؤں۔ مجھے، شاید ... مجھے نہیں معلوم۔ (رونے لگتی ہے)

ضمیرحسن : ریحانہ، سنو تو۔ تمھیں کچھ وہم ہو گیا ہے۔ وہاں جاکر تمھیں کیا معلوم ہوتا ہے ؟

ریحانہ : مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ... کہ دیوان خانے میں وہ اکیلے نہیں ہیں۔ (زور زور سے رونے لگتی ہے۔)

ضمیرحسن : ارے ارے! (ہنستا ہے) اچھا میں تمھارا یہ وہم دور کر دوں گا۔ میرا ذمہ۔ اور جب تک تمھارا وہم دور نہ ہو جائے تم دیوان خانے میں نہ جانا۔ بس ؟ لو اب ہنسو۔

ریحانہ : (آنسو پونچھتی ہے) لیکن وہ پوچھیں گے، تو ؟

ضمیرحسن : کوئی بہانہ کر دیا جائے گا۔ اصل میں ریحانہ وہ تمھیں بے حد چاہتے ہیں۔ دیکھو نا، دادا میاں کو وہ کتنا چاہتے تھے، اسی لئے ان سے دادا میاں کے مرنے کی خبر چھپائی گئی۔ لیکن انھوں نے آج تک دادا میاں کو ایک بار بھی نہیں پوچھا۔ اور تم کو جس دن بھی ان کے پاس جانے میں دیر ہو جاتی ہے، وہ ضرور پوچھتے ہیں کہ ضمیر دلہن نہیں آئیں ؟

ریحانہ : ہاں چاہتے تو بہت ہیں، لیکن ...

ضمیرحسن : اچھا تو میں ان کے پاس جا رہا ہوں۔ تمھیں پوچھیں گے تو بتا دوں گا کہ طبیعت خراب ہے۔ اور میں نے تم سے ہنسنے کو کہا تھا۔

ریحانہ : (ہنستی ہے) لو، بس!

ضمیرحسن : (ہنستے ہوئے) شکریہ۔ اچھا میں چلا۔ واپس آؤں تو بھی ہنستی ہوئی ملنا۔

[ہنستا ہوا چلا جاتا ہے۔ ریحانہ پھر سسکیاں بھرنے لگتی ہے۔]

[پردہ گرتا ہے]

پانچواں منظر

[چوتھے منظر والا اسٹیج ۔ مسہریوں کے پاس آغا امیرحسن اور ضمیرحسن کھڑے ہیں۔]

آغا امیرحسن : ضمیر میاں، دلہن کی طبیعت کیا خراب ہے ؟ کئی دن سے وہ ابا حضور کے پاس نہیں گئیں۔ وہ پریشان ہو رہے ہیں۔

ضمیرحسن : ابا میاں، وہ دراصل ... ان کی طبیعت خراب نہیں ہے۔

آغا امیرحسن : الحمدللہ، پھر ؟

ضمیرحسن : اصل میں ... ابا میاں ... انھیں کچھ ذہنی پریشانی ہے۔

آغا امیرحسن : ذہنی پریشانی ؟

ضمیرحسن : وہ دادا حضور کے پاس جاتے ہوئے کچھ ... انھیں دیوان خانے سے کچھ ...

آغا امیرحسن : بات کیا ہے بیٹے ؟ کھل کر کہو۔ (آہستہ سے کراہ کر مسہری پر بیٹھ جاتے ہیں)

ضمیرحسن : ابا میاں میں خود بھی اس سلسلے میں آپ سے بات کرنا چاہتا تھا۔

آغا امیرحسن : ہاں ہاں، کہو۔

ضمیرحسن : یہ جو یہاں کا ماحول ہے ... میرا مطلب ہے دادا حضور کی وجہ سے ... اس نے ریحانہ کو کچھ ... ابا میاں آپ تو اس ماحول کے عادی ہیں، میں بھی کسی حد تک عادی ہو چکا ہوں، لیکن ریحانہ کے لئے ...

آغا امیرحسن : میں سمجھ رہا ہوں بیٹے۔ ہاں، دلہن کو واقعی بڑی پریشانی ہوتی ہوگی۔ کہاں ہیں وہ ؟

ضمیرحسن : (بلند آواز) ریحانہ، ذرا یہاں آنا۔

آغا امیرحسن : میں خود بھی کچھ دن سے قدرے پریشان ہوں بیٹے لیکن پھر سوچتا ہوں کہ اب ان کی زندگی کے دن ہی رہ گئی ہے۔ اور وہ بے چارے تو ... تم تو جانتے ہی ہو بڑھاپے میں آدمی کا تجسس کتنا بڑھ جاتا ہے۔ ہر بات کی کرید رہتی ہے۔ تک بے تک سوالوں سے سب کا ناک میں دم کر دیتا ہے لیکن وہ کس قدر خاموش رہتے ہیں کبھی حجت نہیں کرتے۔ شاذ و نادر ... (ریحانہ داخل ہوتی ہے) آؤ بیٹی ! ادھر آرام سے بیٹھ جاؤ (ریحانہ دوسری مسہری پر بیٹھ جاتی ہے) تمھارا چہرہ کیسا ستا گیا ہے۔ ضمیر میاں ! انھیں کچھ طاقت کی دوائیں ...

ریحانہ : جی نہیں ابا میاں۔ میں ٹھیک ہوں۔

آغا امیر حسن: ابھی ضمیر میاں نے بتایا۔ ہاں بیٹی، واقعی تمھیں بڑی الجھن ہوتی ہوگی۔ ابا حضور کی وجہ سے ان کا احوال کچھ ایسا رہتا ہے کہ آدمی اگر سوچنے پر آئے تو پاگل ہو جائے۔ لیکن ابا حضور بھی کیا کریں۔ دیکھو نا، ہم نے خود انھیں دنیا سے بے خبر رکھا ہے۔ مرحوم ابا میاں خدا انھیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے، نہایت سعادت مند تھے۔ ابا حضور کے خانہ نشین ہونے کے بعد سے ہمہ وقت اس فکر میں لگے رہتے تھے کہ کوئی بات ان کے خلافِ مزاج نہ ہونے پائے۔ حد یہ ہے کہ آخر عمر تک ابا حضور کے سامنے جب بھی گئے انگرکھا پہن کر گئے۔ سارے گھر میں بجلی کی روشنی آ گئی لیکن دیوان خانے میں وہی فانوس جلتا رہا۔ ابا حضور نے اب سے ستر سال پہلے کسی ریاست کے راجا کو شہسواری سکھائی تھی۔ اس کے صلے میں ان کا معمولی سا وظیفہ مقرر ہو گیا تھا جو کب کا بند ہو چکا تھا لیکن ابا میاں پابندی سے ہر مہینے وہ وظیفہ ابا حضور کی خدمت میں پیش کرتے رہے اور ... (کراہتے ہیں اور اپنا بایاں شانہ دھیرے دھیرے سہلاتے ہیں۔)

ضمیر حسن: ابا میاں! کیا بات ہے؟

آغا امیر حسن: ٹھیک ہوں بیٹے ... ابا حضور یہی سمجھتے رہے کہ اسی وظیفے کی رقم سے گھر چل رہا ہے۔ اور ... اور شاید وہ اب بھی یہی سمجھتے ہیں غنیمت ہے کہ اب ہمیں انھیں حساب نہیں دینا ہوتا۔

ضمیر حسن: حساب؟

آغا امیر حسن: ہاں۔ ابا مرحوم چالیس سال تک ہر مہینے اس رقم کا حساب بنا کر ابا حضور کو دکھاتے رہے۔ وہ اسی رقم میں پورے مہینے کا گھر کا خرچ، کپڑے لتے، بچوں کی تعلیم، ہر چیز کا خرچ دکھاتے تھے۔ انھوں نے ابا حضور کو بالکل خبر نہیں ہونے دی کہ ... پھر ایک دن ابا میاں اچانک ختم ہو گئے اور مرنے سے پہلے صرف اتنا کہہ سکے کہ ابا حضور کو خبر نہ ہونے پائے۔ (آواز گلوگیر ہو جاتی ہے) دلھن، ہمارے ابا میاں بڑی خوبیوں کے آدمی تھے۔ (سر جھکا لیتے ہیں)

ریحانہ: ابا میاں! آپ اتنے متاثر کیوں ہو رہے ہیں؟

ضمیر حسن: ریحانہ، پانی پلاؤ۔ (ریحانہ لپک کر چلی جاتی ہے) ابا میاں، یہ کوئی بڑا مسئلہ نہیں ہے۔ میں نے آپ سے یونہی ذکر کر دیا تھا۔ ریحانہ بھی بس کبھی کبھی پریشان ہو جاتی ہیں۔ اصل میں وہ ابھی عادی نہیں ہیں نا؟ دھیرے دھیرے سب ٹھیک ہو جائے گا۔

[ریحانہ پانی کا گلاس لیے ہوئے داخل ہوتی ہے۔]

ریحانہ: پانی پی لیجیے ابا میاں۔

[آغا امیر حسن پانی پی کر طویل سانس لیتے ہیں]

آغا امیر حسن: وہ ہم سب سے بے پناہ محبت کرتے ہیں۔ مجھ سے بھی۔ حالانکہ مجھ سے انھیں نفرت ہونا چاہئے تھی۔ میری ہی وجہ سے وہ گھوڑے پر سے گر کر اپاہج ہو گئے۔ ورنہ بھلا ان کا سا شہ سوار ... سارے شہر میں شور مچ گیا تھا کہ بڑے آغا گھوڑے پر سے گر پڑے۔ اور میں تو سمجھتا ہوں کہ اسی شرم میں انھوں نے باہر نکلنا چھوڑا۔ لیکن مجھ پر اسی طرح جان چھڑکتے رہے۔ پھر ابّا میاں کے بعد میرا بھی فرض تھا کہ ان کا اسی طرح خیال رکھوں۔ اور جہاں تک مجھ سے ہو سکا ... (کراہ کر بایاں شانہ دبا لیتے ہیں)

ضمیر حسن: کیا ہے ابّا میاں ؟

آغا امیر حسن: شانے میں درد اٹھا ہے بیٹے۔ (زور زور سے کراہنے لگتے ہیں)

ضمیر حسن: لیٹ جائیے ابا میاں (آغا امیر حسن کو بیٹھ کی طرف سے سنبھالتا ہے) ریحانہ تکیہ لاؤ۔

آغا امیر حسن: کراہتے ہوئے تکیہ رہنے دو بیٹے۔ مجھے کچھ ہو رہا ہے۔ دلھن ضمیر میاں، دیکھو ابا حضور کو خبر...

ضمیر حسن: (زور سے) ابا میاں !

ریحانہ: کیا ہوا ؟

ضمیر حسن: شاید بے ہوش ہو گئے ہیں۔

ریحانہ: (روتے ہوئے) ڈاکٹر کو بلواؤ۔

[ضمیر حسن غور سے آغا امیر حسن کو دیکھ رہا ہے۔ پردہ گرتا ہے۔]

چھٹا منظر

[پانچواں منظر والا اسٹیج۔ ضمیر حسن اور ریحانہ مسہریوں پر بیٹھے ہیں۔ ضمیر حسن سر جھکائے ہوئے ہیں اور ریحانہ اسے غور سے دیکھ رہی ہے]

ریحانہ: کیا سوچ رہے ہو ؟

ضمیر حسن: اب سوچنے کے لئے اس کے سوا اور کیا رہ گیا ہے کہ دادا حضور ابا میاں کو پوچھیں گے تو کیا کہوں گا۔

ریحانہ: لیکن اتنے دن ہو گئے۔ ابھی تک تو انھوں نے نہیں پوچھا۔

ضمیر حسن: ہاں، مگر کیا خبر کب پوچھ بیٹھیں۔ اور ریحانہ، اب شاید تمھیں ان کے پاس جانا ہی پڑے گا۔

ریحانہ : وہ تم کو بہت بے چین ہو کر پوچھتے ہیں ۔
ہاں، میں تمھیں بتانا بھول گئی ۔ آج میں گئی تھی ۔

ضمیر حسن : دیوان خانے میں ؟

ریحانہ : بڑی ہمت کر کے طے کیا تھا کہ آج ان کے پاس ضرور جاؤں گی، لیکن ... آواز سن کر باہر ہی سے پلٹ آئی ۔

ضمیر حسن : آواز؟ دادا حضور کی آواز ؟

ریحانہ : نہیں ۔ کوئی اور معلوم ہوتا تھا ... یا شاید وہی تھے ... میں سمجھ نہیں سکی ۔

ضمیر حسن : وہی ہوں گے ۔ کیا کہہ رہے تھے ؟

ریحانہ : کچھ نہیں ۔ شاید کچھ کہہ نہیں رہے تھے ... معلوم نہیں کیسی آواز تھی ۔

ضمیر حسن : تم نے غور نہیں کیا ؟

ریحانہ : نہیں ۔ مجھے ڈر لگنے لگا ۔ میں پلٹ آئی ۔

ضمیر حسن : تمھیں کچھ دیر وہاں ٹھہرنا چاہئے تھا ۔ اس طرح تو خواہ مخواہ دل میں ڈر بیٹھ جاتا ہے ۔

ریحانہ : نہیں ضمیر ۔ (رونے لگتی ہے) وہ ان کی آواز نہیں تھی ۔ وہ کوئی اور تھا ۔

ضمیر حسن : ریحانہ ! دیکھو پھر وہی ... وہاں کوئی اور نہیں تھا ۔ آخر وہ کیسی آواز تھی ؟

ریحانہ : وہ جیسے ... جیسے کوئی دھیرے دھیرے رو رہا ہو ۔

ضمیر حسن : تو ہو سکتا ہے دادا حضور ہی ...

ریحانہ : نہیں ضمیر ... وہ کسی بچے کی سی آواز تھی ۔ (زور زور سے رونے لگتی ہے)

ضمیر حسن : ریحانہ، بس حد ہو گئی ۔ کل ہم دونوں ایک ساتھ ان کے پاس چلیں گے ۔

ریحانہ : لیکن ان کے سامنے ہم دونوں ایک ساتھ ...

ضمیر حسن : کچھ نہیں جی ۔ میں جو مناسب سمجھوں گا وہی ہو گا ۔ اچھا اب سو رہو ۔ رات زیادہ ہو گئی ہے ۔
کل سویرے ہم ان کے پاس چلیں گے ۔

ریحانہ : (لیٹ جاتی ہے) کیا تمھیں ابھی نیند نہیں آ رہی ہے ؟

ضمیر حسن : نہیں ۔ میں بھی سوتا ہوں ۔ (لیٹ جاتا ہے)

[وقفہ]

ریحانہ : مجھے نیند نہیں آ رہی ہے ضمیر !

ضمیر حسن : آجائے گی۔ ایک ... دو ... تین ... چار ... آرہی ہے؟
ریحانہ : (آہستہ سے) ہاں ... آجائے گی۔

[اسٹیج کی روشنی کم ہوتے ہوتے غائب ہوجاتی ہے۔ وقفہ۔ گھڑی کی ٹک ٹک کی آواز آتی ہے۔ اسی کے ساتھ دھیرے دھیرے ہنکارے بھرنے کی آواز آنا شروع ہوتی ہے۔]

ریحانہ : کون؟

[ہنکارے بھرنے کی آواز تیز تر۔ اسٹیج روشن ہوجاتا ہے۔ بڑے آغا فرش پر آہستہ رینگ رہے ہیں۔ ان کا انگرکھا میلا کچیلا ہے۔ سر پر ٹوپی نہیں ہے۔ گردن جھکی ہوئی، تقریباً زمین سے لگی ہوئی ہے۔ ریحانہ چیختی ہے۔]

ضمیر حسن : (سوتے سے جاگ اٹھتا ہے) کیا ہے؟ ریحانہ! ... کیا ہوا؟
ریحانہ : ضمیر!
ضمیر حسن : کیا بات ہے ریحانہ؟ کیا ہوا؟
ریحانہ : وہ ... وہ ... یہاں آگئے۔
ضمیر حسن : کون؟
ریحانہ : دادا حضور!
ضمیر حسن : دادا حضور؟ کہاں؟
ریحانہ : (بڑے آغا کی طرف اشارہ کرتی ہے) ادھر دیکھو ... فرش پر۔
ضمیر حسن : کدھر؟ (مڑکر بڑے آغا کو دیکھتا ہے) ارے! بلند آواز دادا حضور!
بڑے آغا : (سر اٹھا کر کمزور آواز میں) کون؟ ضمیر حسن میاں؟
ضمیر حسن : دادا حضور! (سخت لہجہ) تو آپ باہر نکل ہی آئے۔ (مسہری سے اتر پڑتا ہے۔ ریحانہ بھی اتر کر اس کے قریب آجاتی ہے۔)
ریحانہ : (سرگوشی میں) ان کو اٹھاؤ تو۔
بڑے آغا : کون، ضمیر دلھن؟ کیسی ہو بیٹی؟
ضمیر حسن : زندہ ہیں۔ حالانکہ آپ کی عنایت سے اس وقت انھیں مرجانا چاہئے تھا۔
ریحانہ : (سرگوشی میں) اللہ، یہ تم کو کیا ہو رہا ہے۔ ان کو بستر پر لٹاؤ۔ دیکھو تو کیا حالت ہو رہی ہے۔

ضمیر حسن : لیکن دادا حضور، اگر یہ کبھی جاتیں تو آپ کو خبر نہ کی جاتی۔

بڑے آغا : (محبت آمیز لہجہ) ضمیر حسن میاں، تم بہت بدل گئے ہو بیٹا۔

ضمیر حسن : دنیا بدل گئی ہے دادا حضور، آپ کی دنیا نہیں بدلی تو...

بڑے آغا : میری دنیا تو تمھیں لوگ ہو بیٹے۔

ریحانہ : (سرگوشی میں) خدا کے لئے ضمیر، ان کو اٹھاؤ تو۔

ضمیر حسن : آیئے آپ کو بستر پر لٹا دوں۔ یا کہئے تو دیوان خانے میں پہنچا دوں۔

بڑے آغا : میں جا ہی رہا ہوں بیٹے۔ میں تو صرف یہ پوچھنے کے لئے نکلا تھا... (ہنکارے بھرنے لگتے ہیں)

ضمیر حسن : جی!

بڑے آغا : کہ ضمیر دلھن کیسی ہیں... اور... امیر حسن میاں...

ضمیر حسن : (سرد لہجہ) جی!

بڑے آغا : امیر حسن میاں... امیر حسن میاں... تم لوگ مجھے کیوں نہیں بتاتے؟

ضمیر حسن : ابا میاں مر چکے ہیں۔

ریحانہ : ضمیر!

ضمیر حسن : اور دادا میاں بھی مر چکے ہیں... کوئی چھبیس برس ہوئے... اور دادا میاں نے ابا میاں کو وصیت کی تھی کہ آپ کو ان کے مرنے کی خبر نہ کی جائے اور...

[بڑے آغا کا بدن آہستہ آہستہ کانپتا ہے۔]

ریحانہ : ضمیر! خدا کے لئے... دیکھو تو انھیں کیا ہو رہا ہے۔

ضمیر حسن : اور ابا میاں نے ہم لوگوں کو وصیت کی تھی کہ آپ کو ان کے مرنے کی خبر نہ کی جائے۔ اور میں اپنی اولاد کو وصیت کروں گا، اور میری اولاد اپنی اولاد کو... (بڑے آغا کا سر زمین سے لگ جاتا ہے) دادا حضور! (بڑے آغا کی طرف لپکتا ہے اور انھیں اٹھانے کی کوشش کرتا ہے) ریحانہ انھیں سنبھالو۔

ریحانہ : (بڑے آغا کا ایک شانہ پکڑ لیتی ہے) تم ادھر سے روکو... دیکھو تو... کیا ختم ہو گئے؟

ضمیر حسن : ہوں (بڑے آغا کو غور سے دیکھتا ہے) نہیں، سانس تو شاید... دادا حضور!... ارے، یہ تو واقعی ختم ہو گئے!

[دونوں خاموشی سے بڑے آغا کو دیکھتے رہتے ہیں۔ اسٹیج کی غائب ہوتی ہوئی روشنی میں گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز آتی ہے جو ہلکی ہوتے ہوتے گھڑی کی ٹک ٹک میں بدل جاتی ہے۔]

(پردہ گرتا ہے)

□

لنڈا ونٹنک

گیلے حرف
جذبات فروشانہ اسلوب[2]

(رخسانہ صولت کے افسانوی مجموعے کا لسانی اور اسلوبیاتی جائزہ) .

رخسانہ صولت ۱۹۷۰ء کے بعد کے آنے والے افسانہ نگاروں میں سے ہیں اور نسبتاً مختصر عرصے سے لکھ رہی ہیں ۔"گیلے حرف" ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ہے ۔

یہ کتاب دو حصوں میں منقسم ہے ۔ پہلا حصہ" زندگی کے خلاف چند کہانیاں" کے عنوان سے ہے جس میں نو افسانے ہیں اور دوسرے حصے "زندگی کے لئے چند کہانیاں" میں آٹھ افسانے ہیں ۔ ان دو حصوں کے افسانوں میں فرق زیادہ تر عنوان کا ہے ۔ طنز (IRONY) کے طور پر" زندگی کے لئے" کے افسانوں کے عنوان میں موت کا ذکر آتا ہے ۔ اسلوب اور موضوع کے اعتبار سے دونوں حصوں کے افسانوں میں فرق بہت کم ہے ۔

اسلوب کے اعتبار سے پہلے حصے میں کسی حد تک زیادہ توجہ مکالمہ اور خود کلامی کو دی گئی ہے اور دوسرے حصے میں منظر کشی اور خارجی عمل کی تفسیر کو ۔ مجموعی طور پر پہلے حصے میں افسانے کے ۳۹٪ سطروں میں مکالمہ یا خود کلامی ہے اور دوسرے حصے میں ۲۹٪ (نقشہ ایک) ۔ مگر پھر بھی پہلے حصے کے "آدمی رات کی دھوپ"، "آگ، مٹی اور پانی" اور "دم کٹا انسان" میں حکایتی عناصر نمایاں ہیں ، اور دوسرے حصے کے "چہرہ پھول ، برف آنکھیں" میں مکالماتی عناصر اہم ہیں ۔

طرزِ اظہار کے اعتبار سے دونوں حصوں میں کئی پیکر مشترک ہیں ۔ مثلاً ننگا یا برہنہ جسم کا ذکر (جو یہاں زیادہ تر روح کی علامت ہے) پہلے حصے کے " نہ میں ، نہ تو پھر کون ؟"، "ننگی"، "آج کا نوحہ" اور "درد کا زرد سمندر" میں ملتا ہے اور دوسرے حصے کے "لفظوں کی موت" اور "ننگا پاکفن" میں بھی ہے ۔ "سسکتی لاش" (ننگی" ۳۴ص پہلا حصہ) اور "لاش سسک رہا ہے" (۴۲ص "موت کا سفر" دوسرا حصہ) اس کی ایک

---

[1] رخسانہ صولت ۔ گیلے حرف ۔ اسلام آباد (۱۹۷۸ء) ۱۲۸ صفحات ۔

[2] مضمون پڑھنے اور اس پر مشورہ دینے کے لئے میں محمود ہاشمی صاحب کی بہت ممنون ہوں ۔

اور مثال ہے ۔ دونوں حصوں میں فجائیہ (جیسے "اف"، "اوہ"، "آہ"، "اف خدایا" وغیرہ) ، استعجابیہ (!) واحد متکلم اور واحد غائب اور مذکر یا مونث راوی کے استعمال میں کوئی خاص فرق نہیں ہے ۔ (نقشہ ایک دیکھئے)۔

حالانکہ موضوع کے اعتبار سے انفرادی مسائل جیسے مرکزی کردار کی اپنی روح کی تلاش ("دمیا نہ تو پھر کون ہے؟") اور تنہائی پن کا احساس ("گیلے حرف") پہلے حصے میں زیادہ نمایاں ہیں، پھر بھی کئی موضوع مشترک ہیں ۔ مثلاً عورتوں کے خلاف جبر کا موضوع "نور کا طور" (پہلا حصہ)، "آدھی رات کا سورج" (پہلا حصہ) اور "زندہ لوگوں کا قبرستان" (دوسرا حصہ) میں اہم ہیں ۔ بھوک اور غریبی کی شکایات ان افسانوں میں اکثر آتی ہیں ، خاص طور پر "آگ مٹی اور پانی" (پہلا حصہ) اور "زندہ لوگوں کا قبرستان" (دوسرا حصہ) میں ۔ انسانیت کے ختم ہونے کا خطرہ بھی دونوں حصوں میں مشترک ہے :

"میری آنکھیں صبح و شام یہی دیکھ رہی ہیں کہ یہاں انسانیت کا آخری لاشہ سسکنے والا ہے ۔" (۶۲ ص "درد کا زرد سمندر" پہلا حصہ)

"انسانیت کی زخمی ، اندھی اور لنگڑی لولی سسکتی لاش کو دیکھو ۔" (۴۳ ص "ننگی" پہلا حصہ)

"انسانیت کا لاشہ سسک رہا ہے ۔" (۹۴ ص "موت کا سفر" ۔ دوسرا حصہ)

"وہ کون تھا ؟ ... تمھاری طرح ایک قیدی ۔ جس نے آنکھ کھولتے ہی دنیا میں انسانوں کو انسان کے خلاف برسرِ پیکار دیکھا ۔" (۸۷ ص ۔ "لفظ کی موت" دوسرا حصہ)

سرسری طور پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ کتاب کے دو حصوں میں اسلوب اور موضوع کا کوئی خاص فرق نہیں ہے ۔ افسانوں کی تقسیم صرف عنوان پر مبنی ہے ۔

اسلوب کے اعتبار سے یہ افسانے خطیبانہ ، نظریاتی ، جذبات فروشانہ اور مبالغہ آمیز ہیں ۔ ان میں تقریر کرنے کے عناصر زیادہ ، عکس کھینچنے کے عناصر کم ملتے ہیں ۔ زیادہ توجہ مرکزی کردار کے نظریات ، خیالات اور جذبات کے اظہار پر دی گئی ہے ، اور منظر کشی ، خارجی عمل کے عکس یا کردار کی شناخت کو کم ۔ افسانے کے اکثر حصے مکالمے یا خود کلامی کے ذریعے پیش کیے جاتے ہیں ۔ مثلاً "درد کا زرد سمندر" شروع سے آخر تک ایک خود کلامی ہے ۔ "گیلے حرف" اور "چہرہ پھول ، برف آنکھیں" کی آدھی سے زیادہ سطریں مکالمے پر مشتمل ہیں ۔ اور مجموعی طور پر افسانوں کی بہ نسبت زیادہ سطریں مکالمے یا خود کلامی ہیں ۔

مکالمے میں مرکزی کردار یا راوی ہے اور ایک دوست یا ساتھی۔ یہ ساتھی ہمیشہ مرد ہے۔ چند افسانوں میں ماں کا ذکر ہے اور اکثر مرکزی کردار ان کو پکارتا/تی ہے مگر جواب صرف "گیلے حرف" اور "دم کٹا آدمی" میں ملتا ہے۔ سوائے "نئی دنیا کی موت" اور "کالے سورج کی موت" کے مرکزی کردار اور دوسرے کرداروں کے نام نہیں ہیں۔ مکالموں میں ہمیشہ "تم" کا استعمال کیا جاتا ہے، حالانکہ ساتھی یا ماں راوی سے ہمدردی یا دوستی کا اظہار بہت کم کرتا ہے۔ ان مکالموں کا مقصد "ساتھی" کی شخصیت کو ظاہر کرنا نہیں ہے۔ "ساتھی" کی اہمیت صرف مرکزی کردار یا راوی کو منکشف کرتی ہے۔ "ساتھی" کے ذریعے راوی کے جذبات اور نظریات کا اظہار کیا جاتا ہے۔ اکثر یہ مکالمے گفتگو کے بجائے خطابت سے زیادہ نزدیک ہیں مثلاً:

> "جب تک معاشرے میں جبر اور گھٹن کی فضا رہے گی۔ برائیاں اور بڑھیں گی بڑھیں گی ہنگامے اور فساد پیدا کرتی رہیں گی اور سرمایہ دار سادہ اور جھکے ہوئے لوگوں کو لوٹتے رہیں گے۔ کیوں نہ ہم دیوار ہی گرادیں۔ جس کے پار ان کے لئے سونا ہی سونا ہے۔"
>
> (۳۵ ص۔ "نور کا طور")

خود کلامی میں بھی اکثر راوی کا اصل مقصد نظریہ کا اظہار کرنا ہے۔ ایک سڑک کو دیکھ کر اور سڑک کی گاڑیوں، بسوں، اسکوٹروں اور بیل گاڑیوں کا بوجھ" (۲۳ ص "نہ میں، نہ تو، پھر کون؟") کے بارے میں سوچ کر راوی خود کلامی کے انداز میں کہتی ہے:

> "میری آنکھیں تھک چکی تھیں۔ میرا ذہن کربناکیوں کے ایندھن میں جل رہا تھا۔
> یہ احتجاج کیوں نہیں کرتی؟
> ایک دم اپنا جبڑا کھول کر ان سب کو کیوں نہیں ہڑپ کر جاتی۔
> یہ چیختی چلاتی کیوں نہیں؟
> اسے اتنا صبر کیوں ہے؟ کیسے ہے؟" (۲۳-۲۴ ص "نہ میں، نہ تو، پھر کون؟")

مذکورہ حوالہ ان افسانوں کے جذبات فروشانہ اور مبالغہ آمیز طرز اسلوب کو بھی نمایاں کرتا ہے۔ افسانے میں راوی بتاتا ہے کہ سڑک کو احتجاج کرنا چاہئے مگر افسانوی تناظر میں اس کے کافی شواہد موجود نہیں ہوتے جن کے ذریعے قاری بھی اس پر یقین کر سکے۔ عین ممکن ہے کہ قاری مذکورہ جملوں کو جذباتی ردعمل کہے گا۔ اگر یہ جملے توضیحی انداز کے بجائے واقعات یا عمل کے ذریعے پیش کئے جاتے تو زیادہ قابل یقین ہوتے۔

یہ جذبات فروشانہ انداز راوی کی ذاتی شکایات میں بھی نمایاں ہے۔ مثلاً

> "ماں! میں اتنی تنہا کیوں ہوں؟" ("گیلے حرف" ۱۹ ص)

نقشہ ایک

افسانے میں کتنی فیصد سطروں میں مخاطب [illegible]	مخاطب	راوی (مونث یا مذکر)	بیانیہ نقطۂ نظر	استفہامیہ (؟)	فجائیہ (ارے، خدایا، اوہ وغیرہ)	
						زندگی کے خلاف چند کہانیاں
٪۵۸	ماں، آدمی	مونث	واحد متکلم	۱۲	۱	گیلے موت
٪۳۲	مونث روح، مذکر ساتھی	مذکر	واحد متکلم	۱۴	۰	نہ میں، نہ تو، پھر کون؟
٪۴۵	آدمی، مذکر ساتھی	مذکر	واحد متکلم	۲	۱	نور کا طور
٪۱۲	پاس	مذکر	واحد متکلم	۶	۱	آدھی رات کی دھوپ
٪۴۷	آواز، مذکر دوست	مونث	واحد متکلم	۳۲	۳	ننگی
٪۱۱	بیٹا	مونث	واحد متکلم	۱	۰	آگ، مٹی اور پانی
٪۳۵	آدمی	مذکر	واحد غائب	۴	۰	آج کا نوحہ
٪۱۰۰	(خود کلامی)	مونث	واحد متکلم	۵	۰	درد کا زرد سمندر
٪۱۳	ماں	مذکر	واحد غائب	۲	۰	دم کٹا انسان
٪۳۹	واحد متکلم میں	۳ مونث ۶ مذکر	۷ متکلم ۲ غائب	۸۲	۶	کُل
						زندگی کے لئے چند کہانیاں
٪۱۷	آدمی قیدی	مذکر	واحد غائب	۳	۰	کالے سورج کی موت
٪۱۵	آدمی	مونث	واحد متکلم	۱	۰	لفظ کی موت
٪۱۷	مذکر دوست	مذکر	واحد متکلم	۲	۲	موت کا سفر
٪۳۵	احمد	مونث، ساتھ	واحد متکلم	۵	۳	نئی دنیا کی موت
٪۳۶	آدمی	مونث	واحد متکلم	۴۱	۱	پرایا کفن
٪۲۰	مذکر دوست	مذکر	واحد متکلم	۱۶	۰	نیلی سڑک اور جنازہ
٪۲۸	آدمی	مونث	واحد متکلم	۳	۱	زندہ لوگوں کا قبرستان
٪۵۶	عورت	مونث	واحد غائب	۳۳	۳	چہرہ بکھول، برف آنکھیں
٪۴۹	واحد متکلم میں	۲ مذکر ۴ مونث	۶ غائب ۲ متکلم	۱۰۸	۱۰	کُل

نقشہ دو

واحد متکلم			
واحد متکلم ۔ مونث راوی	تجائیہ	استجابیہ	مکالمے فی صد سطریں
جیسے موت	۱	۱۲	۵۸٪
نظی	۳	۳۶	۴۷٪
آگ، مٹی اور پانی	۰	۱	۱۱٪
درد کا زرد سمندر	۰	۵	۱۰۰٪
لفظا کی موت	۰	۱	۱۵٪
نئی دنیا کی موت	۰	۵	۳۵٪
پرایا کفن	۱	۴۱	۳۶٪
زندہ لوگوں کا قبرستان	۱	۳	۲۸٪
کُل	۶	۱۰۴	۴۳۰٪
واحد متکلم ۔ مذکر راوی			
نہ میں، نہ تو، پھر کون؟	۰	۱۴	۳۲٪
نور کا طور	۱	۶	۴۵٪
آدمی رات کی دھوپ	۱	۶	۱۲٪
موت کا سفر	۲	۲	۱۷٪
نیلی سڑک اور جنازہ	۳	۱۶	۲۰٪
کُل	۷	۴۴	۲۵٪

"اور جس دن میری آنکھوں میں حرارت کی چنگاریاں روشن ہوئی تھیں میری روح نے زہر کا پیالا منہ سے لگالیا تھا۔" (۴۴ ص "نہ میں، نہ تو، پھر کون؟")

"میں حالات کی تلخیوں کے زہر بھرے جام چسک کر پینے پر مجبور ہوں۔"

(۶۴ ص "درد کا زرد سمندر")

ممکن ہے کہ راوی ایسے جذبات سچ مچ محسوس کرتا ہو مگر قاری ان میں شریک نہیں ہو سکتا کیونکہ افسانے کے واقعات میں ان کے لئے کافی دلائل نہیں دیئے جاتے۔

اس مبالغہ آمیز اسلوب کا ایک اور پہلو اس کے فجائیہ اور استفہامیہ کے استعمال میں موجود ہے۔ ان افسانوں میں عام روش یہ ہے کہ ایک صفحے میں دس پندرہ استفہامیہ ہوں گے۔ (مثلاً ۱۲۷، ۱۰۴، ۱۰۱ص وغیرہ) اس کی ایک مختصر مثال یہ ہے:

"... آوازوں کی کھنک میرے قریب آنے لگی۔!
"اف"! میں خوشی سے تھرانے لگی۔! یہ! یہ سب تو میرے اپنے ہیں۔ میرے دوستوں کے چہرے۔! میرے عزیزوں کے چہرے۔!
اور میرے اپنے۔!"

(ص ۱۰۴ "پرایا کفن")

اس صفحے پر ۱۷ استعجابیہ ہیں اور ۲۶ جملے۔ اس زیادتی سے، جیسے شکایات کی زیادتی سے اثر ختم ہو جاتا ہے۔ استعجابیہ کا ضرورت سے زیادہ استعمال خاص طور پر ان افسانوں میں ملتا ہے جہاں راوی واحد متکلم اور مونث ہے (نقشہ دو)۔ یہ اشارہ دیتا ہے کہ شاید جذبات فروشانہ انداز کی وجہ یہ ہے کہ ادیب نے اپنے آپ کو راوی سے ہم آہنگ کیا ہے۔

مذکورہ بحث سے میری مراد یہ نہیں ہے کہ افسانے میں نظریہ یا جذبہ لازمی طور پر افسانے کے فنی معیار میں ایک نقص ہوگا۔ مراد یہ ہے کہ فنی اعتبار سے کامیاب افسانے کے لئے ادیب کو اپنے جذبات بتانے کے بجائے انھیں اس طرح دکھلانا ہے کہ قاری بھی ان میں شریک ہو سکے۔ □

شریف ارشد

جدید تر شعری آہنگ

دنیا بدل گئی اقدار بدل گئے، الفاظ بدل گئے معنی بدل گئے، روایت بدل گئی بغاوت بدل گئی لیکن ہمیں حیرت ہے کہ اس عہد کے اہل علم اور ادیب گفتگو تو کرتے ہیں جدید شاعری کی لیکن آہنگ سے متعلق ان کا تصور اب بھی پرانا ہے۔ ترقی پسندیت کے بعد جب شروع شروع میں جدیدیت کی لہریں بحرالہند میں ابھری تھیں تو یہی دقت پیش آئی تھی۔ یعنی یہ کہ ترقی پسندیت کی دھن میں انھیں یہ نہیں معلوم ہو رہا تھا کہ جدیدیت کو کس ادبی و شعری آہنگ و اقدار پر تولیں پرکھیں کیوں کہ ترقی پسند دور ادب ہر شاعر اپنی گردن میں خالی کنستر لٹکا کر بجاتے پھرتے تھے اور وہ شور برپا تھا کہ تو بہ ہی بھلی جبکہ جدیدیت کا آہنگ جداگانہ تھا لیکن رفتہ رفتہ لوگ اس آہنگ سے بیزار ہوتے گئے اور پپیہے کی سریلی آواز و آہنگ سے محظوظ ہونے لگے۔ اب روایت و تجربے کے درمیان سے جو ایک نئی شعری صنف نثری نظم وجود میں آئی ہے تو پھر آہنگ کا مسئلہ اہم صورت اختیار کر گیا ہے۔ لیکن میرے خیال میں اہم مسئلہ یہ ہے کہ ہم "جدید تر" شاعری (نثری نظم) میں "جدید" آہنگ کی پیوند کاری کر رہے ہیں۔ ہم اس بار پھر بھول رہے ہیں کہ "نثری نظمیت" "شعری جدیدیت سے آگے کا قدم ہے اور زینے پہ چڑھنے والا آدمی ہر قدم پہ نئے افق سے روشناس ہوتا ہے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ نثری نظم انتہائی نازک ترین دوشیزہ ہے۔ اسے نازک ترین زیور ہی چاہئے۔ یہ پھولوں کی میزان پہ تلے گی اور خوشبو اس کا آہنگ ہوگی۔ شامہ جس کا معطر ہے وہ اس شاعری کے آہنگ سے محظوظ ہوے گا۔ خدارا اس پھول کی دوشیزہ کو چاندی، سونے اور ہیروں کے زیورات نہ پہناؤ، اسے ثقل برداشت نہ ہوگا۔

آہنگ یقیناً "الفاظ کی کیمیا" کا نام ہے لیکن کہاں کہاں الفاظ و آہنگ آپس میں ضم ہو کر PHYSICAL CHEMISTRY کی شکل پیدا کر رہے ہیں اس کا ادراک ضروری ہے۔ الفاظ کا غذ پہ سیاہی کی لکیر کا نام ہے لیکن ہمیں الفاظ سے نہیں الفاظ کے تلفظ سے سروکار ہے اور آواز طبیعیات کے ذیل میں آتی ہے۔ آہنگ الفاظ کی آواز سے الگ ایک طرح کی سامعہ نواز لہریں ہیں جو عقل و دل کے احتفاظ

کی باعث ہوتی ہیں۔ یہ دراصل ایک CHEMICAL PHENOMENON ہے۔ ادبی عبارتوں میں جہاں جہاں یہ سامعہ نوازی پیدا ہو جاتی ہے وہ عبارت الفاظ و آہنگ کا پر اعجاز مرکب ہو جاتی ہے اور باعث مسرت ہوتی ہے۔ رقص میں یہ آہنگ بدن کے لوچ میں مضمر ہے۔ بدن کھول کر جسم کے تمام رطب و یابس دکھا کر ناچنے والی حسینہ اگر اپنے جسم کا لوچ نہ دکھا سکے تو اس کا رقص کلاسیکل نہیں کہلائے گا البتہ فرش پہ دونی، چونی، اٹھنی کی ڈھیر ضرور لگ جائے گی۔ یہ دراصل COMERCIAL DANCE کہلائے گا۔ کلاسیکل ڈانس تو وہ ہوتا ہے جس میں آدمی دم بخود رہ جاتا ہے۔ نثری نظم ابھی طعن و تشنیع کے دور سے گذر رہی ہے۔ یہ دور گذرے تو یقیناً یہ شاعری اپنا جداگانہ آہنگ پیدا کرے گی۔

نثری شاعری میں آہنگ بہت ہی لطیف ترین وجدان کا نام ہے۔ یہاں آہنگ، حسن تعمیر، حسن تاکید، حسن تجرید، حسن تصویر، ابہام و اعلان، اوقاف و اسکان اور لفظی کیمیاگری کا نام ہوگا۔ عبارت میں کہیں کہیں فکر و الفاظ و آہنگ کا ایک ایسا مرکب تیار ہوگا جو عقل و دل و دماغ کو وہ تازگی بخشے گا جیسے کوئی گرمی کے دنوں میں فالودہ کھا رہا ہو۔ برف کی سل پہ رکھی ہوئی گنڈیریاں بھی کام و دہن کو ٹھنڈک دیتی ہیں جب کہ فالودہ زبان و حلقوم کے اندر ریشم کی ڈوریوں کی طرح مچلتی اور سرسراتی ہیں۔ نثری نظم دراصل وحی کی زبان ہے۔ ظاہر ہے نثری نظم میں کوئی مقام حاصل کرنا کتنا مشکل ہوگا لیکن ایسا بھی نہیں کہ نثری نظم کو کوئی شاعر نہ ملے۔ قرآن کریم نثری نظم کے آہنگ و اسلوب کا آفاقی معیار ہے۔ اگر اس عہد کی عالمی نثری شاعری نے قرآن کریم کو معیارِ استناد مانا تو یقیناً یہ شاعری اہل علم میں مقبول ہوگی۔ ابھی تو اردو میں نثری نظم کی حیثیت ایک DISTANT DRUM سے زیادہ کچھ نہیں پھر بھی خورشید الاسلام، سلیم الرحمٰن، اعجاز احمد، افتخار جالب، عادل منصوری، ع رشید کے یہاں مجھے وہ دستک سنائی دیتی ہے جس سے آئندہ یہ دروازہ کھل سکتا ہے۔ ☐ (مینی مضامین سیریز ۱)

شریف ارشد

جدید تر شعری آہنگ

دنیا بدل گئی اقدار بدل گئے، الفاظ بدل گئے معنی بدل گئے، روایت بدل گئی بغاوت بدل گئی لیکن ہمیں حیرت ہے کہ اس عہد کے اہل علم اور ادیب گفتگو تو کرتے ہیں جدید شاعری کی لیکن آہنگ سے متعلق ان کا تصور اب بھی پرانا ہے۔ ترقی پسندیت کے بعد جب شروع شروع میں جدیدیت کی لہریں بحرالہند میں ابھری تھیں تو یہی دقت پیش آئی تھی۔ یعنی یہ کہ ترقی پسندیت کی دھن میں انھیں یہ نہیں معلوم ہو رہا تھا کہ جدیدیت کو کس ادبی و شعری آہنگ و اقدار پہ تولیں پرکھیں کیوں کہ ترقی پسند دور ادب ہر شاعر اپنی گردن میں خالی کنستر لٹکا کر بجاتے پھرتے تھے اور وہ شور برپا تھا کہ توبہ ہی بھلی جبکہ جدیدیت کا آہنگ جداگانہ تھا لیکن رفتہ رفتہ لوگ اس آہنگ سے بیزار ہوتے گئے اور پپیہے کی سریلی آواز و آہنگ سے محظوظ ہونے لگے۔ اب روایت و تجربے کے درمیان سے جو ایک نئی شعری صنف نثری نظم وجود میں آئی ہے تو پھر آہنگ کا مسئلہ اہم صورت اختیار کر گیا ہے۔ لیکن میرے خیال میں اہم مسئلہ یہ ہے کہ ہم "جدید تر" شاعری (نثری نظم) میں "جدید آہنگ کی پیوندکاری کر رہے ہیں۔ ہم اس بار پھر بھول رہے ہیں کہ "نثری نظمیت"، "شعری جدیدیت سے آگے کا قدم ہے اور زینے پہ چڑھنے والا آدمی ہر قدم پہ نئے افق سے روشناس ہوتا ہے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ نثری نظم انتہائی نازک ترین دوشیزہ ہے۔ اسے نازک ترین زیور ہی چاہیے۔ یہ پھولوں کی میزان پہ تلے گی اور خوشبو اس کا آہنگ ہوگی۔ شامہ جس کا معطر ہے وہ اس شاعری کے آہنگ سے محظوظ ہوئے گا۔ خدارا اس پھول کی دوشیزہ کو چاندی، سونے اور ہیروں کے زیورات نہ پہناؤ، اسے ثقل برداشت نہ ہوگا۔

آہنگ یقیناً "الفاظ کی کیمیا" کا نام ہے لیکن کہاں کہاں الفاظ و آہنگ آپس میں ضم ہو کر PHYSICAL CHEMISTRY کی شکل پیدا کر رہے ہیں اس کا ادراک ضروری ہے۔ الفاظ کا غذ پہ سیاہی کی لکیر کا نام ہے لیکن ہمیں الفاظ سے نہیں الفاظ کے تلفظ سے سروکار ہے اور آواز طبیعیات کے ذیل میں آتی ہے۔ آہنگ الفاظ کی آواز سے الگ ایک طرح کی سامعہ نواز لہریں ہیں جو عقل و دل کے اختلاط

کی باعث ہوتی ہیں۔ یہ دراصل ایک CHEMICAL PHENOMENON ہے۔ ادبی عبارتوں میں جہاں جہاں یہ سامعہ نوازی پیدا ہو جاتی ہے وہ عبارت الفاظ و آہنگ کا پر اعجاز مرکب ہو جاتی ہے اور باعث مسرت ہوتی ہے۔ رقص میں یہ آہنگ بدن کے لوچ میں مضمر ہے۔ بدن کھول کر جسم کے تمام رطب و یابس دکھا کر ناچنے والی حسینہ اگر اپنے جسم کا لوچ نہ دکھا سکے تو اس کا رقص کلاسیکل نہیں کہلائے گا البتہ فرش پہ دونی، چونی، اٹھنی کی ڈھیر ضرور لگ جائے گی۔ یہ دراصل COMERCIAL DANCE کہلائے گا۔ کلاسیکل ڈانس تو وہ ہوتا ہے جس میں آدمی دم بخود رہ جاتا ہے۔ نثری نظم ابھی طعن و تشنیع کے دور سے گذر رہی ہے۔ یہ دور گذرے تو یقیناً یہ شاعری اپنا جداگانہ آہنگ پیدا کرلے گی۔

نثری شاعری میں آہنگ بہت ہی لطیف ترین وجدان کا نام ہے۔ یہاں آہنگ، حسن تعمیر، حسن تاکید، حسن تحدید، حسن تصویر، ابہام و اعلان، اوقاف و اسکان اور لفظی کیمیاگری کا نام ہوگا۔ عبارت میں کہیں کہیں فکر و الفاظ و آہنگ کا ایک ایسا مرکب تیار ہوگا جو عقل و دل و دماغ کو وہ تازگی بخشے گا جیسے کوئی گرمی کے دنوں میں فالودہ کھا رہا ہو۔ برف کی سل پہ رکھی ہوئی گنڈیریاں بھی کام و دہن کو ٹھنڈک دیتی ہیں جب کہ فالودہ زبان و حلقوم کے اندر ریشم کی ڈوریوں کی طرح مچلتی اور سرسراتی ہیں۔ نثری نظم دراصل وحی کی زبان ہے۔ ظاہر ہے نثری نظم میں کوئی مقام حاصل کرنا کتنا مشکل ہوگا لیکن ایسا بھی نہیں کہ نثری نظم کو کوئی شاعر نہ ملے۔ قرآن کریم نثری نظم کے آہنگ و اسلوب کا آفاقی معیار ہے۔ اگر اس عہد کی عالمی نثری شاعری نے قرآن کریم کو معیار استناد مانا تو یقیناً یہ شاعری اہل علم میں مقبول ہوگی۔ ابھی تو اردو میں نثری نظم کی حیثیت ایک DISTANT DRUM سے زیادہ کچھ نہیں پھر بھی خورشید الاسلام، سلیم الرحمٰن، اعجاز احمد، افتخار جالب، عادل منصوری، ع رشید کے یہاں مجھے وہ دستک سنائی دیتی ہے جس سے آئندہ یہ دروازہ کھل سکتا ہے۔ □ (مینی مضامین سیریز ۱)

برج راج پورہ
کوٹا (راجستھان)

عقیل شاداب

غزلیں

(۱)

مدماتی زلفیں بکھرائے آنگن میں
رات کسی کا دل بہلائے آنگن میں

یوں ممتا کے دیپ جلائے آنگن میں
ماں بچے کو دودھ پلائے آنگن میں

پری نیند کی پر پھیلائے آنگن میں
ممتا بیٹھی لوری گائے آنگن میں

آنکھ مچولی کرتے ہیں گھر والوں سے
دن کے گھٹتے بڑھتے سائے آنگن میں

پہلی پہلی رات گذاری ہے گھر میں
نئی نویلی کیسے آئے آنگن میں

تن کی خوشبو سے گھر بار مہک اٹھیں
جاڑوں میں جب دھوپ نہائے آنگن میں

بچپن اور جوانی کے کتنے پل چھن
ہم نے تم نے کھوئے پائے آنگن میں

لمحہ لمحہ مہک رہا ہے آج تلک
طرح طرح کے پھول کھلائے آنگن میں

پھینکا کرتے ہیں بورائی بیری پر
کنکر اور پتھر ہی ہائے آنگن میں

کاش پلٹ آئیں پھر ماضی کے دن رات
کاش کوئی پھر سے آجائے آنگن میں

سمٹی سمٹائی شرمیلی تنہائی
کپڑے دھوتے اور سکھائے آنگن میں

رات گئے جب کوئی کمرہ جاگ اٹھے
ایک دریچہ سا کھل جائے آنگن میں

بار بار کیوں تاکے بند کینواڑوں کو
کیوں کوئی خود سے شرمائے آنگن میں

جنم جنم کا وہ ترموہی ہے شاداب
جو گھر پر ایمان نہ لائے آنگن میں

(۲)

ایسا کوٹا ایسا چنبل ایسا گھر
کہاں ملے گا یہ گنگا جل ایسا گھر

گرمی کے موسم میں بادل ایسا گھر
تپتی دوپہری میں پیپل ایسا گھر

سانسیں بن کر مہک رہا ہے سینے میں
کسی کنوارے تن کے صندل ایسا گھر

بہنا کی کھٹی میٹھی باتوں جیسا
بھابی کی آنکھوں کے کاجل ایسا گھر

ابا کی اکھڑی اکھڑی کھانسی جیسا
ماں کے گیلے گیلے آنچل ایسا گھر

جس دن سے وہ چلی گئی اپنے میکے
اس دن سے لگتا ہے جنگل ایسا گھر

کالی کالی زلفوں جیسا سایہ دار
گورے گورے تن کے مخمل ایسا گھر

نئی نویلی دلہن کے نخروں جیسا
الھڑ محبوبہ کے چھل بل ایسا گھر

سردی میں کشمیری شال دوشالے سا
گرمی میں ڈھاکے کی ململ ایسا گھر

پیڑوں کی چھاؤں میں کیا مل جائے گا
چھوڑ کے جانے والے پاگل ایسا گھر

آگ خون کی ہولی کھیلنے والوں نے
بنا دیا پل بھر میں مقتل ایسا گھر

کھو کر اس کو جنم جنم تک ترسو گے
آج ملے شاداب نہ اب کل ایسا گھر

عبدالرحیم نشتر

غزلیں

اب وہ آواز کہاں دل کو لبھانے والی
کچھ ملاوٹ ہوئی اس میں بھی زمانے والی
خالی ہاتھوں کی لکیروں کو تکا کرتا ہوں
سنتا آیا ہوں کہانی میں خزانے والی
میں تو اس رات کا بجھتا ہوا تارا ٹھہرا
اب کوئی صبح کہاں مجھ کو جگانے والی
میں بھی ہوں رنگِ شفق پل میں بکھر جاؤں گا
ہے کوئی شام کہاں مجھ کو منانے والی
تم اگر بادِ صبا ہو تو مجھے مہکا دو
ایک رُت میرے لئے بھی ہو ترانے والی
میں کہاں سینہ سپر ہو کے نکل آیا ہوں
ہے بہت تیز ہوا تیر چلانے والی
اب کوئی پھول کھلے یا نہ کھلے غم کس کو
فصلِ گل آئی ہے زخموں کو سجانے والی
رات پھر آئے گی آواز اسی لڑکی کی
مجھ کو، میں کیا ہوں یہ احساس دلانے والی
چوڑیاں بجتی ہیں پازیب کھنک جاتی ہے
گیت سنگیت میں ہر سانس رچانے والی
کیوں یہ احساس میں خوشبو سی گھلی جاتی ہے
ایک ہنستے ہوئے موسم کو رلانے والی
نور کی بوند کس آکاش سے اتری نشتر
میرے ویراں در و دیوار سجانے والی

کیا ہیں کھلی فضا میں مری جاں نئے سراغ
اڑتے ہیں کیوں پرند ملے گا کسے سراغ
رودِ افق چمکنے لگی کس کے واسطے
ماہ و نجوم میں جو ہویدا ہوئے سراغ
بجھتی ہوئی اداس شبِ تشنگی کا چاند
بہتی ہوئی شفاف ندی کا بنے سراغ
وہ کون ہے جو چاروں طرف خیمہ زن ہوا
زنغے میں گھر گیا ہوں مجھے کیا ملے سراغ
کیجے بھی کیا امیدِ سپاہِ یزید سے
مردانِ حر کے سر ہیں نئے عہد کے سراغ
باندھا گیا ہے کیوں مجھے سانسوں کی ڈور سے
کیا ہیں بکھرے جہاں میں میرے لئے سراغ
اپنی بساط کیا تھی حریفوں کے سامنے
جب سر کٹا دیا تو ملے کچھ نئے سراغ

حبیب ہاشمی
۱۷۲۔ جی۔ ٹی۔ روڈ، شیب پور
ہوڑہ ۷۱۱۱۰۲

غزلیں

آنے والا ہے وہ پلکوں کو پیاسی رکھنا
نیلی جھیلوں میں نہ کچھ رخت اداسی رکھنا

زخم بن جائے نہ اظہار پئے رشتۂ جاں
روح کا غم تہِ خوش رنگ لباسی رکھنا

ٹوٹ کر جسم پہ گر جائے نہ رشتوں کی فصیل
احتیاطاً حدِ فاصل بھی ذرا سی رکھنا

غم کو تنہائی کا احساس نہ ہونے پائے
گھر کے گلدانوں میں کچھ پھول بھی باسی رکھنا

کس طرح خشک کریں مژۂ نمناک حبیب
ہم کو آتا ہی نہیں درد قیاسی رکھنا

شام آئی تو کہاں چاہنے والے ٹھہرے
میرے کمرے میں ترے غم کے اجالے ٹھہرے

کسی چہرے کو دمکنے کا ہنر کیا دیتے
ہم تو گمنام اجالوں کے حوالے ٹھہرے

ہاں کسی وقت تھے افکار جنوں خیز مگر
اب تو دیمک زدہ بوسیدہ رسالے ٹھہرے

تنگ و تاریک گذرگاہوں کے گل جنس حقیر
شاہراہوں کے سبھی سنگ شوالے ٹھہرے

پھول صحراؤں میں رہیں خار گلستانوں میں
اس ہوس گاہ کے دستور نرالے ٹھہرے

اوصاف نجمی

باقر گنج ، پٹنہ

کھوکھلی نصرتوں کا اعزاز

تو کیا جو ہوا
اس کو ہونا یونہی تھا
اس نے ہجرت زدہ قافلوں کو
جن اذیت گزیدہ تہوں میں اتارا
خوف سے نیم جاں موت کے منتظر
ان کو اپنے گھروں کی پناہوں میں
جس بے پناہی کی بے رحمیوں کا نشانہ بنایا
اس نے بے دست و پائی کے کچلے ہوئے پیکروں کو
کھوکھلی نصرتوں کا جو اعزاز پایا
آج اسے بھی انہی راستوں سے گزر کر
اپنے خوں میں نہانا پڑا
اس کی عظمت کے سارے فسانے
جو اس کے حواریوں نے گڑھے تھے
اب حقیقت کی یلغار میں بے صدا ہو گئے
وہ بھی تاریخ کے مردہ اوراق کا
اک سیہ باب ہو جائے گا
تو کیا جو ہوا
اس کو ہونا یوں ہی تھا
اس کا فاسد لہو
ان ہزاروں ستم دیدگاں کے لہو کی توقیت نہیں
خوں سے تر آخری ساعتوں میں
اس نے افسوس کا ذائقہ بھی چکھا یا نہیں
کون جانے
اس کو اتنا تو عرفان ہو ہی گیا
کھوکھلی نصرتوں کا یہ اعزاز کچھ بھی نہیں

آلین روب گرییئے

ترجمہ : محمد یٰسین

پوشاک والے کی ڈمی

کافی پاٹ میز پر دھرا ہے ۔
یہ چار پایوں والی ایک گول میز ہے جس پر مٹیالے اور سرخ چیک والا ایک میز پوش بچھا ہے جس کی زمین کا رنگ مختلف ہے ـــــ غالباً زردی مائل سفید جو کبھی ہاتھی دانت کی مانند بالکل ہی سفید رہا ہوگا ۔ میز کے بیچوں بیچ عام ٹیبل میٹ کی جگہ چینی مٹی سے بنی ایک ٹالی دھری ہے : ٹالی کا نقشہ مکمل طور سے چھپا ہوا ہے یا کم از کم شناخت کے ناقابل ہے ـــــ کافی پاٹ کی وجہ سے ، جو اس پر رکھا ہوا ہے ۔ کافی پاٹ بھوری مٹی کا بنا ہوا ہے ۔ اس کی شکل گلوب یا گیند کی سی جس پر سلنڈر والا پرکولیٹر (PERCOLATOR) اور مینڈک کی چھتری نما ایک ڈھکن چڑھا ہے ۔ کافی پاٹ کا دہانہ S کی شکل کا ہے جس کے سرے چپٹے یا پھیلے ہوتے سے ہیں اور جو جڑ کی طرف سے ذرا زیادہ گول ہے ۔ دستہ کان کی شکل کا ہے یا کان کے باہری حصے کی طرح ۔ اسے بہر حال کان کی بگڑی ہوئی شکل سے تعبیر کیا جا سکتا ہے ـــــ انتہائی گول اور خفیف سی لو : کم و بیش ایک ایسا کان جو کسی برتن کے دستے سے مشابہ ہو ۔ دہانہ ، دستہ اور مینڈک کی چھتری جیسا ڈھکن بالائی یا سفید مکھن کے رنگ کا ہے ۔ پاٹ کا بقیہ حصہ چمکدار ، خوش نما اور یکساں بھورا ہے ۔

میز پر سوائے میز پوش ، ٹالی اور کافی پاٹ کے کچھ بھی نہیں ہے ۔

دائیں جانب کھڑکی کے سامنے پوشاک والے کی ڈمی ایستادہ ہے ۔

میز کے پیچھے مینٹل پیس پر ایک بڑا سا مستطیل نما آئینہ ہے جس میں فرانسیسی کھڑکی کا نصف حصہ (دایاں نصف) دکھائی دیتا ہے ، اور بائیں جانب (مطلب کھڑکی کے بائیں جانب) آئینہ لگی وارڈ روب یا کپڑوں کی الماری کا عکس دیکھا جا سکتا ہے ، اس بار پورے کا پورا اور جوں کا توں (یعنی دائیں جانب دایاں نصف اور بائیں جانب بایاں نصف)

اس طرح مینٹل پیس پر یکے بعد دیگرے کھڑکی کے تین نصف حصے بغیر کسی توقف کے مسلسل

دیکھے جا سکتے ہیں ــــ وہ ہیں علی الترتیب (بائیں سے دائیں)، بایاں نصف جوں کا توں دیکھا جا سکتا ہے، دایاں نصف، یہ بھی جیسے کا ویسا دیکھا جا سکتا ہے، اور دایاں نصف جو بر عکس نظر آتا ہے چونکہ وارڈروب کمرے کے عین کونے میں ہے اور کھڑکی کے بالکل سرے سے جا ملی ہے، اس لئے کھڑکی کے دو دائیں نصف وارڈروب کے جو خود بھی کھڑکی کے فریم کا ایک حصہ نظر آتا ہے، ایک تنگ عمود کے ذریعہ ایک دوسرے سے قدرے علیحدہ نظر آتے ہیں۔ (بائیں نصف کا دایاں عمود عین دائیں نصف کے بائیں عمود کے اوپر تلے گزرتا ہے)۔ تینوں نصف کی وجہ سے ونڈو اسکرین کی دوسری جانب باغ میں موجود بے برگ و ثمر درختوں کو دیکھا جا سکتا ہے۔

اس طرح سے کھڑکی بالائی حصے کو چھوڑ کر جس میں چھت کے کچھ حصے اور وارڈروب کا بالائی حصہ دکھائی دیتا ہے، آئینے کی پوری سطح کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔

مینٹل پیس کے آئینے میں دو اور ڈمی بھی دیکھی جا سکتی ہیں، ایک کھڑکی کے پہلے سب سے تنگ حصے میں، بالکل بائیں جانب؛ اور دوسری کھڑکی کے تیسرے نصف کے سامنے (جو دائیں جانب سب سے آخر میں ہے)۔ یہ ڈمی ایک دوسرے کی جانب نہ تو رخ کیے ہوئے ہیں اور نہ ہی ایک دوسرے سے رخ پھیرے ہوتے؛ دائیں جانب والی ڈمی اس طرح مڑی ہوئی ہے کہ اس کا دایاں پہلو بائیں جانب والی ڈمی کی طرف ہے جو قدرے چھوٹی ہے اور دائیں جانب والی ڈمی کی طرف اپنا بایاں پہلو کیے کھڑی ہے۔ لیکن بادی النظر میں سمجھنا مشکل ہے کیوں کہ دونوں کا عکس آئینے میں ایک ہی ڈھنگ سے پڑ رہا ہے اور اس طرح دونوں کا ایک ہی پہلو دکھائی دے رہا ہے ــــ غالباً بایاں پہلو۔

تین ڈمی ایک ہی قطار میں ایستادہ ہیں۔ بیچ والی ڈمی جو آئینے کے بائیں جانب ہے اور اپنے دائیں جانب والی ڈمی کی نسبت اسی قدر بڑی ہے جتنی وہ اپنی بائیں جانب والی ڈمی سے چھوٹی ہے، عین اسی انداز یا سمت میں میز پر رخ کیے ہوئے ہے۔

کافی پاٹ کی گلوب نما سطح پر کھڑکی کا ٹیڑھا میڑھا عکس پڑ رہا ہے، کم و بیش کسی ذو اربعۃ الاضلاع کے نقشے کی طرح جس کے حلقے کسی دائرے کے قوس سے بنائے گئے ہیں۔ کھڑکی کے دونوں نصف کے درمیان لکڑی کے عمودی پٹکے سے جو لکیر بنی ہے، وہ دفعتاً اس کے عکس کے نیچے پھیل کر ایک عجیب شکل اختیار کر گئی ہے۔ یہ یقینی طور پر ڈمی کا عکس ہے۔

کمرہ کافی روشن ہے، کیوں کہ کھڑکی غیر معمولی طور پر کشادہ ہے، اگرچہ اس کے صرف دو ہی حصے ہیں۔

میز پر رکھے ہوئے کافی پاٹ سے گرم گرم پانی کی ایک خوشگوار مہک باہر نکل رہی ہے ۔

ٹمی اپنی مخصوص جگہ پر نہیں ہے : عموماً اسے کھڑکی کے زاویے میں رکھا جاتا ہے، آئینے والی وارڈروب کی مخالف سمت میں ۔ وارڈروب کو وہاں رکھا گیا ہے جہاں یہ کپڑوں کی فٹنگ میں مدد معاون ہو ۔

ٹامی کا ڈیزائن دراصل دو مہیب اور تقریباً وحشت ناک آنکھوں والا ایک الو ہے ۔ لیکن، اس وقت، کافی پاٹ کی وجہ سے کچھ بھی نظر نہیں آرہا ہے ۔ □

سلام بن رزاق
۴/۳۸ بی ۔ قریش نگر
کرلا ایسٹ، بمبئی ۷۰۰۰۷۰

دودِ چراغ

اپنے ہی حلق سے نکلی ہوئی کراہ اسے کسی دور کی وادی سے آتی ہوئی صدائے بازگشت لگی۔ نبض یوں ڈوب رہی تھی جیسے کوئی جہاز دھیرے دھیرے تہہ آب ہوتا جارہا ہو۔ اس کا جسم ساکت تھا اور آنکھوں کے سوا کسی عضو میں زندگی کے آثار نہیں تھے۔ سب کچھ بے حس و حرکت ہو چکا تھا، حتیٰ کہ اب درد کا احساس بھی ختم ہوتا جارہا تھا البتہ ذہن حیرت انگیز طور پر بیدار ہو گیا تھا۔

وہ گردن کو گھما نہیں سکتا تھا۔ صرف دیدوں کو حرکت دے کر اردگرد نگاہ ڈال لیتا۔ غالباً وہ بیچ سڑک پر پڑا ہوا تھا۔ بائیں طرف اپنا بازار کی دکان کی قطار تھی۔ ساری دکانوں کے شٹر گرے ہوئے تھے۔ اس نے دوچار دکانوں کے سائن بورڈ پڑھنے کی کوشش کی۔

"شکتی میڈیکل اسٹور"

"بھارت جنرل اسٹور"

"بدرالدین سویٹ میٹ مارٹ"

"بھوسلے مسالے والا"

"نیو گلشن ریسٹورنٹ"

اس سے آگے اس سے پڑھا نہیں گیا۔ حروف دھندلانے لگے تھے۔

درد کی ایک ہلکی سی لہر نیچے کہیں اس کی ریڑھ کی ہڈی سے اٹھتی ہوئی گردن کی طرف چلی۔ اس نے کراہنا چاہا مگر آواز حلق ہی میں پھڑپھڑا کر رہ گئی۔ اس نے دیدے گھمائے۔ دائیں طرف کرشنا تالاب تھا۔ کرشنا تالاب کے کنارے بنی ریلنگ سنسان تھی البتہ تالاب کے بیچ میں دو کشتیاں ہولے ہولے ڈول رہی تھیں۔ کشتیاں خالی تھیں۔ تالاب کے پس منظر میں عمارتیں تھیں۔ انھیں میں ایک عمارت بری طرح جھلسی ہوئی تھی جس سے اب بھی دھواں اٹھ رہا تھا۔ عمارتوں کے درمیان مسجد کا گنبد صاف دکھائی دے رہا تھا۔ گنبد کے اوپر ہلال کا نشان تھا۔ بالکل سامنے ہنومان ٹیکری تھی۔

جس کی چوٹی پر بنا ہنومان مندر اور اس کے کلس پر لہراتا چھوٹا سا بھگوان جھنڈا۔

اور ان سب کے اوپر آسمان میں چمکتا سورج، جس کی تیز شعاعیں اس کی آنکھوں میں گڑ رہی تھیں۔ اس نے آنکھیں بیچ لیں۔ ایک سرخ گیلے گیلے اندھیرے کی چادر اس کی بصارت کے آگے تن گئی۔ چادر سے قطرہ قطرہ خون ٹپک رہا تھا۔ اس نے پھر آنکھیں کھول دیں۔ اسے کیا ہوگیا ہے، وہ اٹھنا چاہتا ہے۔ اٹھ کر چلنا چاہتا ہے، دوڑنا چاہتا ہے، چیخنا چلانا چاہتا ہے۔ مگر وہ تو جنبش بھی نہیں کرسکتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کسی نے پورے جسم کو کیلوں سے ٹھونک دیا ہے۔ کس نے اس کی ایسی حالت کی؟ کون تھے وہ لوگ؟ وہ کسی کو بھی تو نہیں دیکھ سکا۔

وہ سب اندھیرے سے نکل کر اندھیرے میں غائب ہوگئے تھے۔

اس سے پہلے کہ وہ معاملے کو سمجھ سکتا۔ انھوں نے اسے گھیر لیا تھا۔ کسی نے اپنے ہاتھ کی گپتی گپتی اس کے سینے میں گھسیڑ دی تھی۔ وہ دونوں ہاتھوں سے سینہ پکڑ کر بیٹھ گیا۔ پھر ایک سنسناتا ہوا تلوار کا وار اس کے دائیں کاندھے پر پڑا تھا اور وہ زمین پر لڑھک گیا۔ وہ چیخ بھی نہیں سکا نہ کسی کو مدد کے لیے پکار سکا۔ اس کے منہ سے ایک دردناک کراہ نکل گئی تھی بس۔ پھر اس کے چاروں طرف اندھیرے کی تہیں گہری ہوتی چلی گئیں۔ گہری، بے حد گہری۔ اور جب اس کی آنکھ کھلی تو سورج اس کی پلکوں پر اتر آیا تھا۔ اوپر آسمان میں سفید بگلوں کی ایک ڈار اڑی چلی جارہی تھی۔ بگلے بہت اوپر تھے۔ اس کی حد سماعت سے پرے۔ مگر اسے ان کے پروں کی نرم پھڑپھڑاہٹ اپنے لہو میں گھلتی محسوس ہوئی۔ اف! پھر وہی درد کی لہر — نس نس میں اٹھتی ٹیس — جیسے — جیسے کسی خاردار جھاڑی پر ریشمی چادر کو بچھا کر دھیرے دھیرے کھینچا جارہا ہو۔ کتنا کرب ہ کتنا سکون ؟ یہ لمحہ لمحہ بدلتی کیفیت کیسی ہے؟

اس نے پھر گردن گھمانے کی کوشش کی، مگر ناکام رہا۔ کوشش کے نتیجے میں درد کی ایک نئی لہر گردن کے نیچے سے اٹھ کر پوری ریڑھ کی ہڈی میں پھیل گئی۔ اس نے کراہنے کے لئے منہ کھولا، مگر اس کی کراہ حلق میں گھر گھرا کر رہ گئی۔ اس نے پھر آنکھیں بند کرلیں اور ذہن کو بالکل ڈھیلا چھوڑ دیا۔ اتنے میں کہیں سے ایک منظر سرکتا ہوا سا آیا اور اس کی آنکھوں کے سامنے کچھ شبیہیں ابھرنے لگیں۔ کچھ بچے دوڑتے ہوئے آرہے تھے قلقاریاں مارتے، ہنسی کے پھول بکھیرتے، ننھے ننھے ہاتھ پیر، شگفتہ چہرے، مسکراتی آنکھیں۔ ان کے آگے آگے رنگ برنگی پروں والی تتلیاں اڑ رہی تھیں اور وہ سارے کے سارے بچے اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے انھیں پکڑنے کی کوشش کر رہے تھے۔ انھیں بچوں میں اس کا اپنا بچہ بھی تھا۔ پھر اس نے دیکھا کہ اچانک ان تتلیوں کا حجم بڑھنا شروع ہوگیا اور دیکھتے ہی دیکھتے

وہ ساری تتلیاں چیلوں جتنی بڑی ہوگئیں اور اس سے پہلے کہ بچے کچھ سمجھتے وہ پلٹ کر ان پر جھپٹ پڑیں۔ ان کے پروں کی خوفناک پھڑپھڑاہٹ سے فضا بھر گئی۔ ان کی تیز مڑی ہوئی منقاریں بچوں کی گردنوں میں پیوست ہوگئیں۔ ایک چیل اس کے بچے پر بھی جھپٹی۔ اس کی معصوم آنکھوں میں خوف اتر آیا۔ اس کا ننھا سا منہ کھل گیا۔ وہ چیخا مگر اس کے حلق سے آواز بالکل نہیں نکلی۔ اسے پورا منظر یوں لگا جیسے کوئی گونگی فلم دیکھ رہا ہو۔

اس نے پھر گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ مگر وہاں نہ تتلیاں تھیں نہ بچے ـــــ الکٹرک پول پر ایک کوا بیٹھا کائیں کائیں کر رہا تھا۔ اس کی منقار بار بار یوں کھل بند ہو رہی تھی، جیسے کوئی ہوا میں مقراض چلا رہا ہو۔ وہ کوے کو غور سے دیکھتا رہا۔ کوا بھی اس کی طرف دیکھ دیکھ کر کائیں کائیں کئے جا رہا تھا۔ پھر کوے کی چونچ لمبی ہونے لگی۔ لمبی اور لمبی ـــــ اب مقراض کی دونوں نوکیں اس کی آنکھوں میں کھُب رہی تھیں ـــــ

منظر پھر بدلا ـــــ

ایک عورت ـــــ جوان عورت، نیم عریاں حالت میں ایک اونچی عمارت کی کگار پر کھڑی تھی، اس کے کپڑے جگہ جگہ سے پھٹ گئے یا پھاڑ دیئے گئے تھے۔ اس کے ہاتھوں، پنڈلیوں اور چہرے پر خراشیں پڑی ہوئی تھیں جن سے تازہ تازہ خون رس رہا تھا۔ اس نے غور سے دیکھا، وہ عورت کوئی اور نہیں اس کی بیوی تھی۔ اتنے میں کہیں سے کتوں کے بھونکنے کی آواز آئی اور وہ وحشت زدہ سی ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ اسے لگا، اس کی ایک ذرا سی غفلت اسے بیسیوں فٹ نیچے گرا سکتی ہے۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے اسے پیچھے ہٹنے کو کہا۔ مگر وہ اس کی طرف قطعی متوجہ نہیں تھی۔ وہ دونوں ہاتھ بلند کر کے پوری قوت سے چیخا۔ اور دوسرے ہی لمحے پوری عمارت تاش کے گھروندے کی طرح لرزی اور بھر بھرا تی ہوئی اس پر گرنے لگی۔

اس نے پھر گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔

الکٹرک پول پر پہلے کوے کے پہلو میں دوسرا کوا آکر بیٹھ گیا تھا۔

یہ کیا ہو رہا ہے؟ کیوں ہو رہا ہے؟ یہ کیسے منظر ہیں؟ اس نے ذہن پر زور دینے کی بے حد کوشش کی مگر وہ ان مناظر کو کوئی معنیٰ نہ دے سکا۔ بس اسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ کسی تند و تیز دھارے میں غوطے کھا رہا ہے۔ لمحے بھر کو اس کا سر سطح سے اوپر اٹھتا ہے۔ ایک منظر اس کی آنکھوں کے سامنے لہراتا ہے اور وہ پھر سطحِ آب سے نیچے چلا جاتا ہے۔ نہ اوپر آنے پر اس کا اختیار ہے نہ ڈوب جانے پر

اس کا بس ——— ڈوبنے ابھرنے کی اس کیفیت نے اسے بے حد نڈھال کر دیا تھا۔ وہ اب آنکھیں بند کر کے سو جانا چاہتا تھا۔

ایک بے حد گہری نیند سو جانا چاہتا تھا۔

مگر ضروری تو نہیں کہ آدمی جب آنکھیں بند کرے اسے نیند آ ہی جائے۔

آنکھیں بند کرتے ہی اسے ایک جلتا ہوا مکان دکھائی دیا۔ مکان کے چاروں طرف سے شعلے اٹھ رہے تھے۔ دھوئیں کے مرغولے اٹھ اٹھ کر آسمان میں تحلیل ہوتے جا رہے تھے۔ شعلوں کے پس منظر میں اس نے دیکھا کہ ایک بڑھیا اس جلتے مکان سے باہر نکلنا چاہتی ہے مگر لپلپاتے شعلے اس کا راستہ روک لیتے ہیں۔ بڑھیا مدد کے لئے چلاتی ہے۔ وہ اس کی آواز پہچان لیتا ہے، وہ اس کی ماں ہے۔ وہ اسے بچانے کے لئے بھاگتا ہے اور جلتے مکان میں دیوانہ وار گھس جاتا ہے۔ مگر اس کی حیرت کی انتہا نہیں رہتی۔ اس کی ماں تو عمارت سے باہر کھڑی ہے اور ہاتھ ہلا ہلا کر اسے آگے بڑھنے سے روک رہی ہے۔ مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ وہ تو جلتی عمارت میں داخل ہو چکا تھا اور لپلپاتے شعلے اب عمارت کی چھت کو چاٹنے لگے تھے۔ وہ عمارت سے باہر نکلنا چاہتا ہے مگر وقت گذر چکا ہے۔ ایک شہتیر چنگھاڑتا ہوا اس کی طرف لپکا۔ اس نے دونوں ہاتھ اپنے سر پر رکھ لئے اور ایک بار پھر اس کی آنکھ کھل گئی۔ اب الکٹرک پول پر بے شمار کوّے جمع ہو چکے تھے۔ دائیں، بائیں ——— اوپر نیچے ——— اس کی نظر دھندلانے لگی۔ کیا واقعی اس قدر کوّے جمع ہو گئے ہیں یا یہ بھی اس کی بینائی کا دھوکا ہے ——— کوّے ایک دو ہی ہوں اور اس کی آنکھوں کے سامنے کھنچی ہوئی گیلی گیلی دھندلی دھندلی بینائی کے کارن اسے وہ کئی عدد دکھائی دے رہے ہوں۔

"بیٹا ——— آج کام پر مت جا ——— شہر میں بڑا ہنگامہ ہے۔"

"پورا شہر فساد کی لپیٹ میں۔"

"سنئے، مجھے بڑا ڈر لگ رہا ہے ——— آپ آج کام پر نہ جائیے۔"

"دس ہلاک ——— پچاس زخمی۔"

"بپا، میلے کو ٹکٹ لانا ——— بہت چھالے ٹکٹ۔"

"لاٹھی چارج ——— فائرنگ ——— کرفیو۔"

"یار تمھارے علاقے میں تو کرفیو لگا تھا۔ تم کیسے آ گئے کام پر؟"

"کرفیو رات کا ہے۔ ویسے بھی آخر کب تک بیٹھیں یار گھر میں۔ پیٹ کی آگ فساد کی آگ سے

زیادہ جھلسا دینے والی ہوتی ہے۔"

کرفیو لگنے میں صرف دس منٹ باقی ہیں اور وہ تیز تیز قدم اٹھاتا گھر کی طرف چلا جا رہا ہے۔ سڑک سنسان ہے۔ اردگرد کی عمارتوں میں سناٹا۔ پاس ہی ایک ملک بوتھ سے آگ کے شعلے نکل رہے ہیں۔ سڑک کے ایک کنارے کانچ کی کرچیں بکھری ہوئی ہیں۔ اکثر الکٹرک پول کے بلب اندھے کر دیئے گئے ہیں اور وہ قدم اٹھاتا جلدی جلدی گھر کی طرف جا رہا ہے۔

ہزاروں بار وہ اس سڑک سے گزرا ہے۔ تقریباً روز ہی گزرتا ہے۔ یہ سڑک اور اس کے آس پاس کی ایک ایک چیز اس کی دیکھی بھالی ہے مگر بعض اوقات دیکھی بھالی چیزیں بھی کتنی اجنبی ہو جاتی ہیں۔ اچانک اس کی رفتار تیز ہو گئی۔ اس وقت اس کی قوت سماعت ہزار گنا بڑھ گئی تھی بلکہ اس کا رواں رواں کان بن گیا تھا۔ سڑک کے کنارے ایک پتلی سی گلی میں آہٹ سی ہوئی۔ پھر سرگوشیاں ــــ پر اسرار سرگوشیاں ــــ دہشت انگیز سرگوشیاں ــــ گلی سے چند سایے نکلے اور وہ ٹھٹکا ــــ ٹھٹک کر رکا ــــ سایے اس کی طرف بڑھے ــــ پلک جھپکتے وہ سایوں میں گھر کر رہ گیا۔ وہ منتظر تھا کہ شاید کوئی اس سے پوچھے۔

وہ کون ہے؟ اس کا کیا نام ہے؟ اس کا دھرم کیا ہے؟ وہ کسی مذہب یا مسلک کو مانتا بھی ہے یا نہیں؟ مگر کسی نے بھی اس سے کچھ نہیں پوچھا۔ جیسے وہ سب جانتے ہوں کہ وہ کون ہے؟ جیسے ان سب کو معلوم ہو کہ انھیں کیا کرنا ہے؟

ایک سایے میں حرکت ہوئی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے بجلی سی لہرائی اور سیدھے اس کے سینے میں دھنستی چلی گئی۔ اس نے کراہ کر دونوں ہاتھوں سے سینہ تھام لیا۔ پھر دوسری بجلی اس کے دائیں کندھے پر گری۔ دور کہیں پولیس کی سیٹی بجی۔ سایے تیزی سے دوبارہ اندھیرے میں مدغم ہو گئے۔ پولیس کی سیٹی کی آواز دور ہوتی چلی گئی۔ اور یک بیک اس کے پیروں تلے زمین یوں کانپی جیسے کوئی بہت بڑا سیارہ اچانک اس کرے کے قریب سے گزر گیا ہو۔ پھر اس کی پلکوں پر اندھیرا تہہ بہ تہہ جمتا چلا گیا۔

کون تھے وہ لوگ؟ دوست؟ دشمن؟؟ ــــ نہ دوست نہ دشمن ــــ اسے ان لوگوں نے کیوں مارا؟ اسے مار کر انھیں کیا ملا ہوگا؟ اس کے پاس کیا تھا؟ اس کے پاس کیا تھا؟ خالی جیبیں ــــ خالی ٹفن بکس ــــ نہیں ٹفن بکس خالی نہیں تھا۔ اس میں ایک کیلا اور دو بسکٹ تھے جو لنچ پر اسے کینٹین سے ملے تھے اور اس نے انھیں اپنے بچّے کے لیے ..... کوئی گرم سیال شے اس کے سینے سے اچھلی اور حلق میں آکر اٹک گئی۔ یہ سب کیا ہے؟ یہ سب کیسے ہوا؟ کیوں ہوا؟ اس کے پاس ایک سوال

کا بھی جواب نہیں ہے۔ وہ دماغ پر زور دیتا ہے کہ اس کے ذہن کے کسی گوشے سے ان سوالوں کے جوابات نمودار ہوں۔ مگر اس کے ذہن میں تو سناٹا ہے۔ سوالات آوارہ بگولوں کی مانند اٹھتے ہیں اور دھول اڑاتے گزر جاتے ہیں اور جوابات چمکتے سرابوں کی مانند کبھی نظر آتے ہیں کبھی اوجھل ہو جاتے ہیں۔ نہ سوالات پر اس کا اختیار ہے نہ جوابات اس کے قابو میں ہیں۔ کوّوں کی تعداد بڑھتی جارہی ہے۔

کائیں کائیں، کائیں کائیں۔

مندر کا بھگوا جھنڈا برابر لہرا رہا ہے۔

مسجد کا ہلال چمک رہا ہے۔

جھلسی ہوئی عمارت سے دھواں نکل رہا ہے۔

اب سورج عین اس کی پیشانی پر نیش زن ہے۔ وہ سورج کو اپنی پیشانی سے جھٹک دینا چاہتا ہے۔ مگر ــــــ وہ تو جنبش کرنے سے بھی قاصر ہے۔

کوّوں کی کائیں کائیں چاروں طرف گونج رہی ہے۔ مندر کا بھگوا اور مسجد کا ہلال اونچے بہت اونچے ہو کر آسمان کو چھو رہے ہیں۔ جھلسی عمارت کا دھواں پھیل پھیل کر ہر شے کو اپنی آغوش میں سمیٹ لینا چاہتا ہے۔ افق کے فاصلے گھٹ رہے ہیں۔ زمین سکڑ کر ایک تابوت کی شکل اختیار کرتی جارہی ہے اور آسمان ــــ آسمان ایک نیلی چادر کی طرح اس پر تنا ہوا ہے۔ اس کا دم گھٹنے لگا۔ وہ اس تنگ زمین کے اوپر اور اس مخدوش آسمان کے نیچے کبھی کبھی اطمینان کی سانسیں نہیں لے سکتا۔ کبھی بھی نہیں۔

اسے مکاں اور لامکاں کی حدوں سے نکلنا ہوگا۔ مگر کیسے نکلے؟ کدھر سے نکلے؟ اس کی راہ میں تو بے شمار رکاوٹیں بھی ہیں۔

کوّوں کی کائیں کائیں۔ مندر کا بھگوا، مسجد کا ہلال، جھلسی عمارت کا دھواں، تالاب کی ہلکی ہلکی لہریں، لہروں پہ ہلکورے لیتی کشتیاں، نیلے آسمان کی چھت سے لٹکتا روشن سورج ـــــ وہ ان سب سے نجات حاصل کرنا چاہتا ہے۔ ان سب کو اپنے وجود سے جھٹک دینا چاہتا ہے۔

آخر اس نے تہیہ کر لیا کہ وہ ہر شے سے اپنی ہستی کو علیحدہ کرے گا تبھی وہ سکون سے سو سکے گا۔ اس نے اپنی ساری قوت سمیٹ کر آنکھوں میں جمع کر لی۔

اب اس کا جسم سرد ہو چکا تھا مگر آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ اس نے سب سے پہلے کائیں کائیں کرتے کوّوں کی جانب دیکھا۔ اس کی آنکھیں بندوقوں کی نالیں بن گئیں۔ دھائیں دھائیں دھائیں دھائیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے سارے کوّے اس کی نظروں کے سامنے پھڑپھڑا کر ڈھیر ہو گئے۔

پھر اس نے مندر کے کلس کی طرف دیکھا، مندر کا بھگوا شعلہ بن گیا۔ ایک زوردار دھماکہ ہوا — اب وہاں مندر کی جگہ چٹیل میدان تھا۔ پھر اس نے مسجد کے ہلال پر نگاہ ڈالی۔ ہلال کپکپایا اور دیکھتے ہی دیکھتے ہلال، مسجد کا گنبد بلکہ پوری مسجد دھواں دھواں ہو کر نظروں سے غائب ہو گئی۔ اس تباہی سے اسے اندر ہی اندر بڑی راحت کا احساس ہوا۔ اب اس نے ہر اس شے کو نیست و نابود کرنا شروع کر دیا جو اس کی نظروں کی زد میں تھی۔ مندر، مسجد، اونچی اونچی عمارتیں، تالاب، تالاب میں تیرتی کشتیاں — جب وہ اپنے اردگرد کی ایک ایک چیز کو تباہ کر چکا تب اس نے آخری دہکتی ہوئی نگاہ اپنے سر پر لٹکتے سورج پر ڈالی۔ بھک سے سورج گل ہو گیا جیسے کسی نے پھونک مار کر چراغ بجھا دیا ہو چاروں طرف گھُپ اندھیرا چھا گیا۔

تبھی اسے لگا اس کا وجود ہوا کی طرح لطیف ہو کر اس مخملی اندھیرے میں لپٹا اوپر ہی اوپر اٹھتا جا رہا ہے۔ □

خالد حسین

کارِ جہاں دراز ہے

یاجوج اور ماجوج کے بسائے ہوئے ملک عدن کا دستور تھا کہ جب بادشاہ سلامت سلامتی سے حکومت کرنے کے بعد عدم کو تشریف لے جاتے تو ان کا جانشین اسے بنایا جاتا کہ اگلے روز جس کے سر پر سب سے پہلے 'ہما' نامی پرندہ رونق افروز ہوتا۔ بادشاہ کے مرتے ہی ہزاروں لوگ اپنے ہاتھ آسمان کی طرف پھیلا دیتے اور خداوند عزوجل سے ہم کلام ہوتے اور نہایت عاجزی و انکساری سے کہتے کہ اے دو جہاں کے اصلی مالک و مختار 'ہما' کو ہمارے سر پر بیٹھنے کا حکم فرما تاکہ ہم بھی تیری بخشی ہوئی زمین پر چند روز حکومت کر کے بہارِ باغِ دنیا دیکھ لیں۔ ہزاروں آوازیں خدائی مائی کرو ویوسسٹم کے ذریعہ دو جہاں کے والی تک پہنچتیں۔ یزداں اپنی بنائی ہوئی مخلوق کی تابعداری و محکومی پر خوش ہوتا اور کسی ایک خوش بخت پر اپنی نوازشوں کی بارش کر دیتا ——

ایک بار جب ملک عدم کا بادشاہ خاک میں سما گیا تو سبھی باشندگانِ عدن اپنی خوش بختی کے لیے دعائیں مانگنے لگے۔ ایک بڑے محل کے اندر بیٹھا ایک مالدار تاجر جائے نماز پر بیٹھا خداوند کریم سے دعا مانگ رہا تھا۔

"اے اللہ! کل صبح سب سے پہلے ہما کو میرے سر پر بٹھا دے اور مجھے بادشاہ بنا دے۔ اگر ایسا ہوا تو میں اس ملک میں امن و سلامتی قایم کروں گا کسی کو تکلیف نہیں دوں۔ ہر ایک کے ساتھ انصاف کروں گا۔ ملک کو خوش حال بنا دوں گا۔ قوم کو ہر طرح سے خوش رکھوں گا۔"

یہ سُن کر تاجر کا غلام جو اس کے پاس ہی بیٹھا تھا، اپنے آقا سے کہنے لگا: "آقا! اگر جان بخشی ہو تو میں بھی ایک دعا مانگنا چاہتا ہوں۔" آقا نے جب اجازت دے دی تو اس نے اپنے ہاتھ دعا کے لئے اٹھائے اور کہنے لگا۔

"خداوند برحق! اگر کل صبح سب سے پہلے ہما میرے سر پر بیٹھے اور میں بادشاہ ہو جاؤں

توم پہ قوم پر اتنا ظلم کروں گا کہ چنگیز اور ہلاکو کی روحیں شرما جائیں۔ میری حکومت میں بربریت کا وہ ننگا ناچ ہوگا کہ میرے ملک کی آنے والی سینکڑوں نسلیں میرا نام سن کر کانپ جایا کریں گی۔ میں ظلم اور عیاشی کو اپنا مقصد بناؤں گا۔ میرے اللہ! میری دعا قبول کر اور مجھے صرف ایک بار اس ملک کا بادشاہ بنا دے۔"

صدقے خدا کی بے نیازی کے کہ اس نے غلام کی دعا سن لی۔ اگلی صبح "ہما" اس کے سر مبارک پر بیٹھا اور وہ اس ملک کا بادشاہ بن گیا۔ بادشاہ بنتے ہی اس نے رب جلیل سے کئے گئے وعدہ کو نبھایا اور قوم پر وہ ظلم کئے کہ ہر شخص الاماں الاماں کرنے لگا۔ اس نے پوری قوم کو الٹی چھری سے ذبح کیا۔ کسی بہو بیٹی کی عزت سلامت نہیں رکھی۔ بادشاہ کے خلاف ایک لفظ بولنے پر سرتن سے جدا کر دیا جاتا۔ لوہے کی گرم سلاخیں، کوڑے، جیل اور گولیاں قوم کا نصب العین بن گئیں۔ آخر جب عوام میں قوت برداشت نہ رہی تو ان کے چند نمایندوں نے بادشاہ سے ملنے کا ارادہ کیا۔ انھوں نے اپنے وفد کی سربراہی کے لئے اسی تاجر کو چنا کہ جس کے پاس بادشاہ کبھی غلام ہوا کرتا تھا۔ جب تاجر وفد کو لے کر بادشاہ کے محل میں پہنچا تو بادشاہ سلامت نے صرف وفد کے سربراہ سے ملنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ چنانچہ جب تاجر بادشاہ کے روبرو پیش ہوا تو بادشاہ اپنے آقا کو دیکھ کر حیران ہوا۔ وہ اپنے آقا کی تعظیم میں تخت سے اٹھ کھڑا ہوا اور پوچھا۔

"میرے آقا! آپ نے آج کس طرح قصر شاہی میں آنے کی تکلیف گوارہ کی؟" آقا نے جب عوام کی حالت زار بیان کی اور اسے ظلم بند کرنے کی تلقین کی تو بادشاہ کھلکھلا کر ہنس پڑا اور بولا "آقا! وہ دن یاد کر و جب میں آپ کا غلام ہوا کرتا تھا۔ ایک دن آپ نے اور میں نے ایک ہی جگہ پر بیٹھ کر خدا سے الگ الگ دعا کی تھی۔ آقا! آپ نے فرمایا تھا کہ اگر آپ بادشاہ بن گئے تو قوم کا دامن خوشیوں سے بھر دیں گے اور میں نے کہا تھا کہ اگر میں بادشاہ بن گیا تو میں قوم پر اتنے ظلم کروں گا کہ چنگیز و ہلاکو کی سرکش روحیں شرما جائیں۔ آقا! پروردگار نے میری دعا قبول کی تھی، آپ کی نہیں۔ لہذا میں تو صرف اپنے خدا سے کیا ہوا وعدہ نبھا رہا ہوں ــــ اور یہ سن کر آقا اپنا سا منہ لے کر قصر شاہی سے باہر آ گیا۔

☐

سجاد عزیز

روشن جھیل کی تلاش میں......

وہ دونوں پیاسے تھے اور پانی کی تلاش میں جا رہے تھے۔

"ہم پیاسے ہیں" پہلے مسافر نے کہا۔

"جب پیاس ہے تو یقیناً پانی ضرور موجود ہے" دوسرے نے کہا۔

"ہاں پانی موجود ہے اس لئے ہمیں پیاس ہے۔" پہلے نے کہا۔

"جو کچھ بھی ہو ـــــ جب پانی موجود ہے تو اس پیاس کو بجھنا چاہئے" دوسرے مسافر نے کہا اور مجھے معلوم ہے کہ وہ میٹھے اور صاف و شفاف پانیوں کی جھیل جہاں ہے۔ وہاں جلد پہنچ جانا چاہئے کہ پیاس کی شدت بڑھتی جا رہی ہے"۔

"اس تاریک اور اندھیری شب میں؟" پہلے مسافر نے حیرت سے کہا۔" روشنی کا نام و نشان تک نہیں ہے۔ تم اندھیرے میں منزل بھول جاؤ گے۔ اندھیرے میں سفر نا ممکن ہوتا ہے"۔

"نہیں ـــــ مجھے اپنے سفر کی سمت بخوبی معلوم ہے۔ اندھیرا میرے سفر کی رکاوٹ نہیں ہوگا۔ میں یقیناً جھیل تک پہنچ جاؤں گا"۔

"تمھیں میں روکنا نہیں چاہتا ـــــ میں بھی شدید پیاس محسوس کر رہا ہوں۔ راستے کا مجھے بھی بخوبی علم ہے۔ مگر روشن دن میں ہی سفر کروں گا۔ میں کبھی بھی طرح خطرہ مول نہیں لینا چاہتا"۔

"راستے کی رکاوٹوں سے خوف نہ کھاؤ میرے دوست"۔ دوسرے مسافر نے پہلے سے کہا۔

"نہیں میرے رفیق ـــــ اندھیرا ختم ہونے تک میں انتظار کروں گا"۔

"ٹھیک ہے۔ میں چلتا ہوں۔ ہم دونوں یہیں ملیں گے"۔

"میں منتظر رہوں گا" پہلے مسافر نے الوداعی انداز میں کہا۔

پھر دونوں ایک دوسرے سے رخصت ہو گئے۔

تھوڑے عرصے بعد جب ان کی ملاقات ہوئی تو دونوں ہی غیر مطمئن اور افسردہ تھے۔

"تم نے اپنی پیاس بجھالی ؟ روشن راہوں کے مسافر نے پوچھا۔
"ہاں" دوسرے مسافر نے کہا۔ راستہ تاریک تھا۔ میں جھیل تک پہنچ گیا۔ میں نے پانی ... مگر ..."
"مگر کیا ؟"
"کیا تم نے اپنی پیاس نہیں بجھائی ؟" تاریک راستے کا راہ گیر حیرت سے پوچھنے لگا۔
"نہیں ـــــ میں پیاسا ہوں۔ راستہ مجھے اپنی منزل تک لے گیا۔ مجھے راہ کا ہر نشان مل رہا تھا ـــــ مگر روشن اجالوں کے نیچے وہاں کوئی جھیل نہ تھی ـــــ کاش میں اندھیرے میں ہی روانہ ہو گیا ہوتا۔ میری پیاس بجھ جاتی مگر تم مجھے کچھ افسردہ اور ..."
تاریک راستے کے راہی نے اس کا جملہ کاٹتے ہوئے کہا۔
"نہیں ـــــ میرے دوست اندھیرے میں سفر غلط تھا۔ راہ تاریک تھی۔ جھیل اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اور .... پانی ... وہ کیا تھا ... کیسا رنگ تھا ... کچھ عجیب ... سچ پوچھو میں ابھی بھی پیاسا ہوں ـــــ"
اب دونوں ایک دوسرے کو حسرت اور افسوس کے ساتھ تکے جا رہے تھے ـــــ کسی گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے۔ □

مظہر الزماں خاں

آخری کلوزاپ

قافلے سے بچھڑنے کے بعد وہ دونوں مختلف زمینوں کی مٹی چاٹ چکے تھے ۔ اور اس وقت ان میں سے ایک درخت کے نیچے لیٹا ہوا تھا۔ اور دوسرا ایک محدود دائرے کے گرد چکر لگا رہا تھا۔ لیکن ہر چار چکر کاٹنے کے بعد وہ کچھ لمحوں کے لئے ٹھہر جاتا اور ورزش کی طرح مختلف سمتوں میں ہاتھ پاؤں گھمانے لگتا تھا۔ اور دوسرا اپنے ساتھی کی اس عجیب و غریب حرکت کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ کہ اچانک اس کی نظر شاخ پر بیٹھے ہوئے چڑیا اور چڑے پر جا کر ٹھہر گئی ۔ جو فطری عمل میں مشغول تھے ـــــ دونوں کے اس عمل کو دیکھ کر دفعتاً اسے اپنا بچھڑا ہوا بستر یاد آ گیا تو وہ فوراً اٹھا اور محدود دائرے کے گرد چکر لگانے والے ساتھی سے مخاطب ہوا ۔"

"سنو !"

"کیا ہے !" وہ ایک لمحہ کے لئے رک کر اس کی طرف دیکھنے لگا ۔

"آج مجھے اپنا چھوڑا ہوا بستر یاد آ رہا ہے ۔ جسے میں بھول چکا تھا ـــــ لہٰذا اب میں اپنے گھر جا رہا ہوں۔"

"زندگی کے بحرِ ذخار میں تو ہم اتر نہیں سکے"۔ اس کے ساتھی نے کہا۔ کیا اب کوہ ضوفشاں بھی چھوڑ دیں گے جو تازہ ہوا اور روشنی سے معمور ہے ؟"

"مجھے اب نہ بحرِ ذخار کی آرزو ہے اور نہ کوہِ ضوفشا کی خواہش"۔

"کیوں بھائی ! وہ حیرت سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا ـــــ "کیا تھک چکے ہو ۔ ؟ !"

"میرے پاؤں ۔ بفضل تھکن سے نا آشنا ہیں ۔ لیکن آج مجھے شدت سے اپنا بستر یاد آ رہا ہے جو شاید میرے انتظار میں اب برف بن گیا ہوگا اس لئے میں تمھارا ساتھ نہیں دے سکتا ـــــ"

"میں بھی گرم ہوں بھائی" ! وہ بولا ! مجھے بھی اپنا بستر یاد آتا ہے ۔ مگر میرے نزدیک بستر سے زیادہ اہمیت زندگی کی ہے ـــــ

"زندگی ایک دھجی دھجی بستر ہے۔ جس پر ہم لیٹ کر کچھ لمحوں کے لئے گم ہو جاتے ہیں۔ اس لئے اب میں ایک پل بھی نہیں ٹھہر سکتا ــــــ اور وہ چڑیا، چڑے کو گھورتے ہوئے تھوک نگل کر آگے بڑھ گیا۔ اور پھر ایک طویل سفر کے بعد اسے کسی اجنبی کے قدموں کی چاپ سنائی دی تو وہ چونک کر پلٹا

"کہاں جا رہے ہو"؟ اجنبی نے قریب پہنچ کر کہا۔

"پتہ نہیں"! وہ جان بوجھ کر انجان بن گیا۔

"بغیر سوچے سمجھے نکلے کیوں تھے؟"

"کوئی خود سے نہیں نکلتا ــــــ نکالا جاتا ہے؟"

"کس نے نکالا تھا؟"

"اس دور بلاخیز میں صحیح نہیں کہا جا سکتا کہ کس کی کوشش ہوں۔ لیکن تمھاری ہی طرح کو ہوگا جب مجھے نکال کر مطمئن ہو گیا ہوگا کہ وہ کوئی تخلیقی کام کر چکا ہے۔

"بے شک تم اس کی تخلیق ہو"۔ اجنبی نے کہا۔ مگر اس طرح بے مقصد زمین چاٹنے سے کیا فا ــــــ کوئی عملی کام کرو بھائی۔ تاکہ وقت تمھیں سر پہ بٹھالے"۔

"مجھے نہ وقت سر پر بٹھا سکتا ہے اور نہ میں وقت کو سر پہ بٹھانے کا قائل ہوں"۔ وہ بولا "کیوں کہ دونوں ہی درد سر ہیں"۔

"منجمد ذہن کے مالک ہو ــــ" اجنبی نے اسے سراپا گھورتے ہوئے کہا ــــ" را میں کوئی ملا تھا؟!"

"ہاں!" وہ بولا "ایک سبز پوش ملا تھا ــــ شاید کچھ پاگل تھا ــــ ہر چند قد کے بعد تخم ریزی کرتا تھا اور آگے بڑھ جاتا تھا ــــ جب میں نے اس سے پوچھا کہ بھائی کب سے تخم ریزی کر رہے ہو۔ اور اس طرح کہاں تک کرو گے، تو وہ بولا تھا ــــ صدیوں سے کر رہا ہوں اور سیکڑوں میل تک کرتا ہوں۔ لیکن جب واپس لوٹتا ہوں تو فصل کاٹ لی جاتی ہے ــــ نہیں وہ کون ہیں جو میری واپسی تک ساری فصل کاٹ کر لے جاتے ہیں۔ اور مجھے ایک دانہ بھی نص نہیں ہوتا ــــ یہ کہہ کر وہ پھر تخم ریزی کرتا ہوا آگے بڑھ گیا تھا"۔

"ہوں!" وہ ایک گہری سانس لے کر بولا ــــ" راستے انتہائی خطرناک بن چکے ہیں د ــــ دیکھ دیکھ کر قدم بڑھاؤ ورنہ تلوے زخمی ہو جائیں گے ــــ"

"میرے تلوے اب خطرات کے عادی بن چکے ہیں بھائی۔ اور زخم کا احساس مر چکا ہے

اس لئے فضول اپنی اور میری سانسوں کو ضائع نہ کرو"۔ یہ کہہ کر وہ آگے بڑھ گیا تھا۔ اور پھر جب کئی فرلانگ زمین اس کے قدموں کے نیچے سے گذر چکی تو غیر ارادی طور پر اس کے قدم ٹھہر گئے اور وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاروں طرف دیکھنے لگا صدیوں سے بنے ہوئے مکڑیوں کے ان گنت جالے آج بھی اسی طرح موجود تھے۔ اور اب بھی ان میں بے شمار انسانی لاشیں پھنسی ہوئی تھیں۔ اور مکڑیاں مسلسل ان کے اعضاء کتر رہی تھیں۔ تاہم وہ پورے تھے یا پورے کر دیئے جاتے تھے —— وہ چپ چاپ کھڑا۔ مکڑیوں کے جالے میں پھنسی ہوئی لاشوں میں اپنے آپ کو تلاش کرتا رہا۔ لیکن ان لاشوں میں جب اسے اپنی لاش کسی بھی جالے میں دکھائی نہ دی تو وہ جھلا کر ہاتھ کی لکیروں کو دیکھنے لگا اور پھر تیز تیز قدموں سے ایک لمحہ رکے بغیر اپنے بچھڑے ہوئے گھر پر پہنچ گیا۔ لیکن اپنے گھر پر دو اجنبی چہروں کو دیکھ کر اس کی آنکھیں شفق بن گئیں۔ اور وہ ایک طویل تخ بستہ سانس لے کر ان سے مخاطب ہوا ——

"کیا یہ تمھارا اپنا گھر ہے؟"

"اوں ہوں!" وہ بولے۔

"پھر تم یہاں کیا لینے آئے ہو —— ؟"

"پرائے بستر کی آگ کو گھونٹ گھونٹ پی کر اپنی پیاس بجھانا چاہتے ہیں —— کیا تم بھی اسی مرض میں مبتلا ہو۔؟"

"ہاں!" وہ خون کا گھونٹ پی گیا۔

"تو پھر آؤ!" دونوں نے کہا۔ "تمھارا نمبر ہمارے بعد آئے گا —— مگر تمھارا لباس دیکھ کر یوں لگتا ہے کہ تم بے جیب کے گاہک ہو —— کیا ادھار کا کھاتہ سمجھا ہے!!"

"ہوں!" اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"دھکے دے کر نکال دیئے جاؤ گے۔ سمجھے!"

"کسی میں دم ہے جو مجھے۔ یہاں سے ہٹا سکے؟ —— اس نے آنکھیں نکال دیں۔

"کیوں ایک مری ہوئی کتیا کے پیٹ کو ایندھن بنانا چاہتے ہو۔ بھائی۔ اب کی بار وہ بے حد نرم لہجے میں بولے —— جاؤ کسی وادی میں اتر جاؤ —— اور اس کے اندر جھن سے کوئی چیز ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو گئی لیکن کھوپڑی کے اندر ابھی تک چڑیا چڑے کی جنگ جاری تھی۔ اور جسم میں گرم آندھی کے آوارہ بگولے چکرا رہے تھے تاہم وہ اٹھا اور سرعت سے اندھیرے میں گم ہو گیا تو کچھ دیر کے بعد ایک بکری کی کرب انگیز آواز تاریکی میں گونجی اور دور انتہائی بلندی سے ایک سیارہ ٹوٹ کر عمیق پستیوں میں اتر گیا۔ ☐

انیس رفیع
آکاش وانی، گورکھپور

ایک اور تری شنکھو

ریہرسل :
بلیک آؤٹ
برّی، بحری، فضائی جنگیں :
COMMIT NO NUISANCE
"پیشاب کرنا منع ہے"

۔ یہ اطلاع لئے کھڑی تھی ایک سنسان گلی "پیشاب کرنا منع ہے"۔ کیوں؟ کیوں ہے ایسا؟ گلی اور وہ بھی سنسان گلی۔ وہ تو ہوتی ہے بس ایسے ہی کاموں کے لئے۔ اور پھر جب بلیک آؤٹ ہو تو وہ تختی بھی تو نظر نہیں آتی۔ کیا کرنا ہے؟ کیا نہیں کرنا ہے۔ یہ تو اس وقت سوچا جا سکتا ہے جب دیواروں سے لپٹے ہوئے الفاظ صاف صاف دکھائی پڑیں۔ اندھیرا نہ ہو تو دیوار پر رینگنے والی چیونٹیاں بھی نظر آجاتی ہیں اور ان کے سروں پر لدے ہوئے انڈے تو اور بھی نمایاں طور پر دکھائی پڑتے ہیں۔ ان چیونٹیوں کو کہاں سے آنا ہے اور کہاں جانا ہے یہ سب ان کے من میں بسا ہوتا ہے۔ ان کے من کی تختی کے الفاظ کچے نہیں ہوتے۔ کوئی بھی اندھیرا انھیں دھوکا نہیں دے سکتا۔ اور وہ جو دیواروں سے لگی اطلاعیں محسوس کرتے ہیں اور ان کا من کچا گھڑا ہے۔ پتہ نہیں وہ کب ٹوٹ جائے، کب پگھل جائے۔

ٹوٹنے اور پگھلنے کا خوف ہر سنسان گلی پر حاوی ہوتا ہے۔ پیشاب یا اس جیسی چیز ہر گلی پر کیوں حاوی ہے؟ سڑک پہ بھی وہی، دیواروں پر بھی وہی۔ اور ہاں اندھیرے میں گم ہونے والی اس اطلاعی تختی پر بھی وہی۔ یہ گلی کیوں نہیں صاف ہوتی؟ کیا میونسپلٹی کے پاس صرف مردہ ڈھونے والی گاڑیاں ہیں اور پھر مردے بھی تو سڑ جاتے ہیں گلیوں ہی میں۔

کس طرح گزر سکتا ہے کوئی اس گلی سے۔ اور یہ محلے والے! ان لوگوں نے تو اپنی ناکیں SEAL کرا رکھی ہیں۔ اگر کتے بھونکنے لگیں تو شاید یہ سب اپنے کان بھی SEAL کرالیں گے۔ بس یہی تو ایک علاج

رہ گیا ہے ان کے پاس ۔ ناک بند کرو، آنکھ بند کرو، کان بند کرو، شہر بھی بند کرو۔ شہر SEAL اور یہ سب تماشے ہیں۔ کچھ بھی بند نہیں ہوتا۔ SEAL ٹوٹتے ہی رہتے ہیں اور پیشاب ۔ کتے بھی تو پیشاب کرتے ہیں ۔ ٹانگ اٹھا کر۔

کبھی تختی پر۔

کبھی دیوار پر۔

اور کبھی گلی میں۔

"COMMIT NO NUISANCE"

بلیک آؤٹ۔ گھن گرج گھراؤ۔ آسمان سے گلی تک ۔ نیلے پیلے پانیوں کی دھار۔ اندھیرا۔ سخت سناٹا۔ سخت دباؤ۔

میں اس گلی سے گزر رہا تھا۔

COMMIT NO NUISANCE کے بورڈ کے نیچے دو اشخاص آپس میں گڈمڈ ہو رہے تھے۔ میں نے انھیں اپنی انگلیوں پر گننے کی کوشش کی۔ کبھی ایک۔ کبھی دو۔ کبھی ایک کبھی دو ۔ پھر میری انگلیاں بالکل مشین کی تیزی سے انھیں گننے لگیں۔ اچانک جیسے بریک لگ گئی ۔ یا خون کے دباؤ کا پارہ لڑھک کر بالکل زیرو کے آس پاس پہنچ گیا۔ دونوں انگلیاں بھی الگ الگ رک گئیں گویا یہ دو ہی تھے۔ ایک ہی ہونے کا گمان ختم ہوا۔

دونوں آمنے سامنے کھڑے تھے ۔ دونوں ایک ہی جیسے تھے ۔ تھوڑا سا فرق تھا تو اس بات کا کہ جو شخص ضرورت سے فارغ ہونے کو گھٹنے موڑ کر بیٹھا تھا اس کے بدن پر کپڑے تھے اور جو بانہہ پکڑ کر اسے کھینچے جا رہا تھا وہ مادر زاد ننگا تھا۔ اس کے ننگے پن کی تفصیل لیمپ پوسٹ کی مریل اور کمزور روشنی سے بہت صاف صاف جھانک رہی تھی ۔ گرچہ کچھ خطوط بڑے ہی DULL تھے ۔ کم از کم جس طرح نظر آرہے تھے اس حساب سے ۔ مگر خطوط سے زیادہ عجیب و غریب تھے وہ DIOLOGES جو ان دونوں کے درمیان اب شروع ہو چکے تھے ۔ ایک کہہ رہا تھا :

"چھوڑ دے مجھے ۔ مت گھسیٹ کہ میں اپنے ارادے کا پکا ہوں ۔ پیشاب کر کے ہی جاؤں گا۔"

ننگا شخص بول رہا تھا ۔

"ارادوں پر شکست و ریخت کی پرچھائیاں پڑتی ہی رہتی ہیں ۔ یہ ازلی اصول ہے ۔ ابتک اس کا پہنچنا مقدر ہے اور یہ ذاتِ آدم کے لیے مقدس و مبارک بھی ہے ۔ تم یہاں پیشاب نہیں کر سکتے کہ اس

مقدس اصول کو ٹھکرا کر ہمارے اور تمھارے پاس کچھ بھی نہ بچے گا۔"

"میں کہتا ہوں چھوڑ دے مجھے۔ میری نسیں جل رہی ہیں۔ جسم کی ضرورتیں اصولوں کو ننگا کر ہی دیتی ہیں۔ یہ وقت درس و تدریس کا نہیں۔ یہ بہت نازک مرحلہ ہے۔ یہ معاملہ میری سلگتی ہوئی نسوں کا ہے کہ جب بھی ان میں آنچ اٹھتی ہے تو اس دھرتی پر کچھ نہ کچھ ایسا ضرور ہوتا ہے جو پہلے کبھی نہیں ہوا ہوتا۔"

ننگے اور کپڑے والے آدمی کی کشتیں مجھے آہستہ آہستہ بے زمین کرتی جا رہی تھیں اور میں آسمانوں کی طرف اٹھتا جا رہا تھا۔ اچانک دونوں کی نظریں مجھ پر پڑیں۔ میں چیخنے لگا۔ "بچاؤ میں ڈوب رہا ہوں۔ آسمان دلدل کی طرح گداخت ہے۔ میں سر کے بل اس میں دھنستا جا رہا ہوں۔"

کون سن سکتا تھا میری آواز سوا ان دونوں کے۔ کپڑے والا شخص بول رہا تھا ——"چھوڑ دے! اڑنے دے مجھے۔ میں اس شخص کو بچانا چاہتا ہوں۔"

ننگا آدمی چیخا۔ "نہیں تم زمین چھوڑ کر اوپر نہیں اٹھ سکتے۔ جانے والے کو روکنا فطرت سے انحراف ہے۔ تمھیں یاد نہیں۔ تمھاری نسوں کا معاملہ ہے۔ نسوں کی آگ انڈیل دو اس گلی میں۔ میں اسے بجھانے کا انتظام کرتا ہوں۔"

"نہیں مجھے اس اڑتے ہوئے شخص کو بچانا ہے۔ سوا میرے یہاں اسے بچانے والا کوئی نہیں کہ جاگنے والے سب سو رہے ہیں۔"

"میں تمھیں کسی قیمت پر انحراف کی اجازت نہیں دے سکتا۔"

"انحراف میرا مقدر ہے۔ مقدر اپنی مٹھیوں میں رکھتا ہوں۔ ہماری تمھاری جنگ ناگزیر ہے۔"

(بری، بحری، فضائی چیخیں)

اس کے بعد ہی کپڑے والے آدمی نے بڑی سرعت سے اپنے کپڑے کھول ڈالے اور ننگے شخص کو زمین پر پٹک دیا۔ میں معلق سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ زمین پر پٹکنے کے بعد اس شخص نے بزور بازو آدمی کے بدن سے اپنے کپڑے باندھ دیئے۔ ننگا آدمی پسینوں میں تر تھا۔ جسم کی تفصیلیں گھیروں میں آچکی تھیں۔ اس نے سہمی سہمی نظروں سے چاروں طرف دیکھا اور نامانوس تفصیلوں پر اپنی ہتھیلیاں رکھ کر بلیک آؤٹ کی سیاہیوں میں تحلیل ہو گیا۔

کپڑے والا شخص جو اب ننگا تھا آسمان کی جانب یعنی میری طرف آ رہا تھا۔ میں نے زمین کی اور دیکھا۔ گلی سنسان تھی۔ ایک تیسرا شخص COMMIT NO NUISANCE کی تختی کے نیچے جلدی جلدی اپنے پتلون کے بٹن کھول رہا تھا۔ □

شمیم انور

I-203 بہاڑپور روڈ
کلکتہ ۷۰۰۰۲۴

غزل

جنگل جنگل آگ لگا کر پتھر کو پگھلائیں گے
دل کی صورت ڈھال کے اپنے شہر میں بیچے جائیں گے

آنے والی نسلوں سے ہم کیسے آنکھ ملائیں گے
راہ کی کٹھنائی کے ڈر سے رستے بدلے جائیں گے

پوپلے منہ کا مصرف آخر کچھ تو ان کو لینا ہے
اپنے عہد کی باتیں کہہ کر بچوں کو بہلائیں گے

کمروں کی حد بندی کی تو اوپر سے آئی آواز
اپنے اپنے پیر اٹھا لو، ہم دھرتی سرکائیں گے

سندر بلڈنگ سے ممتا کی بارش ہو امید کہاں
اونچے روشن دان سے کالے سائے نیچے آئیں گے

چپ کبھی ہو کہ اپنا سفر تو آج ہوا کی ضد پر ہے
ورنہ لمبے کان اٹھائے وہ بھی پیچھے آئیں گے

موسم موسم میرے پڑوسی ذوق بدلتے رہتے ہیں
طوطے کے خالی پنجرے میں مینڈک پالے جائیں گے

دونوں ایک ہی فن کے ماہر ایک ہے رستہ دونوں کا
لیکن ساتھی بن کر دونوں ساتھ نہیں چل پائیں گے

آخر کب تک بوجھ سہیں گے بنجے تو نزدوشی ہیں
اونچے لوگوں میں تو بونے بونے ہی کہلائیں گے

درد کی لذت کیا کم ہوگی نیند نہ ہم کو آئے گی
خواب کی باتیں کہتے کہتے وہ خود ہی سو جائیں گے

قطرہ قطرہ چن کر خوشیاں جمع کریں گے چالیس چور
کھل جا سم سم کہنے والے مفت میں حصہ پائیں گے

اپنی ضد سے خوفزدہ ہیں ان کے پہرے دار بہت
غار کے منہ پر رکھے پتھر ہم اک دن سرکائیں گے

نور بھارتی

۲۵۸ - جی۔ ٹی۔ روڈ (ساؤتھ)
ہوڑہ - ۷۱۱۱۰۲

غزلیں

شہر یا دشت، یا صحرا صحرا
ہم بکھر جائیں گے، لمحہ لمحہ

لے کے نکلے ہیں سفینہ لیکن
ریت ہی ریت ہے دریا دریا

راکھ کے ڈھیر کو سونے دو ابھی
اس کی مٹی بھی ہے شعلہ شعلہ

کھرکی گرد تو چھٹ جانے دو
صاف ہو جائے گا، چہرہ چہرہ

بچ کے شب خوں سے نکل آئے مگر
دن کا چکر بھی ہے خطرہ خطرہ

نورؔ ہر بات ہے۔ بہکی بہکی
ایک اک ذہن ہے بہکا بہکا

دھوپ کے شہر میں کہرا دیکھا
آگ اور پانی کا رشتہ دیکھا

اپنی ہی ہڈی کو وہ چوس گیا
ہائے کس شخص کو بھوکا دیکھا

موم کی طرح گلی رات مگر
اپنے گھر میں نہ اجالا دیکھا

بچ بچا کر میں نکلتا کیوں کر
ایک اک موڑ پہ پہرہ دیکھا

جس طرف دیکھوں نظر آئے وہی
آج یہ کون سا چہرہ دیکھا

غزلیں

منصور آذر
۱۰۸/۲۷ بی صفدر جنگ انکلیو
نئی دہلی ۱۱۰۰۱۶

کسی خموش تبسم کے جب لگے معنی
تو میرے ذہن کے اندر بہت ہنسے معنی
وہ ایک اوس کا قطرہ تھا پھول کے لب پہ
ذرا سی آنچ جو پائی تو اڑ گئے معنی
بڑا سکون تھا جب چپ تھا تیری محفل میں
میں جب چلا گیا اس پہ بہت لگے معنی
وہ لفظ لفظ بدن تھا مگر شکستہ تھا
پر اک نگاہ نے اس کی عجب کیے معنی
پڑی تھی لاش کوئی ریگ زار ساحل پر
سراب تھا یا کہ طوفاں کہاں گئے معنی
ہر ایک لوح بدن کا اک آئنہ کی طرح
وہ عکس لمس سے پیدا کیے ہوئے معنی
زمیں غزل کی بنائی ہے آسماں آذر
ستاروں کی طرح چمکے ہوئے ہیں معنی

نجم عثمانی
معرفت : سید ابوالقاسم
سی۔ایم۔پی۔ایف۔آفس دھنباد

ہو رہی ہے رات دن ہر سمت سے یلغار اب
لڑ رہا ہے بس اکیلا ہی سپہ سالار اب
ایک مرکز پر سمٹ کر رہ گئی ہے زندگی
جذب ہے دیوار ہی میں سایۂ دیوار اب
مجھ کو جس کی جستجو تھی، میرا دشمن مل گیا
میں ہوں اپنے آپ ہی سے برسر پیکار اب
آپ دروازوں پہ دستک دے رہے ہیں کس لئے
جائیے اس شہر میں کوئی نہیں بیدار اب
بچ کے طوفاں سے نکلنے کی کوئی صورت نہیں
ڈوبتی کشتی کا کر لیں آخری دیدار اب
کشتیٔ دل کے مقدر میں لکھا تھا ڈوبنا
تھم گیا طوفان بھی، خاموش ہے منجدھار اب

شاہین الہ آبادی

غزلیں

لذتِ کربِ فنِ شیشہ گری سے پوچھو
اتنا خوش کیوں ہوں مری ناہسری سے پوچھو
اپنے ماحول سے کیوں اتنا جبردار ہوں میں
پوچھنے والوں مری خبری سے پوچھو
کیوں عزیز اتنا ہے بے وطنی کا احساس مجھے
ہم نشینو مری جنت بدری سے پوچھو
میں نے کیوں بھاگتے لمحوں کا تعاقب نہ کیا
یہ سوال اپنی وسیع النظری سے پوچھو
مجھ سے کچھ لوگ گریزاں ہیں کیوں، ناراض ہیں کیوں
پوچھنا ہے تو مری دیدہ وری سے پوچھو

کیوں ٹوٹ کے بکھرا ہوں مقدر سے نہ پوچھو
جو بات ہے شیشے کی وہ پتھر سے نہ پوچھو
ڈرتا ہوں کہ حرف آئے نہ قاتل کی انا پر
روداد مرے قتل کی خنجر سے نہ پوچھو
ہر ڈوبنے والے سے مجھے کیوں ہے محبت
سوکھے ہوئے دریا کے شناور سے نہ پوچھو
ہو جائے نہ ثابت کہیں خود کج روی اپنی
کیا لٹنے کے اسباب ہیں رہبر سے نہ پوچھو
سچ ٹھہری ہے کیوں مردہ ضمیروں کی گواہی
انصاف کے بگڑے ہوئے تیور سے نہ پوچھو

احسن شخصی

کس سمت کی زہریلی ہواؤں سے بچو گے
اس شہر کی تم دھوپ نہ چھاؤں سے بچو گے
موسم کی زبان خشک زمیں چاٹ رہی ہے
بادل ہے گھرا کیسے گھٹاؤں سے بچو گے
برباد ہوا اپنی دعاؤں کے اثر سے
تم بھی کسی مفلس کی دعاؤں سے بچو گے
کاندھوں پہ تعلق کا کوئی بوجھ نہ رکھنا
الزام تراشی کی سزاؤں سے بچو گے
محرومیِ حالات ہوس لوٹ رہی ہے
اب کیسے ضرورت کے خداؤں سے بچو گے

شکیل رضا

آگ کے پجاری

وہ ظلمات کے ایک وسیع صحرا میں بھٹک رہا ہے ۔ اسے کوئی راستہ کوئی ڈگر سجھائی نہیں دے رہی ہے ۔ وہ جیسے جیسے آگے بڑھتا ہے ۔ اندھیرے کے سائے پھیلتے جاتے ہیں ۔ تاریکی آنکھوں میں چبھنے لگتی ہے ۔ اور وہ دیوانہ وار دوڑنے لگتا ہے ۔ دور بہت دور دوڑتا جاتا ہے ۔ اس بات سے بے خبر کہ وہ دوڑ رہا ہے ۔ یا زمین اس کے قدموں کے نیچے سے نکلی جا رہی ہے ۔ انسان زندگی کے محور پر دوڑتا ہے یا محور زندگی کا دوسرا نام ہے ۔ اسے صرف اتنا ہی محسوس ہوتا ہے ، جیسے دوڑنا ہی اس کی زندگی ہے ۔ اور یہی احساس رفتار میں اضافہ کر دیتا ہے ۔

دفعتاً اس کے قدم تھم جاتے ہیں ۔ حیرت میں ڈوبی ہوئی آنکھیں پتھرانے لگتی ہیں ۔ اور اندھیروں کے افق پر روشنی ہالہ سا ابھرتا ہوا دکھائی دیتا ہے ۔ سیاہی کی چادر بتدریج پھٹنے لگتی ہے ۔ اس کے قدم روشنی کی جانب بڑھتے جاتے ہیں ۔ جہاں بہت سی پرچھائیاں حرکت کرتی ہوئی نظر آتی ہیں ۔ اس کے ساتھ ہی عجیب سی بے ہنگم آوازیں اس کی سماعت سے ٹکرانے لگتی ہیں ۔ ایک شور سا گونجنے لگتا ہے ۔ اور وہ ان آوازوں کی ہیئت پر غور کرتا ہے ۔ اسے محسوس ہوتا ہے ۔ جیسے بہت سے لوگ کسی ویران کھنڈر میں جمع ہیں اور وحشیوں کی طرح چیخ رہے ہیں ۔ قہقہے لگا رہے ۔ ہیجان انگیز رقص میں ڈوبے ہوئے ہیں ۔

کھنڈر کے وسط میں ایک لاوا روشن ہے ۔ اور آگ بڑی تیزی سے بھڑکتی جا رہی ہے ایسی ہی آگ ان ناچتے ہوئے وحشیوں کے سینوں میں جل رہی ہے ۔ ان کے جسم شعلوں کی طرح دہک رہے ہیں ۔ سسکیوں کی آواز چیخ و پکار میں ہم آہنگ ہو کر مٹتی جا رہی ہے چیخ و پکار کے خول سے ایک اور آواز نکلنے لگتی ہے ۔ یہ آواز کس کی ہے ۔ ان وحشیوں کی ہے ۔ یا خود اس کی !! ہاں یہ آواز اسی کی ہے ۔ وہ بھی ان وحشیوں کے ساتھ مل کر چیخ رہا ہے ۔ دیوانہ وار رقص کر رہا ہے ۔ چاروں طرف شور ہی شور ہے ۔ آگ ہی آگ ہے ۔ جو تیزی سے جل رہی ہے ۔

ایک بار پھر اس کے قدم رک جاتے ہیں۔ اس کی آواز دم توڑ دیتی ہے۔ فنا ہو جاتی ہے اور وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے ان وحشیوں کی طرف دیکھنے لگتا ہے۔ جو اسے حصار میں لے کر دھیرے دھیرے اس کی جانب بڑھ رہے ہیں۔ مگر یہ وحشی اس کی جانب کیوں بڑھ رہے ہیں۔ کیا وہ اسے ننگا کر دینا چاہتے ہیں۔ ہاں ان وحشیوں کے چہرے پر یہی لکھا ہوا ہے۔ مگر نہیں۔ وہ ننگا نہیں ہوگا۔ وہ اپنے کپڑے نہیں اتارے گا۔

وہ ایک بار پھر سے چیخنے لگتا ہے۔ حصار تنگ ہوتا جاتا ہے۔ فاصلہ گھٹتا جاتا ہے۔ آگ تیزی سے لپکنے لگتی ہے۔ اور وہ سارے وحشی اچانک اس پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔ وہ گھبرا کر اپنی آنکھیں بند کر لیتا ہے۔ وحشی اسے اپنے کندھوں پر اٹھائے ہوئے لاوے کی جانب بڑھتے جاتے ہیں۔ لاوا قریب اور قریب ہوتا جاتا ہے۔ آگ بھڑکتی جاتی ہے اور اچانک اس کا وجود پگھلنے لگتا ہے۔ اس کے وجود کو پگھلتا ہوا دیکھ کر وہ سارے وحشی لاوے میں کود پڑتے ہیں۔ □

اقبال نازش

زرد جنگل

مدتوں جو میری تلاش میں گنگی سڑک کا وجود خراشتا رہا۔ جب وہ میرے کندھوں پر چڑھا تو زور زور
سے کائنات کے سینے میں چیخیں چبھونے لگا اور ——— اور میرے سر کے بالوں کو نوچنا شروع کیا۔ بالآخر تھک کر
اس نے اپنی جیب سے ہتھوڑا نکال ہی لیا اور میرے سر پر اس طرح مارنے لگا جیسے وہ سنگ تراشی کا صرف شوق
رکھتا ہو نہ کہ مہارت

وہ چاہتا تھا کہ اپنی قوت بازو کا سہارا لے کر ہتھوڑا میرے سر پر اس طرح مارے کہ میرا سر چکنا چور ہو جائے
اور سب کچھ سمیٹ لے لیکن ——— لیکن وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ میرے سر نے ریگزاروں کی کوکھ سے جنم لیا ہے جو کتنی
بار سمٹنے کے بعد بھی بکھرنے کا عمل جاری رکھتے ہیں۔

کندھوں پر سوار وہ اس طرح میرے گرد پھیلتا رہا جیسے اس کی خونخوار نگاہوں میں برسوں کی بھوک تھی
اور جیسے وہ

لیکن وہ شاید یہ بھول بیٹھا ہے کہ میرا سر اسی روز تعمیر ہوا تھا جب سورجوں کا ایک قافلہ زمین پر نمودار ہوا
اور ان میں دیر تک جنگیں رہی تھیں۔ آخر یہ طے پایا تھا کہ

اور جب وہ ماضی کی دیواروں سے جا ٹکرایا تو آہستہ آہستہ شرمندہ ہو کر میرے کندھوں سے اتر کر دور بازار
کی گلیوں میں چھپنے لگتا ہے۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ اس کے چہرے پر زردیوں کا جنگل اگ آیا ہے اور اپنے ہی پیدا کردہ
جنگل میں پھر چھپانے کی کوشش کر رہا ہے اور اب وہ آہستہ آہستہ میری آنکھوں سے اوجھل ہوتا جا رہا ہے ۔

اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَیْهِ رَاجِعُوْنَ ؕ

ابھی پلٹ کر چلنے لگا تو میں حیرت کے مارے دم بخود رہ گیا۔ میرے آگے آگے ایک عجیب و غریب طویل القامت
سایہ چل رہا ہے اور اس کی پشت میری طرف ہے لیکن مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ اس کی پشت پر لاکھوں آنکھیں اگ
آئی ہیں اور وہ مجھے برابر حصار میں لئے ہوئے ہے اور ، اور ——— میں ، میں ———!!

رؤف خیر

ترائیلے

"آ عندلیب..."

کرم کرنے پہ ہو میں کب سے مائل
بقول اقبال کوئی تو ہو سائل
مری ہستی نہ ہو تاروں سے مائل
کرم کرنے پہ ہوں میں کب سے مائل
زمین و آسماں ہیں میرے قائل
الگ ہیں تم سے کب میرے مسائل
کرم کرنے پہ ہوں میں کب سے مائل
بقول اقبال کوئی تو ہو سائل

حرفِ ناگفتہ

ادب کے نام پہ کیا رہ گیا ہے کہنے کو
مگر وہ بات جو میں چپ رہوں تو رہ جائے
یہ حرف و صوت کا دھارا بہت ہے بہنے کو
ادب کے نام پہ کیا رہ گیا ہے کہنے کو
یہ گھاس پھوس کا چھپر بہت ہے رہنے کو
مگر وہ آگ جو مجھ میں ہے کس جگہ جائے
ادب کے نام پہ کیا رہ گیا ہے کہنے کو
مگر وہ بات جو میں چپ رہوں تو رہ جائے

"... سرگرانی اور ہے"

شوق پڑھنے کا بہت تھا تو کتابیں کمیاب
وقت ارزاں ہو تو پھر جاں پہ گراں ہوتا ہے
چہرہ چہرہ میں پیا کرتا ہوں تازہ زہراب
شوق پڑھنے کا بہت تھا تو کتابیں کمیاب
اب مرے پاس کتابیں تو ہیں بے حد و حساب
جن کے پڑھنے کو مگر وقت کہاں ہوتا ہے
شوق پڑھنے کا بہت تھا تو کتابیں کمیاب
وقت ارزاں ہو تو پھر جاں پہ گراں ہوتا ہے

جیتے جی

دیکھا نہ جائے ہے تری بے چہرگی کا دکھ
اے مرگِ ناشناخت مرا نام پیش ہے
یہ کس غریب سے نہ اٹھا زندگی کا دکھ
دیکھا نہ جائے ہے تری بے چہرگی کا دکھ
دیکھوں تو جیتے جی کبھی خودکشی کا دکھ
یہ زندگی تو اپنے لئے اک گنیش ہے
دیکھا نہ جائے ہے تری بے چہرگی کا دکھ
اک مرگِ ناشناخت مرا نام پیش ہے

ٹائم کیپسول

بنو امیّہ ہی باقی نہ رہے بنو عبّاس
نہ اپنے آپ کو دہرا کے تھک سکی تاریخ
ہوا و حرص بھلا کس کو آسکے ہیں راس
بنو امیّہ ہی باقی نہ رہے بنو عبّاس
سروں میں دفن ہوئی اقتدار کی بو باس
ہر ایک حرفِ ہوس پر کھنچا خطِ تنسیخ
بنو امیّہ ہی باقی نہ رہے بنو عبّاس
نہ اپنے آپ کو دہرا کے تھک سکی تاریخ

شہ مات

پندار ٹوٹنا ہے الٹنا بساط کا
یوں بھی ہوا کہ پیادوں سے شہ مات ہوگئی
اک مہرۂ غلط ہے سبب اختلاط کا
پندار ٹوٹنا ہے الٹنا بساط کا
کتنا کٹھن رہا ہے سفر احتیاط کا
دو شاطروں سے کتنی بڑی بات ہوگئی
پندار ٹوٹنا ہے الٹنا بساط کا
یوں بھی ہوا کہ پیادوں سے شہ مات گئی

تقویم

(تبصرہ کے لیے ہر کتاب کی دو کاپیاں بھیجنا ضروری ہے۔ دوسری صورت میں ادارہ تبصرہ شایع کرنے سے معذور ہوگا۔ ادارہ)

سرسید اور ہندوستانی مسلمان • نورالحسن نقوی • ایجوکیشنل بک ہاؤس

مسلم یونی ورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ • ۲۰ روپے

اردو ادب سے ڈاکٹر نورالحسن نقوی کا تعلق صرف تدریسی ضرورت کا نہیں بلکہ وہ اپنے ادبی سرمایہ سے واقف ہونے کے ساتھ ہم عصر ادبی سرگرمیوں سے بھی قدرے دلچسپی رکھتے ہیں اور ادب کے بدلتے ہوئے مزاج کی شناخت کی اہلیت بھی ——— اب تک ڈاکٹر نقوی کی تحقیقی اور تدوینی کاوشوں کے کئی نمونے منظر عام پر آچکے ہیں۔ گذشتہ دنوں اقبال کے فکر و فن ان کی ایک تنقیدی کتاب بھی شایع ہو کر آئی ہے۔ اس طرح انھوں نے تحقیق، تدوین اور تنقید تینوں میں اپنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا ہے۔

سرسید اور ہندوستانی مسلمان ان کی تازہ ترین تصنیف ہے جسے میں تنقید سے زیادہ تحقیق کے خانے میں رکھوں گا، کہ پوری کتاب مستند حوالوں، سرسید کی تحریروں اور سرسید سے متعلق کتابوں کے معتبر بیانات پر مبنی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ نورالحسن نقوی نے کتاب کی منصوبہ بندی اس انداز میں نہیں کی ہے کہ وہ اپنے بیان کردہ معروضات کو حوالے اور دلائل سے مستحکم کرکے سبکدوش ہو جائیں بلکہ انھوں نے اس سے زیادہ مشکل راستہ اختیار کیا ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ کے دوران ہر جگہ اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ مصنف نے خاصی محنت و جانفشانی سے پہلے حقائق جمع کئے ہیں اور معتبر حوالوں سے جمع کردہ حقائق پر رائے قائم کرنے کی کوشش کی ہے ——— "سرسید اور ہندوستانی مسلمان" کتاب کے پہلے باب کا عنوان ہے جس کو کتاب کا نام دے دیا گیا ہے۔ پہلا باب اس لئے کلیدی حیثیت رکھتا ہے کہ بعد کے ابواب میں سرسید کے سیاسی نظریات، تصور تعلیم، اصلاح معاشرت، نظریہ شعر و ادب وغیرہ مسائل سے بحث کی گئی ہے اور یہ سب مسائل کسی نہ کسی طرح سرسید کے حوالے سے ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل کے گرد گھومتے ہیں ——— سرسید چونکہ بنیادی طور پر ایک مصلح اور سماجی سطح پر بالغ نظر رہنما تھے جن کی اصلاح اور رہنمائی میں نہ صرف یہ کہ کوئی سیاسی مقصد کارفرمانہ تھا بلکہ ان کا طریقۂ کار سماجی خرابیوں کی اساس کو سمجھنے اور بغیر کسی شور و شر اور نعرہ بازی کے ان کی اصلاح کی کوشش اور مذموم چیزوں کی بیخ کنی کرنے سے عبارت تھا۔

اس کتاب کے پہلے باب میں سرسید کی عملی زندگی کے آغاز سے "اسباب بغاوت ہند" کی تصنیف، تہذیب الاخلاق نکالنے کے محرکات، مذہب سے متعلق بعض غلط فہمیوں اور جدید تعلیم کے ذریعہ مسلمانوں کے مسائل کا حل ڈھونڈھنے کی کوشش جیسے موضوعات پر اجمالی گفتگو کی گئی ہے اور اس اجمال کی تفصیل کے طور پر مختلف ابواب میں ہر موضوع پر الگ الگ سیر حاصل بحث ملتی ہے۔

مذہبی افکار و عقائد سے متعلق باب میں سرسید کی تفسیر قرآن اور تہذیب الاخلاق، شاہ ولی اللہ کی حجۃ البالغہ کے دیباچہ اور سرسید کے مذہبی افکار و عقائد اور ان سے متعلق ضروری معلومات کو بنیاد بنا کر گفتگو کی گئی ہے۔ دوسرے ابواب کی طرح اس باب میں بھی مصنف نے اپنی رائے کم سے کم دی ہے اور زیادہ تر اس بات کی کوشش کی ہے وہ کہیں گرفت میں نہ آنے پائیں۔ اس رویے سے ایک طرح کی معروضیت کا انداز پیدا ہو گیا ہے اور یہ معروضیت بہرحال مستحسن ہے —— پوری کتاب میں یہی ایک ایسا موضوع تھا جس کے ذیل میں سرسید پر خاصی تنقیدی نظر ڈالی جا سکتی تھی مگر ڈاکٹر نورالحسن نے اس موضوع تک پر بھی بت شکنی سے احتراز کیا ہے۔ ایک آدھ جگہ سرسید کے مذہبی افکار پر تنقید ملتی بھی ہے تو وہ حالی یا کسی اور کے حوالے سے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ دینی معاملات میں سرسید کی مداخلت کا جواز کسی بھی طریقہ پر پیش کرنا ممکن نظر نہیں آتا۔ اس بات کو بہت اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہئے کہ سرسید کی تفسیر، قرآن کو سمجھنے کی کوشش نہیں بلکہ ہندوستانی مسلمانوں کی اصلاح کی کوشش کے ایک وسیلہ کے طور پر استعمال کرنے کی غرض سے لکھی گئی تھی۔ اس ضمن میں رسومات اور فروعات دین پر خاصے متوازن خیالات ملتے ہیں مگر عقل اور اسلام میں تطبیق، روح کے وجود، جبر و اختیار اور معجزات کے موضوع پر سرسید کے افکار کو ہدف اعتراض بننے سے کوئی نہیں بچا سکتا۔

جس باب میں سرسید کے تصور تعلیم سے بحث کی گئی ہے وہ نسبتاً زیادہ وقیع باب ہے۔ اس میں ذریعۂ تعلیم کے بارے میں مادری زبان کا استعمال اور پھر بعد میں انگریزی کو مناسب ذریعۂ تعلیم خیال کرنے پر سرسید کی نظریاتی تبدیلی کے منطقی اسباب و علل بتلائے گئے ہیں۔ تعلیم نسواں کے سلسلہ میں سرسید کے اس خیال کو کہ پہلے مردوں کی تعلیم ضروری ہے اور جب مرد تعلیم یافتہ ہوں تو وہ خود خواتین کی تعلیم کا انتظام کر لیں گے، علی گڑھ میں شیخ عبداللہ کے ذریعہ نسواں کالج کے قیام کے ذریعہ مستحکم کیا گیا ہے —— ان کے علاوہ جدید تعلیم سے مسلمانوں کی بیزاری، راجا رام موہن رائے کی تحریک اور محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کے قیام جیسے موضوعات پر تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے۔

کتاب کے آخر میں دو ابواب سرسید کے نظریۂ شعر و ادب اور ان کے اسلوب نگارش سے متعلق ہیں۔ اول الذکر میں سرسید کے ادبی نظریات کا جائزہ لیا گیا ہے اور حالی کے مقدمہ کو سرسید کے فیض صحبت کا نتیجہ بتلایا گیا ہے اور نیچرل شاعری کی تحریک، اردو کی مروجہ لفظیات میں انگریزی الفاظ کے اضافے اور اسلوب کے موضوع پر ان کے خیالات کو سرسید کی ادبی خدمات میں شمار کیا گیا ہے۔

اسلوب نگارش پر اظہار خیال کرتے ہوئے ڈاکٹر نورالحسن نقوی نے غالب اور سرسید کی نثر کا موازنہ کرنے کی کوشش کی ہے جو تنقیدی یا تحقیقی معروضیت کو شخصیت پرستی کی بھینٹ چڑھانے کے

مترادف ہے۔ سرسید کے مضامین میں متروک الفاظ کے استعمال اور بے لچک مسلوں جیسے مزاج
عکاسی کرنے والی قطعیت پسند نثر کو غالب کے خطوط کے ہم پلہ قرار دینا بہرحال انصاف قرار نہیں دیا
مجھے سرسید کی نثر کا سب سے بڑا کمال یہ دکھائی دیتا ہے کہ اس نثر سے اردو نثر کی جمالیات میں ایک گ
تبدیلی کا سراغ ملتا ہے اور سرسید کی نثر کے ذریعہ پہلی بار اردو نثر کو علمی نثر سے شناسائی ہوتی ہے۔
اس کتاب کے آغاز میں پروفیسر خلیق احمد نظامی کا ایک جامع مقدمہ شامل ہے جو نہ صرف
سرسیدیات سے نظامی صاحب کے شغف اور دلچسپی کا پتہ دیتا ہے بلکہ اس کتاب کے وقار میں بھی اض
کرتا ہے۔ کتاب کی طباعت اور گٹ اپ کا معیار ایجوکیشنل بک ہاؤس کے شایان شان ہے۔

ـــــــ ابوالکلام قاسمی

جرنل (شمارہ ۱ تا ۴) ● خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ ● قیمت
فی شمارہ ۱۵ روپے۔

بڑی لائبریریاں بالخصوص مغربی ممالک کی لائبریریوں کی جانب سے ایسے کتابچے اور رس
کی اشاعت کا چلن عام ہے جن کے ذریعہ متعلقہ لائبریری کے بارے میں ضروری معلومات فراہم ہوتی
اور نادر کتب اور مخطوطات کی تفصیلات تک رسائی آسان ہو۔ ہندوستان کی اہم لائبریریوں میں اس
کے حسن انتظام کی مثالیں "خدابخش اورینٹل لائبریری" پٹنہ اور "رضا لائبریری" رامپور ہے اور بدانتظا
عدم توجہی اور لاپرواہی کی بڑی مثال علی گڑھ کی مولانا آزاد لائبریری ہے۔

ڈاکٹر عابد رضا خاں بیدار نے جب سے خدابخش اورینٹل لائبریری کے ڈائرکٹر کی ذمہ دا
سنبھالی اس لائبریری کے وقار میں اس اعتبار سے غیر معمولی اضافہ ہوا ہے کہ ان کی توجہ کے سبب ہند
کی کسی لائبریری سے اس انداز کا جرنل پہلی بار منظر عام پر آیا ہے جس میں شامل مضامین عام ادبی و علم
کی تعمیم پسندی سے الگ متعلق لائبریری کے مخطوطات اور نادر کتب پر مبنی مضامین کی اشاعت کی جا
اور لائبریری کو بڑے پیمانے پر متعارف کرایا جائے۔

"خدابخش لائبریری" جرنل میں انگریزی، فارسی اور اردو میں ایسے مضامین بھی شامل
جو یا تو لائبریری کے بانی کی زندگی اور ان کے علمی مشاغل پر روشنی ڈالتے ہیں یا کسی نہ کسی طرح لائبر
کی روایت اور موجودہ حیثیت کی عکاسی کرتے ہیں۔ لائبریری کے ڈائرکٹر نے اپنی آمد کے بعد سے "
بخش اردو لکچر" کا ایک سلسلہ شروع کیا تھا، اس سلسلہ کے بعض بہت اہم اور وقیع مضامین بھی اس ج
کے چاروں شماروں میں شامل ہیں۔ اس سلسلہ کے مضامین میں ڈاکٹر نذیر احمد کے تین مضامین اور کلیم
احمد کا مضمون بلاشبہ کسی بھی رسالہ کے معیار اور وقار کی ضمانت بن سکتے ہیں۔ کلیم الدین احمد کا مضمون
تنقید ــ ایک بازدید، مضمون نگار کے بارے میں پیدا شدہ بہت سی غلط فہمیوں اور بدگمانیوں کا از
کرتا ہے۔ اس مضمون میں کلیم الدین احمد نے اپنی تنقید پر بہت ہی سلجھے ہوئے انداز میں گفتگو کی ہے ا
خصوصیت سے مختلف فیہ مسائل کی وضاحت کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں

کلیم الدین احمد گالزوردی کے حوالے سے بزعم خود اس تنقید کے لالٹین بردار ہیں جو حسن و قبح کو روشنی میں لاتی ہے اور کھرے یا کھوٹے کی شناخت کرتی ہے۔ مگر نظری سطح پر گذشتہ چالیس سالوں سے اس دعویٰ کے باوجود اپنے آپ کو ایک بار بھی معروضی فاصلے سے نہیں دیکھ پائے ہیں۔

جرنل کے ان چاروں شماروں کے مشمولات کا احاطہ کرنا یا ان کی صحیح قدر و قیمت کا تعین ان چند سطور میں ممکن نہیں، اتنا کہنا کافی ہے کہ یہ سارے شمارے اپنے معیار کے اعتبار سے اس رسالے کو ہند و پاک کے صف اول کے جرائد میں نمایاں جگہ دینے کے لئے کافی ہیں ــــ مجموعی طور پر جناب قاضی عبدالودود اور مختار الدین آرزو کے مضامین تحقیق و تدوین کا عمدہ معیار پیش کرتے ہیں۔ دوسرے اور تیسرے شمارے کی زیادہ تر تحریریں قاضی صاحب کے مضامین پر مشتمل ہیں۔ اس رسالہ کی مجلس ادارت میں قاضی عبدالودود، سید حسن عسکری، فیاض الدین حیدر اور عابد رضا خاں بیدار کے نام صرف رسمی نہیں معلوم ہوتے۔ ان بڑے ناموں کی عزت سے رسالہ کا معیار ہم آہنگ نظر آتا ہے۔ اس سلسلے میں بیدار صاحب کی محنت و جانفشانی سب سے زیادہ قابل تحسین ہے۔ چاروں کی ضخامت دو سو سے چار سو صفحات کے درمیان ہے۔

ــــ دردانہ کلام قاسمی

مشرقی معیار نقد • غضنفر علی غضنفر • عشام پبلشرس، ۶ ایس ایس ایسٹ، علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ • ساڑھے پانچ روپے۔

مشرقی معیار نقد ایک ابھرتے ہوئے نوجوان ادیب اور شاعر کے رشحات قلم کا نتیجہ ہے غضنفر علی نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز چند سال پہلے شاعری سے کیا تھا اور اب جب کہ مشرقی تنقید کے ادق اور تقریباً ان چھوئے موضوع پر ان کی یہ مختصر سی کتاب منظر عام پر آئی ہے تو ہم ان کی تحقیقی اور تنقیدی کاوشوں کے اعتراف کے لئے خود کو مجبور پاتے ہیں۔ مشرقی تنقید کا سارا سرمایہ عربی اور فارسی کی کتب میں بکھرا پڑا ہے اور بیک وقت ان دونوں زبانوں پر دسترس نہ ہونے کے سبب اردو کے نقاد عموماً اس موضوع پر اظہار خیال کرنا آسان نہیں سمجھتے۔ شبلی، حالی، امداد امام اثر اور مولوی عبدالرحمٰن کے وسیلے سے جو مشرقی اصول نقد ہمارے سامنے آتے ہیں وہ بہت ناکافی ہیں۔ حالی اور مولوی عبدالرحمٰن نے ابن قتیبہ، قدامہ ابن جعفر، ابن خلدون، ابن رشیق، امیر عنصر المعالی، نظامی عروضی سمرقندی کے اقوال نقل کرکے ان کا انطباق اردو ادب پر کرنے کی کوشش کی ہے جب کہ شبلی نے بعض بنیادی مسائل اور معیارات کا ذکر بغیر کسی حوالہ کے اس طرح کیا ہے کہ ان کی پیش کردہ تعریفیں خود اردو تنقید کے مبادیات نظر آتی ہیں۔ ڈیڑھ دو سال قبل ماہنامہ "زبان و ادب" میں غضنفر علی غضنفر کا ایک مضمون "قدیم مشرقی تنقید اور اردو تذکرے" کے عنوان سے شایع ہو چکا ہے۔ کتاب اس مضمون کی توسیع معلوم ہوتی ہے البتہ تنقید کی قدیم مصطلحات کی تعریف اور بعض ہم عصر شعراء کے اشعار کی پرکھ کا اضافہ ضرور کیا گیا ہے۔

غضنفر علی غضنفر نے اپنی کتاب میں زیادہ تر ثانوی حوالوں سے کام لیا ہے اور ثانوی حوالوں کے

مترادف ہے۔ سرسید کے مضامین میں متروک الفاظ کے استعمال اور بے لچک مسلوب جیسے مزاج کی عکاسی کرنے والی قطعیت پسند نثر کو غالب کے خطوط کے ہم پلہ قرار دینا بہر حال انصاف قرار نہیں دیا جا سکتا۔ مجھے سرسید کی نثر کا سب سے بڑا کمال یہ دکھائی دیتا ہے کہ اس نثر سے اردو نثر کی جمالیات میں ایک گرانقدر تبدیلی کا سراغ ملتا ہے اور سرسید کی نثر کے ذریعہ پہلی بار اردو نثر کو علمی نثر سے شناسائی ہوتی ہے۔

اس کتاب کے آغاز میں پروفیسر خلیق احمد نظامی کا ایک جامع مقدمہ شامل ہے جو نہ صرف یہ کہ سرسیدیات سے نظامی صاحب کے شغف اور دلچسپی کا پتہ دیتا ہے بلکہ اس کتاب کے وقار میں بھی اضافہ کرتا ہے۔ کتاب کی طباعت اور گٹ اپ کا معیار ایجوکیشنل بک ہاؤس کے شایان شان ہے۔

ـــــــ ابوالکلام قاسمی

جرنل (شمارہ ۱ تا ۴) ● خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ ● قیمت فی شمارہ ۱۵ روپے۔

بڑی لائبریریوں بالخصوص مغربی ممالک کی لائبریریوں کی جانب سے ایسے کتابچے اور رسائل کی اشاعت کا چلن عام ہے جن کے ذریعہ متعلقہ لائبریری کے بارے میں ضروری معلومات فراہم ہو سکے۔ اور نادر کتب اور مخطوطات کی تفصیلات تک رسائی آسان ہو۔ ہندوستان کی اہم لائبریریوں میں اس طرح کے حسن انتظام کی مثالیں "خدا بخش اورینٹل لائبریری" پٹنہ اور "رضا لائبریری" رامپور ہے اور بد انتظامی، عدم توجہی اور لاپرواہی کی بڑی مثال علی گڑھ کی مولانا آزاد لائبریری ہے۔

ڈاکٹر عابد رضا خاں بیدار نے جب سے خدا بخش اورینٹل لائبریری کے ڈائرکٹر کی ذمہ داری سنبھالی اس لائبریری کے وقار میں اس اعتبار سے غیر معمولی اضافہ ہوا ہے کہ ان کی توجہ کے سبب ہندوستان کی کسی لائبریری سے اس انداز کا جرنل پہلی بار منظر عام پر آیا ہے جس میں شامل مضامین عام ادبی و علمی جرائد کی تعمیم پسندی سے الگ متعلق لائبریری کے مخطوطات اور نادر کتب پر مبنی مضامین کی اشاعت کی جائے اور لائبریری کو بڑے پیمانے پر متعارف کرایا جائے۔

"خدا بخش لائبریری" جرنل میں انگریزی، فارسی اور اردو میں ایسے مضامین بھی شامل ہیں جو یا تو لائبریری کے بانی کی زندگی اور ان کے علمی مشاغل پر روشنی ڈالتے ہیں یا کسی نہ کسی طرح لائبریری کی روایت اور موجودہ حیثیت کی عکاسی کرتے ہیں۔ لائبریری کے ڈائرکٹر نے اپنی آمد کے بعد سے "خدا بخش اردو لکچر" کا ایک سلسلہ شروع کیا تھا، اس سلسلہ کے بعض بہت اہم اور وقیع مضامین بھی اس جرنل کے چاروں شماروں میں شامل ہیں۔ اس سلسلہ کے مضامین میں ڈاکٹر نذیر احمد کے تین مضامین اور کلیم الدین احمد کا مضمون بلا شبہ کسی بھی رسالہ کے معیار اور وقار کی ضمانت بن سکتے ہیں۔ کلیم الدین احمد کا مضمون "میری تنقید — ایک بازدید"، مضمون نگار کے بارے میں پیدا شدہ بہت سی غلط فہمیوں اور بدگمانیوں کا ازالہ کرتا ہے۔ اس مضمون میں کلیم الدین احمد نے اپنی تنقید پر بہت ہی سیکھے ہوئے انداز میں گفتگو کی ہے اور خصوصیت سے مختلف فیہ مسائل کی وضاحت کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ

کلیم الدین احمد گالزورذی کے حوالے سے بزعم خود اس تنقید کے لالٹین بردار ہیں جو حسن و قبح کو روشنی میں لاتی ہے اور کھرے یا کھوٹے کی شناخت کرتی ہے۔ مگر نظری سطح پر گذشتہ چالیس سالوں سے اس دعوی کے باوجود اپنے آپ کو ایک بار بھی معروضی فاصلے سے نہیں دیکھ پائے ہیں۔

جرنل کے ان چاروں شماروں کے مشمولات کا احاطہ کرنا یا ان کی صحیح قدر و قیمت کا تعین ان چند سطور میں ممکن نہیں، اتنا کہنا کافی ہے کہ یہ سارے شمارے اپنے معیار کے اعتبار سے اس رسالے کو ہند و پاک کے صف اول کے جرائد میں نمایاں جگہ دینے کے لئے کافی ہیں ـــــ مجموعی طور پر جناب قاضی عبدالودود اور مختارالدین آرزو کے مضامین تحقیق و تدوین کا عمدہ معیار پیش کرتے ہیں۔ دوسرے اور تیسرے شمارے کی زیادہ تر تحریریں قاضی صاحب کے مضامین پر مشتمل ہیں۔ اس رسالہ کی مجلس ادارت میں قاضی عبدالودود، سید حسن عسکری، فیاض الدین حیدر اور عابد رضا خاں بیدار کے نام صرف رسمی نہیں معلوم ہوتے۔ ان بڑے ناموں کی عزت سے رسالہ کا معیار ہم آہنگ نظر آتا ہے۔ اس سلسلے میں بیدار صاحب کی محنت و جانفشانی سب سے زیادہ قابل تحسین ہے۔ چاروں کی ضخامت دو سو سے چار سو صفحات کے درمیان ہے۔

ـــــ دردانہ کلام قاسمی

مشرقی معیار نقد • غضنفر علی غضنفر • عشام پبلشرس، ۶ ایس ایس ایسٹ، علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ • ساڑھے پانچ روپے۔

مشرقی معیار نقد ایک ابھرتے ہوئے نوجوان ادیب اور شاعر کے رشحات قلم کا نتیجہ ہے غضنفر علی نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز چند سال پہلے شاعری سے کیا تھا اور اب جب کہ مشرقی تنقید کے ادق اور تقریباً ان چھوئے موضوع پر ان کی یہ مختصر سی کتاب منظر عام پر آئی ہے تو ہم ان کی تحقیقی اور تنقیدی کاوشوں کے اعتراف کے لئے خود کو مجبور پاتے ہیں۔ مشرقی تنقید کا سارا سرمایہ عربی اور فارسی کی کتب میں بکھرا پڑا ہے اور بیک وقت ان دونوں زبانوں پر دسترس نہ ہونے کے سبب اردو کے نقاد عموماً اس موضوع پر اظہار خیال کرنا آسان نہیں سمجھتے۔ شبلی، حالی، امداد امام اثر اور مولوی عبدالرحمٰن کے وسیلے سے جو مشرقی اصول نقد ہمارے سامنے آتے ہیں وہ بہت ناکافی ہیں۔ حالی اور مولوی عبدالرحمٰن نے ابن قتیبہ، قدامہ ابن جعفر، ابن خلدون، ابن رشیق، امیر عنصر المعالی، نظامی عروضی سمرقندی کے اقوال نقل کر کے ان کا انطباق اردو ادب پر کرنے کی کوشش کی ہے جب کہ شبلی نے بعض بنیادی مسائل اور معیارات کا ذکر بغیر کسی حوالہ کے اس طرح کیا ہے کہ ان کی پیش کردہ تعریفیں خود اردو تنقید کے مبادیات نظر آتی ہیں۔ ڈیڑھ دو سال قبل ماہنامہ "زبان و ادب" میں غضنفر علی غضنفر کا ایک مضمون "قدیم مشرقی تنقید اور اردو تذکرے" کے عنوان سے شائع ہو چکا ہے۔ کتاب اس مضمون کی توسیع معلوم ہوتی ہے البتہ تنقید کی قدیم مصطلحات کی تعریف اور بعض ہم عصر شعراء کے اشعار کی پرکھ کا اضافہ ضرور کیا گیا ہے۔

غضنفر علی غضنفر نے اپنی کتاب میں زیادہ تر ثانوی حوالوں سے کام لیا ہے اور ثانوی حوالوں کے

نتیجہ میں جو قباحتیں اور لغزشیں لازم آتی ہیں وہ سب اس کتاب میں موجود ہیں۔ غضنفر علی نے اپنی کتاب کا زیادہ انحصار عبادت بریلوی کی کتاب "اردو تنقید کا ارتقا" پر رکھا ہے ـــــ اس کتاب کو مشرقی تنقید کی بوطیقا کا درجہ دینے کے ساتھ اس کتاب میں اردو تنقید کی تاریخ، شعرالعجم، مراۃ الشعر اور مقدمہ شعر و شاعری سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔ ویسے تو ان کتب کے علاوہ "کتابیات" میں ایک لمبی فہرست بھی ملتی ہے جن تک اگر مصنف کی رسائی ہوتی تو شاید اس کتاب کی تنقیدی قدر و قیمت کچھ اور ہوتی۔

"مشرقی معیار نقد" میں جہاں عربی اور فارسی تنقید کے چند بنیادی عناصر کی نشاندہی کی گئی ہے وہیں اردو شعرا کے تذکرے اور ابتدائی زمانے کے اردو شعرا کے کلام میں بھی بعض نظریہ ہائے شعر کی طرف بھی اشارے کئے گئے ہیں ـــــ اخیر میں مشرقی تنقید میں استعمال ہونے والی تنقیدی اصطلاحات اور بدیع و بیان سے متعلق لفظیات کی تشریح اور تعریف کے ذریعے انھیں سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔

مجموعی طور پر یہ کتابچہ غضنفر علی غضنفر کی محنت و کاوش کا ایسا نتیجہ ہے جس سے ہر حال میں پذیرائی ملنی چاہئے۔ کہ اس نا پختہ عمر میں ایسے سنجیدہ موضوعات پر لکھنے کی توفیق بہت کم ہی لوگوں کو ہوتی ہے۔

ـــــ دردانہ کلام قاسمی

ناول کا فن ● مصنف: ای۔ ایم۔ فارسٹر، مترجم: ابوالکلام قاسمی ● ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ ● قیمت ۱۵ روپے

ابوالکلام قاسمی سے میرا پہلا تعارف نوجوان ابھرتے ہوئے شاعر و افسانہ نگار کی حیثیت سے ہوا، اس کے ایک دو سال بعد ہی وہ مدیر اور تنقید نگار کی حیثیت سے سامنے آئے اور اب اپنی تیسری صلاحیت کی جلوہ نمائی انھوں نے مترجم کی حیثیت سے کی ہے۔

ای۔ ایم۔ فورسٹر کی کتاب ASPECTS OF NOVEL ہمارے ملک میں خاص طور سے بے حد مقبول ہوئی ہے، کیوں کہ مصنف سے ہمارا غیر معمولی جذباتی لگاؤ اسی طرح ہے جس طرح فورسٹر کو ہمارے خطۂ زمین سے وابستگی ہے۔ اس کے علی الرغم کتاب خود بھی بہت سادہ اور واضح انداز میں لکھی گئی ہے کیوں کہ یہ ان کی عالمانہ تقاریر کا مجموعہ ہے۔ کتاب کے نفس مضمون سے بحث کرنے کی چنداں ضرورت نہیں ہے کیوں کہ اس کے محاسن و معائب سے سب ہی لوگ آگاہ ہیں اور یہاں پیش نظر صرف ترجمہ ہے۔

قاسمی نے پوری کتاب کا ترجمہ نہیں کیا ہے مثلاً پہلے باب کے بارے میں وہ لکھتے ہیں: "اس باب کا آخری حصہ والٹر اسکاٹ کی "انٹی کوئری" کی تلخیص اور اس کا جزوی تجزیہ ہے۔ میں نے اس حصہ کو ترجمہ میں شامل نہیں کیا ہے کہ یہ تلخیص صفحات کے غیر ضروری اضافہ کا سبب بن رہی تھی"۔ اسی طرح اپنے مقدمہ کے آخر میں وہ لکھتے ہیں: "اس میں جگہ جگہ غیر ضروری چیزیں حذف کر دی گئی ہیں اور ان جملہ ہائے معترضہ کو بریکٹ میں لکھا گیا ہے جو اصل کتاب میں مسلسل عبارت کا حصہ ہیں"۔ اعتراف میں راست گوئی کو انھوں نے اس حد تک اختیار کیا ہے "پیٹرن، آہنگ، فنتاسی اور پروفیسی کے مباحث قدرے دقیق ہیں۔ میں باوجود کوشش کے انھیں بہت زیادہ عام فہم نہ بنا سکا"۔ گویا انھوں نے اس ترجمے کے سلسلہ میں بلند بانگ دعوے نہیں کئے ہیں اس کا ایک بڑا فائدہ یہ ہوا ہے کہ

قاری کھلے دل کے ساتھ بغیر کسی مرعوبیت کے ان کے ترجمہ کو پڑھ سکتا ہے اور مستفید ہو سکتا ہے، حالانکہ میں سمجھتا ہوں کہ یہ قاسمی کا انکسار ہے، ورنہ اس درمیان دو ایک ترجمے جو بڑے دم دعوے کے ساتھ پیش کئے گئے ہیں ان سے جو مایوسی ہوئی ہے اس کا ازالہ "ناول کا فن" سے بڑی حد تک ہو جاتا ہے۔

ترجمہ کی بہت سی خوبیاں بیان کی جاتی ہیں مثلاً اصل متن سے وفاداری، مصنف کے اسلوب وغیرہ کا احترام، عبارت کی روانی کا برقرار رکھنا وغیرہ لیکن سب سے اہم بات میرے نزدیک صرف یہی نہیں ہے کہ ہم غیر زبان کی لغات سے وافر آگاہی رکھتے ہوں بلکہ یہ ہے کہ ہم اپنی زبان کے مزاج داں بھی ہوں تاکہ ہمارا قاری مطالعہ کے وقت قدم قدم پہ یہ محسوس نہ کرے کہ وہ "طامی اردو" پڑھ رہا ہے۔ بھونڈی، بھدی اور ناقص زبان میں ترجمہ خواہ کتنا ہی "مطابق اصل" ہو تمسخر آمیز ہی نہیں ذہن و ذوق پر گراں بھی گزرتا ہے۔ ایسے ترجمے پڑھ کر مجھے زمینداری کے زمانہ کی "منشیانہ زبان" کا مزہ آجاتا ہے۔ آپ کی تفنن طبع کے لئے نمونہ حاضر ہے: "باغ گمسپلا بہ آراضی پنج بگھہ حامل مبلغ سترہ پیڑان اور اس سے متصل مسمی کے چار کھیتان ... الخ۔ ہمیں خوشی ہے کہ قاسمی اس قبیل کی زبان سے متعارف نہیں ہیں اور انھوں نے اپنا ترجمہ اردو ہی میں کیا ہے۔

ناول جس قدر پر تجسس اور پر تحیر ہوتا ہے اتنی ہی رواں شگفتہ اور پر کیف زبان میں اُس پر تنقید کی کتاب کا قاسمی نے اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ میں ثبوت کے طور پر دو جملے پیش کرتا ہوں: "اور سبھی خواب و خیال کی دنیا میں رہنے والے فن کار اور عاشق زمان کے جبر سے جزوی طور پر آزاد ہیں۔ زمان انھیں ہلاک کر سکتا ہے لیکن ان کی توجہ کو مرکوز نہیں کر سکتا، اور جب قیامت کا دن اپنی پوری قوت کے ساتھ فنا کے گھنٹے پر ضرب لگائے گا تو ممکن ہے کہ اس وقت بھی یہ لوگ کسی اور جانب متوجہ ہوں۔ ایک اور اقتباس ملاحظہ ہو: "میریڈیتھ کے ناولوں کا پلاٹ المیہ یا طربیہ کی دیوی کا مندر نہیں ہے بلکہ وہ کیوسکس کے اس سلسلے سے مماثل ہے جو لکڑی کے ڈھلوانوں پر کمال ہنرمندی سے سجا دیئے گئے ہوں جس پر اس کے کردار اپنی صلاحیتوں کے بل بوتے پر چڑھتے ہیں اور وہاں سے ایک بدلی ہوئی شکل لے کر ابھرتے ہیں۔" یہ عبارتیں ہمیں بڑی مانوس معلوم ہوتی ہیں کیوں کہ ان کی ساخت ہماری اپنی زبان کی ہے۔ یہ ترجمہ کا بہت بڑا وصف ہے۔ اس کا اعتراف کیا جانا چاہیے۔

قاسمی نے نامانوس اور بھاری بھرکم الفاظ سے احتراز کر کے عام فہم الفاظ اور مروج تراکیب کو استعمال کیا ہے۔ وہ اس گر سے بھی آگاہ ہیں کہ انگریزی جملوں اور اردو جملوں کی ساخت میں بنیادی فرق ہے اس لیے ترجمہ کا مطلب صرف ترجمہ نہیں بلکہ جملہ کی ساخت کی تقلیب بھی ہے۔ ایک امر اور جس نے مجھے خاصا متاثر کیا وہ یہ ہے کہ بعض جدید PHONY نقادوں کی طرح انھوں نے غلط اردو کو مستند بنانے کی کوشش نہیں کی ہے بلکہ اس کے برخلاف اپنی زبان کے تقاضوں کا احترام کیا ہے۔ قاسمی نے بعض مقامات پر ترجمہ میں چوک بھی کی ہے۔ بعض جملوں کا ترجمہ ڈھیلا ڈھالا بھی ہو گیا ہے۔ ان کوتاہیوں کو میں نظر انداز کرتا ہوں کیوں کہ خود قاسمی نے کوئی بڑا دعویٰ نہیں کیا۔ علاوہ ازیں یہ ان کا پہلا ترجمہ ہے۔ جب پہلے ہی مرحلہ پر انھوں نے بہت سی توقعات دلا دی ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ اپنی غیر اہم فروگذاشتوں کو خود ہی دور نہ کرلیں۔

"ناول کا فن" صرف اردو کے عام قاری اور طلبہ کے لئے ہی ایک معیاری اور مخلصانہ پیش کش نہیں ہے بلکہ آج کل کے پیشہ ور "ترجمہ سازوں" کے لئے مثال اور نمونہ بھی ہے۔

——— ابن فرید

قدرشناسی ● عتیق اللہ ● ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ ● قیمت ۲۰ روپے

انتشار و بحران کے دور کی جدید نسل نے تنقید کو جھنجھلاہٹ اور کلبیت کے اظہار کا وسیلہ بنا دیا تھا۔ بصیرت اور بصارت دونوں کا توازن نفی کی بار در سے دھواں دھواں اڑ رہا تھا۔ دیکھنے، سوچنے اور سمجھنے کے لئے کوئی آمادہ نہیں تھا۔ ٹٹول ٹٹول کر ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑنے کی کوشش کرنا ہی اصل مقصود رہتا تھا۔ ناکامیوں کی اس نسل کے بطن سے جو نسل پیدا ہوئی ہے وہ اپنی دہشتوں کا ادراک خود کرنے کا اعتماد رکھتی ہے۔ یہ نسل بے ہوشیوں کو ترک کرنے کی صلاحیت اور اپنے مثبت معیارات متعین کرنے کا شعور رکھتی ہے۔ عتیق اللہ نے مصحف اقبال توصیفی کے بارے میں لکھا ہے: "مصحف اقبال توصیفی نے ابتداءً جیومیٹریکل اشکال کے ذریعہ اپنی نظموں کو پیچیدہ تر (پیچیدہ تر۔ اصل لفظ پیچ ہے) بنانے کی جس کوشش کو روا رکھا بعد ازاں اس کوشش کو ترک کرکے نظم کو اپنی زندگی جینے اور اپنی دریافت آپ کرنے کی آزادیاں بھی فراہم کیں۔" اپنی زندگی جینے اور اپنی دریافت آپ کرنے کی آزادیاں جدید تر نسل کا امتیازی وصف ہے۔ اسی وجہ سے اس کے فن اور اس کے اظہار میں تازگی اور ندرت ہے جو ہمیں فوراً متوجہ کرلیتی ہے۔ یہ نسل ان عصبیتوں سے بھی بالاتر ہے جو بعض سیاسی یا ذاتی مصلحتوں کی بنا پر روا رکھی جاتی ہیں۔ عتیق اللہ اسی جدید تر نسل کے ابھرتے ہوئے نقاد ہیں۔

"قدرشناسی" ان کے چھ تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے۔ شروع میں ایک مختصر سا چند سطری دیباچہ "معروض" کے عنوان سے ہے جس میں انھوں نے تصریح کی ہے کہ وہ بنیادی طور پر نقاد نہیں ہیں لیکن اس کے ساتھ انھوں نے اپنے اس نظریہ کا بھی اعلان کردیا ہے کہ "تنقید ضرورت ہے" اس سے ہم یہ نتیجہ بھی اخذ کرسکتے ہیں کہ تنقید فن پارہ کو پرکھنے کا فن ہے، یہ خود تخلیقی ادب کی صف میں کھڑی ہونے کی مجاز نہیں۔

عتیق اللہ نے عام طور سے زبان اور ساختی صفات کی طرف زیادہ توجہ دی ہے اس طرح انھوں نے اپنی تنقید کے لئے ایک نئی جہت تلاش کرلی ہے۔ ان کے مضامین میں ایک مضمون "ترقی پسند شعری روایت" کے عنوان سے بھی ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ نقاد کے اس منصب سے اچھی طرح آگاہ ہیں کہ اسے ادب کی پرکھ کے لئے غیر جانب دار ہونا چاہئے۔ اس مضمون کے علاوہ ن۔ م۔ راشد اور اردو افسانہ پر دو مضامین پرمغز اور معیاری ہیں۔ باقی تین مضامین شاید ضرورت کے تحت ہی لکھے گئے ہیں لیکن اس کے معنی یہ بھی نہیں ہیں کہ یہ کمزور مضامین ہیں۔

عتیق اللہ کے تنقیدی مضامین کے مجموعہ "قدرشناسی" کے مطالعہ کے بعد سے ان سے توقعات وابستہ ہوگئی ہیں۔ امید ہے کہ وہ اپنا مقام بنانے کے لئے سنجیدگی کے ساتھ کاوش کریں گے۔

——— ابن فرید

سفینۂ غزل ● عروج زیدی ● عرفان زیدی، محلہ کٹرہ کرنیلان، رام پور (یو۔پی) ● قیمت ۱۵ روپے

عروج زیدی اب اپنی شاعری کے اس دور میں داخل ہو چکے ہیں کہ انھیں کلاسیکی مزاج کے اساتذہ میں شمار کرنا ان کا جائز اعتراف ہوگا۔ یہ جملہ میں نہ لکھتا اگر اس بے امانی (INSECURITY) نہ ہوتے کہ ان کے کلام کا مطالعہ سفارش ناموں کے بغیر نہ کیا جائے گا۔ اس استناد و اعتبار کے مقام پر پہنچنے کے باوجود وہ اپنے ہر مجموعۂ کلام میں تین چار مقدمات و تقریظات شامل کرتے ہیں۔ حسبِ معمول اس مجموعۂ غزل کے شروع میں بھی گوپال متل، رشید حسن خاں اور ڈاکٹر احمد سجاد کی سفارشی تحریریں شامل کی گئی ہیں۔ ان تینوں تحریروں میں گوپال متل کا حرفے چند بکواس ہے۔

"سفینۂ غزل" عروج زیدی کی ۱۹۵۴ء سے ۱۹۷۰ء کے دوران کی غزلیات کا انتخاب ہے۔ پہلی غزل "حمد" اور دوسری و تیسری غزلیں "نعت" ہیں۔ اس کے بعد ساری غزلیں "کلام بایار" کی فضا کی حامل ہیں، لیکن یہ حقیقت ہے کہ عروج نے سطحی جذباتی عشق بازی کے بجائے صالح و مثبت اقدارِ حیات کو موضوعِ شعر بنایا ہے۔ کلاسیکی رنگ کے باوجود وہ محض روایتی شاعر نہیں ہیں بلکہ عصری ماحول و مزاج کے نباض بھی ہیں۔ ان کے کلام کا مطالعہ کرتے ہوئے ہمیں یہ احساس تو ضرور ہوتا ہے کہ غزل کے ماضی کے علائم کو وسیلۂ اظہار بنایا گیا ہے لیکن ہمارا اپنا عصر شاعر کی نظر سے اوجھل نہیں ہے۔ انھوں نے فیوڈل علائم کا استعمال اس لئے کیا ہے کہ ان کی نشوونما اسی ماحول میں ہوئی ہے اور وہ ان کی زندگی کے نصفِ اول دور کا ماحولی حیطہ بھی تھا۔ البتہ انھوں نے پیش آمدہ نسل اور آنے والے دور کے لئے اپنے مشاہدات و تاثرات کے لئے راہ روشن رکھی ہے۔ اسی لئے ہم ان کے کلام سے خود کو بڑی حد تک مانوس پاتے ہیں:

شعورِ تنہا روی ہے مجھ کو، ضرورت رہنما نہیں ہے
جہاں جہاں میرے نقشِ پا ہیں وہاں کوئی دوسرا نہیں ہے

جستجو چاہے تو بچ کر بھی گزر سکتی ہے
ہر طرف گردِ سفر ہو، یہ ضروری تو نہیں

نظر، زبان، قلم میرے حق میں سب چپ ہیں
تری خموشی محبت کا رنگ گہرا ہے

احباب کی محفل میں محتاجِ تعارف ہوں
کس موڑ پہ لے آئی تقدیر شناسائی

جو آتی ہے تو یادِ عشرتِ رفتہ ضرور آتے
مگر پرچھائیوں کا ہم کبھی پیچھا نہیں کرتے

اے گردشِ زمانہ کیا مصلحت ہے آخر
لہجہ بدل کے تو نے اکثر مجھے بلایا

کمند ڈال رہا ہوں چاند تاروں پر
مآل کچھ ہو، مگر خواب تو سنہرا ہے

ہر ایک چہرے کے پیچھے ہیں مختلف چہرے
مرے عزیزوں کا چہرا کہاں اکہرا ہے

عصرِ نو میں زہر کو تریاق کہنا فرض ہے
اب ضمیر و ذہن کی بالیدگی اچھی نہیں

"سفینۂ غزل" عروج زیدی کی پختہ کاری اور رہنما حیثیت کا نمائندہ ہے۔ ہمیں امید ہے کہ اب وہ "احباب کی محفل میں محتاجِ تعارف" نہ رہیں گے۔

—— ابنِ فرید

آذری ● مصنف: احمد کسروی تبریزی ● مترجم: کبیر احمد جائسی ● مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی ● قیمت ۱۲ روپے

فارسی کی بہت سی علاقائی بولیاں ہیں جیسے دری، لری، بروجردی وغیرہ۔ انھیں میں ایک آذری بھی ہے جو آذر بائیجان کے علاقے میں مروج ہے۔ موخر الذکر بولی پر ترکی کا غیر معمولی اثر ہے۔ چنانچہ ایرانیوں نے علاقائی عصبیت کی بنا پر اسے انتہائی حد تک نظر انداز کیا بلکہ زبان پارس کے علاوہ انھوں نے مشکل سے ہی کسی علاقائی زبان کو فارسی مانا۔ اس تنگ نظری کی وجہ سے علاقائی زبانوں پر بہت کم کام ہوا۔ آذری کا بھی یہی انجام ہوا۔ ضرورت تھی کہ اس پر لسانی و تاریخ زبان کے زاویہ سے کام ہو۔ اتفاق دیکھئے کہ اس نوعیت سے اگر کسی نے کام کیا تو وہ احمد کسروی تبریزی تھا جو شہنشاہیت کے خلاف جنگ کا ایک سپاہی بھی تھا۔ اس کے بعد دوسرے محققوں نے بھی توجہ دی جو ماہرین لسانیات بھی تھے لیکن کسروی کا مقام ان سے پھر بھی بلند رہا حالانکہ اسے لسانیات اور تاریخ زبان کے علوم سے کوئی علاقہ نہ تھا۔ اس طرح کسروی کی اس تصنیف کا مقام اب بھی استناد کا ہے۔ کبیر احمد جائسی نے اس تصنیف کا بہت ہی معیاری اور خوش صفات ترجمہ کیا ہے۔ شروع میں انھوں نے مقدمۂ مترجم بھی شامل کیا ہے جس سے آذری اور کسروی کے بارے میں وافر معلومات حاصل ہوتی ہیں۔

اردو زبان میں فارسی ادب سے متعلق یہ ترجمہ ایک گراں قدر اضافہ ہے۔

——— ابن فرید

بازدید

● نہ پہلے سے کوئی تعارف نہ تعلق، مگر اس خوشی کو کیا کہیے جو اس دیارِ غیر میں آپ کا ادبی مجلہ "الفاظ" پاکر ہوئی ہے۔ حیران تو آپ بھی ہوں گے کہ دنیا کے اس گوشے میں جسے ماوراء ہی کہیے تو بہتر، آپ کی کوششوں کے، آپ کی کاوشوں کے پرستار موجود ہیں۔ یہ دوماہی الفاظ کا جنوری، فروری ۷۹ء کا شمارہ ہے اور اس کی دستیابی کے لئے میں مقامی انڈین ایمبیسی کا ممنون ہوں۔

ایک مدت دراز کے بعد ہندوستان سے اردو کا کوئی ادبی مجلہ حاصل ہوا ہے۔ کوئی بارہ تیرہ برس قبل جب پاکستان میں ہندوستانی رسائل کی آمد تھی "شب خون" الٰہ آباد اور "کتاب" لکھنؤ وغیرہ مل جاتے تھے۔ پھر تو آپ جانتے حالات کیا سے کیا ہوگئے۔ بعد میں ہم نے بھی تشویش روزگار مول لے لی، وطن چھوڑ دیا تو لکھنا پڑھنا بھی بس واجبی سا رہ گیا۔ مگر اب بھی کوئی خوب صورت تحریر نظر سے گزرے تو ریزہ ریزہ حوصلوں کو جمع کر دیتی ہے۔ یوں پرستش کر بیٹھتی ہے کہ دیر تک ذات کا بابِ طلسمات کھلا رہتا ہے کہتی ہے لکھو کچھ تم بھی۔ مگر ہم تو ان لمحوں کے شاکی ہیں جب ہاتھ میں قلم ہوتا تھا اور دماغ میں اس قدر بے تحاشہ الیکٹرانکس نہ گھستی تھی۔ کہاں روپوش ہوئے وہ، کچھ پتہ نہیں۔

زیرِ نظر شمارے کے تمام حصے، کہانیاں، نظمیں، غزلیں، ریڈیائی تمثیل غرض سبھی انتہائی SELECTIVE ہیں۔ کہانی سے متعلق آپ کی چھیڑی ہوئی بحث میں جناب حسین الحق کی تنقیدی آراء بڑے گھن گرج کے ساتھ ہیں۔ عصری حسیت کے باب میں جہاں وہ "عرفان" سے گذر کر وجدان کی طرف جا رہے تھے، حسن عسکری سے اپنا تقابل کرتے ہوئے اپنی شناخت بھی چھوڑ گئے کہ ابھی تو میں جوان ہوں، یہ بھلا کہ تنقید کم اور کاٹ زیادہ کیوں ہے۔ بعض جگہ سیدھی سچی دل کو لگتی باتیں کہی ہیں تو کیا خوب "کہ ہماری زندگیوں میں کہانی سے زیادہ رول اخبارات کا ہے۔ اخبارات ہی انقلاب لاتے ہیں اور COUNTER REVOLUTION کا سبب بنتے ہیں" ایسی صورت میں "قاری کی شمولیت"، "عرفان"، "وجدان" وغیرہ کا جھنجھٹ کہاں رہ گیا۔ لے دے کے ایک "اظہار" والی بات بچی سو وہی کہانی کار سے کہانی کہلواتی ہے اور اس کا ان کو خود بھی اقرار ہے۔ جناب کلام حیدری کی کہانی "الف۔ لام۔ میم" اسی اظہار کی کوشش ہے اگرچہ بہت سے خوبصورت حصوں میں بعض بڑے بے ڈھب PACHES آگئے ہیں اور ان کی نشان دہی ضروری تھی اس لئے جو ہماری حقیر رائے تھی براہ راست انھیں بھیج دی۔ جناب خورشید الاسلام اور شہریار کی غزلیں کس قیامت کا سماں برپا کر رہی ہیں مت پوچھئے۔ یا پھر صلاح الدین پرویز کی نظم "ایک عورت" کی

اختتامی لائن " دربدر اک گھر پریشاں اور اس پر سر عجیب " امریکی شاعر WALT WHITMAN کے لہجے میں ہے اور ایک ذہین قاری کو LIGHT YEARS کی طرف لے چلتی ہے۔ وھٹمین کے یہاں ایسی بے شمار لائنیں ہیں۔ شمیم حنفی کی ریڈیائی تمثیل "مٹی کا بلاوا" GENERATION GAP کا المیہ ہے۔ مگر ایسے سارے ہی المیے حقیقت کی سرحدوں سے جاگتے ہیں اس لئے اب مذمت کی گنجائش تو رہ نہیں، بس ایک لفظ باقی بچا ہے "سمجھوتہ" —— بخوشی ورنہ بالجبر —— مزاحمت کی دیواریں، کہانی کے قامت سے کچھ زیادہ ہیں اور اسی تکنیک کا نام ہے MELODRAMA ۔

لطف المنان - لوساکا، زمبیا

● نئی کہانی پر بحث آپ نے اچھی نکالی ہے۔ یہ سلسلہ جب تک چلتا ہے اسے جاری رکھنا چاہئے۔ اس سلسلے میں واقعی گہری سنجیدگی سے سوچنے کی ضرورت ہے۔ میں اپنی طرف سے بھی کچھ نام پیش کرتا ہوں۔ اگر پسند فرمائیں تو ان حضرات سے بھی رجوع کریں جو نئی کہانی پر بہتر رائے دے سکیں گے: ڈاکٹر وزیر آغا، شمس الرحمٰن فاروقی، بلراج مین را، نیر مسعود، جوگندر پال، چودھری محمد نعیم، آغا بابر، انور سجاد، انور عظیم، سریندر پرکاش، رشید امجد، شمس الحق عثمانی، یونس اگاسکر —— ان کے علاوہ میرا انتخاب آپ بھی ہیں۔

نئی کہانی ایک وسیع مفہوم رکھتی ہے۔ اسے ایک خاص طرز فکر کے افسانوں میں محدود یا محبوس کر دینا ناانصافی ہے۔ تجریدی، علامتی، تجرباتی، اسلوبیاتی، بیانیہ یا عام سمجھ میں آنے والے اور اینٹی افسانے یہ سب نئی کہانیوں کی شاخیں ہیں۔ افسانہ فن ہے اور فن سے ملنے والا حظ ہی فن کی اصل حقیقت ہے؛ بات سمجھ میں آئے نہ آئے اگر ہمارا ذہن ان نقوش، فقروں یا لکیروں کو قبول کرنے میں تامل نہ کرتا ہو تو فن کا مقصد پورا ہو جاتا ہے۔ فن اصلاح لانے کا ذریعہ ہرگز نہیں ہے؛ ذہنی آسودگی ضرور بخش سکتا ہے؛ اور پھر کوئی ضروری نہیں کہ کسی ایک فن (کہانی/نظم/مصوری/موسیقی/رقص وغیرہ) سے دنیا کا ہر فرد محظوظ ہونے کی پوری صلاحیت رکھتا ہو۔ لہٰذا کسی فن کار پر اس کے کسی فن پارے کے وسیلے سے کیچڑ نہیں اچھالنا چاہئے۔ ہاں ہمیں یہ دیکھنے کا حق ہے کہ اپنے فن سے اس نے کس قدر انصاف کیا ہے؛ اور ہم اس فن پارے پر اپنی رائے بھی ضرور دے سکتے ہیں، لیکن یہ رائے کوئی قطعی رائے نہ ہوگی اسے منوانے کا ہمیں حق نہیں ہے۔ اور ہر ادیب یا فن کی کسی صنف پر لیا بھی کسی قطعی رائے کا ہونا ذرا مشکل ہے۔ اعتراض کا کوئی نہ کوئی پہلو نکل ہی آتا ہے۔ یہاں میں ایک بات کی طرف اشارہ کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ ایک سچا فن کار اپنے فن کے ذریعہ کوئی فرسٹریشن پھیلانے کی کوشش قطعی نہیں کرے گا۔ اگر اس نے ایسا کیا تو اس کا وجود رہ جائے گا لیکن اس کی سچائی مر جائے گی۔ (سچائی مر جانے پر زندہ کیا بچتا ہے؟) بہتر ہوگا اگر نئی کہانی پر ان فن کاروں کے انٹرویوز بھی شایع کئے جائیں۔

محمود یٰسین، کلکتہ

لکھنؤ میں اردو کتابوں کا میلہ
ٹرافی ایجوکیشنل بک ہاؤس نے حاصل کی

اردو کتابوں کے قومی میلہ کا انعقاد ۱۰ سے ۱۷ اپریل ۱۹۸۵ء تک اتر پردیش اردو اکادمی اور نیشنل بک ٹرسٹ (انڈیا) کے باہمی تعاون سے لکھنؤ میں ہوا۔ ہندوستان کی کسی بھی علاقائی زبان کی کتابوں کا یہ پہلا میلہ تھا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ اردو کتابوں کو پھر سے اردو داں طبقے کی زندگی میں عزت و احترام کی جگہ دلوائی جائے اور اردو دوستوں کو تھوڑا بہت اندازہ اس کا بھی ہو کہ پچھلے تیس برس میں تقریباً سبھی علوم و فنون کی کتابیں اردو میں چھپی ہیں، اچھی اور دیدہ زیب چھپی ہیں اور اپنے مرتبے کی حیثیت سے بھی کم نہیں۔

اس میلے کے تین حصے تھے۔ ایک حصہ ۱۹۴۷ء کے بعد چھپنے والی نمایندہ اردو مطبوعات پر مشتمل تھا۔ اس حصے سے اندازہ ہوتا تھا کہ اردو صرف شاعری اور افسانے کی زبان نہیں ہے بلکہ اس میں سائنسی اور سماجی علوم اور بچوں کی کتابوں کی بھی بڑی تعداد موجود ہے۔ دوسرا حصہ اردو ناشرین اور کتب فروشوں کی اسٹالوں پر کی کتابوں سے آباد تھا۔ ان میں نیشنل بک ٹرسٹ (انڈیا) ترقی اردو بورڈ۔ این۔ سی۔ آر۔ ٹی، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ سے لے کر بہار اردو اکادمی اور دوسرے پبلشروں کے کوئی ۳۲ اسٹال لگے تھے اور کتابیں بک رہی تھیں۔ ہر روز رات کو ۸ بجے خریدی ہوئی کتابوں کی رسیدوں کا قرعہ کھولا جاتا تھا اور جیتنے والے خریدار کو انعامی کتابوں کا ایک سیٹ دیا جاتا تھا۔ یہ انعامی کتابیں مختلف پبلشر دیتے تھے۔ اس کے علاوہ اردو پبلشر اور سیلر اپنے خریداروں کو، دیدہ زیب کیلنڈر، ڈائریاں، قلم اور دیگر یادگاری تحفے بھی دے رہے تھے۔ شاید پہلی بار ناشروں اور کتب فروشوں کو اندازہ ہو رہا تھا کہ صرف اپنے خریداروں کے حلقے تک محدود رہنا کافی نہیں ہے بلکہ اشتہار اور اشاعت بھی ضروری ہے اور اس سے نئے خریدار بنائے جا سکتے ہیں اور نئے حلقوں تک پہنچا جا سکتا ہے۔

تیسرا حصہ ادبی اور تہذیبی نشستوں پر مشتمل تھا۔ ہر روز کوئی نہ کوئی تقریب تھی۔ ایک دن ادبی رسائل کی کانفرنس تو دوسرے دن اردو کے ناشروں اور کتب فروشوں کا اجتماع۔ ان دونوں اجتماعات میں کل ہند انجمنیں قائم ہوئیں اور ادبی رسالوں کے مدیران اور ناشران کرام کو احساس ہوا کہ اجتماعی ڈھنگ سے تنظیم کے ذریعہ زیادہ فائدے حاصل کئے جا سکتے ہیں اور اب وقت آگیا ہے کہ تجارت کے نئے ڈھنگ اختیار کئے جائیں۔

اتر پردیش اردو اکیڈمی نے اشاعتی اداروں کی کتابوں کی اشاعت و طباعت کے معیار اور اسٹالوں کی زیب و زینت کے لئے ایک ٹرافی بھی رکھی تھی۔ ایجوکیشنل بک ہاؤس کو اس کتابی میلے میں یہ امتیاز حاصل ہوا کہ اس ادارہ کو ججوں نے تمام اشاعتی اداروں کے درمیان سب سے بڑا درجہ دیا اور ٹرافی کا مستحق قرار دیا۔ واضح رہے کہ گذشتہ سال بھی اردو اکیڈمی نے ایجوکیشنل بک ہاؤس کو کتابوں کی معیاری طباعت کا ڈیڑھ ہزار روپیہ کا پہلا انعام دینا منظور کیا تھا۔ اس موقعہ پر منعقدہ ایڈیٹرس کانفرنس میں "الفاظ" کے ایڈیٹر ابوالکلام قاسمی نے اردو رسائل کے ادبی معیار کے مسئلے پر ایک اہم اور مبسوط مضمون پڑھا اور پبلشرز کی کانفرنس میں ایجوکیشنل بک ہاؤس کے مالک اسد یار خاں نے نمایاں حصہ لیا۔

عام دلچسپی کے جلسوں میں بیت بازی کا مقابلہ، ادبی سوال و جواب اور شعری نشست کو شامل کیا جا سکتا ہے۔ ان جلسوں میں ہزاروں کا مجمع تھا جو دیر تک دلچسپی سے ان محفلوں میں شریک رہتا تھا۔

سب سے زیادہ تعجب کی بات یہ تھی کہ میلہ صرف میلہ ہی نہیں تھا بازار بھی تھا۔ کتابوں کی خریداری ہوئی، رسالے بکے حتیٰ کہ اتر پردیش اردو اکیڈمی کے خبرنامے کا روزانہ ضمیمہ بھی نکلا اور توقع سے کہیں زیادہ بکا۔ گو مہینے کی آخری تاریخیں تھیں۔ کالجوں اور اسکولوں میں امتحان کا موسم تھا، گرمی سے لکھنؤ بے حال تھا مگر اس کے باوجود اردو کتابوں کے قومی میلے میں شائقین کی بھیڑ لگی ہوتی تھی۔

اب میلے نے اردو والوں کی بے بسی اور مایوسی کو توڑا۔ ماشاء اللہ کچھ کم تو کیا ہوگا اور یہی اس کا مقصد بھی تھا۔ ہماری زبان ہزار دشواریوں کے باوجود اتنی توانائی آج بھی رکھتی ہے کہ بیزاری کے اندھیروں کو چیر کر زندہ رہ سکے اور یہی اس میلے کا مقصد بھی تھا۔

امید صلاحیتوں کو زندہ رکھتی ہے اور ناامیدی زندگی کو کھیل ڈالتی ہے۔ میلہ امید کی ننھی سی کرن کو جگانے کا کام تھوڑا بہت بھی کر سکا ہو تو چاہیے کہ اس کا کام پورا ہوا۔

جلد ۴ شمارہ ۵،۶

دوماہی

الفاظ

ستمبر، اکتوبر، نومبر، دسمبر ۱۹۷۹ء

فہرست کتب نمبر

ایڈیٹر

اسد یار خاں

زر سالانہ ——— دس روپے
فی کاپی ——— دو روپے

پرنٹر پبلشر ——— اسد یار خاں
مطبوعہ ——— اسرار کریمی پریس الٰہ آباد
کتابت ——— ریاض احمد الٰہ آباد
سرورق ——— انوار انجم

مقام اشاعت:
ایجوکیشنل بک ہاؤس
مسلم یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱

پتہ: دوماہی الفاظ ایجوکیشنل بک ہاؤس
مسلم یونی ورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱ فون نمبر ۳۷۶۸

کیا ہم شدت سے [illegible]
پھر سے اردو داں طبقے کی زندگی میں [illegible]
برس میں تقریباً سبھی علوم و فنون کی کتابیں اردو میں چھپ [illegible]
کم نہیں۔

اس میلے کے تین حصے تھے۔ ایک حصہ ۱۹۰۰ء کے بعد [illegible]
تھا کہ اردو صرف شاعری اور افسانے کی زبان نہیں ہے بلکہ اس میں [illegible]

دوسرا حصہ اردو ناشرین اور کتب فروشوں کی اسٹالوں [illegible]
اردو بورڈ، این۔ سی۔ ای۔ آر۔ ٹی، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ نے [illegible]
لگے تھے اور کتابیں بک رہی تھیں۔ ہر روز رات کو [illegible]
خریدار کو انعامی کتابوں کا ایک کتابوں کا ایک سیٹ دیا جاتا تھا۔ [illegible]
پبلشر اور سیلر اپنے خریداروں کو، دیدہ زیب کیلنڈر، ڈائریاں، قلم اور [illegible]
اور کتب فروشوں کو اندازہ ہو رہا تھا کہ صرف اپنے خریداروں کے [illegible]
بھی ضروری ہے اور اس سے نئے خریدار بنائے جا سکتے ہیں اور [illegible]

تیسرا حصہ ادبی اور تہذیبی نشستوں پر مشتمل تھا۔ ہر روز [illegible]
تو دوسرے دن اردو کے ناشروں اور کتب فروشوں کا اجتماع۔ ان [illegible]
کے مدیران اور ناشران کرام کو احساس ہوا کہ اجتماعی ڈھنگ سے [illegible]
اب وقت آگیا ہے کہ تجارت کے نئے ڈھنگ اختیار کئے جائیں۔

اتر پردیش اردو اکیڈمی نے اشاعتی اداروں کی کتابوں کی اشاعت [illegible]
زینت کے لئے ایک ٹرافی بھی رکھی تھی۔ ایجوکیشنل بک ہاؤس کو اس [illegible]
تمام اشاعتی اداروں کے درمیان سب سے بڑا درجہ دیا اور ٹرافی [illegible]
نے ایجوکیشنل بک ہاؤس کو کتابوں کی معیاری طباعت کا [illegible]
منعقدہ ایڈیٹرس کانفرنس میں "الفاظ" کے ایڈیٹر ابوالکلام [illegible]
اور مبسوط مضمون پڑھا اور پبلشرز کی کانفرنس میں ایجوکیشنل [illegible]

عام دلچسپی کے جلسوں میں بیت بازی کا مقابلہ، ادبی [illegible]
جلسوں میں ہزاروں کا مجمع تھا جو دیر تک دلچسپی سے ان [illegible]

سب سے زیادہ تعجب کی بات یہ تھی کہ شید صرف میلے [illegible]
رسالے بکے حتی کہ اتر پردیش اردو اکیڈمی کے خبرنامے کا روزانہ [illegible]
تاریخیں تھیں۔ کالجوں اور اسکولوں میں امتحان کا موسم تھا۔ گرمی سے
کے قومی میلے میں شائقین کی بھیڑ لگی ہوتی تھی۔

اب میلے نے اردو والوں کی بے بسی اور مایوسی کو توڑ یا شک [illegible]
زبان ہزار دشواریوں کے باوجود اتنی توانائی آج بھی رکھتی ہے کہ بیزاری کے اندھیرے [illegible]
یہی اس میلے کا مقصد بھی تھا۔

امید صلاحیتوں کو زندہ رکھتی ہے اور ناامیدی زندگی کو کھوکھلا کر ڈالتی ہے۔ میلہ امید کی [illegible]
کا کام تھوڑا بہت بھی کر سکا ہو تو جانیے کہ اس کا کام پورا ہوا۔

مدافعت و اقدام

ہریلے کھیتوں کو عبور کر کے پتھریلی وادی میں داخل ہوا کوئی میرے قریب دوڑ کر آیا اور بولا۔
ھارا انتظار کر رہا ہوں۔
رہے تھے ــــــ اسی پتھریلی وادی میں۔ آخر کیوں ؟
کچھ پودوں کے بیج ہیں۔ اور پھر میری ہتھیلی پر کچھ بیج رکھ کر بولا۔ یہ بیج صرف تمہیں دینے

سکتے ہو کہ میں وہی شخص ہوں جس کے متعلق تمہیں بتایا گیا تھا۔ ؟
تو ان زہریلے کھیتوں میں داخل ہونا ہی ناممکن ہے۔ اگر کوئی چلا ان میں داخل ہو
ناممکن ہے۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ کچھ عرصہ بعد ایک شخص ان کھیتوں کو عبور کر کے اسی
سے یہ بیج دیدینا اور وہ شخص تم ہو تمہیں ان بیجوں کو صرف بونا ہی نہیں بلکہ ان کی

اں بویا جائے ؟
میں انھیں کسی زرخیز وادی میں بویا جائے تو بہتر ہوگا۔
ہے ہو کہ ہمارے آباؤ اجداد کی غلطیوں کی وجہ سے زرخیز وادیوں میں خاردار
نے بسیرا کر رکھا ہے۔
؟
دوں اور کھیتوں کے نگہبانوں نے یہ تاثر دے رکھا ہے کہ یہ بیج بیکار

اہیا ہتے ہو ؟
نہیں چاہتا بلکہ ان نگہبانوں کے تاثر کو غلط ثابت کرنے کیلئے کسی

اداریہ

۱۹۷۹ء کا آخری شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ یہ مختصر شمارہ ستمبر تا دسمبر گویا چار مہینوں کا ہے۔

ہم اپنے پڑھنے والوں سے شرمندہ ہیں کہ اس سال "الفاظ" باقاعدگی سے نہ نکل سکا۔ حالات ہی ایسے تھے کہ ہماری کوئی کوشش کام نہ آئی۔ کیسی بدنصیبی کی بات ہے کہ علی گڑھ جو علم و ادب کا گہوارہ اور ایک اہم تعلیمی مرکز ہے اس کا شمار ہمارے ملک کے ان بدنصیب شہروں میں ہوتا ہے جو آئے دن آگ اور خون کی لپیٹ میں آتے رہتے ہیں۔ دو امن دشمن کسی بات پر دست و گریباں ہو جاتے ہیں۔ اگر بدقسمتی سے ان میں سے ایک مسلمان اور دوسرا غیر مسلم ہے تو بات کی بات میں ہر طرف دھواں اٹھنے لگتا ہے۔ کاروبار معطل ہو جاتا ہے تعلیمی ادارے بند ہو جاتے ہیں۔ روز کنواں کھودنے اور پانی پینے والے خواہ ہندو ہوں یا مسلمان بھوکوں مرنے لگتے ہیں۔ اس سال بھی یہی ہوا۔ کتنے معصوم مارے گئے۔ وہ ہندو تھے یا مسلمان اس سے ہمیں کیا لینا۔ یہ سچ ہے کہ سب ہمارے تھے۔ ہماری اس بستی میں بسنے والے۔ ہمارے گلی کوچوں سے روز گزرنے والے۔ اس کے علاوہ مالی نقصان بھی بے حساب ہوا۔

جس علاقے میں الفاظ کا دفتر ہے یہاں ۲۳ دن تک مستقل کرفیو نافذ رہا جس کے اثرات مہینوں تک باقی رہے چنانچہ ایک عرصے یہاں ہو کا عالم رہا۔ ہمیں یقین ہے کہ اس سال کے اختتام اور ان حالات کے خاتمے کے ساتھ معذرتوں کا سلسلہ بھی اگر اللہ نے چاہا تو آج ختم ہو رہا ہے۔ نیا سال ہم اس نئے عزم کے ساتھ شروع کر رہے ہیں کہ اب ہماری پوری توجہ اس پر ہوگی کہ "الفاظ" وقت پر شائع ہو اور آپ کی توقعات پر پورا اترے۔

اس موقعے پر ایک اور بات آپ کے علم میں لانی ضروری ہے کہ "الفاظ" کے سابق مدیر جناب ابوالکلام قاسمی اپنی مصروفیتوں کے باعث اب ادارت کے فرائض انجام نہ دے سکیں گے۔ قاسمی صاحب بڑے فرض شناس ادیب ہیں۔ انھوں نے کئی برس الفاظ کی ترتیب کا کام بڑی توجہ سے انجام دیا اور اسے اس قابل بنایا کہ یہ اعلیٰ ادبی جرائد کی صف میں جگہ پا سکے۔ ادارہ ان کے تعاون کے لئے شکر گزار ہے۔

جنوری سنہ ۸۰ء سے یہ ذمہ داری نئی مجلس ادارت نے سنبھال لی ہے جس میں راقم الحروف کے ساتھ ڈاکٹر نورالحسن نقوی اور ڈاکٹر اطہر پرویز شریک ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ قارئین اور اہل قلم کا تعاون اسی طرح برقرار رہے گا۔

—— اسد یار خاں

الیاس قریشی

مدافعت و اقدام

میں جوں ہی زہریلے کھیتوں کو عبور کر کے پتھریلی وادی میں داخل ہوا کوئی میرے قریب دوڑ کر آیا اور بولا۔

تم آگئے ؟ میں کب سے تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔

میرا انتظار کر رہے تھے ـــــ اسی پتھریلی وادی میں۔ آخر کیوں ؟

میرے پاس کچھ پودوں کے بیج ہیں۔ اور پھر میری ہتھیلی پر کچھ بیج رکھکر بولا۔ یہ بیج صرف تمہیں دینے کے لئے جمع کیا گیا تھا۔

مگر تم یہ کیسے کہہ سکتے ہو کہ میں وہی شخص ہوں جس کے متعلق تمہیں بتایا گیا تھا۔ ؟

وہ اس لئے کہ اوّل تو ان زہریلے کھیتوں میں داخل ہونا ہی ناممکن ہے۔ اگر کوئی چلا ان میں داخل ہو بھی جاتا ہے تو انہیں عبور کرنا ناممکن ہے، مجھے بتایا گیا تھا کہ کچھ عرصہ بعد ایک شخص ان کھیتوں کو عبور کر کے اسی پتھریلی وادی میں آئے گا اسے یہ بیج دیدینا اور وہ شخص تم ہو تمہیں ان بیجوں کو صرف بونا ہی نہیں بلکہ ان کی پرورش بھی کرنی ہے۔

تو ان بیجوں کو کہاں بویا جائے ؟

میرے خیال میں انہیں کسی زرخیز وادی میں بویا جائے تو بہتر ہوگا۔

مگر تم یہ کیوں بھول رہے ہو کہ ہمارے آباؤ اجداد کی غلطیوں کی وجہ سے زرخیز وادیوں میں خاردار پودوں نے اور زہریلے کھیتوں نے بسیرا کر رکھا ہے۔

پھر تم انہیں کہاں بوؤ گے ؟

شاید تمہیں معلوم ہوگا کہ ان پودوں اور کھیتوں کے نگہبانوں نے یہ تاثر دے رکھا ہے کہ یہ بیج بیکار ہو چکے ہیں اور اب ان کا اگنا ناممکن ہے۔

کیا تم اپنے فرض سے منہ موڑنا چاہتے ہو ؟

نہیں میں اپنے فرض سے منہ موڑنا نہیں چاہتا بلکہ ان نگہبانوں کے تاثر کو غلط ثابت کرنے کیلئے کسی

ایسی جگہ انھیں بونا چاہتا ہوں جہاں کسی بھی پودے کا اگنا ناممکن ہے۔

کیا کوئی ایسی جگہ تمہارے ذہن میں ہے؟

ہاں اسی پتھریلی وادی کے آگے جو صحرا ہے میں وہیں انھیں بوؤں گا۔

وہاں انھیں بونا ناممکن ہے

میں اپنے عزم اور حوصلے سے اسے ممکن کر دکھاؤں گا۔

میں نے بھی یہی سوچا تھا مگر ناکام رہا۔

تم نے کوشش کی اور ناکام رہے ——— کیسے؟

میں اس صحرا کے قلب میں بیج بونے کے لئے گیا تھا مگر مجھے فرار ہونا پڑا تھا کیونکہ مختلف رنگ کے سانپوں نے یکبارگی متحد ہو کر مجھ پر بزن بول دیا تھا۔ اور میں اپنے فرض کو بھول کر اپنی جان بچانے کے لئے بھاگ آیا تھا۔

فرض کو بھول کر صرف جان بچانے کے لئے بھاگ آئے تھے اور اب کیا تم خود کو زندوں میں شمار کرتے ہو؟

افسوس میں نے اس موقعہ کو گنوا دیا صرف جان بچانے کے لئے اگر میں نے یہ غلطی نہ کی ہوتی تو آج تم کڑوے الفاظ نہ اگلتے۔

بیتی ہوئی باتوں پر تبصرہ کرنے سے سوائے نقصان کے فائدے کا کوئی امکان نہیں جو ہوا اسے بھول جاؤ۔ اور اب یہ بتاؤ کہ اس مشن میں تم میرا ساتھ دوگے؟

"ہاں میں تمہارا ساتھ دونگا" اب مجھے تمہارے ہمراہ صرف اس مشن کو پورا کرنا ہی نہیں ہے بلکہ اپنے ماتھے پر لگے ہوئے دھبے کو بھی دھونا ہے۔

خیر تمہاری اطلاع کے مطابق وہاں مختلف رنگ کے سانپوں نے بسیرا کر رکھا ہے اور ظاہر ہے کہ تمہارے مشن کو ناکام بنانے کے لئے وہ حملہ کریں گے تو ہم دونوں صرف مدافعت کرتے ہی رہ جائیں گے۔ اور اسکا قوی امکان ہے کہ وہ ہم پر سبقت لے جائیں اور ایک بار پھر یہ مشن کامیاب نہ ہو سکے اس لئے ہمارے پاس کم سے کم ایسا کوئی ہتھیار ضرور ہونا چاہیئے جس کی مدد سے ہم مدافعت کرتے ہوئے بھی اقدامی پوزیشن میں ہوں۔

تم نے ٹھیک کہا بالکل تنہا جا کر میں نے فاش غلطی کی تھی اور اب اس غلطی کو دہرانا پاگل پنے کے مترادف ہوگا۔

اس وادی میں کافی تلاش کے بعد ایک سوکھے ہوئے پیڑ سے دو مضبوط ٹہنیاں توڑ کر ہم دونوں اپنے مشن پر نکل کھڑے ہوئے۔ پتھریلی وادی کو عبور کر کے ہم صحرا میں داخل ہوئے اور جوں ہی ہم دونوں صحرا کے قلب میں پہنچے میرے ساتھی نے فوراً چھوٹے چھوٹے گڑھے کھود کر بیج بونا شروع کر دیا۔ تبھی میرے کان میں سانپوں کی پھنکار کی آواز آئی شاید انھیں ہماری موجودگی کا پتہ لگ چکا ہے اور وہ غم و غصہ میں پھنکاریں مار رہے ہیں ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ سامنے سے مختلف رنگ کے سانپ تیزی سے ہماری جانب بڑھتے ہوئے نظر آئے میرے ساتھی نے ایک دفعہ حملہ کرتے ہوئے سانپوں کو اور مجھے دیکھا پھر بیج بونے میں مصروف ہو گیا۔ میں نے مضبوطی سے اپنے ہاتھوں میں سوکھے ہوئے درخت سے توڑی ہوئی ٹہنی کو پکڑ لیا اور مختلف قسم کے سانپ جوں ہی قریب آئے میرے ہاتھوں میں جکڑی ہوئی ٹہنی بری طرح ان پر گرجنے برسنے لگی ———— اور کچھ ہی دیر بعد میں مدافعت کرتے ہوئے اقدامی پوزیشن میں آ گیا۔ میرا ساتھی اس معرکے سے لاپرواہ مسلسل بیج بوئے جا رہا تھا۔

اور اب سانپ اکا دکا بیشتر ابدل بدل کر حملہ کر رہے تھے اور انھیں ہر بار منہ کی کھانی پڑ رہی تھی ۔۔۔

▯

اکبر حسین اکبر

غزلیں

زمیں الٹ نہ دے طوفان کا جنوں اب کے
لرز رہا ہے ہر اک جسم کا ستوں اب کے
بچے گا ایک بھی قطرہ نہ آرزوؤں کا
نچوڑے گا یوں حالات کا فسوں اب کے
لبوں پہ وقت کے پہرے پڑے ہوئے ہیں مگر
سنا رہی ہے نظر قصہ دروں اب کے
اجالے کرتے رہے ظلمتوں کا قتل سدا
مگر یہ ہونے لگے کیسے سرنگوں اب کے
یوں مصلحت کے دھندلکے میں چھپتی ہے حیات
سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ کیا کروں اب کے
بشر بشر ہے ابھی ساعتوں کے دوزخ میں
نظر نظر کو میسر نہیں سکوں اب کے
خرد نے بانٹ دیا مجھ کو کتنے حصوں میں
سمیٹ لے مجھے شاید مرا جنوں اب کے
لہو کا رنگ بھی تبدیل ہو گیا اکبر
رگوں میں دوڑ رہا ہے سفید خوں اب کے

لمحہ لمحہ لہو کا دلدادہ
زندگی خودکشی پہ آمادہ
ساعتیں جال بن رہی ہیں پھر
کر رہی ہے حیات پھر وعدہ
لڑکھڑانے لگا ہے پائے شوق
سخت دشوار ہے ترا جادہ
میں ہوں شہرِ انا کا باشندہ
میرے حصے میں ہے خودی زیادہ
ساعتوں کی صلیب کی زینت
بن گئی زندگی کی مریادا
ریزہ ریزہ ہے پیکرِ جذبات
ٹوٹتا جا رہا ہے ہر وعدہ
کوئی نقطہ نہ چاہتوں کا ملا
زیست کا تھا ورق ورق سادہ
کتنی بوسیدہ جسم کی دیوار
ہر نفس ٹوٹنے پہ آمادہ

فرحت قادری

تانڈو رقص

جنونِ وقت کا کیوپڈ چلا رہا ہے تیر!
تمام دشت میں
صحرا میں آگ بھڑکی ہے
تمام گاؤں میں
شہروں میں دھول اڑتی ہے!
ہر ایک سمت ہیں عفریت بے نوائی کے
اک التہاب ہے تنہائیوں کا چاروں طرف
اجاڑپن کی چٹانیں ہیں سر اٹھائے ہوئے
اور ان چٹانوں میں نوحہ کناں ہیں سناٹے!
نہ کوئی نغمہ
نہ سازِ وفا
نہ سودائی!
انا کا نام نہیں
ذات کا پیام نہیں!
خلوص و مہر کے آئینہ خانے میں اب تک
وہی کریہہ سا اک تانڈو رقص جاری ہے!

بوجھ آسمان کا

یہ خاکداں ہے کہ سیماب کا کوئی ٹکڑا
ازل سے اس کے مقدر میں بے قراری ہے!

ہزاروں صدیوں نے
اک اک قدم پہ ساتھ دیا
نہ جانے کتنے ہی یگ اس کے ہم سفر بھی بنے
ہزاروں وقت کے اصنام راہ میں آئے!
مگر ازل سے سلگتی زمیں
سلگتی رہی
ہر ایک یگ میں
بڑے کرب سے تڑپتی رہی
کبھی نہ چاند کی ٹھنڈک ہی اس کو راس آئی
نہ تشنگی کبھی شبنم سے بجھ سکی اس کی!
یہ بے قرار تھی پہلے بھی
اب بھی نٹ کھٹ ہے
اگرچہ سینے پہ اس کے ہے آسمان کا بوجھ

وفا براہی

غزلیں

کس نے چھیڑا دیپک راگ
آگ لگی ہے اف ری آگ
کون بجھائے تن کی آگ
من کو ہے جیون سے لاگ
کوئی روئے، کوئی گائے
اپنا اپنا یہ ہے بھاگ
دھیرے دھیرے تن ہو راکھ
آفت ہے جیون کی آگ
مستی میں پھیلائے پھن
جھوم رہا ہے کالا ناگ
بن اگنی کے تن جل جائے
ایسی ہے برہا کی آگ
دھن جن، تن من، ایک اک آس
تجھ بن سب کچھ دیا تیاگ
جیون ہے مرتیو کا روگ
مرتیو ہے جیون کا سہاگ
اک دن ایسا بھی ہوگا
دھرتی سے پھوٹے گی آگ
دنیا ہے یا بیٹھا ہے
کنڈل مارے کالا ناگ
چیخ اٹھیں گے لوگ وفا
جس دن ہم لیں گے بیراگ

گلوں کی بات نہ رنگیں چنار کے قصے
زبان برگ پہ ہیں نوک خار کے قصے
خود اپنی لاش اٹھائے ہے اپنے کاندھے پر
جو لکھ رہا تھا غریب الدیار کے قصے
فقیہہ شہر کو اتنا کوئی بتا دیتا
لئے ہیں دوش پہ ہم بھی خمار کے قصے
بحکم اہلِ طرب آج یہ ہوا اعلان
سنائے اب نہ کوئی سوگوار کے قصے
بھری بہار میں گلشن کو جس نے لوٹا تھا
سنا رہا ہے وہ فصل بہار کے قصے
ابھی جو عارض و گیسو سے بھی نہیں واقف
چلے ہیں لکھنے وہ لیل و نہار کے قصے
فسانۂ غم ہستی کے سننے والے بھی
سکون شب سے سنیں کوہسار کے قصے
جو بے شعور ہیں فرصت انھیں کہاں اے دوست
لب شعور پہ ہیں نور و نار کے قصے
سنائے دشت نوردوں کو اے وفا کوئی
حصول گل کا فسانہ بہار کے قصے

حکیم منظور

غزل

گہرا نیلا رنگوں کا اک برف سمندر، اللہ ہو
چلتی پھرتی آنکھ کا یہ سیمابی منظر، اللہ ہو

اک اٹھتی دیوار کا سایا، ذہن برابر حاوی تھا
اک گہرا بہتا دریا تھا، بدن برابر، اللہ ہو

میں آنے والی رت کا چہرہ، یوں لکھنا چاہوں گا
سر پر جلتا سورج، پاؤں برف کے اندر، اللہ ہو

دنیا[1] سے بے گانی، دنیا والے کی جانی پہچانی
پانی گاگر بنا جب اس کی ٹوٹی گاگر، اللہ ہو

دو قوسوں کی آدھی دنیا، آدھی آنکھ میں پوری ہے
اندر بس انساں ہی انساں، لا ہے باہر، اللہ ہو

موسم تیکھا، گل اندام پرندے گم سم پیڑوں پر
سوچ کی دنیا پر اندر پر، یہ سب بے پر، اللہ ہو

پتھر کے اندر اک شعلہ پتھر کے اوپر کائی سی
رنگوں کی چادر پر رنگوں کی اک چادر، اللہ ہو

زندہ آنکھوں کی تصویریں آویزاں دیواروں پر
بازاروں کی رونق بے مایا سوداگر، اللہ ہو

وہ لمحہ کتنا پاکیزہ، کیسا سندر تھا یعنی جب
دو حصوں میں مٹی دھرتی ہوتی برابر، اللہ ہو

میرا کرب میں سوچوں آخر صحرا کس کا حصہ ہیں
سات زمینوں کا حصہ میں سات سمندر، اللہ ہو

نام اس کا منظور ہے، لیکن بے چہروں کو نا منظور
کام نہایت ٹیڑھا وہ ہے آئینہ گر، اللہ ہو

---

[1] کشمیر کی ایک صوفی شاعرہ اور برگزیدہ روحانی ہستی حضرت للہ عارفہؒ سے متعلق واقعہ کی طرف اشارہ ہے۔

الف احمد برق

لمحوں کی تشخیص

وہ بدقت ہی چل پارہا تھا مگر اس کی چال سے حد درجہ عجلت ظاہر ہو رہی تھی۔ ہوا کے شر پسند جھونکے بار بار اس کے قدموں کو لڑکھڑاتے دے رہے تھے۔ ہر لمحہ مجھ پر یہی احساس غلبہ پا رہا تھا کہ یخ بستہ ہوا کا اگلا جھونکا اسے یا تو منجمد کر دے گا یا زمین بوس کر دے گا اور یہ یقینی بات تھی کہ اگر وہ ایک بار حالات کے آگے سجدہ ریز ہو جائے تو دوبارہ جبینِ نیاز بلند نہ کر سکے گا۔

برائے نام جسم پر جھولتے ہوئے گندے چیتھڑے اس سے دو قدم آگے ہوا کے دوش پر لہراتے ہوئے گویا اس کی راہبری کر رہے تھے۔ پیٹ ریڑھ کی ہڈیوں سے مسلسل بغل گیری میں مشغول تھا۔ بھوک اس کے وجود سے متنفر دکھائی دیتی تھی۔ پیاس اس کے ہونٹوں پر کسی قحط زدہ علاقے کی شکستہ زمین کی صورت ابھر آئی تھی۔ آنکھوں کی جگہ دو گہری کھائیاں تھیں جن میں نہ جانے کتنے تصوراتی پیکر گھٹ گھٹ کر دم توڑ چکے تھے۔

اب اس کی رفتار میں بلا کی تیزی آ گئی تھی۔ اگر میں یونہی سوچتا رہتا تو عین ممکن تھا کہ وہ صرف دو چار لمحوں میں میری نظروں سے اوجھل ہو جائے۔ لہٰذا میں نے ہڑبڑا کر اٹھنے کی کوشش کی۔ اور مجھے اپنے پیروں پر کھڑے ہوتے ہوتے ایک صدی بیت گئی۔

میں بھی بہ دقت چل پا رہا تھا۔ میری چال میں بھی وہی لڑکھڑاہٹ تھی۔ ہوا کے جھونکے میرے قدموں کو بھی متزلزل کر رہے تھے۔ مگر میں بدستور اس کا پیچھا کرتا رہا اور کئی صدیوں بعد اس کے قریب پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔

سنو! میں نے اس کے دامن کے تار کو تھامتے ہوئے کہا۔ اس نے تڑپ کر رخ بدلا۔ دراصل نادانستگی میں میں نے اس کی دکھتی رگ پکڑ لی تھی۔ اس کے چہرے کی اذیت ناکی کچھ اور بڑھ گئی۔ میں نے فوراً اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔

میں صدیوں سے تمھارا پیچھا کر رہا ہوں۔

کیوں؟ اس کے غار نما ذہن سے صرف ایک لفظ رینگ کر باہر نکلا اور چند لمحوں تک آس پاس کی چٹانوں سے درمیان تڑپ کر ساکت ہو گیا۔

میں صرف اتنا جاننا چاہتا ہوں کہ تم اتنی عجلت میں کہاں جارہے ہو؟ میرے اس سوال پر اس کے حلق سے عجیب و غریب آوازیں نکلنے لگیں جو گھٹے گھٹے قہقہے سے مشابہ تھیں۔ غالباً اس کے نزدیک یہ ایک احمقانہ سوال تھا۔

تم کہاں جارہے ہو؟ اس بار میں نے اپنے لہجہ میں کرختگی پیدا کر لی۔ میرے استفسار پر اس نے بہت کوششوں کے بعد تھوڑا سا خون تھوکا اور آگے بڑھ گیا۔

اس کی اس ناشائستہ حرکت پر مجھے بہت طیش آیا۔ میں نے لپک کر اس کی کلائی تھام لی مگر فوراً ہی مجھے کلائی چھوڑنی پڑی کیوں کہ ناگہاں مجھے اپنی رگوں میں خون کے انجماد کا احساس ہوا تھا۔

اب وہ میرے سامنے سر جھکائے کھڑا تھا گویا میرے ہی انتظار میں کھڑا ہو۔ میں نے موقع کو غنیمت جانا اور اپنا سوال دوہرایا۔

کہاں جارہے ہو؟

مرنے!

مرنے ــــــ غیر ارادی طور پر میرے حلق سے ایک پر شور قہقہہ ابل پڑا۔ اب۔ اب کیا زندہ ہو؟

□

تبصرے

(تبصرہ کے لیے ہر کتاب کی دو کاپیاں بھیجنا ضروری ہے۔ دوسری صورت میں ادارہ تبصرہ شایع کرنے سے معذور ہوگا۔ ادارہ)

بزم و رزم فطرت • عبد المجید شمس عظیم آبادی • سائنٹفک پبلشرز، مجید ولا پٹنہ • ۱۲ روپے

یہ پروفیسر عبد المجید شمس کا مجموعہ کلام ہے جس میں ان کی غزلیں نظمیں، مثنویاں اور رباعیات شامل ہیں۔ اس میں علامہ جمیل مظہری، جناب ماہر القادری مرحوم اور جناب عابد رضا بیدار کی آرا بھی شریک ہیں۔ شمس صاحب ہماری زبان کے مقتدر شاعر ہیں۔ آپ کا کلام اردو کے ممتاز ادیبوں سے خراج تحسین حاصل کر چکا ہے۔ زیر نظر مجموعہ موصوف کا تیسرا مجموعہ کلام ہے اور پختگی فن کا ثبوت دیتا ہے۔ آپ نے بھی نظیر کی طرح آدمی نامہ لکھا ہے۔ یہ بھی طنز نگاری کا دلچسپ نمونہ ہے۔ ان کے یہاں نئے مسائل بھی ہیں اور تصوف کی جھلک بھی ملتی ہے ان کے یہاں تغزل کی کارفرمائی بھی ہے۔ تاہم وہ اپنی شخصیت کا بھرپور اظہار اپنی نظموں کے ذریعہ ہی کرتے ہیں۔ انھوں نے عوامی مسائل کو بھی اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے۔ جس سے ان کی انسان دوستی کا پتہ چلتا ہے۔ رباعیات میں ان کی فن کارانہ پختگی اور زیادہ نمایاں ہے۔ ایک رباعی نمونے کے طور پر پیش خدمت ہے۔

مذہب کا نہ لو نام مصلے چھوڑو مندر سے بچو ذکر کلیسا چھوڑو
انساں کو اپنا نہ بنا لو جب تک اللہ کے ملنے کی تمنا چھوڑو

امید ہے کہ "بزم و رزم فطرت" مقبولیت حاصل کرے گا اور بڑے شوق سے پڑھا جائے گا۔

نوائے طالب • طالب رزاقی • اردو اکیڈیمی، آندھرا پردیش، حیدر آباد • ۸ روپے

یہ بھی شاعری کا مجموعہ ہے جو طالب رزاقی مرحوم کے کلام کا انتخاب ہے۔ موصوف اردو کی روایتی شاعری سے بھی ربط رکھتے ہیں اور جدید ادبی تحریکات سے بھی متاثر ہیں۔ ان کی نظمیں ان کے جدید ذہن کی غماز ہیں لیکن ان کی شاعری کے اصلی جوہر غزل میں ہی کھلتے ہیں۔

بے وجہ دل شوق تڑپتا تو نہیں ہے تم بھول گئے ہو کہیں ایسا تو نہیں ہے

ان کی غزلوں میں ایک ہلکی سی کسک ہے جو دل کے تاروں کو جھنجھنا دیتی ہے۔ بقول اختر حسن

صاحب ؒ طالب کی شاعری کے رنگ و پے میں زندگی کے سوز و ساز کی جو لہریں کارفرما ہیں وہی ان کی آواز اور ان کے لہجے میں ایک گہری شاعرانہ دردمندی کی لے بن کر ان کے پڑھنے والوں کو اپنی طرف کھینچتی ہیں۔"

اردو اکیڈیمی حیدرآباد مبارکباد کی مستحق ہے کہ اس نے طالب رزاقی مرحوم کا یہ انتخاب شائع کیا اور وہ کام کیا جو ان کی زندگی میں نہ ہو سکا۔ یہ قابل ستائش ہے کہ اکیڈیمی نے طالبانِ طالب تک ان کا کلام پہنچایا۔ کتاب اچھی چھپی ہے لیکن جزبندی ہوتی تو پڑھنے والوں کو آسانی ہوتی اور کتاب کی عمر بھی بڑھ جاتی۔ اردو اکیڈیمی حیدرآباد کو کتابیں چھاپتے وقت اس کا بھی خیال رکھنا چاہیے۔

آندھرا پردیش ● ایم۔ باگا ریڈی ● ناشر اردو اکیڈیمی، حیدرآباد ● ۸ روپے

یہ کتاب آندھرا پردیش کے وزیر پنچایت راج اور اکیڈیمی کے صدر کی تصنیف ہے جو موصوف کا اردو دوستی کا بین ثبوت ہے۔ یہ آندھرا پردیش کے بارے میں غیر معمولی معلومات فراہم کی ہے۔ اس سے روایت کی تاریخی، جغرافیائی، صنعتی اور زراعتی ترقی کے بارے میں بہت کچھ پتہ چلتا ہے۔ یہ ساری معلومات دلچسپ بھی ہیں اور بڑے دلچسپ پیرائے میں بیان کی گئی ہیں۔ اردو میں اپنی نوعیت کی یہ پہلی کتاب ہے اور ایک بہت بڑی ضرورت کو پورا کرتی ہے۔ ایم۔ باگا ریڈی کو زبان و بیان پر غیر معمولی قدرت حاصل ہے اور یہ کتاب جابجا ان کے عالمانہ انداز بیان کی غمازی کرتی ہے۔ ہم مصنف کو ان کی اس خوبصورت کتاب پر مبارکباد پیش کرتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ وہ ادب کی دنیا سے اپنی دلچسپی کو نہ صرف برقرار رکھیں گے بلکہ اس میں اضافہ بھی کریں گے۔

عکس کہکشاں ● شاہد ساگری ● شاہد پبلیکیشنز، بھوپال ● ۱۰ روپے

یہ اردو غزل گو شعرا کی غزلوں کا انتخاب ہے۔ وہ خود بھی شاعر ہیں اور اس انتخاب نے انھیں رسوا بھی کر دیا۔ اس میں دو سو بیس شعرا کی غزلیں شامل ہیں۔ ظاہر ہے کہ پھر کلام میں تنوع کا ہونا لازمی ہے۔ ان میں مشہور غزلگو شعرا بھی ہیں اور نسبتاً غیر معروف بھی۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اردو کے خاموش خدمت گاروں کی تعداد کتنی زیادہ ہے۔ اس انتخاب میں کسی مخصوص نقطۂ نظر کی جھلک نہیں نظر آتی اور اس کی وجہ سے انھیں اس انتخاب میں آسانی بھی ہوئی ہوگی۔ ڈاکٹر سید حامد حسین صاحب نے صحیح لکھا ہے کہ" اس کی ضرورت ہمیشہ باقی رہی ہے کہ ایسے شعرا کے کلام کو جنھیں ادب کے مورخین غیر معروف کہہ کر اپنی ذمہ داری سے بری ہو جاتے ہیں کہیں نہ کہیں نمایندگی ملتی رہے۔"

چاند تارے ● حافظ عبدالرزاق حافظ باقوی ● اردو اکیڈیمی، حیدرآباد ● ۴ روپے

" چاند تارے " بچوں کے ایک شاعر کی ۵۵ نظموں کا مجموعہ ہے۔ ان کے کلام کو دیکھ کر اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ بچوں کے شاعروں کی صف میں ایک نام اور بڑھ گیا ہے۔ ہمارے ملک میں جہاں شاعروں کی تعداد سینکڑوں اور ہزاروں تک پہنچتی ہے وہاں بچوں کے لئے لکھنے والے انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں شاید اس لئے کہ

بچوں کے لیے لکھنا نسبتاً مشکل ہے۔ ان نظموں میں تنوع بھی ہے۔ وہ سیدھے سادے انداز میں اپنی بات کہتے ہیں جو یقیناً بچوں کے دل میں اتر جائے گی۔ انھوں نے اسلام کی تعلیمات کو بھی اپنی نظموں کا موضوع بنایا ہے اور ہلکے پھلکے انداز کی چیزیں بھی لکھی ہیں جنھیں بچے ہنسی خوشی سے پڑھیں گے۔ ہم امید کرتے ہیں کہ یہ کتاب لوگ اپنے بچوں تک ضرور پہنچائیں گے۔

جدید تعلیمی مسائل • سید ضیاء الدین علوی • ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ

• قیمت ۹ روپے

تعلیم کے مسائل پر اردو میں بہت کم کتابیں لکھی گئی ہیں، اور جو لکھی بھی گئی ہیں وہ زبان و بیان کے لحاظ سے بہت مشکل ہیں۔ اس لیے عام طور پر لوگ ان سے استفادہ نہیں کر سکتے۔ علوی صاحب خود بھی شعبۂ تعلیم سے متعلق ہیں۔ وہ ان مسائل سے خوب واقف ہیں اس لیے انھوں نے کوشش کی ہے کہ تعلیمی مسائل کو زیادہ پر مقصد اور دلچسپ طور پر پیش کیا جائے۔ کتاب پانچ حصوں پر مشتمل ہے: (۱) اصول تعلیم (۲) نفسیات تعلیم (۳) طریقۂ تعلیم (۴) نصاب کے اصول (۵) ملک کے تعلیمی نظام اور اس کے تعلیمی مسائل۔

علوی صاحب نے ان سب مسئلوں پر جدید نظریوں کی روشنی میں اظہار خیال کیا ہے۔

گلدستۂ مضامین و انشا پردازی • ڈاکٹر محمد عارف خاں • ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ • قیمت: ۹۵/۶

اس کتاب میں طالب علموں کی ضرورت کا خیال رکھتے ہوئے جدید موضوعات سے متعلق کارآمد مضامین ہیں۔ یہ مضامین موضوعات کے اعتبار سے تین حصوں میں تقسیم کیے گئے ہیں۔ پہلے حصے میں تاریخی، علمی، ادبی، اصلاحی، مذہبی، سیاسی، سماجی وغیرہ سے متعلق موضوعات شامل ہیں۔ دوسرے حصے میں خطوط نویسی کے قاعدے بیان کیے گئے ہیں اور مختلف اشخاص اور مختلف مواقع اور ضروریات کے تحت ہر قسم کے خطوط کے نمونے دیے گئے ہیں۔ اس سلسلے میں حفظ مراتب، القاب و آداب اور لفافہ نویسی کے قواعد اور ہدایات وغیرہ کو عملی مشقوں اور مثالوں کے ذریعے واضح کیا گیا ہے۔

تیسرے حصے میں مذکر، مونث، ضرب الامثال، محاورے مع معنی بیان کیے گئے ہیں۔ ان کو غور سے پڑھ کر طلبا آسانی سے خطوط بھی لکھ سکتے ہیں اور مضامین بھی۔

اس کتاب میں جو مضامین دیے ہیں ان سے حالات حاضرہ کے مختلف پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے اور مصنف نے کتاب کو وقت اور ضرورت کے تقاضوں سے آراستہ کیا ہے۔ جیسے ہندوستان کا ایٹمی دھماکہ، ایمرجنسی، بنگلہ دیش کا قیام، چاند کی تسخیر، ترک اسلحہ، بڑھتی ہوئی آبادی کا مسئلہ۔

اس کتاب میں مختلف کھیلوں پر مضامین ہیں۔ تاریخی عمارتوں کی سیر سے متعلق خوبصورت مضامین۔ سماجی مسئلوں۔ طالب علموں کی زندگی۔ ہمارے تہوار اور ہندوستان کی اہم شخصیتوں پر سیر حاصل مضامین ہیں۔

یہ مضامین طلبا کی امتحانی ضروریات کو کامیابی سے پورا کرتے ہیں۔

مثنوی سحر البیان • میر حسن، مقدمہ ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی • ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ • قیمت : ۵/۰۰

مثنوی سحر البیان (قصہ بے نظیر و بدر منیر) کو جو مقبولیت حاصل ہوئی وہ محتاج بیان نہیں۔ یہ مثنوی برسوں سے چھپ رہی ہے اور اسی شوق کے ساتھ پڑھی جا رہی ہے۔ طباعت کا یہ سلسلہ بدستور جاری ہے۔ زیر نظر کتاب کی دو خصوصیات ہیں۔ اس میں اردو کے فاضل ادیب کا مقدمہ شامل ہے اور اعلیٰ طباعتی معیار سے آراستہ ہے۔ شاید اس سے پہلے یہ کتاب اتنے خوبصورت طباعت کے ساتھ منظر عام پر نہیں آئی۔ ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی (استاد شعبۂ اردو دہلی یونی ورسٹی) نے اس پر ایک سیر حاصل مقدمہ لکھا ہے جس میں مثنوی کی تعریف اور اس کی تاریخ کے ساتھ ساتھ میر حسن کی زندگی کے حالات، مثنوی کا تجزیاتی مطالعہ شامل ہے۔ جس میں کردار نگاری، منظر نگاری، زبان اور طرز ادا غرض ہر متعلق موضوع پر بحث کی گئی ہے۔ ظہیر صاحب نے لکھنؤ کی اہم مثنوی گلزار نسیم سے بھی اس کا موازنہ کیا ہے اور دونوں مثنویوں کا حق ادا کر دیا ہے۔

سحر البیان کا یہ مطالعہ بڑے معروضی انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ ظہیر صاحب نے اس کی خامیوں پر بھی نظر ڈالی ہے جن کا سمجھنا ضروری ہے لیکن اس کی نشاندہی سے مثنوی کی بڑائی میں کوئی فرق نہیں آتا۔

یہ نسخہ اس لائق ہے کہ لوگ اسے خریدیں، پڑھیں اور اپنے پاس محفوظ رکھیں۔ اس گرانی کے زمانے میں اس کی قیمت بھی زیادہ نہیں ہے۔

جمالیات اور ادب • ڈاکٹر ثریا حسین • ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ • قیمت : ۱۵/۰۰

زیر نظر کتاب جمالیات کے موضوع پر ایک اہم کتاب ہے۔ اردو میں یوں تو مختلف اصناف ادب اور مختلف شاعروں اور ادیبوں پر وقتاً فوقتاً لکھا جاتا رہا ہے جن کی تنقیدی اہمیت مسلم ہے لیکن فکری مسائل پر بہت کم لکھا گیا ہے۔ ہمیں خوشی ہے کہ جمالیات جیسے اہم موضوع کی طرف اب خصوصیت سے توجہ دی جا رہی ہے۔ جمالیات حسن و فن کے امتزاج کو فلسفیانہ طور پر سمجھنے کا نام ہے اور فنون لطیفہ کے ہر شعبے پر اثر انداز ہوتا ہے کسی فن کی بڑائی کا ایک بڑا انحصار اس کے جمالیاتی اظہار میں ہوتا ہے۔ اس کے توسط سے ہم لفظ و معنی کے حسن کو پرکھ سکتے ہیں اور اس سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ ادب کی فنی حیثیت اور اس کے اقدار کا تعین جمالیات سے مدد لئے بغیر نہیں ہو سکتا کیوں کہ یہ "عبارت کیا، اشارت کیا، ادا کیا" غرض سب کو متاثر کرتی ہے۔ اس لئے اس کی فلسفیانہ اساس پر غیر معمولی توجہ کی ضرورت ہے۔ ہمیں خوشی ہے کہ علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کی پروفیسر ثریا حسین نے اس سلسلے میں توجہ دی ہے۔ "جمالیات اور ادب" کا دائرہ خاصا وسیع ہے۔ انھوں نے مغرب میں قدیم یونانی تصورات سے لے کر عہد جدید تک اس کے فکری پس منظر کا جائزہ لیا ہے۔ جہاں ایک طرف افلاطون اور ارسطو

کے خیالات کو سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے وہاں دوسری جانب بام گارٹن، کانٹ، ہیگل، شوپنہادر، نیتشے اور لیوٹالسٹائی کے تصورات کا تجزیہ بھی کیا گیا ہے۔

اس کے بعد اس میں بیسویں صدی کے مفکروں کا مطالعہ بھی کیا گیا ہے۔ پڑھنے والے کروشے، برگساں، یونگ، مارکس، پلیخنوف اور سارتر وغیرہ کے نظریات سے بھی واقف ہو جاتے ہیں اور اس طرح مختلف نظریات کا ایک تقابلی مطالعہ ہو جاتا ہے۔

ڈاکٹر ثریا حسین نے ہندوستانی جمالیات کا بھی جائزہ لیا ہے اور "رس" اور "آنند" کی روشنی میں ان کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے جہاں خاص طور پر ابھیوا ناگپتا کا ذکر کیا ہے وہاں ٹیگور اور رادھا کرشنن کے خیالات کو بھی نظر انداز نہیں کیا۔

ایرانی اور عربی فن کاروں نے جمالیات کے نئے نظریات کی تخلیق کی جو شام، مصر، اسپین اور ترکستان، ایران اور افغانستان سے ہوتے ہوئے ہندوستان پہنچے۔ دراصل ان کے مطالعے کے بغیر اردو میں جمالیات کا مطالعہ مشکل ہو جائے گا۔ جیسا کہ مصنف نے لکھا ہے کہ "قدیم زمانے میں اردو ادب اور شاعری پر فارسی ادبیات کا غلبہ تھا۔ ہر صنف ادب میں فارسی اساتذہ کی پیروی کی جاتی تھی۔ ہر موقع پر ان سے سند لی جاتی تھی اور حسن وفن کی اقدار کے لئے بھی اس کی طرف رجوع کیا جاتا تھا۔"

اسی لئے "اردو میں جمالیات" کے موضوع پر بحث کرنے سے پہلے ڈاکٹر ثریا حسین نے فارسی اثرات کا جائزہ لیا ہے۔ اردو میں جمالیات کا احساس رومانوی ادیبوں کے یہاں شعوری طور پر ملنے لگا۔ پھر ترقی پسند ادب اور جدیدیت کے تصورات نے اس میں رنگ بھرے۔ اس کتاب میں مصنف نے اس پر بڑی اچھی بحث کی ہے۔

"جمالیات اور ادب" چار ابواب پر مشتمل ہے۔ اور ایک اہم لیکن مشکل موضوع پر لکھی گئی ہے۔ البتہ کتاب کو پڑھتے وقت یہ جی چاہتا ہے کہ کاش ان مسائل کو اور تفصیل سے پیش کیا گیا ہوتا کیوں کہ اس کتاب کو لکھنے سے پہلے ڈاکٹر ثریا حسین نے خود تفصیل سے مطالعہ کیا ہے جس کا اندازہ "کتابیات" سے ہوتا ہے۔ تاہم اس کتاب میں وہ بڑی حد تک اپنے مقصد میں کامیاب ہوئی ہیں۔ وہ ان تمام مباحث کی روشنی میں اس نتیجے پر پہنچی ہیں کہ "ادب (شعر و افسانہ) کسی دوسرے علم یا سیاسی نظریے یا مذہب یا اخلاقیات کا تابع مہمل نہیں بلکہ ایک خود مکتفی فن ہے جو اپنی توجیہہ اور تفسیر کے لئے سماجیات، نفسیات، فلسفے، نئے تحلیلی سائنسی طریقوں، تاریخ اساطیر، مذہبی روایات سب سے مدد لیتا ہے مگر اپنی انفرادیت کا تحفظ ہمیشہ مد نظر رہتا ہے۔"

امید ہے کہ جمالیات اور ادب سے دلچسپی رکھنے والے حضرات اس کتاب کا مطالعہ کریں گے اور اس سے استفادہ کریں گے۔

ـــــ ادارہ

فہرست کتب

۱۹۸۰

EBH

ایجوکیشنل بک ہاؤس

مسلم یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱

فون: ۳۷۶۸

ملاحظہ طلب

(۱) اپنا نام اور پورا پتہ خوشخط لکھئے۔ ممکن ہو تو انگریزی اور اردو دونوں زبانوں میں لکھئے۔

(۲) اگر حساب میں کوئی غلطی ہوگئی ہو تو اس سے بدگمان اور پریشان نہ ہوں غلطی سے مطلع کیجئے۔ فوراً تحقیقات کر کے تلافی کی جائے گی۔ دیانت داری ہمارا فریضہ ہے۔

(۳) اگر دس دن تک کتابیں یا کوئی جواب نہ پہنچے تو فوراً دوسرا خط لکھئے۔ انتظار کر کے وقت ضائع نہ کیجئے اور اپنے پہلے خط کا حوالہ ضرور دیجئے۔

(۴) تاجران کتب، اداروں اور لائبریریوں کو کمیشن دیا جاتا ہے کمیشن دریافت کرتے وقت کتابوں کے نام اور تعداد بھی تحریر فرمائیں۔

(۵) وی۔ پی۔ منگانے پر وی۔ پی فوراً وصول کرلیں۔ اگر کسی سبب سے فوراً وی۔ پی۔ نہ وصول کرسکیں تو سات یوم کے اندر اندر ڈاک خانہ سے ضرور وصول کرلیں ورنہ سات یوم بعد ڈاک خانہ وی۔ پی۔ واپس کر دیتا ہے۔

(۶) اگر فرمائش بڑی ہے تو اپنے قریب کے ریلوے اسٹیشن کا نام اردو اور انگریزی میں ضرور لکھیں تاکہ پارسل ریل سے روانہ کیا جائے اور خرچ کم ہو۔

(۷) کتابوں کی روانگی کے مصارف و ڈاک خرچ خریدار صاحبان کے ذمہ ہوں گے۔

(۸) ہر خط میں اپنا پورا نام و پتہ ضرور لکھئے پچھلے خطوں کی بنا پر ان باتوں کا لکھنا ترک نہ کیجئے۔

اس فہرست میں دی ہوئی کتب کے علاوہ بھی کتب منگائیں وہ بھی کوشش کر کے مہیا کی جائیں گی۔

منیجر

ایجوکیشنل بک ہاؤس
مسلم یونیورسٹی مارکیٹ علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱

اقبال صدی کے موقع پر اقبال پر نئی مطبوعات

فکرِ اقبال
ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم

- اقبالیات میں گراں قدر اضافہ۔
- اقبال کے شعر و ادب پر مفصل اور معیاری تبصرہ۔
- اقبال کے سات انگریزی خطبات کا اردو خلاصہ۔
- فکر اقبال اصلاً اقبال پر علمی و فکری معلومات کا سرمایہ ہے۔
- یہ کتاب خود لاتعداد کتابوں اور مضامین کے وجود کا سبب بنی ہے۔
- فکر اقبال کے مطالعہ کے بغیر اقبال کا مطالعہ مکمل نہیں ہوتا۔

قیمت: ۴۰/۰۰

اقبال — فن اور فلسفہ
ڈاکٹر نور الحسن نقوی

اس کتاب میں ڈاکٹر نور الحسن نقوی نے اقبال کے فنی کمالات اور فلسفیانہ خیالات پر ایک نئے زاویہ سے نظر ڈالی ہے۔ پوری کتاب کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ کس طرح اقبال کے یہاں فکر و فن شعری قالب میں ڈھل کر ایک ہو گئے ہیں کہ انھیں ایک دوسرے سے جدا کر کے اقبال کی شاعری کا مطالعہ ممکن نہیں رہ جاتا۔

یہ مختصر سی کتاب اقبال کی شاعری کے بعض نئے گوشوں کو سامنے لاتی ہے۔

قیمت: ۷/۵۰

اقبال معاصرین کی نظر میں
وقار عظیم

- وقار عظیم کا مرتب کردہ اہم نقادوں کے اہم ترین مضامین کا مجموعہ۔
- اقبال کی حیات و سیرت پر سیر حاصل مضامین۔

○ اقبال کی فارسی و اردو تصانیف پر مبسوط مقالات ۔
○ اقبال کے جامع مطالعہ کے لیے ناگزیر کتاب ۔
○ اقبالیات میں ایک گراں قدر اضافہ ۔

(زیر طبع)

اقبال شاعر اور فلسفی

سید وقار عظیم

گزشتہ چالیس سال میں اقبال کی شاعری اور فلسفہ پر ان گنت کتابیں سامنے آئی ہیں لیکن وقار عظیم کی یہ تصنیف

اقبالیات میں ایک اہم اضافے کی حیثیت رکھتی ہے

اس میں :

○ اقبال کی فلسفیانہ اور شاعرانہ حیثیت کے مختلف پہلوؤں پر سیر حاصل بحث ہے ۔
○ اقبال کی فلسفیانہ اور حکیمانہ شخصیت کو، ان کے مزاج کی رچی ہوئی شاعرانہ کیفیت کو ایک دوسرے سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا ۔

پروفیسر وقار عظیم کی یہ تصنیف —— اقبال کی شاعری اور فن کو سمجھنے میں مدد کرتی ہے اور اس کے بغیر مطالعۂ اقبال نامکمل ہے ۔

(زیر طبع)

تصوراتِ اقبال

مولانا صلاح الدین احمد

○ برصغیر ہند و پاک کے عظیم شاعر علامہ اقبال کی شاعری اور فکر پر ایک اہم تصنیف ۔
○ صلاح الدین احمد کا مطالعۂ اقبال وسیع اور غائر تھا۔ انھوں نے اقبال کے مردِ مومن اور انسانِ کامل، حرکت و حرارت کی اہمیت، نظریۂ خودی، تصورِ شاہین، تصورِ ملکت، تصورِ معیشت، تصورِ حسن و عشق، وطن و ملت کی کشمکش جیسے موضوعات پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے ۔
○ صلاح الدین احمد نے تصورات اقبال پر ایک ایسے زاویہ سے بحث کی ہے جو بالکل اچھوتا اور نیا ہے۔ "تصورات اقبال" اقبالیات میں ایک اضافہ کی حیثیت رکھتا ہے ۔

قیمت : ۱۵/--

ادب میں جمالیاتی اقدار۔ایک مطالعہ ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی

○ جمالیاتی ادب کی تاریخ میں ایک اہم اور مفید کتاب کی اشاعت۔
○ ادبی تخلیق کو پرکھنے اور جمالیاتی احساس وادراک کے جائزہ کا ایک نیا معیار۔
○ اردو کے شعری سرمایہ ادب کو مشرقی ومغربی جمالیاتی اقدار کے پس منظر میں دیکھنے کی کامیاب اور بھرپور کوشش۔تحقیق وتلاش کے ساتھ مصنف کی گہری بصیرت اور ادب کی تشریح وتعبیر میں تنوع فکر کا اظہار۔
○ آٹھ ابواب اور تین ضمیموں پر مشتمل ہے۔ قیمت: ۱۰/..

جمالیات اور ادب پروفیسر ثریا حسین

اس کتاب میں:

○ مغرب میں جمالیات کے تصورات کا جائزہ لیا گیا ہے۔
○ ہندوستانی، فارسی اور اردو میں جمالیات کا مختصر طور پر تجزیہ کیا گیا ہے۔
○ اردو میں جمالیات اور ادب کے موضوع پر اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ــــ ادب کے طالب علم کے لئے اس کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ قیمت: ۱۵/..

داستان سے افسانے تک وقار عظیم

○ اردو میں پہلی بار اردو فکشن کے تخلیقی اور زندہ عناصر کا باقاعدہ مطالعہ۔
○ داستان سے افسانے تک میں فکشن کے جملہ اصناف کو وقار عظیم نے بڑی کاوش کے ساتھ پیش کیا ہے۔
○ اس کتاب میں اردو داستان، اردو ناول اور اردو افسانے کے ارتقائی عمل کی بھرپور تصویر ملتی ہے۔
○ اس کتاب کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں تحقیق اور تنقید کے ساتھ پورا انصاف کیا گیا ہے۔
○ طالب علموں اور عام پڑھنے والوں کے سامنے اردو فکشن کا ایک جاندار پہلو واضح ہوتا ہے۔

قیمت: ۲۰/..

آغا حشر اور اردو ڈراما

انجمن آرا

- آغا حشر کی سوانح عمری شخصیت اور فن پر جامع اور وقیع تحقیق۔
- ہندوستان میں ڈراما کے فن کے ارتقا کا پس منظر کی حیثیت سے جائزہ۔
- ڈرامہ اور اسٹیج ڈرامہ پر فنی و تحقیقی بحث۔
- آغا حشر کے ڈراموں کے ماخذ کی دریافت اور طبع زاد ڈراموں کا تعارف۔
- آغا حشر کے ڈراموں کے فنی محاسن پر علمی تبصرہ۔
- آغا حشر اور ڈرامہ سے متعلق ضمیموں اور کتابیات سے مزین۔
- معیاری کتابت، طباعت اور گٹ اپ۔

قیمت : ۳۰/..

اکبر کی طنزیہ اور ظریفانہ شاعری

محمد زاہد

اکبر کی شاعری میں طنز و ظرافت کا حسین امتزاج ہے جس کو سمجھنے کے لئے اس کتاب میں مولانا عبدالماجد دریاآبادی، پروفیسر رشید احمد صدیقی، پروفیسر آل احمد سرور، مولانا عبدالمجید سالک پروفیسر خورشید الاسلام، رالف رسل، وزیر آغا اور جناب شان الحق حقی کے اہم مضامین کے علاوہ اکبر الہ آبادی کے کلام کا جامع انتخاب ہے۔

قیمت: ۱۵/..

تنقیدی تناظر

ڈاکٹر قمر رئیس

- گذشتہ آٹھ سال کے دوران لکھے ہوئے تنقیدی مضامین کا انتخاب۔
- عصری ادب کے رجحانات، اصناف ادب اور شخصیات کا فکر انگیز مطالعہ۔
- ادب کا جائزہ تہذیبی و عمرانی تناظر میں سچائیوں تک رسائی کے لئے۔
- غالب، اقبال، جاں نثار اختر اور عمیق حنفی کے فکر و فن کا مطالعہ اور پروفیسر احتشام حسین و سجاد ظہیر جیسے اہل نظر کا جائزہ۔

- ناول اور افسانہ کے مطالعہ کی طرف قمر رئیس نے جس خصوص کے ساتھ توجہ دی ہے اتنا کوئی اور نقاد متوجہ نہ ہوا۔
- قمر رئیس کا واضح اور صاف اندازِ بیان انھیں ہمیشہ ممتاز رکھتا ہے۔

قیمت : ۲۰/..

ادبی تحقیق ـــــ مسائل اور تجزیہ

رشید حسن خاں

مسائلِ تحقیق اور عملی تحقیق کے موضوع پر ایک اہم کتاب

اس کتاب کے پہلے حصے میں :

- ادبی تحقیق کے اصولوں کی وضاحت کی گئی ہے، خاص طور پر حوالے اور استناد کی مشکلوں پر بحث کی گئی ہے۔
- موجودہ حالات میں ادبی تحقیق جن مسائل سے دوچار ہے ان کا جائزہ لیا گیا ہے اور کم معیاری کے اسباب پر گفتگو کی گئی ہے۔

دوسرے حصے میں :

- تاریخ ادب کی دو کتابوں پر اس طرح تبصرہ کیا گیا ہے کہ تحقیق کے صبر آزما تقاضوں کی تفصیل سامنے آسکے اور تاریخ ادب کے مسائل کی وضاحت ہو سکے۔
- اردو شاعری کے ایک انتخاب اور دیوانِ غالب کے ایک نسخے کا اس طرح جائزہ لیا گیا ہے کہ ترتیبِ متن کے اہم مسائل زیرِ بحث آجائیں۔
- ان مفصل جائزوں سے یہ بھی معلوم ہوگا کہ تدوین اور تحقیق کے اصولوں کی پابندی نہ کرنے سے کس قدر خرابیاں پیدا ہو سکتی ہیں اور یہ کہ اخلاقیاتِ تحقیق کے فقدان نے کیا صورتِ حال پیدا کر دی ہے۔

قیمت : ۲۵/..

نثر، نظم اور شعر

ڈاکٹر منظر عباس نقوی

ڈاکٹر منظر عباس نقوی کا پسندیدہ موضوع ادب کا اسلوبیاتی مطالعہ ہے۔ چنانچہ اس کتاب میں موصوف نے اسلوب اور اس کی تشکیل کے عنوان سے ایک اصولی مضمون کے ساتھ خطوطِ غالب، غالب

اور اقبال کی شاعری اور خورشید الاسلام کی نثر کا اسلوبیاتی مطالعہ کیا ہے اور بعض اہم اور نئے نتائج اخذ کئے ہیں۔ نثر، نظم اور شعر اور میر کی امیجری پر بھی دو تجزیاتی مضامین اس مجموعہ میں شامل ہیں۔

قیمت: ۷/۵۰

سرسید اور ہندوستانی مسلمان — ڈاکٹر نور الحسن نقوی

"ڈاکٹر نور الحسن نقوی نے سرسید کی متنوع شخصیت اور ان کے کارناموں کے بعض اہم پہلوؤں کو اس کتاب کا موضوع بنایا ہے اور ادب و تحقیق دونوں کا حق ادا کر دیا ہے۔ ان کا انداز بیان شگفتہ اور سلجھا ہوا ہے۔ واقعات کی تحقیق میں انھوں نے دقتِ نظر سے کام لیا ہے اور اظہارِ رائے میں توازن اور انصاف پسندی کا دامن ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ سرسید کے مذہبی، سیاسی، تعلیمی افکار اور ان کے نظریۂ شعر و ادب پر حقائق کی روشنی میں بحث کی ہے۔ ایک مختصر کتاب میں سرسید کے اتنے مختلف النوع کارناموں کا احاطہ کر لینا ان کا کارنامہ ہے جس کے لئے وہ یقیناً لائق مبارکباد ہیں۔"

(پروفیسر خلیق احمد نظامی)

قیمت: ۳۰/۰۰

ناول کا فن — مترجم: ابوالکلام قاسمی

اردو میں شاندار افسانوی ادب کے باوجود فکشن کی تنقید افسوس ناک حد تک بے مایہ رہی ہے۔

ای۔ ایم۔ فارسٹر کی "آسپیکٹس آف دی ناول" ناول کی تنقید کی روایت ساز اور ناگزیر مثال رہی ہے۔

ابوالکلام قاسمی نے فارسٹر کی اس کتاب کے ترجمے کے ذریعے اردو کو فکشن کی تنقید کی ایک مستحکم بنیاد فراہم کی ہے۔

اس کتاب کو انگریزی ناول کی تنقید میں وہی حیثیت حاصل رہی ہے جو مقدمہ شعر و شاعری کو اردو شاعری کی تنقید میں۔

ناول کا فن، قصہ، پلاٹ، کردار، فنتاسی اور پیغمبری جیسے اہم موضوعات کا احاطہ کرتا ہے۔

قیمت: ۱۵/۰۰

مضامین نو

ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی کا نیا مجموعۂ مضامین

- خلیل الرحمٰن اعظمی اردو ادب کے معتبر نقاد ہیں۔
- ان کے یہاں روایت کی پاسداری اور عصری آگہی انتہائی متوازن انداز میں پائی جاتی ہے۔
- اس مجموعہ میں ان کے منتخب اور اہم مضامین کو شامل کیا گیا ہے۔
- ان کے تبصروں کا ایک انتخاب بھی اس مجموعہ میں شامل ہے۔
- یہ مجموعہ ہر حیثیت سے تنقید میں ایک اضافہ ہے۔

قیمت : ۲۵/..

میں، ہم اور ادب

ابن فرید کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ

- نفسیات، عمرانیات اور ادب کا متوازن امتزاج۔
- ان دس مضامین کا انتخاب جو اب تک فراموش نہ کئے جاسکے۔
- ان مضامین نے ناقدین کو بعض مسلّم نظریات پر نظر ثانی کے لئے مجبور کر دیا۔
- ابنِ فرید نے بہت سی باتیں پہلے کہی ہیں جن کا ذکر اب عام ہے۔
- ابنِ فرید کا اندازِ بیان اور طرزِ استدلال منفرد ہے۔
- ابن فرید کا ناقدانہ فن مشرق و مغرب کا یکساں مستفاد ہے۔

قیمت : ۲۰/..

بجنگ آمد

کرنل محمد خاں کے قلم سے شگفتہ نگاری کی لافانی مثال۔

- یہ کتاب کرنل محمد خاں کی سوانح عمری ہونے کے باوجود ہر ایک کی توجہ کا مرکز بن جاتی ہے۔

- انتہائی خشک واقعات بھی کرنل محمد خاں کے قلم سے سرسبز و شاداب ہو جاتے ہیں۔
- کرنل محمد خاں اپنے بے حد نجی تجربات میں بھی قاری کو شریک کر لیتے ہیں۔
- کرنل محمد خاں کی پہلی ہی تصنیف نے بجت نگاری میں ان کے مقام کا اعتراف کرایا ہے۔
- بجنگ آمد کی مقبولیت کا اندازہ اس امر سے ہی لگایا جا سکتا ہے کہ صرف چھ سال میں اس کے چھ ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

قیمت: ۱۴/..

نظم جدید کی کروٹیں

وزیر آغا

ان یادگار مضامین کا مجموعہ جن کی تازگی اور ندرت نے اردو ادب کے سنجیدہ قارئین کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔

- "سلسلۂ مثال" کی فکر انگیز دریافتوں کے مضامین کا مجموعہ۔
- وزیر آغا نے اپنے ہر موضوع کی غواصی کی ہے اور ہر شاعر کی مرکزی خصوصیت کو نمایاں کیا ہے۔
- وزیر آغا نے نہایت متوازن طریق کار سے اپنی مہم جوئی اور ناظر کے جذبۂ یافت کو تسکین دی ہے۔
- اس کتاب میں اردو کے جدید نظم گو شعراء کا مدلل اور خیال افروز تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔
- اس مجموعہ میں اقبال، راشد، میراجی، فیض، مجید امجد، یوسف ظفر، قیوم نظر، راجہ مہدی علی خاں، اختر الایمان، ضیا جالندھری، بلراج کومل اور شہاب جعفری کو موضوع مطالعہ بنایا گیا ہے۔
- دوسرا ایڈیشن ترمیم اور اہم اضافوں کے ساتھ۔

بہترین کتابت، طباعت اور گٹ اپ کے ساتھ۔

قیمت: ۱۸/..

* پہلی سطح دھرتی کی تاریخ کا آئینہ ہے۔
* دوسری سطح داخلی اور تہذیبی سطح کو اجاگر کرتی ہے۔

○ اس کتاب میں وزیر آغا نے اردو شاعری کی تین بڑی اصناف، گیت، غزل اور نظم کے مزاج کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے اور بتایا گیا ہے کہ اردو شاعری کی بنیادی اصناف یعنی گیت، غزل اور نظم میں مزاجاً کیا فرق ہے۔
* اس کے نفسیاتی، تہذیبی، سماجی اور جغرافیائی محرکات کا سراغ لگایا ہے۔
* ان تینوں پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ ان کے ارتقا اور ان سے پیدا ہونے والے مختلف رجحانات کا تنقیدی جائزہ لیا ہے۔

○ وزیر آغا کی تحریروں میں تنقید، تخلیق اور تخلیق کا ایک دلآویز امتزاج نظر آتا ہے۔ انھوں نے موضوع سے انصاف کرنے کے لئے تاریخ، عمرانیات، فلسفہ، نفسیات اور ادب کے بیکراں سمندروں کو کھنگالا ہے۔

○ یہ کتاب اصول انتقادیات میں ایک نئے باب کا اضافہ ہے۔

قیمت : ۴۰/۰۰

اردو ڈراما تاریخ و تنقید

عشرت رحمانی

اردو ڈراما پر پہلی مبسوط اور مستند تصنیف جس میں :۔

○ ڈرامے کے فن، اس کی ابتدا اور ارتقا کا تفصیلی مطالعہ ہے۔
○ یونانی اور سنسکرت ڈرامے کا تہذیبی اور تاریخی تجزیہ۔
○ اردو ڈراما کی ابتدا ـــــ اس کے عہد بہ عہد ارتقار کا تحقیقی جائزہ ہے۔
○ علاقائی طور پر اردو ڈراما کس کس منزل سے گذرا ـــــ پارسی تھیٹر، لکھنؤ کا نوابی عہد۔ وغیرہ میں اردو ڈرامے کا ارتقائی عمل۔
○ ایک ایکٹ کے ڈرامے، ریڈیائی ڈرامے، اسٹیج ڈرامے اور ان کے مصنفیں پر بحث۔
○ قدیم سے جدید ڈرامے تک کی تصویریں پوری کتاب کے مطالعے کے بعد آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہیں۔

قیمت : ۲۰/۰۰

اردو ڈراما کا ارتقاء

عشرت رحمانی

اردو ڈراما کا مبسوط و مستند فنی اور تحقیقی جائزہ جس میں اندر سبھا، آغا حشر، ان کا فن اور عہد نیز انارکلی کا خصوصی مطالعہ شامل ہے۔ علاوہ ازیں دور جدید کی ڈرامائی سرگرمیوں، بچوں کے ڈراما، ریڈیو اور ٹیلی وژن ڈراما کا تاریخی و تنقیدی تذکرہ پیش کیا گیا ہے۔

قیمت: ۴۰/۰۰

یونانی ڈراما

(چار یونانی ڈراموں کا اردو ترجمہ)

عتیق احمد صدیقی کے قلم سے

- ایسکلس، سوفوکلیز، یوریپڈیز اور ایرسٹوفینز کے چار نمایندہ ڈراموں کا ترجمہ۔
- یونانی ڈراما کی تاریخ اور فن پر سیر حاصل دیباچہ۔
- ہر ڈراما نگار اور ڈرامے کا جامع تعارف۔
- ڈراموں میں استعمال ہونے والے اسماء کی فرہنگ۔
- تقابلی ادب کے مطالعہ کے لئے ایک ناگزیر کتاب۔
- ترجمہ کی برجستگی اور لطافت نے اس کتاب کو لافانی بنا دیا ہے۔

قیمت: ۲۰/۰۰

تنقیدیں

(تیسرا ایڈیشن)

پروفیسر خورشید الاسلام

پروفیسر خورشید الاسلام کا شمار اردو کے ممتاز نقادوں میں ہوتا ہے۔ ان کے اسلوب کی چاشنی، انداز نظر کی ندرت اور تنقیدی بصیرت کا اعتراف اردو کے بڑے بڑے ادیب و نقاد کر چکے ہیں۔ "تنقیدیں" ان کے بہترین اور مشہور تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے۔ اس کتاب کے پہلے ایڈیشن پر حکومت اترپردیش ساڑھے سات سو روپے انعام بھی دے چکی ہے۔

تیسرے ایڈیشن میں مغنی نامہ، ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری، شریف زادہ اور ذکر اس پری وش کا، کا اضافہ کیا گیا ہے۔
قیمت : ۲۰/۰۰

اسلوب

سید عابد علی عابد

اسلوب کے مسئلہ پر اردو میں پہلی مفصل تصنیف

- سید عابد علی عابد نے لکھا تھا "یہ تصنیف میری زندگی کے تجربات اور مطالعات کا نچوڑ ہے اور غالباً حاصل حیات ہے۔"
- پروفیسر حمید احمد خاں نے لکھا "لفظ و معنی کی مسلسل آویزش کی داستان سنانے کا حق ہمارے معاصرین میں سید عابد علی عابد کو اپنے ذاتی اور اکتسابی کمالات کی بنا پر بطور خاص پہنچتا ہے۔"
- اسلوب میں عابد علی عابد جیسے اعلیٰ درجہ کے نقاد کی تجزیاتی کاوشیں ہیئت و مضمون کے نکات کو نمایاں کرتی ہیں۔
- اردو ادب میں نقد و نظر کے جوہر شناس تسلیم کریں گے کہ "اسلوب" کے مسئلہ پر یہ کتاب حرفِ آخر نہیں تو حرفِ اوّل ضرور ہے۔

خوبصورت طباعت اور گٹ اپ۔

قیمت : ۲۰/۰۰

انسان اور آدمی

محمد حسن عسکری کے تنقیدی مضامین کا پہلا مجموعہ

- غالب نے کہا تھا: آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا
- محمد حسن عسکری نے ادب کے آئینہ میں آدمی اور انسان کے فرق یا تعلق کو تلاش کرنے کی سعی و جہد کی ہے۔
- معاملہ خلوص اور دقت نظر کا تھا۔ اس لئے عسکری کے قلم نے جواہر بکھیر دیئے۔
- اس مجموعہ کے مضامین نے عسکری کو اعلیٰ پایہ کا نقاد ثابت کر دیا۔

- حقیقت یہ ہے کہ جس نے عسکری کو نہیں پڑھا وہ اردو کی کلاسیک کے مطالعہ سے محروم رہا۔
- یہ مضامین جب بھی پڑھے جائیں گے نئے معلوم ہوں گے۔
- صفِ اوّل کے نقاد کا صفِ اوّل کا تنقیدی مضامین کا مجموعہ۔

خوشنما طباعت اور گٹ اپ

قیمت : ۱۰/۰۰

ستارہ یا بادبان

محمد حسن عسکری کے تنقیدی مضامین کا دوسرا مجموعہ

- مضامین کا پہلا مجموعہ شایع ہوتے ہی اہلِ نظر عسکری کے دوسرے مجموعہ کے منتظر ہو گئے۔
- مغربی تنقید و ادب کے سیر حاصل مطالعہ کے بعد عسکری نے اردو ادب کو فکر انگیز سرمایۂ تنقید سے مالا مال کر دیا۔
- اس مجموعہ کے ہر مقالہ میں عسکری نے اتنی بہت سی نئی نئی باتیں کہی ہیں کہ ہر بات ہمیشہ نئی رہے گی۔
- عسکری کی تنقید کو سمجھنے کے لئے اور پہلے مجموعہ کے بہت سے مباحث کا مکمل مطالعہ کرنے کے لئے ستارہ یا بادبان کا مطالعہ ناگزیر بن گیا ہے۔
- اس مجموعہ میں بیشتر مضامین فکری اور اصولی موضوعات پر ہیں۔
- عسکری اردو تنقید کی آبرو ہیں، اور یہ مجموعہ اردو میں سنگ میل ہے۔

عمدہ کتابت، طباعت اور گٹ اپ۔

قیمت : ۱۵/۰۰

اردو لسانیات

ڈاکٹر شوکت سبزواری

اردو لسانیات پر اپنی نوعیت کی پہلی تصنیف جس میں بتایا گیا ہے کہ:

- اردو کیا ہے اور کب پیدا ہوئی اور ارتقا کی کن کن منزلوں سے گذری۔

○ اردو کی بنیادی خصوصیات کا تنقیدی اور تاریخی تجزیہ ۔
اور ــــــ
○ اردو صوتیات کی روشنی میں اردو کی ملتی جلتی آوازوں پر خاصی طویل بحث ہے ۔
○ کتاب کے آخر میں لسانیات کی اصطلاحات کی فہرست اور ان کے ترجمے شامل ہیں ۔
○ توضیحی لسانیات اور تاریخی لسانیات پر اردو میں پہلی بار یہ تصنیف ایک ماہر لسانیات کے قلم سے سامنے آئی ہے ۔

قیمت : ۱۲/۰۰

آج کا اردو ادب

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی

○ ڈاکٹر ابواللیث نے معلمانہ انداز میں ادب کے سیاسی و سماجی پس منظر پر بحث کی ہے۔
○ ڈاکٹر ابواللیث نے اردو ادب کی مختلف اصناف کا سیر حاصل جائزہ لیا ہے ۔
○ اس کتاب میں جدید اردو شاعری ، جدید اردو ناول ، اردو افسانہ ، اردو ڈراما ، جدید تنقید ، طنز و مزاح ــــــ پر کارآمد بحث ہے جس میں ادب اور ادیبوں کے کاموں پر تنقیدی نظر ڈالی گئی ہے ۔

قیمت : ۱۶/۰۰

شاعری اور شاعری کی تنقید

ڈاکٹر عبادت بریلوی

○ اردو زبان میں شعر و شاعری پر ایک اہم تصنیف جو تنقید ادب میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے ــــــ اور
○ نظریاتی اور عملی تنقید میں ایک سنگم کی حیثیت رکھتی ہے ۔
○ شاعری اور شاعری کی تنقید کے اصولوں پر سیر حاصل بحث ہے ۔
○ ولی ، سودا ، مظہر جانِ جاناں ، درد ، میر ، غالب ، مومن اور اقبال کے کلام کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے ۔
○ یہ کتاب ہندوستان تمام یونیورسٹیوں کی نصابی ضروریات کو پورا کرتی ہے اور اردو ادب کے ہر طالب علم کے لئے اس کا مطالعہ ازبس ضروری ہے ۔

قیمت : ۲۵/۰۰

جدید شاعری

ڈاکٹر عبادت بریلوی

ڈاکٹر عبادت بریلوی اردو کے اہم نقاد ہیں۔ انھوں نے اس موضوع پر ایک سیر حاصل بحث کی ہے اور جدید شاعری کے مختلف رجحانات کا بڑی دیدہ ریزی کے ساتھ جائزہ لیا ہے۔ "جدید شاعری" دس ابواب پر مشتمل ہے جس میں نظریاتی مباحث بھی ہیں اور ان مباحث کی روشنی جدید شعرا پر عملی تنقید بھی ہے۔ حالی، اقبال سے لے کر فیض، راشد اور ناصر کاظمی تک ـــــ مختلف جدید شعرا کے کلام کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی انھوں نے جدید شاعری کی موجودہ صورتِ حال، جدید اردو شاعری اور نئی نسل اور جدید شاعری کا انحطاط جیسے موضوعات پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ انھوں نے ایک مخصوص زاویۂ نگاہ کو اپنایا ہے اور اسی روشنی میں جدید شاعری کے چند نمائندہ شعرا کے کلام کو پرکھنے کی کوشش کی ہے ـــــ یہ کتاب نہ صرف طلبا کو بلکہ ایک عام انسان کو جدید شاعری کی خوبیوں اور کمزوریوں سے کماحقہٗ واقفیت بہم پہنچا سکتی ہے۔

ڈاکٹر عبادت بریلوی نے جدید شاعری کے اہم ترین ادیبوں اور شاعروں سے ان مسائل پر بحث کی ہے اور ان کے تنقیدی تخلیقی سرمایہ سے استفادہ کیا ہے۔ اردو تنقیدی ادب میں بلاشبہ "جدید شاعری" ایک خوبصورت اور کارآمد اضافہ ہے۔

قیمت: ۲۵/..

غزل اور مطالعہ غزل

ڈاکٹر عبادت بریلوی

- حالی سے لے کر رشید احمد صدیقی اور کلیم الدین احمد تک تنقیدی مباحث کو سامنے رکھ کر اس کی فنی حیثیت کو سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔
- اصولوں اور نظریات پر سیر حاصل بحث ہے۔
- اردو غزل کے ارتقا اور اس میں پیدا ہونے والے مختلف رجحانات کا تنقیدی جائزہ ہے۔
- غزل کا جمالیاتی پہلو بھی ہے اور اس کا تنقیدی مطالعہ بھی۔

- غزل کے جدید رجحانات پر بحث بھی ہے اور مستقبل کے امکانات کی بشارت بھی۔
- طالب علم سے استاد تک اور عوام سے خواص تک، ہر ایک کے لئے یکساں طور پر مفید ہے۔ اس کے بغیر اردو غزل کا مطالعہ نا مکمل رہے گا۔

(زیر طبع)

غزل اور درس غزل

اختر انصاری

اپنے موضوع پر پہلی کتاب ہے جس نے غزل کی تعلیم و تدریس اور افہام و تفہیم کی راہوں کو متعین اور صاف و ہموار کرنے کا اہم فریضہ انجام دیا ہے۔ غزل کس طرح پڑھائی جائے اور غزل کی اندرونی معنویت اور ایمائیت اور اعجاز و تعمیم کو کس طرح طلبہ کے فہم و ادراک کی حدود میں لایا جائے، یہ تو اس کا خاص موضوع ہے ہی، لیکن غالب کے الفاظ میں "فہم سخن اور ذوق معنی" کی دشواریوں اور پیچیدگیوں کو حل کرنے میں بھی ایسی کتاب کے مندرجات اور مباحث سے مدد ملتی ہے۔ دوسرا اڈیشن مفید اضافوں اور ضروری ترمیموں کے ساتھ خاص اہتمام سے منظر عام پر لایا گیا ہے۔

قیمت : ۸/۰۰

حالی اور نیا تنقیدی شعور

اختر انصاری

اردو کی ادبی تنقید میں اولیت کا سہرا حالی کے سر باندھا گیا ہے، لیکن کتاب اس نظریے کے ثبوت میں لکھی گئی ہے کہ حالی نہ صرف اردو کے پہلے نقاد بلکہ ایک ترقی پسند نقاد تھے اور ان کا ادبی تنقیدی شعور سراسر ترقی پسندانہ افکار و تصورات پر مبنی تھا۔ حالی کے تنقیدی مقام کو اس زاویے سے دیکھنے اور دکھانے کی یہ پہلی کوشش ہے۔

قیمت : ۵/۰۰

نیا افسانہ

وقار عظیم

اردو افسانہ اپنے اوائل میں ہی ترقی کی اس منزل پر پہنچ گیا، جہاں پہنچتے پہنچتے کتنی دہائیاں صرف ہو جاتی ہیں۔ گزشتہ چالیس سالوں میں اردو افسانہ نے ترقی کی منزلیں

بڑی تیزی سے طے کیں اور آج اس کا شمار دنیا کے ترقی یافتہ ادب میں ہوتا ہے۔ لیکن اردو افسانہ پر بہت کم لکھا گیا اس کی وجہ یہ تھی کہ اس عہد کے تمام افسانہ نگار زندہ ہیں اور برابر لکھ رہے ہیں۔ ہم عصر ادیبوں پر لکھنا خاصا مشکل کام ہے۔

وقار عظیم نے افسانوی تنقید میں غیر معمولی کارنامے انجام دیئے ہیں اور نیا افسانہ ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ انھوں نے نئے افسانے اور نئے افسانہ نگاروں کا بڑی چابکدستی سے جائزہ لیا ہے اور ہم عصر افسانے کے بدلتے ہوئے رجحانات کا ایک حسین تجزیہ پیش کیا ہے۔ "نیا افسانہ" کے مطالعہ کے بغیر اردو افسانوی تنقید کا مطالعہ نامکمل رہے گا۔ "نیا افسانہ" کا ہندوستانی ایڈیشن ایک بڑی کمی کو پورا کر رہا ہے۔

قیمت : ۱۵/۰۰

سر سید - ایک تعارف

پروفیسر خلیق احمد نظامی

اس کتاب میں علی گڑھ کی پوری تاریخ ہے جس میں یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ کن حالات میں کالج کا قیام ہوا۔ سر سید نے کیسی عرق ریزی سے اس کی آبیاری کی اور کالج کو نہ صرف ایک درس گاہ بنایا بلکہ اسلامی تہذیب اور کلچر کا مرکز بنا دیا۔

قیمت : ۳/۰۰

انتخاب مضامین سر سید

مرتبہ : پروفیسر آل احمد سرور

- اردو انشائیہ نگاری میں سر سید کے مضامین نقش اول کی حیثیت رکھتے ہیں اور ان کی بدولت اردو ادب کو ایک نیا اسلوب ملا۔
- انتخاب مضامین سر سید — ان کے نمائندہ مضامین کا ایک بے مثل انتخاب ہے۔
- اس مجموعہ میں مولانا شبلی نعمانی اور پروفیسر آل احمد سرور کے مضامین سر سید کے کارناموں کا ایک مبسوط مضامین کی حیثیت رکھتے ہیں۔

قیمت : ۵/۰۰

اُردو ادب کی تاریخ (نیا ایڈیشن)

مرتبہ: عظیم الحق جنیدی

یہ کتاب ترتیبِ نو کے ساتھ شائع کی گئی ہے۔ اس ایڈیشن کی خصوصیات یہ ہیں کہ اس میں ہندوستانی زبان کا لسانی ارتقا، اصنافِ شاعری کے علاوہ شاعری کے مختلف اسکولوں سے متعلق تبصرہ بھی دیا گیا ہے اور اردو نظم و نثر کی رفتار بیان کر کے مشاہیر شعراء و نثر نگاروں پر تبصرہ بھی ہے۔ اس تاریخ میں پہلی بار پیروڈی، گیت اور رپورتاژ وغیرہ کا جائزہ بھی لیا گیا ہے۔

قیمت طلبا ایڈیشن: ۶/۰۰ قیمت مجلد: ۷/۵۰

اُردو زبان و ادب

ڈاکٹر مسعود حسین خاں

- ماہر لسانیات ڈاکٹر مسعود حسین خاں کے مضامین کا مجموعہ۔
- جس میں اردو زبان اور ادب سے متعلق اہم مضامین ہیں۔
- شاعروں پر تنقیدی زاویہ سے اظہارِ خیال۔
- فنِ شعر سے متعلق اردو میں پہلی بار علمی مباحث۔
- اردو زبان سے متعلق نئے نظریات۔
- اردو میں اپنی نوعیت کی منفرد کتاب

قیمت: ۷/۵۰

اُردو مثنوی کا ارتقاء

عبدالقادر سروری

جس میں مندرجہ ذیل عنوانات شامل ہیں:

مثنوی کا مقام اصنافِ شعر میں، اردو مثنوی کے اوّلیں نمونے، طویل تر مثنویاں، قدیم مثنویوں کا سنہری زمانہ، بیجاپور کی مثنویاں، گولکنڈے کی مثنویاں، دکن میں مغل عہد کی متصوفانہ مثنویاں، دورِ متوسط کی ابتدائی مثنویاں، مثنویاں اپنے عروج پر، اردو مثنوی دورِ جدید میں۔

قیمت: ۷/۵۰

شعاعِ ادب

شرافت حسین مرزا

- یہ کتاب اردو نثر نگاروں کا ایک مختصر مگر جامع جائزہ ہے۔
- اس کے مطالعہ سے اردو نثر کی ابتدا اور ارتقا کے بارے میں ضروری معلومات حاصل ہوتی ہیں۔
- میر امن سے لے کر آل احمد سرور تک اردو کے ممتاز نثر نگاروں پر تنقیدی مضامین ہیں جن میں ان کی تصانیف پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔
- اردو کے طلبا، اور زبان و ادب سے دلچسپی لینے والوں کے لئے اس کا مطالعہ ناگزیر ہے۔

قیمت: ۳/۷۵

اردو کے تیرہ افسانے

مرتبہ: ڈاکٹر اطہر پرویز

اردو افسانوی ادب کا سنگ میل

جس میں پریم چند سے لے کر قرۃ العین حیدر تک کے وہ افسانے ہیں جو:

- دنیا کے بہترین افسانوں کی صف میں رکھے جا سکتے ہیں۔
- اردو کے تیس سالہ افسانوی ادب کا نچوڑ ہے۔ اطہر پرویز کے ایک جامع پیش لفظ کے ساتھ جس سے افسانے کے فن اور اس کے عالمی معیار پر روشنی پڑتی ہے۔

قیمت مجلد: ۱۵/۰۰ طلبا ایڈیشن: ۱۲/۰۰

منٹو کے نمائندہ افسانے

مرتبہ: ڈاکٹر اطہر پرویز

- اردو کے افسانوی ادب میں منٹو کا منفرد اور نمایاں مقام ہے۔
- اس نے صرف قارئین ہی کو نہیں چونکایا، بزرگوں اور مصنفوں کو بھی مضطرب کر دیا۔
- "ٹھنڈا گوشت"، "کالی شلوار"، "پھاہا"، "دھواں" اور "بو" جیسے افسانے جن سے عدالتیں جز بز ہوگئیں اس مجموعہ میں مکمل حالت میں شامل ہیں۔
- "ہتک"، "ٹوبہ ٹیک سنگھ"، "گوپی ناتھ"، "موذیل" اور "نیا قانون" جیسے لافانی افسانے اس مجموعہ کی زینت ہیں۔

○ یہ مجموعہ منٹو کے نمائندہ افسانوں کی صحیح معنوں میں نمائندگی کرتا ہے ۔
○ منٹو اور اس کے فن پر ڈاکٹر اطہر پرویز نے ایک سیر حاصل مقدمہ بھی تحریر کیا ہے، جو منٹو پر لکھے گئے مضامین اور تنقیدوں میں اضافہ ہے ۔

بہترین کتابت، طباعت اور گٹ اپ ۔

قیمت مجلد : ۱۲/۰۰
قیمت طلبا ایڈیشن : ۸/۰۰

نمائندہ مختصر افسانے

پروفیسر طاہر فاروقی

چند ممتاز افسانہ نگاروں کے افسانے مثلاً پریم چند، علی عباس حسینی، خواجہ حسن نظامی، نیاز فتحپوری، کرشن چندر، عصمت چغتائی، کنھیا لال کپور، راجندر سنگھ بیدی، سعادت حسن منٹو وغیرہ کے افسانے مع افسانے کا ارتقا، افسانے کی تعریف اور افسانہ نگاروں پر تبصرہ ۔

قیمت : ۵/۰۰

نذیر احمد کی کہانی کچھ انکی کچھ میری زبانی

مرزا فرحت اللہ بیگ دہلوی

مرزا فرحت اللہ بیگ نے اپنے محترم استاد شمس العلماء ڈاکٹر مولوی نذیر احمد کی نجی زندگی اور سچی بیوگرافی کا نقشہ کھینچا ہے ۔ مولانا کے اچھے اور ناپسند دونوں پہلوؤں کو عقیدت اور طنز میں سمو کر اپنے مخصوص مزاحیہ طرز میں تحریر کیا ہے ۔ بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب اس کتاب کے مقدمہ میں تحریر فرماتے ہیں کہ "کون ہے جو نذیر احمد کی کہانی پڑھ کر مرزا فرحت اللہ بیگ کو داد نہ دے گا۔ نذیر احمد ایک سچے اور کامیاب طالب علم کی بے نظیر مثال ہیں ۔ یہ کتاب ایسی ہے جو ہر طالب علم کے پیش نظر رہنی چاہیئے ۔ اس میں ان کے عکسی خطوط بھی ہیں ۔

قیمت : ۲/۵۰

تنقیدی سرمایہ

عبدالشکور

اس کتاب میں اردو ادب کے ابتدائی ناقدین پر سیر حاصل تبصرہ کیا گیا ہے اور فن

تنقید کی مسلسل تاریخ کے علاوہ ان تنقیدی رجحانات کا بھی جائزہ لیا گیا ہے جو اردو ادب میں وقتاً فوقتاً ظاہر ہو کر تنقیدی لٹریچر پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ تنقید کے طلباء اور اہلِ ذوق کے لئے بے حد مفید کتاب ہے۔

قیمت : ۲/۵۰

منتخب ادبی خطوط

مرتبہ مغیث الدین فریدی

غلام غوث بےخبر، غالب، شبلی، ریاض، ایم۔ مہدی حسن، ابوالکلام آزاد اور خورشید الاسلام وغیرہ کی خطوط نگاری پر تبصرہ۔

قیمت : ۱/۲۵

مقدمۂ شعر و شاعری

خواجہ الطاف حسین حالی

ڈاکٹر وحید قریشی نے مقدمۂ شعر و شاعری کے پہلے ایڈیشن ۱۸۹۳ء کے متن سے موازنہ کر کے کامل صحت کے ساتھ ترتیب دیا ہے۔ شروع میں مرتب نے تحقیقی و علمی مقدمہ شامل کیا ہے اور آخر میں ایسے حواشی شامل کئے ہیں جو اردو دنیا کے سامنے پہلی مرتبہ آئے ہیں۔ یہ حالی کی قابلِ اعتبار دستاویز ہے اور محققین و طلباء کے لئے رہنما ہے۔

قیمت : ۷/۵۰

مثنوی سحر البیان

ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی

میر حسن دہلوی کی مثنوی سحر البیان اردو ادب کے کلاسیکی سرمایہ میں ناقابلِ فراموش سرمایہ ہے۔ ایک صدی سے زیادہ زمانہ گذرنے کے باوجود اس کا مطالعہ آج بھی ناگزیر ہے۔ مثنوی سے بہرہ حاصل استفادہ میں آسانی فراہم کرنے کے لئے ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی نے اس پر ایک طویل مقدمہ لکھا ہے جس میں اس کے موضوع، کردار، سماجی و تہذیبی پس منظر اور فنی محاسن پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ نصابی ضروریات کے لئے بھی اس نسخہ کا مطالعہ افادہ بخش ہوگا۔

قیمت : ۵/۰۰

مثنوی گلزار نسیم

مرتبہ ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی

پنڈت دیا شنکر نسیم نے گلزار نسیم لکھی ہے۔ ان کا یہ زندۂ جاوید کارنامہ مثنوی گلزار

نسیم المعروف بہ قصۂ گل بکاؤلی مع تنقید وتبصرہ وتشریحات پیش کیا گیا ہے۔
قیمت : ۵/۰۰

مجموعہ نظم حالی
مرتبہ ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی

شمس العلماء مولانا خواجہ الطاف حسین حالی کی مختلف اوقات کی لکھی ہوئی پندرہ نظموں کا مجموعہ مع تنقید، تبصرہ وتشریحات وغیرہ۔

قیمت : ۵/۰۰

سفینہ ادب ۔ از محمد محسن ۔ ثانوی درجہ تک اردو زبان دانی کی تعلیم کے لئے ذہنی نشو ونما اور انداز بیان کو بہتر بنانے کے لئے پہلی کارآمد کتاب۔ قیمت : ۳/۰۰

ساقی نامہ (اقبال) مع تنقید وتبصرہ وتشریحات وغیرہ۔ قیمت ۹۵/۰

انشاء وخطوط نویسی

گلدستۂ مضامین وانشاء پردازی
ڈاکٹر محمد عارف خاں

اس میں اصول مضمون نگاری اور مختلف مضامین ہیں جو کہ اخلاقی، تمدنی، طبعی، تاریخی، ایجادات، سائنسی صنعتی وغیرہ وغیرہ اور نئے عنوانات پر جدید مضامین ہیں۔ دوسرے حصہ میں خطوط نویسی اور خطوط نویسی کیا ہے، خط کے حصے اور خطوط نویسی سے متعلق ہدایات ہیں اور خطوط و درخواستوں کے نمونے دیئے گئے ہیں۔ ان کے علاوہ اس کتاب میں ضرب الامثال مع مطالب، متضاد الفاظ، ہم آواز الفاظ اور واحد جمع ومحاورے اور مطلب وغیرہ بھی دیئے ہوئے ہیں۔
قیمت : ۶/۹۵

کامرس

ہائر سیکنڈری بک کیپنگ اینڈ اکاؤنٹس (حصہ اوّل) ڈاکٹر محمد عارف خاں

یہ کتاب مختلف یونیورسٹیوں و بورڈوں کے ہائی اسکول ہائر سیکنڈری اور پری یونی ورسٹی کے جدید نصابات کے مطابق لکھی گئی ہے۔ اس میں مندرجہ ذیل سبق شامل ہیں۔

انٹروڈکشن ٹو بک کیپنگ، اکاؤنٹینسی اکیویشن، ڈبل اینٹری بک کیپنگ، جنرل لیجر، پرچیز سیل اور ریٹرن بک، کیش بک، بنک ٹرانزیکشن، بل ٹرانزیکشن، جنرل پرچیز، غلطیاں اور ان کی تصحیح، ٹرائیل بیلنس شیٹ، فائنل اکاؤنٹ اور سادہ ترمیمات، فائنل اکاؤنٹ اور ضروری ترمیمات، ورک شیٹ، کیپٹل اور ریونیو ٹرانزیکشن، سنگل انٹری سسٹم، وصولیابی و ادائیگی و آمدنی اور اخراجات کھاتے اور معروضی سوالات وغیرہ شامل ہیں۔ قیمت : ۳۰/۰۰

ہائر سیکنڈری بک کیپنگ اینڈ اکاؤنٹس (حصہ دوم) از ڈاکٹر محمد عارف خاں

یہ کتاب مختلف یونیورسٹیوں اور بورڈس کے ہائر سیکنڈری و پری یونیورسٹی اور بی۔ کام کی کلاسوں کے جدید نصاب کے مطابق ہے۔ اس میں حسب ذیل عنوانات شامل ہیں :

کنسائنمینٹ آف گڈس، جائنٹ وینچر، ایوریج ڈیوڈنٹ، حساب رواں، پارٹنر شپ اکاؤنٹ، اکاؤنٹ آف جائنٹ اسٹاک کمپنی، ڈیپری سیشن اکاؤنٹ وغیرہ اور آخر میں مشقی سوالات ہیں۔ قیمت : ۳۰/۰۰

ایڈوانسڈ اکاؤنٹس (مع کوسٹ اکاؤنٹ و آڈٹنگ)

از ڈاکٹر محمد عارف خاں

یہ کتاب مختلف یونی ورسٹیوں کی انٹرمیڈیٹ، بی۔ کام اور ایم۔ کام کے جدید نصابات کے مطابق لکھی گئی ہے۔ اس میں حسب ذیل عنوانات شامل ہیں۔

ڈیپریسیشن اکاؤنٹ، ریزرو اینڈ پروزن، سمپل اینٹری سسٹم، رائیلٹی اکاؤنٹ، ہائر پرچیز و ڈیپارٹمنٹل اور برانچ اکاؤنٹس، اکاؤنٹس آف سوسائٹی اور انسٹی ٹیوشن، بنک اور انشورنس اکاؤنٹس، ڈبل اکاؤنٹ سسٹم، سیلف بیلنسنگ لیجر، میکینائزڈ اکاؤنٹنگ، مینجمنٹ انسولوینسی اکاؤنٹ، متفرق اکاؤنٹس، کوسٹ اکاؤنٹ اور اوڈیٹنگ اکاؤنٹس وغیرہ وغیرہ دیئے ہوئے ہیں۔ قیمت ۲۵/۰۰

جدید طریقہ و تنظیم تجارت (ماڈرن بزنس میتھڈ اینڈ آرگنائزیشن)

از ڈاکٹر محمد عارف خاں

اس کتاب میں تجارت سے متعلق موجودہ طریقے بیان کئے گئے ہیں۔ یہ کتاب ہائر سیکنڈری پری یونیورسٹی و بی۔کام کے طلبار کی ضرورت کو پورا کرتی ہے۔ اس میں حسب ذیل عنوانات ہیں:

انٹروڈکشن ٹو بزنس، تجارت اور پیداوار کا تعلق، فورمس آف بزنس آرگنائزیشن، سول پروپرائٹر، پارٹنرشپ، جائنٹ اسٹاک کمپنی، کوآپریٹو آرگنائزیشن، گورنمنٹ انٹرپرائز، لارج اسکیل بزنس آرگنائزیشن، آرگنائزیشن آف ہوم ٹریڈ اور ڈسٹری بیوشن آف کموڈیٹیز، مڈل مین، مال فروخت کرنے کی شرائط ایک تجارتی سودے کی مختلف منزلیں، ہول سیل بزنس، ریٹیل ٹریڈ، ڈیپارٹمنٹل اسٹور، ملٹی شاپ، میل آرڈر بزنس، سپر بازار، ہائر پرچیز وغیرہ وغیرہ، غیرملکی تجارت، ایکسپورٹ امپورٹ ٹریڈ وغیرہ، غیرملکی تجارت سے متعلق خط وکتابت ملکی بیجک اور حساب فروخت، فروخت بڑھانے کے طریقے، ملکی تجارت میں ادائیگی، بنک اور بنک کاری ازر کا بنیادی طریقہ وغیرہ وغیرہ۔ قیمت: ۲۰/۰۰

سباسبات

دنیاکی حکومتیں (ورلڈ کانسٹی ٹیوشن) نیا ایڈیشن ڈاکٹر محمد ہاشم قدوا

دنیا کی حکومتوں میں برطانیہ، کناڈا، امریکہ، سودیت روس، سوئزرلینڈ، جاپان، چین اور ہند یونین کے نظام حکومت کو عام فہم زبان میں پیش کیا گیا ہے اور کوشش کی گئی ہے طلبا ان ملکوں کے دستور اور طرز حکومت کو اچھی طرح سمجھ سکیں۔ ضرورت کے لحاظ سے کتاب کو جامع مکمل اور اپ ٹوڈیٹ بنایا گیا ہے اور عام فہم انداز میں آسان اردو میں لکھا گیا ہے۔ ہر سبق کے آخر میں مختلف یونی ورسٹیوں کے امتحانی سوالات دیئے گئے ہیں۔ قیمت : ۰۰/-

جمہوریۂ ہند کا دستور اساسی (کانسٹی ٹیوشن آف انڈیا) ڈاکٹر محمد ہاشم قدوا

جمہوریۂ ہند کا یہ ایڈیشن مع تازہ ترین تبدیلیوں اور معلومات پر مشتمل ہے۔ اردو اصطلاح کے ساتھ انگریزی مترادفات بھی دیئے گئے ہیں۔ حالات اور ضرورت کے لحاظ سے کتاب کو جامع اور مکمل اور اپٹوڈیٹ بنایا گیا ہے۔ جمہوریۂ ہند کے جدید دستور کی مختصر تاریخ کے علاوہ اس میں دستور کی خصوصیتیں، شہریت، بنیادی حقوق، مملکتی پالیسی، انڈین یونین، مرکزی حکومت مجلس قانون ساز یا پارلیمنٹ، ریاستی حکومت، ریاستی مجلس قانون ساز، سپریم کورٹ، ہائی کورٹ، پبلک سروس کمیشن، لوکل سلف گورنمنٹ، کارپوریشن، اترپردیش، میونسپل بورڈ، ڈسٹرکٹ بورڈ، گاؤں پنچایت، انتخابات، انتظامی، ہندوستان کے بعض سماجی مسئلے جیسے بیروزگاری کا اور گورنمنٹ کا پنج سالہ منصوبہ مع تیسرا منصوبہ بھی شامل ہے۔ یہ کتاب سوکس کے دوسرے پرچے کے لئے ہے۔ اس میں سوالات بھی دیئے گئے ہیں تاکہ طالب علموں کو سمجھنے میں سہولت ہو۔ یہ کتاب ہائی اسکول اور پری یونی ورسٹی کے لئے علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی میں رائج ہے اور ہائر سیکنڈری اور انٹرمیڈیٹ کے لئے دوسرے بورڈ نے منظور کر رکھی ہے۔ قیمت : ۰۰/-

مبادئ سیاسیات (ایلیمنٹس آف پالیٹکس) از ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی

برائے انٹرمیڈیٹ، ہائر سیکنڈری اور پری یونیورسٹی وغیرہ کے لئے خاص طور پر لکھی گئی ہے جس میں حسب ذیل مضامین ہیں:- (۱) علم سیاسیات کی تعریف اور نوعیت (۲) سیاسیات کا دوسرے سماجی سائنسوں سے تعلق (۳) مملکت کی تعریف اور اس کے اجزاء (۴) مملکت اور اس کی قسمیں (۵) مملکت کی ابتدا اور ارتقاء (۶) اقتدار اعلیٰ (۷) قانون (۸) دستور اساسی (۹) مملکت کے مقاصد اور فرائض (۱۰) جمہوریت اور رائے عامہ (۱۱) اعضائے حکومت اور نظریہ تفریق اختیارات (۱۲) مجلس قانون ساز (۱۳) حق رائے دہی (۱۴) سیاسی پارٹیاں (۱۵) جماعت عاملہ (۱۶) عدلیہ (۱۷) مقامی حکومت (۱۸) قوم پرستی (۱۹) بین الملکیت اور بین الاقوامی تنظیم وغیرہ وغیرہ شامل ہیں۔

قیمت : ۱۰/۰۰

تاریخ وجغرافیہ

تاریخ وتہذیب عالم (ورلڈ ہسٹری اینڈ سویلزیشن) اے۔ اے۔ ہاشمی

ورلڈ ہسٹری کی کتاب اردو میں لکھی گئی ہے۔ اس کتاب میں مندرجہ ذیل ملکوں کی تہذیبوں اور حکومتوں کے بارے میں لکھا گیا ہے:۔ مصر، بحر روم کی تہذیب، یونان کی تہذیب، روم کی سلطنت اور تہذیب، چین کی ابتدائی تہذیب اور ایرانی سلطنت، جاپان، ترک، منگول، عرب، خلافت امیہ، خلافت عباسیہ، عیسائی، انگریز، امریکن، فرانسیسی، نپولین، صنعتی اور سوشلزم انقلاب شہنشاہیت اور بین الاقوامی مجلس وغیرہ۔

قیمت : ۱۵/۰۰

اسلامی تاریخ اے۔ اے۔ ہاشمی

عام فہم اور آسان زبان میں تاریخ اسلام کو پیش کیا گیا ہے تاکہ طلبہ اسے درسی ضروریات کے، اور کم تعلیم یافتہ حضرات اپنی معلومات میں اضافہ کے لئے رہنما بنا سکیں۔ اس میں ولادت رسول سے خلافت مصر تک کی تاریخ کو مختصراً بیان کیا گیا ہے۔ اور آخر میں

تہذیب و تمدنِ عالم میں عربوں کے اضافہ کا جائزہ لیا گیا ہے۔ قیمت : ۵/۰۰

ہمارا جغرافیہ (حصہ اول) از افضال احمد صدیقی

اس کتاب میں ہندوستان کا جغرافیہ بہت سلیس زبان میں دیا ہوا ہے۔ ہر سبق کے آخر میں سوالات کے بعد عملی کام دیا گیا اور طلبار کی آسانی کے لئے نقشے، ماڈل اور چارٹ بھی دیئے گئے ہیں۔ قیمت : ۲/۷۵

ہمارا جغرافیہ (حصہ دوم) از افضال احمد صدیقی

اردو زبان میں ایشیا کے جغرافیہ پر کوئی ایسی کتاب نہیں تھی جس سے طلبار فائدہ اٹھا سکیں۔ لہٰذا اس کتاب میں اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ طلبار کو ایشیا کی جغرافیائی معلومات حاصل ہو سکیں۔ ہر سبق کے آخر میں سوالات کے بعد عملی کام بھی دیا گیا ہے تاکہ یہ کام طلبار اپنی مدد سے انجام دے سکیں۔ اس کتاب میں نقشے، ماڈل اور چارٹ بھی دیئے گئے ہیں تاکہ طلبار آسانی سے سمجھ سکیں۔ قیمت : ۳/۷۵

ہمارا جغرافیہ (حصہ سوم) از افضال احمد صدیقی

اس کتاب میں عالمگیر جغرافیہ کو بہت مختصر خلاصہ اور سلیس زبان میں پیش کیا گیا ہے تاکہ طلبار کو جغرافیائی اصولوں کو سمجھنے میں کوئی دقت نہ ہو۔ طلبار کی آسانی کے لئے ضروری مسائل پر نقشے بھی فراہم کئے گئے ہیں تاکہ سمجھنے میں مدد ملے اور ہر سبق کے آخر میں سوالات بھی ہیں۔ قیمت : ۳/۷۵

متفرق

جدید تعلیمی مسائل (ایجوکیشنل پرابلمس) از ڈاکٹر ضیاء الدین علوی

اس کتاب کا مقصد اردو داں طبقہ کو جدید تعلیمی قدروں سے روشناس کرانا ہے اور یونیورسٹی کے ابتدائی درجوں کے طلبہ کی درسی ضروریات کو پورا کرنا ہے اور روزمرہ پیش آنے والے تعلیمی مسائل، تعلیم کے جدید نظری اور عملی رجحانات کی روشنی میں سمجھے جائیں۔

اس کتاب میں اصول تعلیم، نفسیات تعلیم، طریق تعلیم، نصاب، ملک کا تعلیمی نظام اور اس کے مسائل، فلسفہ اور تعلیم اور سماجیات اور تعلیم وغیرہ وغیرہ کے ابواب شامل ہیں اور آخر میں جدید تعلیم کا تاریخی پس منظر اور چند مغربی اور مشرقی کے ابواب بھی ہیں۔ قیمت : ۹/۰۰

اصولِ تعلیم (از ڈاکٹر ضیاء الدین علوی

تعلیم کے موضوع پر اردو زبان میں درسی کتابوں کی بہت کمی ہے جس کی وجہ سے طلباء کو بڑی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اصولِ تعلیم پر تو بالخصوص ایک مستند کتاب کی ضرورت محسوس کی جاتی ہے۔ انہیں حالات کے تحت یہ کتاب ناظرین کی خدمت میں پیش کی جا رہی ہے۔

اس کتاب میں مندرجہ ذیل مباحث شامل ہیں :۔ تعلیم کا مفہوم بعد مقاصد، مختلف نظامات فلسفہ اور ان کا تعلیم سے تعلق، سماجیات اور اس کا تعلیم سے تعلق، نصاب، طریق تعلیم اور تعلیمی کی جانچ وغیرہ۔ آخر میں ضمیمہ میں روسو، ڈیوی اور گاندھی کے تعلیمی نظریات کے اقتباسات دیئے گئے ہیں تاکہ طلباء کو دنیا کے چند بڑے مفکرین تعلیم کے خیالات خود ان کی زبان سے معلوم ہو سکیں۔

قیمت : ۱۲/۰۰

تعلیمی نفسیات کے نئے زاویئے (ایجوکیشنل سائیکلوجی) از مسرت زمانی ابن فرید

(NEW ASPECTS OF EDUCATIONAL PSYCHOLOGY)

چوتھا ایڈیشن ـــ ترمیم و اضافہ کے ساتھ

- ○ تعلیمی نفسیات کے بنیادی نوعیت کے تمام نصابوں کے لئے ناگزیر کتاب۔
- ○ یہ کتاب ٹریننگ کالج، پری یونیورسٹی، انٹرمیڈیٹ اور گریجویٹ طلباء کے لئے جدید نصابات کے مطابق تیار کی گئی ہے۔
- ○ یہ کتاب جدید نصابی تقاضوں کے مطابق باتصویر ہے اور جدول و نقشہ جات سے مزین ہے۔
- ○ یہ کتاب اٹھارہ ابواب پر مشتمل ہے جن کے عنوانات مندرجہ ذیل ہیں: نفسیات کی تعریف، شخصیت کی نشو و نما، کردار اور شخصیت کی جسمانی بنیاد، نظام عصبی، محسوسات، نشو و نما، احساسات و جذبات، ادراک، توجہ، مشاہدہ، اکتساب، تکان، حافظہ، ذہانت، شخصیت اور سیرت، فکر و تخیل، دماغی صحت، تعلیمی و حرفتی رہنمائی۔
- ○ تمام اصطلاحات کے انگریزی و اردو متبادلات ساتھ ساتھ دیئے گئے ہیں تاکہ مباحث کو سمجھنے میں کسی طرح کی دقت نہ ہو۔
- ○ انتہائی خوبصورت اور اعلیٰ و معیاری کتابت و طباعت جو ایجوکیشنل بک ہاؤس کا امتیاز ہے۔

قیمت : ۱۰/۰۰

عام معلومات ڈاکٹر ضیاء الدین علوی نظرثانی: ڈاکٹر اشفاق محمد خاں

- ○ جنرل سائنس سے لے کر معلوماتِ عامہ کے تمام مضامین اس کتاب میں شامل ہیں۔
- ○ اس کتاب میں ہماری زمین اور اس پر بسنے والے جانداروں کی زندگی کے بارے میں ہی نہیں بلکہ ہندوستان کا جغرافیہ، ہندوستان کی تاریخ، ہندوستانی جمہوریہ، روزمرہ کی زندگی میں سائنس کی اہمیت جیسے مسائل کا ذکر ہے۔
- ○ اردو زبان میں اپنی نوعیت کی پہلی معلوماتی کتاب۔

قیمت : ۵/۰۰

ایجادات کی کہانی
از ڈاکٹر ضیاء الدین علوی

- یہ کتاب عہد قدیم سے لے کر عہد حاضر تک کی اہم ایجادات کے بارے میں اہم معلومات کا خزانہ ہے۔
- اردو زبان میں ایک ایسی انسائیکلو پیڈیا ہے جو دلچسپ بھی ہے اور مفید بھی۔
- انسانی تہذیب کے عہد بہ عہد ارتقاء اور نئے نئے کارناموں کا ایک مکمل جائزہ ہے۔ قیمت : ۵۰/۴

رہبرِ صحت
از مسرت زمانی

جس میں حفظانِ صحت اور اس کی اہمیت، صفائی و تندرستی، تشریح الاعضاء، تیمارداری، اتفاقیہ حادثات و مجروح کی پہلی امداد، پٹیاں اور ان کا استعمال، امراض و حفاظت و جراثیم و بچاؤ ٹیکہ، بچے کی پرورش، تعلیم و نگہداشت و سوالات وغیرہ دلچسپ اور آسان اردو میں موجود ہیں۔ قیمت : ۵/۰۰

علمِ خانہ داری (نیا ترمیم شدہ ایڈیشن)
مسرت زمانی

اس کتاب میں انتظاماتِ خانہ داری اور امور خانہ داری کے مختلف شعبوں سے متعلق ضروری تعلیم دی گئی ہے۔ اس کے علاوہ اس میں باورچی خانہ کے تحت مختلف قسم کے ہندوستانی انگریزی و نیز بیماروں کے لئے کھانے پکانے کے طریقے، آئس کریم، پڈنگ، کباب، مرغ مسلّم، پلاؤ، دہی بڑے، پکوڑیاں، زبان، سری پائے، ٹافی، چاکلیٹ، اچار، مربّے، تقریبوں اور تیوہاروں کا انتظام، گھر کی منتظمہ کے فرائض، کپڑوں کا انتخاب، دھونا، استری کرنا، رنگنا، داغ دھبّوں کا دور کرنا وغیرہ کی ترکیبیں شامل ہیں۔ نئے ایڈیشن میں افزائش حسن، لباس اور سوئی کا کام کے ابواب کا اضافہ کیا گیا ہے۔ قیمت : ۱۰/۰۰

بچوں کی تربیت
مسرت زمانی

اس میں بچہ کی پیدائش کے قبل اور اس کے بعد کی حفاظت، نگہداشت اور

بچوں کی جسمانی، دماغی، اخلاقی نشوونما کی تربیت و اصولوں اور نگہداشت وغیرہ کے طریقے ہیں۔ اس کتاب کی تعریف مہاتما گاندھی اور پرنسپل طبیہ کالج علی گڑھ، آل انڈیا ریڈیو دہلی اور لکھنؤ وغیرہ و دیگر ہستیوں نے کی ہے۔ یہ کتاب ہندوستان کی مختلف یونیورسٹیوں کے نصاب میں داخل ہے۔
قیمت : ۵/۰۰

ہندوستان کا تہذیبی ورثہ

از ڈاکٹر ضیاء الدین علوی

اس میں ہندوستان کے قدیم تہذیبی ورثہ اور دور حاضر کے اقتصادی، سیاسی اور سماجی مسائل پر آسان اردو میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ جنرل ایجوکیشن کے مقاصد پر ایک مختصر بحث بھی شامل ہے اور پڑھنے والوں کی آسانی کے لئے ہر سبق کے آخر میں بحث و مباحثہ کے عنوانات اور مزید مطالعہ کے لئے اشارات و سوالات بھی شامل ہیں۔
قیمت : ۲/۲۵

قواعد و گرامر و لغت

اردو میں مشکل الفاظ کی بہترین فرہنگ

فیروز اللغات

(جیبی ایڈیشن)

(فوٹو آفسٹ سے طبع شدہ)

طلباء اور معمولی میں حصہ لینے والے شائقین کے لئے اس لغت میں :

- بیس ہزار سے زیادہ الفاظ اور ان کے معانی ہیں۔
- تمام الفاظ پر اعراب لگائے گئے ہیں تاکہ صحیح تلفظ کیا جاسکے۔
- ہر اسم کی تذکیر و تانیث بھی بتائی گئی ہے۔
- اس میں تمام متداول اور مشکل الفاظ ہیں جو درسی اور ادبی کتب اور اخبارات و رسائل میں استعمال ہوتے ہیں۔
- وہ تمام افعال دیئے گئے ہیں جن کے ساتھ کوئی محاورہ وابستہ ہے۔

قیمت مجلد : ۶/۵۰
پلاسٹک کور : ۷/۰۰

اُردو صرف

مؤلفہ: ڈاکٹر محمد انصار اللہ

اردو میں قواعد کی کتابیں بہت لکھی گئی ہیں لیکن —— "اردو صرف" اس سلسلہ کی تازہ ترین کتاب ہے —— جو

- اردو کے ہر طالب علم کے لئے مفید اور کارآمد ہے اور ان کی مشکلات کو دور کرتی ہے۔
- مروجہ مشکل اصطلاحوں کے معنی و مفہوم کو واضح کرتی ہے۔
- علم صرف کے مبادیات پر مشتمل ہے اور اس میں مجملاً صرف کے اصولوں اور بعض مصطلحات کا ذکر ہے۔
- قواعد کے مسائل الجھے ہوئے ہیں ان کا حل پیش کرتی ہے۔
- کلمے کی مختلف قسموں اور حالتوں اور ان کے بنائے جانے کے مختلف طریقوں سے متعلق بحثوں پر مشتمل ہے۔

قیمت : ۲/۹۵

اُردو نحو

مؤلفہ: ڈاکٹر محمد انصار اللہ

نحو میں جہاں ایک جانب جملے کے اجزا یعنی اسم، ضمیر، صفت، فعل اور صرفوں اور ان کی جنس، تعداد اور حالت وغیرہ سے بحث کی جاتی ہے —— وہاں دوسری جانب: جملے کی ساخت —— مختلف کلمات کے جملوں میں استعمال کے طریقوں اور اس استعمال کی حالت میں واقع ہونے والی تبدیلیوں کا بیان ہوتا۔

طلبا کے لئے "اردو نحو" پر یہ کتاب بہت سیدھے سادے انداز میں لکھی گئی جسے طالب علم استاد کی مدد کے بغیر پڑھ سکتے ہیں۔

قیمت : ۱/۹۵

فارسی

نصابِ فارسی
مرتبہ ڈاکٹر غلام سرور

نصاب فارسی برائے امتحان ہائی اسکول و منشی و ادیب وغیرہ کے لئے لکھی گئی ہے۔ ایران کے جدید و قدیم نثر نگار اور شعرار کے کلام کا انتخاب ہے۔ قیمت : ۴/۰۰

سخنِ نو (انتخاب نثر و نظم فارسی۔ تین حصے)
مرتبہ ڈاکٹر غلام سرور

- جدید فارسی کا ایک ایسا انتخاب جو جدید فارسی کے طالب علم کے لیے رہنما کی حیثیت رکھتا ہے۔
- یہ تینوں انتخابات سلسلہ وار بھی ہیں اور ان کو علیحدہ طور پر بھی پڑھا جا سکتا ہے۔
- یہ نصاب کے لئے بھی کارآمد اور فارسی کے عام مطالعہ کے لئے بھی مفید ہے۔

حصہ اوّل برائے ہائی اسکول : ۳/۵۰ حصہ دوم برائے انٹرمیڈیٹ : ۲/۵۰
حصہ سوم برائے بی۔ اے۔ : ۲/۷۵

گلہائے بہار
از ڈاکٹر غلام سرور

یعنی انتخاب شعر فارسی جدید۔ پروفیسر صاحب ایران گئے تھے۔ وہاں کے مشہور شعرائے فارسی جدید کے کلام کا انتخاب لے کر آئے۔ یہ کتاب بی۔ اے۔ اور علوم مشرقی کے لئے بیحد مفید ہے۔ قیمت ۲/

انتخاب غزلیات فیضی
مرتبہ ڈاکٹر محمد ابراہیم قاضی

- فیضی ہندوستان کی ان باکمال ہستیوں میں سے ہیں جنھوں نے امیر خسرو کی روایت کو آگے بڑھایا اور فارسی میں ایران کے شعرا کی سطح کی شاعری کی۔
- فیضی کا یہ انتخاب، فیضی کی شاعری کی بڑی اچھی نمائندگی کرتا ہے۔
- ہندوستان کے فارسی گو شعرا میں فیضی کا مقام بلند ہے اور "انتخاب غزلیاتِ فیضی" اس کا بہترین ثبوت فراہم کرتا ہے۔

قیمت : ۲/۰۰

دینیات

نصابِ دینیات (حصہ اول) — ڈاکٹر اقبال حسن خاں

اس کتاب میں اسلام کے بنیادی اصول، عقائد، عبادات، سیرت نبوی اور خلافت راشدہ کے بارے میں ضروری معلومات دلکش اور سادہ انداز بیان کے ساتھ پیش کی گئی ہیں۔
بچوں سے لے کر بڑوں تک کے لئے دلچسپ اور کارآمد۔

قیمت : ۶/۵۰

نصابِ دینیات (حصہ دوم) — ڈاکٹر اقبال حسن خاں

- یہ کتاب دینی مسائل اور ان کے مختلف پہلوؤں سے مسلمانوں کو روشناس کرتی ہے۔
- اس کتاب میں سیرت نبوی کا تاریخی اور علمی پہلو قرآن مجید کا نزول، اسلام کا معاشرتی نظام وغیرہ کا تفصیلی جائزہ ہے۔

قیمت : ۴/۰۰

نصابِ دینیات (حصہ سوم) — ڈاکٹر اقبال حسن خاں

- اس کتاب میں فقہ کے مفہوم، ماخذ و تاریخ اور احکام و مسائل پر ضروری مواد فراہم کیا گیا ہے۔
- اسلام کے اخلاقی نظام و رہنمایانِ دین کے کارناموں کو سیدھی سادی زبان میں بیان کیا گیا ہے۔
- یہ کتاب مسلمانوں کو ان کے دین سے باخبر کرتی ہے۔

قیمت : ۴/۵۰

العقیدۃ الحسنہ

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی قدس سرہٗ العزیز کے مایۂ ناز رسالہ العقیدۃ الحسنہ کا اردو ترجمہ مع سوانح حیات حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی و ضروری اور مفید حواشی کے ساتھ جس میں تمام مشکل الفاظ

فلسفیانہ اصطلاحات، فقہی نکات اور عقائد کے مشکل مقامات کو نہایت آسان اردو میں بیا
کیا گیا ہے۔
قیمت : ۷۵/

کتاب الحقوق و کتاب الصدق

یعنی ترجمہ دو ابواب کتاب احیاء العلوم الدین امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کا آسان اردو
ترجمہ کیا گیا ہے۔
قیمت : ۰۰/

ہادیانِ دین
از سید فرمان حسین

قدیم روایات اور جدید تحقیقات کے درمیان توازن کا اعلیٰ شاہکار، سلسلۂ ہدایت کی
اہم تاریخ، انبیاء علیہم الصلوٰۃ والتسلیم اور ائمہ معصومینؑ کی سوانح حیات، شیعہ طلباء کے لئے بالخصوص
اور تمام امتِ محمدیؐ کے لئے بالعموم قابل مطالعہ کتاب، جس میں مصنف نے بڑی ہی کاوش اور
تحقیق سے واقعات کو ترتیب دیا ہے۔ کتاب کا مطالعہ تاریخ اسلام کی معلومات میں گوناگوں
اضافہ کا ضامن ہے۔
قیمت : ۵/۵۰

قولِ سدید
از مولوی ضیاء احمد بدایونی

یعنی دورِ خلافتِ معاویہ و یزید جس کو عباسی نے لکھا ہے اور وہ ہندوستان اور پاکستان
میں ضبط کر لی گئی ہے۔ اس کا جواب مولوی ضیاء احمد بدایونی سابق پروفیسر صدر شعبۂ فارسی
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے نہایت تحقیق اور کمال سنجیدگی سے کتاب مذکور میں لکھا اور عباسی کے
گمراہ کن دلائل کا پردہ چاک کیا ہے۔
قیمت : ۲/۲۵

جلوۂ حقیقت
از مولوی ضیاء احمد بدایونی

- مذہبی مضامین کا ایک نادر مجموعہ جس میں تاریخِ اسلام کی قدیم مستند روداد کا لب لباب ہے۔
- اس میں عقیدۂ رسالت کی ضرورت، حدیث کی عظمت، سیرت مرتضوی کی ایک جھلک، واقعۂ کربلا، اس کا منظر و پس منظر وغیرہ وغیرہ۔ ان تمام مسائل پر سیر حاصل بحث ہے۔

قیمت : ۸/-

متفرق قاعدہ وغیرہ

اردو کا نیا آسان قاعدہ

اردو کے قدیم قاعدے جو بچوں کے ذہن کے لئے ایک بارِ عظیم تھے۔ اعراب کی الجھنیں، مرکبات کی دشواریاں، مہمل الفاظ کی بہتات سے بچے گھبرا جاتے تھے یا ملائے مکتب کی ضربات بید سے نوازے جاتے تھے اور بچوں کو رٹنے کی ڈگر پر ڈال دیا جاتا تھا۔ اس نئے آسان قاعدہ نے ان خرابیوں کو دور کیا ہے۔ بچوں کی نفسیات تعلیمی کو اس قاعدۂ تعلیم میں ڈھالا گیا ہے اور یہ ایک نیا اور آسان اور کامیاب باتصویر قاعدہ ہے۔ **قیمت** : حصہ اول ۸۰ پیسے
حصہ دوم ۸۰ پیسے

آسان اردو (حصہ اول، دوم، سوم)

نیا آسان قاعدہ حصہ اول و حصہ دوم کے ختم کرنے کے بعد آسان اردو کی سیریز شروع ہوتی ہے۔ اس سیریز کو مصنف نے بہت ہی اچھے طریقہ سے لکھا ہے اور اس پر جو قصہ اور کہانیاں اور نظمیں دی گئی ہیں وہ بچوں کے اخلاق پر اور دماغ پر اچھا اثر ڈالیں گی۔ قیمت : ایک روپیہ فی حصہ

ہندی کا نیا آسان قاعدہ

یعنی اردو کے ذریعہ از خود ہندی سکھانے والی کتاب۔ اس کتاب کے ذریعہ ایک اردو داں بغیر کسی استاد کے دو تین ہفتے میں خود ہندی سیکھ لیتا ہے اور بے تکلف ہندی کی کتابیں پڑھنے لگتا ہے۔ اس کتاب سے ملک بھر میں ہزاروں نے فائدہ اٹھایا ہے۔ اس سے اچھی اور کوئی کتاب نہیں لکھی گئی ہے۔ قیمت : ۱/۰۰

اردو شکھشک

یہ ہندی کے ذریعہ از خود اردو سکھانے والی کتاب ہے۔ آسان اور سہل ہے۔ اس کے پڑھنے سے بغیر استاد تین چار ہفتے میں اچھی اردو سیکھ سکتے ہیں۔
قیمت : ۱/۵۰

بچوں کی نئی نظمیں حصہ اول، دوم

چھوٹے بچوں کے لئے آسان مفید اور دلکش نظموں کا باتصویر مجموعہ بچوں کو مادری زبان سکھانے اور ان کے اخلاق اور معاشرتی تعلیم دینے کا مؤثر ذریعہ نظم ہی ہے۔ نظموں سے حاصل کی ہوئی باتیں بچوں کے دماغ میں تازہ رہتی ہیں۔ قیمت حصہ اول ۵۰ پیسے حصہ دوم ۷۵ پیسے

فلسفیانہ اصطلاحات فقہی نکات اور عقائد کے مشکل مقامات کو نہایت آسان اردو میں بیان کیا گیا ہے۔
قیمت : ۰/۷۵

کتاب الحقوق و کتاب الصدق

یعنی ترجمہ دو ابواب کتاب احیاء العلوم الدین امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کا آسان اردو میں ترجمہ کیا گیا ہے۔
قیمت : ۱/۰۰

ہادیانِ دین

از سید فرمان حسین

قدیم روایات اور جدید تحقیقات کے درمیان توازن کا اعلیٰ شاہکار، سلسلۂ ہدایت کی اہم تاریخ، انبیاء علیہم الصلوٰۃ والتسلیم اور ائمہ معصومینؑ کی سوانح حیات، شیعہ طلباء کے لئے بالخصوص اور تمام امتِ محمدی کے لئے بالعموم قابل مطالعہ کتاب، جس میں مصنف نے بڑی ہی کاوش اور تحقیق سے واقعات کو ترتیب دیا ہے۔ کتاب کا مطالعہ تاریخ اسلام کی معلومات میں گوناگوں اضافہ کا ضامن ہے۔
قیمت : ۵/۵۰

قولِ سدید

از مولوی ضیاء احمد بدایونی

یعنی دورِ خلافتِ معاویہ و یزید جس کو عباسی نے لکھا ہے اور وہ ہندوستان اور پاکستان میں ضبط کر لی گئی ہے۔ اس کا جواب مولوی ضیاء احمد بدایونی سابق پروفیسر صدر شعبۂ فارسی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے نہایت تحقیق اور کمال سنجیدگی سے کتاب مذکور میں لکھا اور عباسی کے گمراہ کن دلائل کا پردہ چاک کیا ہے۔
قیمت : ۲/۲۵

جلوۂ حقیقت

از مولوی ضیاء احمد بدایونی

- مذہبی مضامین کا ایک نادر مجموعہ جس میں تاریخِ اسلام کی قدیم مستند روداد کا لب لباب ہے۔
- اس میں عقیدۂ رسالت کی ضرورت، حدیث کی عظمت، سیرت مرتضوی کی ایک جھلک، واقعۂ کربلا، اس کا منظر و پس منظر وغیرہ وغیرہ۔ ان تمام مسائل پر سیر حاصل بحث ہے۔

قیمت : -/۸

متفرق قاعدہ وغیرہ

اردو کا نیا آسان قاعدہ اردو کے قدیم قاعدے جو بچوں کے ذہن کے لئے ایک بار عظیم تھے۔ اعراب کی الجھنیں، مرکبات کی دشواریاں، مہمل الفاظ کی بہتات سے بچے گھبرا جاتے تھے یا ملائے مکتب کی ضربات بید سے نوازے جاتے تھے اور بچوں کو رٹنے کی ڈگر پر ڈال دیا جاتا تھا۔ اس نئے آسان قاعدہ نے ان خرابیوں کو دور کیا ہے۔ بچوں کی نفسیات تعلیمی کو اس قاعدۂ تعلیم میں ڈھالا گیا ہے اور یہ ایک نیا اور آسان اور کامیاب باتصویر قاعدہ ہے۔ قیمت : حصہ اول ۸۰ پیسے
حصہ دوم ۸۰ پیسے

آسان اردو (حصہ اول، دوم، سوم) نیا آسان قاعدہ حصہ اول و حصہ دوم کے ختم کرنے کے بعد آسان اردو کی سیریز شروع ہوتی ہے۔ اس سیریز کو مصنف نے بہت ہی اچھے طریقہ سے لکھا ہے اور اس پر جو قصہ اور کہانیاں اور نظمیں دی گئی ہیں وہ بچوں کے اخلاق پر اور دماغ پر اچھا اثر ڈالیں گی۔ قیمت : ایک روپیہ فی حصہ

ہندی کا نیا آسان قاعدہ یعنی اردو کے ذریعہ از خود ہندی سکھانے والی کتاب۔ اس کتاب کے ذریعہ ایک اردو داں بغیر کسی استاد کے دو تین ہفتے میں خود ہندی سیکھ لیتا ہے اور بے تکلف ہندی کی کتابیں پڑھنے لگتا ہے۔ اس کتاب سے ملک بھر میں ہزاروں نے فائدہ اٹھایا ہے۔ اس سے اچھی اور کوئی کتاب نہیں لکھی گئی ہے۔ قیمت : ۱/۰۰

اردو شکھشک یہ ہندی کے ذریعہ از خود اردو سکھانے والی کتاب ہے۔ آسان اور سہل ہے۔ اس کے پڑھنے سے بغیر استاد تین چار ہفتے میں اچھی اردو سیکھ سکتے ہیں۔
قیمت : ۱/۵۰

بچوں کی نئی نظمیں حصہ اول، دوم — چھوٹے بچوں کے لئے آسان مفید اور دلکش نظموں کا باتصویر مجموعہ بچوں کو مادری زبان سکھانے اور ان کے اخلاق اور معاشرتی تعلیم دینے کا موثر ذریعہ نظم ہی ہے۔ نظموں سے حاصل کی ہوئی باتیں بچوں کے دماغ میں تازہ رہتی ہیں۔ قیمت حصہ اول ۵۰ پیسے حصہ دوم ۵۰ پیسے

ہماری خاص خاص مطبوعات ایک نظر میں

اقبالیات

کلیات اقبال اردو (عکسی)	صدی ایڈیشن	۳۰/۰۰
فکر اقبال	خلیفہ عبدالحکیم	۴۰/۰۰
اقبال فن اور فلسفہ	ڈاکٹر نورالحسن نقوی	۷/۵۰
اقبال شاعر اور فلسفی	وقار عظیم	(زیر طبع)
اقبال معاصرین کی نظر میں	″	۲۵/۰۰
تصورات اقبال	مولانا صلاح الدین احمد	۱۵/۰۰
بانگ درا (عکسی)	علامہ اقبال	۱۰/۰۰
بال جبریل (عکسی)	″	۸/۰۰
ضرب کلیم (عکسی)	″	۸/۰۰
ارمغان حجاز اردو (عکسی)	″	۴/۵۰

غالبیات

دیوان غالب (عکسی)	ڈاکٹر نورالحسن نقوی	۱۲/۰۰
غالب: تقلید اور اجتہاد	پروفیسر خورشید الاسلام	۲۰/۰۰
غالب: شخص اور شاعر	مجنوں گورکھپوری	۱۵/۰۰
اطراف غالب	ڈاکٹر سید عبداللہ	۲۰/۰۰
فلسفی غالب	احمد رضا	۶/۰۰

جمالیات

جمالیات اور ادب	پروفیسر ثریا حسین	۱۵/۰۰
ادب میں جمالیاتی اقدار۔ ایک مطالعہ	ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی	۱۰/۰۰

فیض

کلام فیض (عکسی)	فیض احمد فیض	۳۰/۰۰
نقش فریادی (عکسی)	″	۶/۰۰
دست صبا (عکسی)	″	۶/۰۰
زنداں نامہ (عکسی)	″	۷/۵۰
دست تہ سنگ (عکسی)	″	۶/۰۰

ڈراما

اردو ڈراما کا ارتقاء	عشرت رحمانی	/۰۰
اردو ڈراما: تاریخ و تنقید	″	/۰۰
یونانی ڈراما	عتیق احمد صدیقی	/۰۰
انارکلی	ڈاکٹر محمد حسن	/۰۰

لسانیات

اردو لسانیات	ڈاکٹر شوکت سبزواری	/۰۰
اردو زبان و ادب	ڈاکٹر مسعود حسین خاں	۵۰

مثنوی

اردو مثنوی کا ارتقاء	عبدالقادر سروری	۵۰
مثنوی گلزار نسیم	ظہیر احمد صدیقی	۰۰
مثنوی سحر البیان	″	۰۰

افسانہ

اردو کے تیرہ افسانے	مرتبہ ڈاکٹر اطہر پرویز	۰۰
منٹو کے نمائندہ افسانے	″	۰
پریم چند کے نمائندہ افسانے	قمر رئیس	۰۰
نمائندہ مختصر افسانے	محمد طاہر فاروقی	۰
نیا افسانہ	وقار عظیم	۰۰
داستان سے افسانے تک	″	۰

سرسیدیات

سرسید اور ہندوستانی مسلمان	ڈاکٹر نورالحسن نقوی	۰
سرسید۔ ایک تعارف	پروفیسر خلیق احمد نظامی	
سرسید اور علی گڑھ تحریک	″	۰
انتخاب مضامین سرسید	آل احمد سرور	

ادب و تنقید

تنقیدیں	پروفیسر خورشید الاسلام	۲۰/۰۰
تنقیدی تناظر	ڈاکٹر قمر رئیس	۲۰/۰۰
ادبی تحقیق: مسائل اور تجزیہ	رشید حسن خاں	۲۵/۰۰
نثر، نظم اور شعر	ڈاکٹر منظر عباس نقوی	۷/۵۰
شناسا چہرے	ڈاکٹر محمد حسن	۱۵/۰۰
ناول کا فن	ابوالکلام قاسمی	۱۵/۰۰
مضامین نو	خلیل الرحمٰن اعظمی	۳۵/۰۰
یونانی ڈراما	عتیق احمد صدیقی	۲۰/۰۰
میں ہم اور ادب	ابن فرید	۲۰/۰۰
اسلوب	سید عابد علی عابد	۲۰/۰۰
نظم جدید کی کروٹیں	وزیر آغا	۱۸/۰۰
تنقید اور احتساب	〃	۱۵/۰۰
اردو شاعری کا مزاج	〃	۴۰/۰۰
تخلیقی عمل	〃	۲۰/۰۰
انسان اور آدمی	محمد حسن عسکری	۱۰/۰۰
ستارہ یا بادبان	〃	۱۵/۰۰
آج کا اردو ادب	ڈاکٹر ابواللیث صدیقی	۱۲/۰۰
جنگ آمد	کرنل محمد خاں	۱۴/۰۰
غزل اور مطالعہ غزل	ڈاکٹر عبادت بریلوی	۲۰/۰۰
شاعری اور شاعری کی تنقید	〃	۲۵/۰۰
جدید شاعری	〃	۲۵/۰۰
غزل اور درس غزل	اختر انصاری	۸/۰۰
حالی اور نیا تنقیدی شعور	〃	۵/۰۰
اردو ادب کی تاریخ	عظیم الحق جنیدی	۷/۵۰
مقدمہ شعر و شاعری	مقدمہ از وحید قریشی	۷/۵۰
تنقیدی سرمایہ	عبدالشکور	۳/۵۰
باغ و بہار	سلیم اختر	۱۰/۰۰
شعاع ادب	شرافت حسین مرزا	۳/۷۵
اکبر کی طنزیہ اور ظریفانہ شاعری	محمد زاہد	۱۵/۰۰
نذیر احمد کی کہانی کچھ ان کی کچھ میری زبانی	فرحت اللہ بیگ	۲/۵۰
منتخب ادبی خطوط	مغیث الدین فریدی	۱/۲۵
مجموعہ نظم حالی	ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی	۵/۰۰
سفینۂ ادب	محمد حسن	۳/۰۰
ساقی نامہ مع شرح	علامہ اقبال	۰/۹۵
منشی پریم چند شخصیت اور کارنامے	ڈاکٹر قمر رئیس	(زیر طبع)
محمد حسن عسکری اور مشرق کی بازیافت	ابوالکلام قاسمی	〃
چہرہ پس چہرہ	ابن فرید	〃

قواعد و گرامر اور لغت

اردو صرف	ڈاکٹر محمد انصار اللہ	۲/۹۵
اردو نحو		۱/۹۵
انگلش ٹرانسلیشن کمپوزیشن اینڈ گرامر	ایم۔ اے شہید	۴/۵۰
فیروز اللغات جدید (عکسی)		۲۵/۰۰
فیروز اللغات جیبی (عکسی)		۷/۰۰

انشاء و خطوط نویسی

گلدستہ مضامین و انشاپردازی	ڈاکٹر محمد عارف خاں	۶/۹۵

کامرس

ہائر سیکنڈری بک کیپنگ (حصہ اول)	ڈاکٹر محمد عارف خاں	۳۰/۰۰
ہائر سیکنڈری بک کیپنگ (حصہ دوم)	〃	۳۰/۰۰
ایڈوانسڈ اکاؤنٹس	〃	۲۵/۰۰
جدید طریقہ و تنظیم تجارت (بزنس میتھڈ اینڈ آرگنائزیشن)	〃	۳۰/۰۰

سیاسیات

دنیا کی حکومتیں (ورلڈ کانسٹی ٹیوشن)	محمد ہاشم قدوائی	۱۴/۰۰
تاریخ افکار سیاسی (ہسٹری آف پالیٹیکل تھاٹ)	محمد ہاشم قدوائی	(زیر طبع)
جمہوریہ ہند (کانسٹی ٹیوشن آف انڈیا)	〃	۱۰/۰۰
مبادیٔ سیاسیات (ایلیمنٹس آف پالیٹکس)	〃	۱۰/۰۰
مبادیات علم مدنیت (ایلیمنٹس آف سوکس)	〃	۵/۰۰

تاریخ

تاریخ و تہذیب عالم (ورلڈ ہسٹری)	اے۔ اے۔ ہاشمی	۱۵/۰۰
اسلامی تاریخ	〃	۵/۰۰
ہماری تاریخ و تمدن (حصہ دوم)	وحید اشرف	۳/۹۵
ہماری تاریخ و تمدن (حصہ سوم)	〃	۳/۵۰

جغرافیہ

ہمارا جغرافیہ (حصہ اول)	افضال احمد صدیقی	۲/۷۵
ہمارا جغرافیہ (حصہ دوم)	〃	۳/۷۵
ہمارا جغرافیہ (حصہ سوم)	〃	۳/۷۵

متفرق

جدید تعلیمی مسائل (ایجوکیشنل پرابلمس)
ڈاکٹر ضیاء الدین علوی ۹/۰۰
اصول تعلیم ۱۵/۰۰
تعلیمی نفسیات کے نئے زاویے " مسرت زمانی
(نیو اسپیکٹس آف ایجوکیشنل سائیکلوجی) ابن فرید } ۱۰/۰۰
رہبر صحت مسرت زمانی ۵/۰۰
علم خانہ داری " ۱۰/۰۰
بچوں کی تربیت " ۵/۰۰
ہندوستان کا تہذیبی ورثہ ڈاکٹر ضیاء الدین علوی ۲/۲۵
عام معلومات " ۵/۰۰
ایجادات کی کہانی ۴/۵۰

فارسی

نصاب فارسی ڈاکٹر غلام سرور ۴/۰۰
سخن نو حصہ اول " ۳/۵۰
سخن نو حصہ دوم " ۲/۵۰
سخن نو حصہ سوم " ۲/۷۵
گلہائے بہار " ۲/۰۰
انتخاب غزلیات فیضی ڈاکٹر محمد ابراہیم قاضی ۲/۰۰
قاآنی و قصیدہ نگاری او ڈاکٹر نصیر احمد صدیقی ۷/۵۰

دینیات

نصاب دینیات حصہ اول ڈاکٹر اقبال حسن خاں ۶/۵۰
نصاب دینیات حصہ دوم " ۴/۰۰
نصاب دینیات حصہ سوم " ۴/۵۰
العقیدۃ الحسنہ ۰/۷۵
ہادیان دین سید فرمان حسین ۵/۵۰
کتاب الحقوق ۱/۰۰
قول سدید مولوی ضیاء احمد بدایونی ۲/۲۵
جلوۂ حقیقت " ۸/۰۰

متفرق قاعدہ وغیرہ

نیا آسان قاعدہ حصہ اول ۰/۸۰
نیا آسان قاعدہ حصہ دوم ۰/۸۰
آسان اردو حصہ اول ۱/۰۰
آسان اردو حصہ دوم ۱/۰۰
آسان اردو حصہ سوم ۱/۰۰
ہندی کا نیا آسان قاعدہ
(اردو کے ذریعہ ہندی سکھانے والا) } ۱/۰۰

اردو شکشک
(ہندی کے ذریعہ اردو سکھانے والی کتاب) } ۱/۵۰
بچوں کی نئی نظمیں حصہ اول مسرت زمانی ۰/۷۵
بچوں کی نئی نظمیں حصہ دوم " ۰/۷۵

درسی مطبوعات

معیار ادب پروفیسر ثریا حسین ۶/۰۰
انتخاب اردو شاعری (۱۸۵۷ء تک) ڈاکٹر قمر جہاں ۴/۵۰
ابتدائی اردو نصاب ابوالکلام قاسمی ۶/۰۰
ادبی نمونے ڈاکٹر نورالحسن نقوی ۵/۰۰
آسان اردو ڈاکٹر مسعود عالم ۳/۵۰
بنیادی اردو عتیق احمد صدیقی ۲/۵۰
بنیادی نصاب ۲/۵۰
اردو نصاب حصہ اول محمد حسن، قمر رئیس،
ظہیر احمد صدیقی وغیرہ ۵/۰۰
اردو نصاب حصہ دوم ۷/۵۰
لازمی اردو نصاب خالدہ ناہید ۳/۵۰
اردو نثر و نظم منظر عباس نقوی، عتیق احمد صدیقی ۵/۰۰
اردو افسانے، انشائیے اور ڈرامے محمد قاسم صدیقی ۴/۷۵
نقوش ادب (حصہ نثر و نظم) مرتبہ شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی ۵/۰۰
خیابان ادب (حصہ نثر) مرتبہ عظیم الحق جنیدی ۳/۷۵
خیابان ادب (حصہ نظم) " ۳/۷۵
ابتدائی اردو نصاب (حصہ نثر و نظم)
مرتبہ شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی ۲/۵۰
نیا ادبی نصاب حصہ نثر و نظم
مرتبہ اطہر پرویز و عظیم الحق جنیدی ۵/۰۰
انتخاب نو (حصہ نثر و نظم) حصہ اول
مرتبہ شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی ۳/۰۰
انتخاب نو (حصہ نثر و نظم) حصہ دوم " ۳/۵۰
منتخبات نظم مرتبہ شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی ۱/۰۰
نصاب فارسی ڈاکٹر غلام سرور ۴/۰۰
سخن نو (حصہ اول) " ۳/۵۰
سخن نو (حصہ دوم) " ۲/۵۰
سخن نو (حصہ سوم) " ۲/۷۵
گلہائے بہار " ۲/۰۰

ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ

ایجنسی کی مطبوعات

اقبال کی تلاش

ظ۔ انصاری

صاحبِ طرز انشا پرداز اور غالب کو پہچاننے والے ظ۔ انصاری نے اقبال کی تلاش میں بھی اردو تنقید کا ہاتھ بٹایا۔

اس مجموعے میں ان کے ۱۲ مختصر اور طویل اور فکر انگیز مقالے شامل ہیں جن سے اقبال اور کلامِ اقبال کے مطالعے میں مدد ملتی ہے۔

اقبال کی معنویت اور تاثیر کو سمجھنے کی طرف ایک نیا قدم۔

قیمت : ۲۰/۰۰

نظیر نامہ

مرتبہ : شمس الحق عثمانی

"نظیر اکبر آبادی" کے مضامین کا بھرپور مجموعہ جس میں :

- نگار کے نظیر نمبر کے بہترین مضامین کا انتخاب۔
- نظیر پر لکھی ہوئی کتاب کا خلاصہ ــــ اور اس کے ساتھ ممتاز نقادوں کے مضامین۔
- نظیر نئے نقادوں کی نظر میں۔
- نظیر کے کلام کا انتخاب جن کے بغیر کلام نظیر کا مطالعہ نامکمل رہتا ہے۔

مجموعہ کے مضمون نگاروں میں :

- نیاز فتحپوری ○ مجنوں گورکھپوری ○ آل احمد سرور
- احتشام حسین ○ مخمور اکبر آبادی ○ اختر اورینوی
- ضیا احمد بدایونی ○ ابواللیث صدیقی ○ سجاد باقر رضوی
- اور دوسرے نئے نقاد

قیمت : ۴۰/۰۰

قدر شناسی

عتیق اللہ

اردو تنقید میں ایک نیا نام ــــ

جو تنقید میں ــــ

- توازن برتتا ہے
- جو ادب کو قدیم و جدید کے خانوں میں تقسیم نہیں کرتا۔
- جو ادب کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کرتا ہے۔

"قدر شناسی" میں شاعری اور افسانے پر سیر حاصل بحث ہے۔ بلاشبہ یہ اس دور کی اہم کتاب ہے جس کا مطالعہ ادیبوں، شاعروں اور طالب علموں کے لئے یکساں طور پر ناگزیر ہے۔

قیمت : ۲۰/۰۰

کرب خود کلامی (مجموعہ کلام)

اعجاز صدیقی (مرحوم)

اعجاز صدیقی کی قومی، وطنی، سیاسی و مسائلی نظمیں

- اعجاز صدیقی کو شاعری اپنے والد سیماب اکبرآبادی سے ورثے میں ملی۔
- اعجاز صدیقی کی نظمیں سنجیدہ اور پر وقار ہیں۔
- اعجاز صدیقی کے فن میں ان کی فکر اور بصیرت نے اس کو ہم عصر زندگی کا ترجمان بنا دیا ہے۔

۱۹۷۹ء کا اہم شعری مجموعہ ــــ

کرب خود کلامی

قیمت : ۱۲/۰۰

مطبوعات نیشنل بک ٹرسٹ

نئی فصل	بھٹاچاریہ	۸/۶۵
خلا کا سفر	بھگوتی پرساد	۹/۷۵
ریل گاڑی	چندر دون چمن لال مہتہ	۷/۷۵
زمین کی کہانی	ترجمہ راشد شہسوانی	۸/۵۰
پنجابی ڈرامے	" مخمور جالندھری	۱۲/۰۰
یہ ہماری زندگی اور آدھے چاند کی رات	ترجمہ عرش ملسیانی	۱۴/۲۵
پورن کمبھ	ترجمہ شانتی رنجن بھٹاچاریہ	۱۶/۷۵
دیمک	" رفعت سروش	۷/۷۵
آئینہ	" کنھیالال گاندھی	۹/۵۰
میلا آنچل	" سلمیٰ صدیقی	۱۸/۷۵
اردو مطبوعات واشاعت کے مسائل	مرتبہ انور کمال حسینی	۷/۰۰
سفر تمام ہوا	نیل پدمناتھن	۱۱/۷۵
قصہ پنجاب	ہرجیت سنگھ	۸/۵۰
آدھی گھڑی	پار پرتو	۱۵/۰۰
ایٹم کی کہانی	دھنونت کشور گپت	۹/۵۰
آزاد ہند فوج کی کہانی	ترجمہ قمر رئیس	۹/۲۵
گجراتی کے یکبابی ڈرامے	ترجمہ مظفر حنفی	۱۲/۲۵
چڑیاں	سلطانہ آصف فیضی	۳/۰۰
بوند اور سمندر	ترجمہ رضیہ سجاد ظہیر	۲۸/۷۵
ہندی کے یکبابی ڈرامے	ترجمہ محمد حسن	۱۲/۵۰
لہروں کی آواز	" راج نراین راز	۱۹/۵۰
راگ درباری	" راشد شہسوانی	۱۵/۵۰
آدمی کے روپ	ترجمہ سہیل عظیم آبادی	۱۲/۰۰
موت کے بعد	" محمود سروش	۸/۷۵
میں	" کشور سلطانہ	۹/۰۰
گنگا جیل سے پہلے	" رضیہ سجاد ظہیر	۶/۷۵
برہمن لڑکی	" اگرسین نارنگ	۷/۰۰

نیل کنٹھ پاکھی ٹوکی	راشد شہسوانی	۱۵/۰۰
بنگلہ واڑی	ترجمہ عرش ملسیانی	۵/۲۵
چار دیواروں میں	ظفر ادیب	۷/۷۵
فاطمہ کی بکری اور یمین کی ساتھی	ترجمہ اطہر پرویز	۵/۷۵
پنجابی افسانے	ترجمہ مخمور جالندھری	۷/۰۰
پنجابی کے یکبابی ڈرامے	ایس۔ ایم۔ شاہوار	۱۲/۰۰
عمر قید	سید آل رسول	۱۴/۵۰
تاش کے محل	ترجمہ زینت ساجدہ	۵/۵۰
سفید خون	" رتن سنگھ	۸/۰۰
مٹتی بنتی تصویریں	" رضیہ سجاد ظہیر	۵/۰۰
ہندی افسانے	" مخمور جالندھری	۹/۰۰
ملیالم افسانے	" جیلانی بانو	۸/۷۵
اردو افسانے	مرتبہ رضیہ سجاد ظہیر	۱۰/۵۰
پنجابی افسانے	ترجمہ اگرسین نارنگ	۷/۰۰
تامل افسانے	" حسرت سہروردی	۸/۰۰
زندگی ایک ناٹک	" کشور سلطانہ	۱۰/۰۰
شاعر	" پریش کمار ڈے	۸/۷۵
دود چراغ محفل	بچی بابو	۱۶/۲۵
تصویر بتاں	مترجم سید آل رسول	۱۴/۵۰
سفر تمام ہوا	نیل پدمناتھن	۱۱/۷۵
ڈاکٹر ذاکر حسین	ترجمہ محمد مجیب	۱۰/۰۰
بابا فرید	مترجم عتیق صدیقی	۷/۲۵
منتخب قومی شاعری	مرتبہ سردار جعفری	۴/۰۰
جدوجہد آزادی	ترجمہ غلام ربانی تاباں	۵/۵۰
جدوجہد آزادی میں مجلس قانون ساز کا رول	"	۹/۵۰
آب حیات	تلخیص، احتشام حسین	۶/۷۵
ابو خاں کی بکری	ذاکر حسین	۳/۰۰
پرانوں کی کہانیاں	گوپی چند نارنگ	۸/۲۵
انوکھی دکان	قدسیہ زیدی	۲/۵۰
دنیا کے جانور		۲/۵۰
راجا رام موہن رائے	عرش ملسیانی	۴/۵۰
خواجہ الطاف حسین حالی	صالحہ عابد حسین	۶/۵۰
سلطان زین العابدین	رضیہ سجاد ظہیر	۶/۵۰
ذاکر صاحب کی کہانی	سیدہ خورشید عالم	۶/۵۰
کچھوا اور خرگوش	ڈاکٹر ذاکر حسین	۲/۰۰

ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ

مطبوعاتِ ترقیِ اردو بورڈ

اجارہ داری	اے۔اے۔جی۔رابنس	۱۷/۵۰
فلسفہ کے بنیادی مسائل	اے۔سی۔ایونگ	۱۵/۷۵
امریکی ادب کا مختصر جائزہ	سلامت اللہ خاں	۹/۵۰
دکن کے بہمنی سلاطین	ہارون خاں شیروانی	۱۵/۵۰
تکمیلی احصار	ترجمہ سید مختار حسین	۲۲/۵۰
آزادی	〃 سید انصاری	۷/۲۵
تاریخ شاہجہاں	〃 سید اعجاز حسین	۱۴/۰۰
تعلیم اور اس کا سماجی پس منظر	ڈاکٹر سلامت اللہ	۱۰/۷۵
پوشکن	ڈاکٹر ظ۔انصاری	۱۲/۰۰
سماج اور تعلیم	محمد عبدالقادر عمادی	۶/۸۰
انیس کے مرثیے	مرتبہ صالحہ عابد حسین	۲۰/۰۰
زبان اور قواعد	رشید حسن خاں	۱۷/۰۰
فنِ طباعت	بلجیت سنگھ مطیر	۷/۲۵
یورپ کے عظیم سیاسی مفکرین	ڈاکٹر ہاشم قدوائی	۱۵/۵۰
معاشیات کے بنیادی اصول (حصہ اول)	سراج الحسن	۱۲/۲۵
تاریخ دستورِ انگلستان	سید علی محسن	۶/۰۰
آریہ سماج کی تاریخ	ترجمہ کشور سلطان	۱۰/۵۰
مغلیہ ہندوستان میں طریقِ زراعت	ترجمہ جمال محمد صدیقی	۲۴/۵۰
تالستائے	ڈاکٹر محمد یسین	۹/۲۵
اجزمیں	ترجمہ عبدالرشید	۱۰/۵۰
ظہیرالدین محمد بابر	ترجمہ ڈاکٹر رفعت بلگرامی	۱۴/۲۵
ہند آریائی اور ہندی	ترجمہ ڈاکٹر عتیق احمد صدیقی	۱۲/۵۰
مغلوں کا نظامِ مالگذاری	ترجمہ ڈاکٹر ایس نبی ہادی	۹/۰۰
رنجیت سنگھ	ترجمہ کیلاش چندر چودھری	۹/۲۵
کھاتہ نویسی و کھاتہ داری	ترجمہ کیو۔ایچ۔فاروقی	۱۲/۰۰
انسانی ارتقار	ترجمہ ڈاکٹر ایم۔آر۔ساہنی ڈاکٹر احسان اللہ	۱۲/۷۵
ارضیات کے بنیادی تصورات	ترجمہ ڈاکٹر ماجد حسین	۲۲/۰۰
طبیعیات کے بنیادی تصورات	ترجمہ وکیل احمد جعفری	۲۵/۰۰
حیدر علی	ترجمہ اقتدار حسین صدیقی	۱۷/۰۰
ہندوستانی معاشرہ عہدِ وسطیٰ میں	ترجمہ قمرالدین	۱۸/۲۵
ہندوستانی معیشت	ترجمہ محمد خلیق	۲۷/۲۵
جدید ہندوستان میں ذات پات	ترجمہ شہباز حسین	۱۰/۰۰
تاریخ تعلیم ہند	ترجمہ مسعود الحق	۲۰/۰۰
مفتاح التقویم	حبیب الرحمن خان صابری	۲۸/۰۰
فرہنگ آصفیہ	مؤلفہ مولوی سید احمد دہلوی (مکمل سیٹ)	۱۵۰/۰۰
یونانی ادویہ مفردہ	حکیم سید صفی الدین	۱۴/۵۰
امراض النسار	حکیم خورشید احمد	۲۷/۲۵
اردو املا	رشید حسن خاں	۷/۰۰
مجموعۂ نغز (تذکرہ شعرائے اردو)	مرتبہ پروفیسر محمود شیرانی	۵۰/۰۰
شہیدانِ آزادی (حصہ اول)	ترجمہ بھگونت سنگھ	۳۴/۰۰
برنارڈ شا	عبدالمغنی	۴/۰۰
خسرو شناسی	مرتبہ ڈاکٹر ظ۔انصاری، ابوالفیض سحر	۲۷/۰۰
بچے خفت	ڈاکٹر ظ۔انصاری	۱۱/۰۰
شریمد بھگوت گیتا	ترجمہ حسن الدین احمد	۴/۷۵
چند عام بیماریاں	ڈاکٹر حسین فاروقی	۴/۵۰
چراغ کا سفر	سید محمد ٹونکی	۱/۵۰
شریف زادہ	مرزا ہادی رسوا	۲/۲۵
دیس دیس کی کہانیاں	اطہر پرویز	۲/۲۵
اقبال کی کہانی	جگن ناتھ آزاد	۲/۵۰
عقلمند کمہار اور دوسرے ڈرامے	م۔ندیم	۲/۲۰
چار درویشوں کا قصہ	مرتبہ ڈاکٹر نورالحسن نقوی	۲/۲۵
ننھی بُت کا سفر	مرتبہ م۔ندیم	۲/۲۵
بچوں کی نظمیں	جگن ناتھ آزاد	۲/۰۰
حاتم طائی کا قصہ	مرتبہ ڈاکٹر نورالحسن نقوی	۶/۵۰
ادب کسے کہتے ہیں	اطہر پرویز	۱/۸۵
اچھی چڑیا (نظمیں)	محمد شفیع الدین نیر	۳/۰۰
پیسے کی کہانی	غلام حیدر	۳/۰۰
خط کی کہانی		۳/۷۵
رابنس کروسو	ڈینیل ڈیفو/م۔ندیم	۳/۴۰
حیاتِ جاوید	الطاف حسین حالی	۲۴/۰۰
تاریخ جہانگیر	رحم علی ہاشمی	۱۸/۲۵
پھول بن	ابن نشاطی	۸/۰۰
شعریات	ارسطو	۵/۲۵
انقلاب فرانس	بی۔جی۔سنگھ	۲۵/۵۰
نفسیات جنوں	فہمیدہ زماں	۵/۲۵
تحریک خلافت	قاضی محمد عدیل عباسی	۱۲/۰۰
تعلیمی تشکیل نو کے مسائل	غلام السیدین	۱۲/۷۵
ہندی ادب کے بھکتی کال پر مسلم ثقافت کے اثرات	سید اسعد علی	۱۵/۵۰
دیوان حسرت عظیم آبادی	اسما سعیدی	۱۸/۰۰
ہندوستان میں چھاپہ خانہ	علی ابن الحسنین	۷/۲۵
بنک کی کہانی	غلام حیدر	۴/۵۰
نصوح کا خواب	حفیظ عباسی	۳/۵۰
فطری علاج	حسن الدین	۶/۰۰

(ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ)

متفرق مطبوعات

جمالیات اور ادب	ڈاکٹر ثریا حسین	۱۵/۰۰
ادب میں جمالیاتی اقدار۔ ایک مطالعہ	ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی	۱۰/۰۰
مثنوی سحر البیان	〃	۵/۰۰
شناسا چہرے	ڈاکٹر محمد حسن	۱۵/۰۰
تنقیدیں	پروفیسر خورشید الاسلام	۲۰/۰۰
غالب تقلید اور اجتہاد	〃	۲۰/۰۰
اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک	خلیل الرحمٰن اعظمی	۴۰/۰۰
نظیر نامہ	شمس الحق	۴۰/۰۰
نئے اور پرانے چراغ	ڈاکٹر سید عبداللہ	۱۲/۵۰
وجہی سے عبدالحق تک	〃	۲۵/۰۰
متاعِ بارہ ماسہ	الطاف حسین ندوی	۱۰/۰۰
سائنس اور اجتہاد	ڈاکٹر احسان اللہ خاں	۲۰/۰۰
سماج پر سائنس کے اثرات	〃	۲۰/۰۰
قدر شناسی	عتیق اللہ	۲۰/۰۰
اردو کی بولیاں اور کرخنداری کا عمرانی لسانی مطالعہ	ڈاکٹر نصیر احمد	۶۵/۰۰
شبلی بحیثیت مورخ	اختر وقار عظیم	۲۰/۰۰
بابائے اردو احوال و افکار	سید معین الرحمٰن	۳۰/۰۰
اکبر کی طنزیہ اور ظریفانہ شاعری	محمد زاہد	۱۵/۰۰
آغا حشر اور اردو ڈراما	انجمن آرا	۳۰/۰۰
تماشا اور تماشائی	ڈاکٹر محمد حسن	۶/۰۰
عصری ادب غزل نمبر	〃	۱۰/۰۰
عصری ادب افسانہ نمبر		۱۰/۰۰
آدھی رات کی آزادی	لیری کولنس	۲۵/۰۰
صفدر آہ بحیثیت شاعر	ڈاکٹر زرینہ ثانی	۱۶/۰۰
تنقیدی تناظر	ڈاکٹر قمر رئیس	۲۰/۰۰
ادبی تحقیق مسائل و تجزیہ	رشید حسن خاں	۲۵/۰۰
میں ہم اور ادب	ابن فرید	۲۰/۰۰
ناول کا فن	ابوالکلام قاسمی	۱۵/۰۰
وجدان	ڈاکٹر عصمت جاوید	۱۰/۰۰
نئے تناظر	وزیر آغا	۲۵/۰۰
فن کار سے فن تک	ابوذر عثمانی	۳۰/۰۰
اردو شاعری میں قومی یکجہتی کی روایت	رام آسرے	۲۵/۰۰
آئینۂ فکر	مرزا امیر علی جونپوری	۱۰/۰۰
کلیات نواب مرزا شوق	ڈاکٹر شاہ عبدالسلام	۱۵/۰۰
ذکر السیدین شخصیت و افکار	علامہ شمسی طہرانی	۱۰/۰۰
حیات کلیم	سید محمد حسنین	۲۶/۰۰
سید احمد خاں کا سفرنامہ پنجاب	مولوی سید اقبال علی	۴۰/۰۰
اردو ادب میں خاکہ نگاری	ڈاکٹر صابرہ سید	۲۰/۰۰
پینترے	اوپندر ناتھ اشک	۱۲/۰۰
تولیے	〃	۱۲/۰۰
نٹو میرا دشمن	〃	۱۲/۰۰
مکاتیب رشید احمد صدیقی	خلیق احمد نظامی	۲۰/۰۰
آپ بیتی	عبدالماجد دریابادی	۲۵/۰۰
مشرقی معیار نقد	غضنفر علی	۵/۵۰
اقبال کے آخری دو سال	عاشق حسین بٹالوی	۴۵/۰۰
غالب اور اقبال کی متحرک جمالیات	ڈاکٹر یوسف حسین خاں	۱۵/۰۰
اقبال ایک مطالعہ	کلیم الدین احمد	۴۰/۰۰
ساحر شخص اور شاعر	ناز صدیقی	۲۰/۰۰
اردو تنقید کی اساس	سید محمد ہاشم	۸/۰۰
تحقیق و تدوین	〃	۱۸/۰۰
اخبار نویسی کے ابتدائی اصول	بلجیت سنگھ مطیر	۱۵/۰۰
باقیات انیس حصہ اول	اکبر حیدری کشمیری	۵۰/۰۰
مرزا سلامت علی دبیر	〃	۱۶/۰۰
چند ادبی شخصیتیں	شاہد احمد دہلوی	۳۰/۰۰
افکار عبدالحق	آمنہ صدیقی	۳۵/۰۰
مذہب اور سائنس	مولوی	۱۱/۰۰
آب حیات کا تنقیدی تحقیقی مطالعہ	سید سجاد	۵/۰۰
تحقیقی و تنقیدی مطالعہ باغ و بہار	〃	۹/۰۰
فکری ادب	سید مدیر علی زیدی	۱۰/۵۰
مشاہدات و تاثرات	شیخ عبداللہ	۱۵/۰۰
نثر، نظم اور شعر	منظر عباس نقوی	۷/۵۰
مضامین نو	خلیل الرحمٰن اعظمی	۲۵/۰۰
نقد فیض	نسیم عباسی	۱۴/۰۰
فیض ایک جائزہ	اشفاق حسین	۱۵/۰۰
اشاریہ کلام فیض	معین الدین عقیل	۱۲/۰۰
سیماب کی نظمیہ شاعری	زرینہ ثانی	۱۲/۵۰
اقبال فن اور فلسفہ	ڈاکٹر نورالحسن نقوی	۷/۵۰
فکر اقبال	خلیفہ عبدالحکیم	۴۰/۰۰
نادرات مرزا دبیر	سید صفدر حسین	۱۰/۰۰
اردو ڈراما کا ارتقاء	عشرت رحمانی	۴۰/۰۰
اردو ڈراما تاریخ و تنقید	〃	۲۰/۰۰

یادیں	رحم علی الہاشمی	۵/۰۰
عرضِ ہنر	ڈاکٹر محمد حسن	۱۲/۰۰
ابرِ نیساں	طیبہ خسرو	۱۵/۰۰
پریم چند فن اور تعمیر	ڈاکٹر جعفر رضا	۴۰/۰۰
آفاقی تنقید	کرامت علی کرامت	۳۰/۰۰
اردو میں رپورتاژ نگاری	عبد العزیز	۳۰/۰۰
اردو اسالیب نثر	امیر اللہ شاہین	۲۵/۰۰
جدید اردو لسانیات	〃	۷/۵۰
غزل پس منظر پیش منظر	ساحل احمد	۲۸/۰۰
شعر غیر شعر اور نثر	شمس الرحمٰن فاروقی	۲۱/۰۰
عروض آہنگ اور بیان	〃	۱۵/۰۰
حقائق	گیان چند جین	۳۰/۰۰
سیرۃ المصنفین	امیر اللہ شاہین	۲۵/۰۰
اردو ادب پر ہندی ادب کا اثر	موہن پرکاش	۴۵/۰۰
نقد ریزے	مظفر حنفی	۱۶/۰۰
غالب شناسی	ظ۔ انصاری	۲۰/۰۰
اقبال کی تلاش	〃	۲۰/۰۰
باغ و بہار	سلیم اختر	۱۰/۰۰
اقبال اور جمالیات	نصیر احمد ناصر	۴۰/۰۰
اقبال اور غالب	حامدی کاشمیری	۲۰/۰۰
اردو ناول سمت و رفتار	سید علی حیدر	۱۲/۰۰
انشائے مومن	ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی	۲۵/۰۰
رجب علی بیگ سرور	نیر مسعود رضوی	۳۰/۰۰
کارِ جہاں دراز ہے حصہ اول	قرۃ العین حیدر	۵۰/۰۰
〃 حصہ دوم	〃	۴۰/۰۰
میرا در میریات	صفدر آہ	۱۵/۰۰
سرسید اور ہندوستانی مسلمان	ڈاکٹر نور الحسن نقوی	۲۰/۰۰
پہلا پتھر	طالب زیدی	۴/۰۰
قاآنی و قصیدہ نگاری او	نصیر احمد صدیقی	۷/۵۰
دنیا گول ہے	ابن انشا	۱۵/۰۰
چلتے ہو تو چین کو چلئے	〃	۱۲/۰۰
پریم پچیسی مکمل	پریم چند	۱۸/۰۰
غزل نمبر فن شخصیت		۴۰/۰۰
جاں نثار نمبر	〃	۴۰/۰۰
کلیشور نمبر	〃	۲۵/۰۰
مہندر ناتھ نمبر	〃	۳۰/۰۰
تشکیل جدید	پروفیسر عبد المغنی	۲۰/۰۰
غور و فکر	ڈاکٹر علمہ رضوی برق	۱۵/۰۰
اردو کی نعتیہ شاعری	〃	۵/۰۰
مثنوی کا فن اور مثنویاں	ڈاکٹر نجم الہدیٰ	۱۰/۰۰
اردو ادب کے تین نقاد	ڈاکٹر سید نواب کریم	۱۰/۰۰
اردو ڈراما نگاری	ڈاکٹر قمر اعظم ہاشمی	۶/۰۰
اکبر الٰہ آبادی سماجی و سیاسی مطالعہ	ڈاکٹر افصح ظفر	۴۱/۰۰
نقد جستجو	〃	۱۲/۰۰
سخن کی تلاش	ڈاکٹر وہاب اشرفی	۴۰/۰۰
تلاشِ معیار	ڈاکٹر عبد الرؤف	۱۰/۰۰
مقالات سلطان احمد	ڈاکٹر عبد الخالق	۱۰/۰۰
انشائے ماہ منیر	حسن احمد	۷/۵۰
میر غلام علی عشرت بریلوی	ڈاکٹر احمد سجاد	۲۵/۰۰
مولوی کریم الدین حیات اور کارنامے	خان احمد صدیقی	۴۵/۰۰
شاد عظیم آبادی اور ان کی نثر نگاری	ڈاکٹر وہاب اشرفی	۴۰/۰۰
نئی علامت نگاری	سید محمد عقیل	۱۲/۵۰
تنقید اور عصری آگہی	〃	۱۲/۵۰
مطالعۂ داغ	سید محمد علی زیدی	۲۴/۰۰
یونانی ڈراما	عتیق احمد صدیقی	۲۰/۰۰
قصائد سودا	〃	۱۵/۰۰
جمالیات اور ہندوستانی جمالیات	قاضی عبد الستار	۱۲/۰۰
رام چرت مانس	نور الحسن نقوی	۲۵/۰۰
جدید عربی شاعری	نسیمہ فاروقی	۸/۰۰
بیجنگ آمد	کرنل محمد خاں	۱۴/۰۰
متنی تنقید	خلیق انجم	۶/۰۰
فن اور تنقید	انور کمال حسینی	۱۴/۰۰
اردو کی نثری تاریخ میں سرسید کا مقام	سید سلطان محمود حسین	۶/۰۰
بیچ کا ورق	ظفر اوگانوی	۱۰/۰۰
صغیر بلگرامی (حیات و کارنامے)	〃	۵۰/۰۰
ارسطو سے ایلیٹ تک	جمیل جالبی	۴۰/۰۰
تاریخ ادب اردو (حصہ اول)	〃	۶۰/۰۰
ایلیٹ کے مضامین	〃	۲۵/۰۰
مثنوی کدم راؤ پدم راؤ	〃	۳۰/۰۰
متاعِ سخن (انتخاب شاعری)	ڈاکٹر عبد الحق	۲۰/۰۰
اردو ڈراما اور انارکلی	سید حیدر عباس	۴/۵۰
افکار و نظریات	فضل امام	۱۲/۰۰
جدید ہندی شاعری	〃	۷/۵۰
نغمۂ مسلسل یا گوہر انتخاب	〃	۷/۵۰
مثنوی خنجر عشق	〃	۶/۰۰
اربابِ نثر اردو	مولوی سید محمد صاحب	۱۲/۵۰
انیسیات	سید مسعود حسن رضوی ادیب	۱۲/۵۰
اردو شاعری میں مستقبل	سید حامد حسین	۳۰/۰۰
زیر لب	صفیہ اختر	۱۲/۰۰
حرفِ آشنا	〃	۱۰/۵۰
مکاتیب احسن	عنوان چشتی	۲۰/۰۰
اردو شاعری میں جدیدیت کی روایت	〃	۲۰/۰۰
تنقید سے تحقیق تک	〃	۱۵/۰۰
عکس و شخص	〃	۵/۰۰
بسمل سعیدی شخص اور شاعری	〃	۱۸/۰۰
تیشۂ نظر	ابو الفیض سحر	۸/۰۰
گوپال متل ایک مطالعہ	محمد عبد الحکیم	۱۵/۰۰

گلاف جمع الجزائر	الیگزنڈر سولنیٹسن	۲۰/۰۰
کینسر وارڈ	〃	۱۸/۰۰
لاہور کا جو ذکر کیا	گوپال متل	۱۰/۰۰
تنقید اور احتساب	وزیر آغا	۱۵/۰۰
نظم جدید کی کروٹیں	〃	۱۸/۰۰
تخلیقی عمل	〃	۲۰/۰۰
اردو شاعری کا مزاج	〃	۴۰/۰۰
غالب شخص اور شاعر	مجنوں گورکھپوری	۱۵/۰۰
ادب اور زندگی	〃	۱۲/۰۰
فلسفی غالب	احمد رضا	۶/۰۰
اطراف غالب	ڈاکٹر سید عبداللہ	۲۰/۰۰
اشارات تنقید	〃	۱۷/۵۰
سرسید کے نامور رفقاء	〃	۱۳/۵۰
آج کا اردو ادب	ڈاکٹر ابواللیث صدیقی	۱۶/۰۰
لکھنؤ کا دبستان شاعری	〃	۲۵/۰۰
انسان اور آدمی	محمد حسن عسکری	۱۰/۰۰
ستارہ یا بادبان	محمد حسن عسکری	۱۵/۰۰
اسلوب	عابد علی عابد	۲۰/۰۰
اردو کے تیرہ افسانے	اطہر پرویز	۱۲/۰۰
منٹو کے نمائندہ افسانے	〃	۱۰/۰۰
پریم چند کے نمائندہ افسانے	قمر رئیس	۱۲/۰۰
نمائندہ مختصر افسانے	محمد طاہر فاروقی	۵/۰۰
شاعری اور شاعری کی تنقید	ڈاکٹر عبادت بریلوی	۲۵/۰۰
جدید شاعری	〃	۲۵/۰۰
غزل اور مطالعہ غزل	〃	(زیر طبع)
اردو تنقید کا ارتقاء	〃	۱۶/۰۰
مومن مطالعہ مومن	〃	۳۶/۰۰
سرسید اور علی گڑھ تحریک	پروفیسر خلیق احمد نظامی	(زیر طبع)
سرسید: ایک تعارف	〃	۳/۰۰
انتخاب مضامین سرسید	آل احمد سرور	۵/۰۰
اردو مثنوی کا ارتقاء	عبدالقادر سروری	۷/۵۰
مثنوی گلزار نسیم	ظہیر احمد صدیقی	۵/۰۰
اردو لسانیات	ڈاکٹر شوکت سبزواری	۱۲/۰۰
اردو زبان کا ارتقاء	〃	۱۱/۰۰
داستان زبان اردو	〃	۷/۵۰
اردو زبان و ادب	ڈاکٹر مسعود حسین خاں	۷/۵۰
مقدمہ شعر و شاعری	ڈاکٹر وحید قریشی	۷/۵۰
ادب اور تنقید	اسلوب احمد انصاری	۱۵/۰۰
فسانہ عجائب	اطہر پرویز	۱۵/۵۰
حالی اور نیا تنقیدی شعور	اختر انصاری	۵/۰۰
جدید تعلیمی مسائل	ضیاء الدین علوی	۹/۰۰
اصول تعلیم	〃	۱۵/۰۰
غزل اور درس غزل	اختر انصاری	۸/۰۰
تعلیم و تدریس	عظیم الحق جنیدی	۳/۰۰

کاروان ادب	حمیدہ سلطانہ	۲۰/۰۰
اردو کی تین مثنویاں	پروفیسر خان رشید	۶/۰۰
ترقی پسند ادب	عزیز احمد	۶/۰۰
شعاع ادب	شرافت حسین مرزا	۲/۷۵
بچوں کی تربیت	مسرت زمانی	۵/۰۰
ترقی پسند ادب ایک جائزہ	ہنس راج رہبر	۶/۰۰
ملا وجہی کے انشائیے	ملا وجہی	۸/۰۰
مسعودی بحیثیت جغرافیہ نگار	مقبول احمد	۶/۷۵
اسباب بغاوت ہند	سرسید احمد خاں	۵/۰۰
فن شاعری	علامہ اخلاق دہلوی	
مضمون نگاری	〃	۴/۵۰
صحت الفاظ	سید بدر الحسن	۷/۰۰
دو حالی	ظفر ادیب	۶/۰۰
گفت و شنید	〃	۶/۰۰
یگ جو بیت گیا	〃	۶/۰۰
اردو زبان کا قومی کردار	〃	۲۰/۰۰
خواب نئے	〃	۶/۰۰
نیا افسانہ	وقار عظیم	۱۵/۰۰
ہماری داستانیں	〃	۱۵/۰۰
داستان سے افسانے تک	〃	۲۰/۰۰
فن افسانہ نگاری	〃	۱۲/۰۰
تصورات اقبال	مولانا صلاح الدین احمد	۱۵/۰۰
ترجمہ اور فن روایت	قمر رئیس	۲۵/۰۰
تنقیدی سرمایہ	عبدالشکور	۳/۵۰
منتخب ادبی خطوط	مغیث الدین فریدی	۱/۲۵
گلدستہ مضامین و انشاپردازی	ڈاکٹر محمد عارف خاں	۶/۹۵
تعلیمی نفسیات کے نئے زاویے	مسرت زمانی	۱۰/۰۰
علم خانہ داری	〃	۱۰/۰۰
رہبر صحت	〃	۵/۰۰
عام معلومات	ڈاکٹر ضیاء الدین علوی	۵/۰۰
ایجادات کی کہانی	〃	۴/۵۰
جدید غزل	رشید احمد صدیقی	۳/۵۰
منشی پریم چند شخصیت اور کارنامے	قمر رئیس	(زیر طبع)
اردو شاعری میں سانیٹ	حنیف کیفی	۱۸/۰۰
تنقید و تشخیص	ارشد کاکوروی	۵/۵۰
تحقیقی مطالعے	علامہ اخلاق دہلوی	۴/۰۰
فن تنقید اور تنقیدی مضامین	نجم الہدیٰ	۵/۲۵
جذبات رضی	ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی	۱/۵۰
غالب اور سرور	ایم۔ حبیب خاں	۱۲/۰۰
غالب سے اقبال تک	〃	۱۲/۰۰
اردو کی قدیم داستانیں	〃	۸/۰۰
برہمن کی کہانی	ڈاکٹر محمد انصار اللہ	۵/۰۰
اردو صرف	〃	۲/۹۵
اردو نحو	〃	۱/۹۵

قاعدہ ہندی ریختہ	ڈاکٹر محمد انصار اللہ	۲/۵۰
اردو کی حروف تہجی	"	۲/۵۰
شیخ الہند محمود الحسن	ڈاکٹر اقبال حسن خاں	۳۰/۰۰
ادب میں سوانح نگاری کا ارتقاء	الطاف فاطمہ	۱۲/۵۰
غالب کی کہانی	شفیع الدین نیر	۳/۵۰
تنقیدی نقوش	ڈاکٹر عبدالقیوم	۵/۰۰
روپ رس	قلی قطب شاہ	۵/۰۰
آب حیات کے لطیفے	محمد حسین آزاد	۵/۰۰
حالی کا سیاسی شعور	معین احسن جذبی	۴/۵۰
اردو کے اسالیب بیان	محی الدین قادری زور	۳/۵۰
بیان غالب	باقر	۱۲/۰۰
مختصر تاریخ ادب اردو	اعجاز حسین	۱۵/۰۰
فارسی ادب کا ارتقا کی مختصر تاریخ	زہرا کامونپوری	۸/۰۰
چھیڑ غالب سے چلی جائے	اکبر علی خاں	۱۴/۰۰
چچا چھکن	سید امتیاز علی تاج	۶/۰۰
جب آنکھیں آہن پوش ہوئیں	عزیز احمد	۶/۰۰
بہو کی تلاش	نورالعین صدیقی	۶/۰۰
غم غلط	شوکت تھانوی	۵/۰۰
جزیرہ سخنوراں	غلام عباس	۵/۰۰
شہر کیا سوچتا ہوگا	سید رفیق حسین	۱۰/۰۰
رسوم دہلی	مولوی سید احمد دہلوی	۱۰/۰۰
پری خانہ	واجد علی شاہ اختر	۱۰/۰۰
افادات مہدی	مہدی افادی	۱۲/۰۰
شبلی نقادوں کی نظر میں	ناز صدیقی	۱۵/۰۰
پریم چند کی ناول نگاری	یوسف سرمست	۱۰/۰۰
بیسویں صدی میں اردو ناول	"	۱۵/۰۰
عرفان نظر		۱۲/۰۰
خواص شخصیت اور فن	محمد علی اثر	۱۲/۰۰
تنقیدی افکار	سلیمان اطہر جاوید	۱۰/۰۰
رشید احمد صدیقی	"	۱۲/۰۰
ادب میں ابہام	"	۱۲/۰۰
اسلوب اور انتقاد	"	۵/۰
تنقید شعر	سلیمان اطہر جاوید	۵/۰۰
دبستان آتش	شاہ عبدالسلام	۱۶/۰۰
علی گڑھ سے علی گڑھ تک	ڈاکٹر اطہر پرویز	۱۲/۰۰
اقبال دانائے راز	عبداللطیف اعظمی	۱۵/۰۰
اقبال اور دلی	عبدالقوی دسنوی	۹/۵۰
رابطہ عامہ	عرفان صدیقی	۵/۰۰
جدیدیت کی فلسفیانہ اساس	شمیم حنفی	۲۵/۰۰
شاد عارفی شخصیت اور فن	مظفر حنفی	۲۴/۰۰
صدرالدین آزردہ	عبدالرحمن پرواز اصلاحی	۱۲/۰۰
سرسید احمد خاں ایک سیاسی مطالعہ	عتیق صدیقی	۳۰/۰۰
اردو گیت	ڈاکٹر قیصر جہاں	۱۲/۰۰
اسمٰعیل میرٹھی حیات اور خدمات	ڈاکٹر سیفی پریمی	۱۸/۰۰

اقبال شناسی	علی سردار جعفری	۱۰/۵۰
انشائیات	ڈاکٹر سید عابد حسین	۱۵/۰۰
دلی کی بیگماتی زبان	محی الدین حسن	۷/۰۰
نظرے خوش گزرے	بیگم انیس قدوائی	۱۲/۰۰
فکر و ریاض	علی جواد زیدی	۱۲/۰۰
مثنوی نہ سپہر	ترجمہ رفیق عابد	۲۱/۰۰
اینٹنی اور کلیوپیٹرا	مجیب الرحمن	۱۶/۵۰
دراسات	نثار احمد فاروقی	۱۵/۰۰
آذری	کبیر احمد جائسی	۱۴/۰۰
شگوفہ زار	خواجہ عبدالغفور	۱۶/۰۰
علی برادران اور ان کا زمانہ	سید محمد ہادی	۱۵/۵۰
نئی شعری روایات	شمیم حنفی	۲۱/۰۰
فکر اسلام کی تشکیل جدید	ضیاء الحسن فاروقی	۳۰/۰۰
عشق اور بھگتی	آزاد فاروقی	۶/۰۰
ریڈیو ڈرامے کا فن	ڈاکٹر اخلاق اثر	۱۸/۰۰
کچھ نثریں بھی	آنند نراین ملا	۱۶/۰۰
بازگشت	ڈاکٹر کبیر احمد جائسی	۱۱/۰۰
جدید اردو ادب	ڈاکٹر محمد حسن	۱۵/۰۰
میر انیس سے تعارف	صالحہ عابد حسین	۷/۰۰
مشاہیر کے خطوط	عبداللطیف اعظمی	۱۲/۵۰
مسالک و منازل	ضیاء احمد بدایونی	۲۲/۰۰
نگارشات	پروفیسر محمد مجیب	۱۶/۰۰
ہوا کے دوش پر	غلام ربانی تاباں	۵/۵۰
قدیم دلی کالج	مالک رام	۴/۵۰
مسرت سے بصیرت تک	آل احمد سرور	۱۲/۵۰
نظر اور نظریے	"	۱۲/۵۰
تنقید کیا ہے؟	"	۶/۷۵
طنزیات اور مضحکات	رشید احمد صدیقی	۱۰/۵۰
ہندوستانی مفسرین اور ان کی عربی تفسیریں	سالم قدوائی	۱۶/۰۰
کہاوت اور کہانی	ڈاکٹر سیفی پریمی	۴/۵۰
اشخاص و افکار	ضیاء الحسن فاروقی	۷/۵۰
تجزیے	ڈاکٹر گیان چند جین	۱۳/۰۰
اردو قصیدہ نگاری کا تنقیدی جائزہ	ڈاکٹر محمود الٰہی	۱۴/۰۰
ہماری تہذیبی میراث	سید سفارش حسین	۷/۰۰
حسرت کی شاعری	ڈاکٹر یوسف حسین خاں	۲/۵۰
اردو اسیر	ظہیر الدین مدنی	۵/۵۰
بکھرے ورق	سونیتی کمار چٹرجی	۴/۰۰
جدید ترکی ادب کے ارکان ثلاثہ	ضیاء الحسن فاروقی	۴/۰۰
یاروں کے ساتھ	عتیق صدیقی	۱۸/۰۰
تلاش میر	نثار احمد فاروقی	۱۱/۰۰
آشفتہ بیانی میری	رشید احمد صدیقی	۶/۰۰
دہ صورتیں الٰہی	مالک رام	۱۲/۰۰
ہمارے ذاکر صاحب	رشید احمد صدیقی	۹/۰۰

اثر لکھنوی حیات اور کارنامے	محمود خاور	۱۵/۰۰
ڈاکٹر ذاکر حسین	عبداللطیف اعظمی	۶/۵۰
جانے والوں کی یاد آتی ہے	صالحہ عابد حسین	۱۸/۰۰
قلم کا مزدور	مدن گوپال	۵/۰۰
پریم چند کے خطوط		۷/۵۰
گنج ہائے گراں مایہ	رشید احمد صدیقی	۸/۰۰
مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زباں میں	خواجہ غلام السیدین	۳۰/۰۰
شہر آشوب	نعیم احمد	۸/۵۰
شراب کہنہ	رشید نعمانی	۴/۰۰
اکابر تعلیم	سعید انصاری	۱۲/۰۰
قومی یکجہتی اور سیکولرزم	ڈاکٹر تاراچند	۳/۵۰
آزادی کی چھاؤں میں	بیگم انیس قدوائی	۴۰/۰۰
اردو شاعری میں ہیئت کے تجربے	ڈاکٹر عنوان چشتی	۱۴/۰۰
سرسید کی صحافت	اصغر عباس	۱۷/۰۰
خسرو کا ذہنی سفر	ظ۔ انصاری	۱۰/۰۰
حافظ کی شاعری	کے۔ این۔ پنڈت	۱۶/۰۰
نیاز فتحپوری	امیر عارفی	۱۵/۰۰
تاریخ ادبیات تاجکستان	کبیر احمد جائسی	۱۳/۰۰
نوائے ظفر	خلیل الرحمن اعظمی	۱۰/۰۰
کلاسیکی مغربی تنقید	ڈاکٹر محمد یٰسین	۹/۰۰
ولی کے اردو مخطوطات	ڈاکٹر صلاح الدین	۱۲/۰۰
سب رنگ	”	۵/۰۰
اردو صرف و نحو		۴/۷۵
چند ہم عصر		۵/۰۰
یادگار حالی	صالحہ عابد حسین	۱۳/۰۰
جگر بریلوی ایک تعارف	ڈاکٹر سید لطیف حسین	۴/۵۰
دو تاریخی ڈرامے	فضل الرحمٰن	۷/۵۰
تذکرہ گلشن سخن	مسعود حسن رضوی	۸/۰۰
کیفیہ	برج موہن دتاتریہ کیفی	۱۴/۰۰
فرانسیسی ادب	ڈاکٹر یوسف حسین خاں	۱۷/۰۰
فائز دیوان فائز	مسعود حسن ادیب	۷/۵۰
ہندوستانی اخبار نویسی	محمد عتیق	۱۶/۰۰
فن تحریر کی تاریخ	محمد اسحٰق صدیقی	۱۰/۰۰
محمد رفیع سودا	ڈاکٹر خلیق انجم	۱۵/۰۰
تین مغربی ڈرامے	محمد عتیق صدیقی	۷/۰۰
دیوان اثر	کامل قریشی	۱۸/۰۰
صوبہ شمال مغربی کے اخبارات	محمد عتیق صدیقی	۱۵/۰۰
صحیفۂ خوشنویسان	احترام الدین شاغل	۱۲/۰۰
نئے ڈرامے	ڈاکٹر محمد حسن	۱۲/۰۰
فن شاعری	عزیز احمد	۶/۵۰
یادگار نظیر	مرتبہ جگر بریلوی	۹/۰۰
انتخاب شرح دیوان مومن	حامد حسن قادری	۷/۰۰
زبان زندگی اور تعلیم	غلام السیدین	۳/۵۰
ریختی کا تنقیدی مطالعہ	ڈاکٹر خلیل احمد صدیقی	۲۰/۰۰

غالبیات کے چند مباحث	ابو محمد سحر	۶/۰۰
اردو میں قصیدہ نگاری	”	۷/۰۰
فکری زاویے	ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی	۵/۰۰
فانی کی شاعری	”	۵/۵۰
مزاح و ماحول	ڈاکٹر سلام سندیلوی	۱۲/۰۰
تلاش و تاثر	عبدالقوی دسنوی	۵/۵۰
تجزیہ و تجربہ	سلام سندیلوی	۹/۰۰
اردو سے ہندی تک	عبدالودود	۳/۵۰
حکیم اجمل خاں	کوثر چاندپوری	۹/۰۰
خیر المجالس	مولانا احمد علی	۷/۰۰
گذشتہ لکھنؤ	مولانا عبدالحلیم	۱۰/۰۰
پنجاب میں اردو	محمود شیرانی	۱۰/۰۰
باقیات غالب	وجاہت علی سندیلوی	۴/۰۰
کردار	سید صفی مرتضیٰ	۳/۰۰
ہمارے نثر نگار	”	۲/۵۰
چند ممتاز شعراء		۲/۵۰
اردو انشائیہ	سید صفی مرتضیٰ	۴/۵۰
طنزیہ ڈرامے	ابراہیم یوسف	۸/۰۰
اردو غزل کے پچاس سال	ڈاکٹر عبدالاحد خاں	۹/۰۰
اردو کی کہانی شعراء کی زبانی	مناظر عاشق	۶/۰۰
اردو شاعری میں نرگسیت	ڈاکٹر سلام سندیلوی	۲۵/۰۰
اردو شاعری میں منظر نگاری	”	۱۲/۰۰
مطالعہ و مشاہدہ	”	۱۰/۰۰
ادب کا تنقیدی مطالعہ	”	۱۴/۰۰
مراثی انیس میں جذباتی تاویل	”	۵/۰۰
ادبی اشارے	”	۹/۰۰
اردو رباعیات	”	۱۴/۰۰
تلمیحات	محمود نیازی	۹/۰۰
دو ادبی اسکول	علی جواد زیدی	۷/۰۰
تنقید اور انداز	ڈاکٹر سید جعفر	۵/۰۰
اصناف ادب کا ارتقاء	سید صفی مرتضیٰ	۳/۵۰
سب رس	ملا وجہی	۱۲/۰۰
ناسخ	سید شبیہ الحسن	۳۰/۰۰
دیوان صد غزل	حسین علی	۱۲/۰۰
مولانا محمد علی شخصیت اور خدمات	نظر برنی	۲۰/۰۰
واقعات انیس	میر مہدی حسین	۹/۰۰
جدید ادبی جائزے	اصغر زمانی	۸/۰۰
شوکت تھانوی کی مزاحیہ صحافت	احمد جمال پاشا	۴/۰۰
مغرب کی بیداری	محمد صفیان علوی	۳/۵۰
نظم سائیکلو پیڈیا	ذکی کاکوروی	۱۲/۰۰
غزل انسائیکلو پیڈیا		۲۵/۰۰
ہماری شاعری	مسعود حسن رضوی	۷/۵۰
لکھنؤ کا شاہی اسٹیج	”	۱۲/۰۰
لکھنؤ کا عوامی اسٹیج	”	۱۲/۰۰

اقبالیات

فکر اقبال	خلیفہ عبدالحکیم	۴۰/۰۰
کلیات اقبال اردو (عکسی) صدی ایڈیشن مجلد		۲۰/-
اقبال اور جمالیات	نصیر احمد ناصر	۴۰/۰۰
اقبال اپنے آئینے میں	رئیس احمد جعفری	۲۰/۰۰
اقبال کی کہانی کچھ میری کچھ انکی زبانی	ڈاکٹر ظہیرالدین	۱۰/۰۰
تصورات اقبال	مولانا صلاح الدین احمد	۱۵/۰۰
اقبال کی تلاش	ظ۔ انصاری	۲۰/۰۰
اقبال شناسی	علی سردار جعفری	۱۰/۵۰
ذکر اقبال	عبدالمجید سالک	۱۲/۵۰
اقبال اور سید سلیمان ندوی	طاہر تونسوی	۲۰/۰۰
مطالعات اور مکاتیب علامہ اقبال	سید اختر الاسلام	۲۰/۰۰
اقبال اور عشق رسول	سید محمد عبدالرشید	۱۵/۰۰
خطوط اقبال	رفیع الدین ہاشمی	۳۰/۰۰
سفرنامہ اقبال	حق نواز	۲۵/۰۰
اقبال شخصیت اور شاعر	رشید احمد صدیقی	۱۲/۰۰
اقبال ایک تجزیاتی مطالعہ	سید معراج نیر	۱۵/۰۰
قرآن اور اقبال	ابو محمد مصلح	۱۸/۰۰
سیرت اقبال	محمد طاہر فاروقی	۱۸/۰۰
اقبال آئینہ خانے میں	آفاق احمد	۴۰/۰۰
اقبال کی شاعری اور اس کا پیغام	شیخ اکبر علی	۳۰/۰۰
اقبال اور مغربی مفکرین	جگن ناتھ آزاد	۱۰/۵۰
پیام مشرق	محمد یوسف سلیم چشتی	۶۰/۰۰
اقبال اور پیروی شبلی	افتخار حسین	۱۶/۵۰
فکر اقبال کا تدریجی انقلاب	سردار احمد	۱۰/۰۰
اطراف اقبال	ملک حسن اختر	۲۰/۰۰
اقبال اور عبدالحق	ممتاز حسن	۱۰/۰۰
پیام اقبال	عبدالرحمٰن طارق	۱۰/۰۰
عرفان اقبال	بشیر مخفی	۱۰/۰۰
مقامات اقبال	ڈاکٹر سید عبداللہ	۱۰/۵۰
نقش اقبال	اسلوب احمد انصاری	۲۱/۰۰
اقبال اور غالب	حامدی کاشمیری	۲۰/۰۰
بانگ درا (عکسی)	علامہ اقبال	۱۰/۰۰
بال جبریل (عکسی)	"	۸/۰۰
ضرب کلیم (عکسی)	"	۸/۰۰
حیات اقبال	طاہر تونسوی	۳۰/۰۰
حافظ اور اقبال	ڈاکٹر یوسف حسین خاں	۲۵/۰۰
روح اقبال		۲۵/۰۰
ولی سے اقبال تک	ڈاکٹر سید عبداللہ	۹/۰۰
اقبال فن اور فلسفہ	نورالحسن نقوی	۷/۵۰

غالبیات

دیوان غالب (عکسی)	نورالحسن نقوی	/۰۰
غالب شخص اور شاعر	مجنوں گورکھپوری	/۰۰
فلسفہ غالب	احمد رضا	/۰۰
اطراف غالب	ڈاکٹر سید عبداللہ	/۰۰
غالب تقلید اور اجتہاد	پروفیسر محمد رشید الاسلام	/۰۰
غالب		۸/۰۰
اقبال اور غالب	حامدی کاشمیری	/۰۰
غالب شناسی	ظ انصاری	/۰۰
غالب اور تصوف	مصطفیٰ صابری	/۰۰
غالب ببلوگرافی	ڈاکٹر انصاراللہ	۶/۵۰
غالب اور سرور	ایم حبیب خاں	۲/۰۰
متاع غالب	مرزا جعفر حسین	/۰۰
ہم عصروں پر غالب کا اثر	ظفر ادیب	/۰۰
غالب کی کہانی	شفیع الدین نیر	/۵۰
غالب کے ڈرامے	شوکت تھانوی	۲/۵۰
بیان غالب	باقر	۲/۵۰
غالب کی زندگی	امیر حسن نورانی	۲/۲۵
غالب نما	مرتضیٰ بلگرامی	۴/۰۰
مکالمہ غالب		۵/۰۰
غالب اور شاہان تیموریہ	خلیق انجم	۹/۵۰
غالبیات کے چند مباحث	ابو محمد سحر	۶/۰۰
باقیات غالب	وجاہت علی سندیلوی	۴/۰۰
غالب کی شاعری کا نفسیاتی مطالعہ	سلام سندیلوی	۱۲/۰۰
غالبیات	عبدالقوی دسنوی	۷/۰۰
مشکلات غالب	نیاز فتح پوری	۳/۰۰
غالب اور آہنگ غالب	ڈاکٹر یوسف حسین خاں	۱۶/۰۰
نقش غالب	اسلوب احمد انصاری	۱۰/۰۰
رموز غالب	ڈاکٹر گیان چند	۱۸/۵۰
ذکر غالب	مالک رام	۱۵/۰۰
غالب اور ذکا	ضیاالدین احمد شکیب	۶/۰۰
تلمیحات غالب	محمود نیازی	۶/۰۰
فسانہ غالب	مالک رام	۱۶/۵۰
فرہنگ غالب	مولانا عرشی	۱۵/۰۰
فیضان غالب	عرش ملسیانی	۲۳/۰۰
نکات و رقعات	مولانا عرشی	۱۰/۰۰
چھیڑ غالب سے چلی جائے	اکبر علی خاں	۱۴/۰۰
غالب سے اقبال تک	ایم حبیب خاں	۱۲/۰۰

ایجوکیشنل بک ہاؤس، مسلم یونی ورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ - ۲۰۲۰۰۱

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی مطبوعات

شعبہ اردو

عرفان غالب	آل احمد سرور	۸/۰۰
تنقید کے بنیادی مسائل	"	۷/۵۰
غالب بلگرامی	محمد انصار اللہ	۱۶/۵۰
کلیات جرأت	نور الحسن نقوی	۲۰/۰۰
وحید الدین سلیم	منظر عباس نقوی	۹/۰۰
خطوط وقار الملک		۲۵/۰۰
انتخاب کلام شعرا نمبر		۱۰/۰۰

شعبہ لسانیات

عاشور نامہ	ڈاکٹر مسعود حسین خاں	۱۰/۰۰
زبان و مسائل زبان	عبد الغفار شکیل	۷/۵۰
لسانی و تحقیقی مطالعے	"	۱۰/۰۰

شعبہ فارسی

دیوان سراج الدین خراسانی	ڈاکٹر نذیر احمد	۶۰/۰۰
دیوان مولانا کمال الدین اہلی ترشیزی	شمون اسرائیلی	۱۳/۰۰
گلزار حال	ڈاکٹر تارا چند رعابدی	۲۰/۰۰
مکاتیب سنائی	ڈاکٹر نذیر احمد	۲۰/۰۰
متاع غالب	مرزا جعفر حسین	۷/۰۰
روضات الجنات فی اوصاف مدینۃ ہرات	محمد اسحاق	۲۰/۰۰
طالب آملی	سید نبی ہادی	۶/۰۰
جوگ بششت	ڈاکٹر تارا چند رعابدی	۲۵/۰۰
پنجہ کیانہ	ترجمہ مصطفےٰ قالاد عباسی	۵۰/۰۰

شعبۂ دینیات

محمود الحسن اور علمی کارنامے	ڈاکٹر اقبال حسن خاں	۳۰/۰۰
مولانا انور شاہ کاشمیری	محمد رضوان اللہ	۲۰/۰۰
تبصرۃ المعلمین	سید منظور حسن رضوی	۸/۵۰
بانی درس نظامی	محمد رضا انصاری فرنگی محلی	۱۵/۰۰
تجارتی سود	فضل الرحمن	۵/۵۰
چار علمی مقالات	مولانا سعید احمد اکبر آبادی	۴/۰۰
زندہ سوالات	سید علی نقی نقوی	۳/۰۰
سجدہ گاہ	"	۳/۰۰
مقالات امینی	مولانا محمد تقی امینی	۹/۵۰
نفثۃ المصدور اور ہندوستان کی شرعی حیثیت	مولانا سعید احمد اکبر آبادی	۴/۵۰

شعبۂ اسلامک اسٹڈیز

عراق	محمود	۷/۰۰
برگزیدہ شعر فارسی معاصر حصہ اول	ڈاکٹر منیب الرحمن	۱۰/۰۰
" حصہ دوم	"	۱۰/۰۰
ترکی	اکمل ایوبی	۷/۰۰
جدید فارسی شاعری	ڈاکٹر منیب الرحمن	۴/۵۰
رسالہ والدیہ ترجمہ سی	اکمل ایوبی	۶/۰۰
ابن الفارض	غلام مصطفیٰ	۲۵/۰۰
عبد الرحمن الکواکبی	محمود الحق	۲۵

شعبۂ طب یونانی

کتاب العین	عطاء اللہ بٹ	۳۰/۰۰
نبض	شفاء الملک حکیم عبد اللطیف	۵/۰۰

اخراجات حصہ اول	حکیم سید کمال الدین حسین	۳/۵۰
حصہ دوم	"	۴/۰۰
حصہ سوم	"	۵/۰۰
اطبائے قدیم اور طب	حکیم خلیل احمد	۲/۰۰
ترجمہ کتاب الکشر } مقالات فی العین	حکیم محمد طیب	۴/۰۰
حکمائے قدیم کے } تشریحی کارنامے	حکیم سید محمد کمال الدین حسین	۴/۰۰
رفیق التشخیص حصہ اول	حکیم محمد رفیق الدین	۶/۰۰
رقوش الاطبار	حکیم مختار احمد کامل	۱/۰۰
طب اور سائنس	شفاء الملک حکیم عبداللطیف	۲/۰۰
حکیم العین اور اطبائے قدیم	حکیم محمد طیب	۲/۰۰
مختصر تاریخ، قدیم تشریح } منافع الاعضاء، علم الجراحت	شفاء الملک } حکیم عبداللطیف	۲/۰۰
مفتاح معقولات	حکیم سید علی حیدر جعفری	۲/۵۰
مناعت		۱/۰۰
عربی طبی ریڈر		۳/۰۰

طب کی کتب
(دوسرے اداروں کی)

آئینہ ہومیوپیتھی	مرزا محمد امین
کتاب الولادت	شمسی
ماڈرن میڈیسنز	مجید احمد
علم الادویہ ڈاکٹری	حکیم مظفر حسین
علم الجراثیم	مرزا عبدالنور بیگ

شعبۂ تاریخ

خیر المجالس	پروفیسر خلیق احمد نظامی
تاریخ داؤدی	شیخ عبدالرشید
واقعات عالمگیری	ترجمہ مولوی ظفر حسن

شعلۂ نیم سوز
مجموعۂ کلام
فضا ابن فیضی
۴۰/۰۰

ادب اور زندگی
مجنوں گورکھپوری
۱۲/۰۰

ادب اور تنقید
اسلوب احمد انصاری
۵/۰۰

ڈرامے

یونانی ڈراما	عتیق احمد صدیقی	۲۰/۰۰
تنہائی	ساگر سرحدی	۴/۵۰
جہاں آرا (اوپیرا)	رفعت سروش	۵/۵۰
آذر کا خواب	قدسیہ زیدی	۴/۵۰
جان ہار		۲/۰۰
آزمائش	پروفیسر محمد مجیب	۲/۲۵
خانہ جنگی	"	۲/۲۵
انجام	"	۱/۵۰
کھیتی		۱/۵۰
اوپر کی منزل	کرتار سنگھ دگل	۵/۰۰
پردۂ غفلت	ڈاکٹر عابد حسین	۳/۰۰

کیا خوب آدمی تھا	ڈاکٹر عابد حسین
دروازے کھول دو	کرشن چندر
سراج الدولہ	ترجمہ اشفاق حسین
نقش آخر	اشتیاق حسین
آئینہ ایام	ترجمہ خلیق احمد
انار کلی	امتیاز علی تاج مقدمہ محمد حسن
ہولی اور چراغ	الطرپہ ویز
شرابی	"
گڑیا کا گھر	قدسیہ زیدی
ہیروتی کی تلاش	محمد مجیب

شعراء کے کلام

دیوانِ غالب (عکسی)	نورالحسن نقوی	۱۲..
کلامِ فیض (عکسی)	فیض احمد فیض	۲۰/۰۰
نقشِ فریادی (عکسی)	〃	۶/۰۰
دستِ صبا (〃)	〃	۶/۰۰
زنداں نامہ (〃)	〃	۷/۵۰
دستِ تہِ سنگ (〃)	〃	۶/۰۰
شامِ شہرِ یاراں	〃	۱۰/۰۰
کلیاتِ اقبال اردو (عکسی)	علامہ اقبال	۲۰/۰۰
بانگِ درا (〃)	〃	۱۰/۰۰
بالِ جبریل (〃)	〃	۸/۰۰
ضربِ کلیم (〃)	〃	۸/۰۰
ارمغانِ حجاز اردو (〃)	〃	۴/۵۰
جستہ جستہ	پروفیسر خورشید الاسلام	۱۸/۰۰
شاخِ نہالِ غم	〃	۱۵/۰۰
تیسری کتاب	محمد علوی	۳۰/۰۰
آخری دن کی تلاش	〃	۳/۵۰
نایافت	حامدی کاشمیری	۱۶/۰۰
سفینۂ زرِ گل	فضا ابن فیضی	۱۵/۰۰
شعلۂ نیم سوز	〃	۴۰/۰۰

شکستوں کی فصل	آشفتہ چنگیزی	۱۰/۰۰
گرد باد		۱۵/۰۰
سبز اندر سبز	شمس الرحمٰن فاروقی	۹/۰۰
چار سمت کا دریا	〃	۶/۰۰
گنجِ سوختہ	〃	۵/۵۰
کوئے ملامت	کرشن موہن	۱۰/۰۰
گیان مارگی نظمیں	〃	۱۰/۰۰
شیرازۂ مژگاں	〃	۱۰/۰۰
۱۹۷۱ء کی منتخب شاعری	کمار پاشی۔ پریم گوپال	۴/۰۰
نئے عہد نامے کی سوغات	فیاض رفعت	۱۰/۰۰
شیرازہ	مخمور سعیدی۔ گوپال متل	۱۵/۰۰
کلیاتِ مائل حصہ اول	مولوی احترام الدین	۷۳/۵۰
کاغذی پیرہن	خلیل الرحمٰن اعظمی	۴/۵۰
اس بستی کے اک کوچے میں	ابن انشا	۱۰/۰۰
انتخابِ معانی	محمد رفیق اسلم	۶/۰۰
کاروانِ خیال	عطا کاکوری	۱۵/۰۰
کربِ خود کلامی	اعجاز صدیقی	۱۲/۰۰
الفاظ کا سفر	ظہیر غازی پوری	۱۰/۰۰
کلیاتِ اختر شیرانی	اختر شیرانی	۱۵/۰۰

رشتۂ کلام	محسن زیدی	۱۰/۰۰
ساتواں در	شہریار	۵/۰۰
شعری ادب	ساحل	۱۵/۰۰
میں	عبداللہ کمال	۲۰/۰۰
کینوس	عرفان صدیقی	۱۵/۰۰
ابرِ معنی	قادر صدیقی	۲۰/۰۰
متاعِ واہی	واہی	۲۰/۰۰
ماسوا	ظہیر صدیقی	۱۰/۰۰
فروزاں	جذبی	۲/۲۵
دہانِ زخم	اختر انصاری	۱۵/۰۰
پرِ طاؤس	〃	۴/۵۰
شعلہ بجام	〃	۲/۰۰
امیج	بشیر بدر	۶/۰۰
حسابِ رنگ	بانی	۱۵/۰۰
خرابہ	من موہن تلخ	۱۰/۰۰
جدید غزل	نشاط شاہد	۱۰/۰۰
روحِ محفوظ	سیماب اکبر آبادی	۲۰/۰۰
زت لفظوں	راج نرائن راز	۱۵/۰۰
اتمام	حکیم منظور	۱۵/۰۰
دیوان یکرو	شمیم احمد	۲۵/۰۰
شام گماں	عبدالرحیم نشتر	۵/۰۰

میکدہ	میکش بدایونی	۵/۰۰
شب گشت	عمیق حنفی	۸/۰۰
کلیاتِ شاد عارفی	شاد عارفی	۳۰/۰۰
نئی دنیا کو سلام	سردار جعفری	۸/۰۰
دھرتی کے لمس	زاہدہ زیدی	۱۲/۰۰
زہرِ حیات	〃	۸/۰۰
آتشِ سیال	ساجدہ زیدی	۱۲/۰۰
دشتِ صدا	آزاد گلاٹی	۱۲/۰۰
ضبط شدہ نظمیں	خلیق انجم	۲۱/۰۰
کلیاتِ جگر	مرتبہ کرشن کانت	۱۲/۷۵
جامِ شعور	سید اطہر حسین	۱۶/۰۰
آواز کا جسم	مخمور سعیدی	۱۰/۰۰
روبرو	کمار پاشی	۱۰/۰۰
آتشِ گل	جگر مرادآبادی	۸/۰۰
آہنگ	مجاز	۶/۰۰
جنگل	صلاح الدین پرویز	۲۵/۰۰
ثبات	محبوب راہی	۱۰/۰۰
مٹی کا مکان	شاہد کبیر	۱۵/۰۰
خاموشی	نیر ناگپوری	۱۰/۰۰
از سرِ نو	دلاور فگار	۵/۰۰
انتخابِ کلامِ مومن	عبدالودود خاں	۶/۰۰

روحِ افکار	واجد سحری	۱۰/۰۰
برگِ سبز	آزاد نوحی	۱۰/۰۰
دیوان	ناصر کاظمی	۱۰/۰۰
برگِ نے	〃	۸/۰۰
دردِ آشوب	احمد فراز	۱۰/۰۰
دست رس	نشتر خانقاہی	۱۴/۰۰
شجرِ صدا	عمیق حنفی	۱۰/۰۰
نژادِ سنگ	بلراج کومل	۱۰/۰۰
کلیاتِ فانی	فانی بدایونی	۱۰/۰۰
کلیاتِ حسرت	حسرت موہانی	۱۵/۰۰
صد رنگ آنچل	مناظر عاشق	۷/۰۰
لمحوں کا حصار	آفتاب شمسی	۵/۰۰
زخمِ صدا	اعزاز افضل	۷/۵۰
بیاضِ مریم	سکندر علی وجد	۱۲/۰۰
چشمِ خوں بستہ	انجم جمالی	۱۰/۰۰
مسافتِ شب	زبیر رضوی	۱۰/۰۰
خوشبو کا کرب	نکہت فانی	۵/۰۰
زنجیرِ شب	حامد الہ آبادی	۱۵/۰۰
آؤ کہ خواب بنیں	ساحر لدھیانوی	۱۶/۰۰

لغات

(اردو لغات)

فیروز اللغات (کلاں)	فیروز احمد	٦٠/٠٠
" جدید	"	٢٥/٠٠
" جیبی		٧/٠٠
لغات کشوری	نول کشور	٣١/٠٠
اردو لغت		٦/٠٠
فرہنگ آصفیہ (مکمل)		١٥٠/٠٠

(انگریزی سے اردو ڈکشنری)

انگلش اردو ڈکشنری (کلاں)	مولوی عبدالحق	٦٠/٠٠
" مختصر	"	٢٥/٠٠
" پاپولر	"	٦/٠٠
لیٹسٹ انگلش اردو ڈکشنری		١٨/٠٠
نیو آکسفورڈ ڈکشنری		٩/٥٠
ایڈوانسڈ ٹوینٹی سینچری ڈکشنری		٢٥/٥٠
اسٹوڈنٹس پریکٹیکل ڈکشنری		١٨/٠٠

(اردو سے انگریزی ڈکشنری)

اردو سے انگریزی ڈکشنری	مولوی عبدالحق	٥/٠٠
پاپولر اردو انگلش ڈکشنری		٨/٠٠
اسٹوڈنٹس ہوم ڈکشنری		/٠٠
اسٹوڈنٹس نیو ماڈل ڈکشنری		/٥٠
اسٹوڈنٹس پریکٹیکل ڈکشنری		٧/٠٠

(متفرق لغت)

مختصر فرہنگ پدماوت	محمد انصار اللہ	٥/٠٠
ہندی اردو لغت	فیاض حسین جامعی	٧/٠٠
اردو ہندی ڈکشنری	انجمن ترقی اردو	٠/٠٠
ہندی اردو لغت	ابو محمد امام الدین	٦/٠٠
اردو ہندی لغت	"	١/٥٠
المنجد (عربی اردو لغت)		١٠/٠٠
القاموس الجدید (عربی سے اردو)		٠/٠٠
مصباح اللغات (")		٠/٠٠
القاموس الجدید (اردو سے عربی)		٥/٠٠

تاریخ و مذہبی کتب

فضائل صدقات (عکسی)		١٢/٠٠
سیدہ کا لال		٣/٠٠
جنت کی کنجی		٦/٠٠
دوزخ کا کھٹکا		٤/٠٠
ربانی بہشتی زیور	مجلد ریکسین	١٨/٥٠
عہد نبوی کا نظام حکومت	سید سلیمان ندوی	١/٥٠
تحریک اسلامی کے کارکنوں کی ذمہ داریاں	ابوالاعلیٰ مودودی	١/٠٠
اسلامی نظام زندگی کی بنیادی توحید	نجات اللہ صدیقی	١/٠٠
تبلیغی نصاب اوّل (ریگزین)		١٧/٥٠
" حصہ دوم		١٧/٥٠
مرنے کے بعد کیا ہوگا		٧/٠٠
میں اور میرے اللہ میاں		٦/٠٠
فکر اسلامی کی تشکیل جدید	ضیاء الحسن فاروقی	٣٠/٠٠
مسلمان اور وقت کے تقاضے	مولانا عبدالسلام قدوائی	٨/٠٠
فقہ اسلامی اور دور جدید کے مسائل	مولانا مجیب اللہ ندوی	١٣/٠٠
جہاد اسلام	مولانا آزاد	٢/٥٠
نصاب رغبیات حصہ اول	ڈاکٹر اقبال حسن خاں	٦/٥٠
حصہ دوم ٤/٠٠	حصہ سوم	٤/٥٠

عرب میں تاریخ نگاری کا آغاز و ارتقاء	محمود الحسن	٥/٠٠
دین الٰہی اور اس کا پس منظر	مہر محمد خاں	/٠٠
دنیا اسلام سے پہلے اسلام کے بعد	عبدالسلام قدوائی	/٥٠
اسلامی عقائد و مسائل مذہب	مولانا جمال الدین	/٠٠
مسلمان اور سیکولر ہندوستان	ڈاکٹر مشیر الحق	/٠٠
مسلمان اور عصری مسائل	ڈاکٹر عابد حسین	/٥٠
کتاب و سنت کے جواہر پارے	مولانا جمال الدین	/٢٥
اسلام کی اخلاقی تعلیمات	امام غزالی	/٥٠
امریکہ کے کالے مسلمان	مشیر الحق	/٥٠
مسلم پرسنل لا کے تحفظ کا مسئلہ	طاہر محمود	/٠٠
شیخ الہند محمود الحسن "	ڈاکٹر اقبال حسن خاں	/٠٠
اسلام دوراہے پر	رحم علی الہاشمی	٢٥
الفاروق	شبلی نعمانی	/٠٠
رحمت عالم	سید سلیمان ندوی	٠٠
تاریخ ملت عربی	ہاشمی فرید آبادی	٠٠
احیائے دین	سید قربان حسین	٥٠
قول سدید	مولوی ضیاء احمد بدایونی	٢٥
مذہب اور جدید ذہن	مشیر الحق	

ناول و افسانے

دکھ سکھ اپنے	رضیہ بٹ	۱۰/۰۰
انیلا	〃	۱۰/۵۰
نمو	〃	۷/۵۰
سنگ ریزے	〃	۱۰/۰۰
عاشی	〃	۱۲/۰۰
نائلہ	〃	۱۲/۰۰
ریشم	〃	۱۳/۰۰
روپ	〃	۱۳/۰۰
اکیلی	سلمیٰ کنول	۹/۰۰
اس دیوانگی میں	〃	۱۲/۰۰
عندلیب	〃	۱۵/۰۰
اجالا	〃	۱۶/۵۰
صبا	〃	۱۳/۰۰
صدف	〃	۱۵/۰۰
راستے	حمیدہ جبیں	۱۰/۰۰
آبرو	〃	۱۸/۰۰
کورے کاغذ	〃	۱۲/۰۰
تمنا	〃	۱۰/۰۰
امانت	〃	۱۰/۰۰
شاخ بریدہ	〃	۹/۰۰
شیلا	عطیہ پروین	۹/۰۰
پھول کھلتے ہیں	〃	۱۱/۰۰
آنکھوں کے دیے	〃	۹/۰۰
ترا غم رہے سلامت	〃	۱۰/۵۰
بہاریں پھر بھی آتی ہیں	〃	۸/۰۰
اگر اور جیتے رہتے	〃	۷/۵۰
چھوٹے سرکار	〃	۶/۰۰
چندا	〃	۱۳/۵۰
رقیہ آپا	〃	۷/۰۰
راحتیں اور بھی ہیں	〃	۸/۷۵
پاگل مینا	مینا ناز	۱۵/۰۰
پھول کھلے چمن چمن	〃	۱۲/۰۰
دیکھے پتھر نے صنم	〃	۱۱/۰۰
بند آنکھوں کا سپنا	〃	۱۰/۰۰
ہرے کانچ کی چوڑیاں	〃	۱۲/۰۰
[illegible] پیا چاہے	〃	۱۰/۰۰
[illegible]	〃	۱۰/۵۰
[illegible]ق	〃	۱۰/۰۰
[illegible]ار	〃	۱۳/۰۰
[illegible]	〃	۱۳/۰۰

جب جب پھول کھلے	مینا ناز	۱۰/۰۰
مہرباں کیسے کیسے	〃	۱۷/۰۰
توبہ شکن	〃	۱۳/۵۰
گل شبو گل ہزارا	〃	۱۲/۰۰
جوڑے کا پھول	〃	۱۹/۰۰
پھولوں کی زنجیر	〃	۱۲/۰۰
صنم تیری قسم	〃	۱۰/۰۰
پیاسا پنچھی	〃	۱۲/۰۰
سپنوں کی شہزادی	〃	۱۰/۵۰
پیاسی مینا	〃	۱۲/۰۰
صنم	عفت موہانی	۱۰/۰۰
سویرے	〃	۹/۰۰
درد کا رشتہ	〃	۱۲/۰۰
پیاسی برسات	〃	۱۲/۰۰
بھنور	〃	۱۲/۰۰
قافلے بہار کے	〃	۱۰/۰۰
بے نام بھی آئینہ	〃	۸/۰۰
تقدیر	〃	۱۳/۰۰
پھول کا دل	〃	۸/۲۵
اک زخم یہاں	〃	۱۱/۰۰
محبت نام ہے غم کا	〃	۷/۵۰
ہم بچھے ہیں تیرے لئے	〃	۷/۵۰
آرزو کی سوغات	〃	۱۲/۰۰
بت جھڑ	〃	۱۰/۵۰
بزدل	〃	۷/۰۰
شام تمنا	〃	۸/۰۰
راز	〃	۸/۵۰
تیرے جہاں سے دور	〃	۸/۰۰
انتظار	〃	۵/۷۵
داغ دل	〃	۷/۵۰
راشدہ	سرور جہاں	۷/۵۰
ہم نشیں	〃	۷/۵۰
راہوں میں	〃	۱۲/۰۰
رنگ ہزار	〃	۱۲/۰۰
آواز نہ دو	〃	۱۱/۰۰
دھوپ دھوپ سایہ	〃	۱۵/۰۰
آخری تمنا	نسیم انہونوی	۷/۰۰
نشاط	〃	۹/۰۰
تمنا	〃	۸/۰۰
ایثار	صوفیہ ارمان	۱۱/۰۰

سانسیں		۵/۰۰	گردشیں	باجرہ مشکور
[illegible]		۴/۰۰	اداس شام کے آخری لمحے	کشمیری لال ذاکر
[illegible]		۴/۰۰	ایک عورت ایک قیامت	سیاح شامی
سرکش [illegible]		۳/۰۰	دوسری عورت دوسرا مرد	بی۔ایس۔بادل
[illegible]		۱۶/۰۰	گمنام ہمسفر	سیدہ صفرا
حسینہ	〃	۵/۰۰	دور اک تارا	شیریں گل درانی
نجم السحر	〃	۱۲/۰۰	عقیلہ	ماہ منیر
شگفتہ	〃	۵/۰۰	بھنور اور ساحل	〃
مہ پارہ	〃	۱۱/۰۰	بنی اسرائیل کا چاند	عبدالمجید حیرت
طارق	صادق حسین سردھنوی	۱۲/۰۰	عاطقہ	یاسمین صوفی
جوش اسلام	〃	۱۰/۵۰	زمین کا چاند	فرزانہ یاسمین
سیف اللہ خالد	〃	۱۵/۰۰	چراغ تہہ داماں	اقبال متین
صلیبی جہاد	〃	۸/۰۰	نچا ہوا البم	〃
سراج الدولہ	〃	۹/۰۰	دو بھیگے ہوئے لوگ	اقبال مجید
خوفناک جنگ	〃	۶/۰۰	چار چہرے	سہیل عظیم آبادی
فتح یرموک	〃	۴/۰۰	بے جڑ کے پودے	〃
بایزید یلدرم	〃	۳/۵۰	تنکے کا سہارا	شکیلہ اختر
جنگ خندق	〃	۱۰/۰۰	کرشمہ	عظمت رضا
افریقہ کی دلہن	〃	۱۲/۰۰	ڈاکٹر باجی	〃
جنگ بدر	〃	۱۰/۰۰	سب سے چھوٹا غم	عابد سہیل
آفتاب عالم	〃	۱۸/۰۰	ایک محبت کی کہانی	غازی صلاح الدین
کارٹون	شوکت تھانوی	۷/۵۰	غبار شب	قاضی عبدالستار
بڑبھس		۴/۰۰	خون کا رشتہ	اشونی والیہ
انشاء اللہ		۴/۰۰	نغمے کا سفر	جیلانی بانو
بکواس		۵/۰۰	بیس نئی کہانیاں	علی احمد فاطمی
فرحی	فرزانہ نصیر	۱۰/۰۰	آدمی	الیاس احمد گدی
نائیرہ	〃	۹/۰۰	ٹیپو سلطان	سید امجد علی
پونم کی رات	ملکہ معین	۱۲/۰۰	رنگین کانٹے	نور جہاں سلیم
قرینہ	راشدہ ناز	۱۰/۰۰	کنوارا دامن	نکہت شاجاپوری
عمرانہ	زہرا رضوانہ	۱۲/۵۰	طوفان حوادث	پروین سرور
شانی	رقیہ سلیم	۱۳/۰۰	قسمت	منظر ہاشمی
ماہم	زبیدہ خاتون	۱۵/۰۰	فٹ نوٹ	یوسف ناظم
فاکہہ	〃	۱۶/۰۰	نیکی کر تھانے جا	ابراہیم جلیس
شبیلہ	فرزانہ یاسمین	۹/۰۰	اوپر شیروانی اندر پریشانی	〃
آئینے اکیلے	کرشن چندر	۷/۰۰	مشینوں کا شہر	کرشن چندر
آدھا راستہ	〃	۱۱/۰۰	بیگانہ	البرٹ کامو
دھوپ کی عینک	وجاہت سندیلوی	۱۰/۵۰	کھلونے	مسعود مفتی
چمگادڑ	مخمور جالندھری	۳/۰۰	دیوانی	ماہ مبین
خرمن	شفیق جونپوری	۳/۰۰	ایک عورت ہزار دیوانے	کرشن چندر
ایک صلیب سرحد پر	صفیہ سلطانہ	۱۰/۰۰	دادر پل کے بچے	〃
دو غنڈے	مظفر حنفی	۵/۰۰	زری	زبیدہ سلطانہ
ایک ہی ڈگر	زلیخا حسین	۱۰/۰۰	صفو	〃
جمیلہ پاشا	مادام حلیمہ	۶/۰۰	طیبہ	قمر تاج
ٹیڑھی لکیر	عصمت چغتائی	۱۵/۰۰	ہمسفر	عفت موہانی
رانڈول	نواب زیدی	۱۰/۰۰	دردو درماں	〃
یاسمین	نور جہاں صدیقی	۹/۰۰	آنگن کی چاندنی	عطیہ پروین